نسخۂ متبرّکہ

مَا فِی الاِسلام

جلد ثانی

مؤلّفہ

خاکسار اصغر علی رُوحی

معلّم دیانات وادبیات

اسلامیّہ کالج لاہور

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ

بنورِ حکمتِ قرآں عزیما دل منور کن ٭ کہ محتاجی بتاریکی ست شمعِ شبستانی
کسے کز حضرتِ قرآں بروں افتد بِدو افتد ٭ بگیرندش بغلِ واز گوں رفید پشیانی
زبامِ چرخ می آید صلا در گوشِ جاں ہر دم ٭ کہ خوانِ ہین گستردیم عالم را بمہمانی
حصارِ استوارِ احمدِ مرسل کہ نیز دانش ٭ بگیتی برفشاندش برسر بیرِ قطعِ برہانی
سعادت از شقاوت باز داں بایں سچہ می سنجد ٭ دمِ بادِ سرِ بوجہل با انفاسِ سلمانی
منور شد دروبامِ جہاں از آفتابِ ما ٭ اگر شپّرہ بیروں شو از زندانِ ظلمانی

نسخۂ متبرکہ

مَا فِی الْاِسْلَام

جلد ثانی

مؤلفہ

خاکسار اصغر علی روحی معلم دیانات و ادبیات اسلامیہ کالج لاہور

در اوائل ایام سنہ ۱۳۵۰ ہجریہ علی صاحبہا التحیۃ باہتمام محمد منظور علم پریس لاہور سے انطباع یافت

بار اول ۔۔۔

فہرست مضامین مانی الاسلام جلد ثانی

تاج الدین کاتب

تونڈی راہ والی ڈاکخانہ خاص ضلع گوجرانوالہ

پیش لفظ

یہ امر اکثر قارئین کے لئے باعث حیرت ہو گا کہ اس زمانہ میں جہاں ہر قسم کی ادبی۔ معاشرتی۔ اقتصادی۔ مذہبی کتب کی کوئی کمی نہیں۔ مانی الاسلام جیسی کتاب دوبارہ چھپوانے کا اہتمام کیوں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ہر مسلمان کو صرف اسلامی عقائد اور احکام کا پابند ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے ان اعمال اور عقائد کی تبلیغ بھی ضروری ہے۔ یہ فرض اساتذہ پر خاص طور پر عائد ہوتا ہے جو اپنے طلبا کی تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ خدائے عزوجل کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے بندہ کو کئی پشتوں سے اس شرف سے نوازا اور توفیق بخشی کہ تعلیم کے ہر شعبہ کے لئے صحیح العقیدہ مسلمان پیدا کرے۔ مجھے امریکہ جانے کا تین دفعہ موقعہ ملا۔ یہ تمام عرصہ چند ماہ سے زیادہ نہ تھا لیکن میرے فرزند ڈاکٹر انعام الحق کی نیویارک میں موجودگی کے باعث بہت مفید ثابت ہوا۔ عزیزی انعام نہ صرف صحیح العقیدہ مسلمان ہیں بلکہ عملی طور پر دوسرے فرائض کے علاوہ تبلیغ دین کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ایک اسلامک سنٹر کا اجرا اور ہفتہ وار مسلمانوں کا اجتماع اور وعظ کا اہتمام ان کے معمول میں شامل ہے۔ میں جتنا عرصہ نیو یارک میں رہا حاضرین نے جن میں اکثریت امریکن نو مسلموں کی تھی مختلف مذہبی موضوعات پر بحث میں حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں میں نے اور عزیزی انعام الحق نے شدت سے محسوس کیا کہ اسلامک سنٹر کے ساتھ اسلامی کتب کی ایک لائبریری کا ہونا بہت ضروری ہے جہاں مانی الاسلام جیسی بلند پایہ تالیفات اور تصانیف کی اشاعت کا بھی اہتمام ہو۔ عزیزی انعام الحق اور میری دلی خواہش ہے کہ اس سلسلہ میں مؤلفِ مرحوم کی دوسری تصانیف کو بھی دوبارہ چھپوا کر سعادت دارین حاصل کریں۔

میں ذاتی طور پر برادرم احسان الحق کا ممنون ہوں جنہوں نے اپنی خاص توجہ اور محنت سے کام لے کر اپنے مطبع نیو فائن پرنٹنگ پریس لاہور میں اس کتاب کی طباعت کا اہتمام کیا۔

آخر میں قارئین سے التماس ہے کہ کتاب سے استفادہ کے بعد مؤلف کے حق میں دعائے مغفرت کرنا نہ بھولیں۔

فقط والسلام

خاکسار حافظ عبدالحق

کاتب تاج الدین بابا
تلونڈی راہ والی ڈاکخانہ خاص ضلع گوجرانوالہ

پیش لفظ

یہ امر اکثر قارئین کے لئے باعث حیرت ہو گا کہ اس زمانہ میں جہاں ہر قسم کی ادبی۔ معاشرتی۔ اقتصادی۔ مذہبی کتب کی کوئی کمی نہیں۔ مانی الاسلام جیسی کتاب دوبارہ چھپوانے کا اہتمام کیوں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ہر مسلمان کو صرف اسلامی عقائد اور احکام کا پابند ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے ان اعمال اور عقائد کی تبلیغ بھی ضروری ہے۔ یہ فرض اساتذہ پر خاص طور پر عائد ہوتا ہے جو اپنے طلبا کی تربیت کے ذمہ وار ہیں۔ خدائے عزوجل کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے بندہ کو کئی پشتوں سے اس شرف سے نوازا اور توفیق بخشی کہ تعلیم کے ہر شعبہ کے لئے صحیح العقیدہ مسلمان پیدا کرے۔ مجھے امریکہ جانے کا تین دفعہ موقعہ ملا۔ تہ تمام عرصہ چند ماہ سے زیادہ نہ تھا لیکن میرے فرزند ڈاکٹر انعام الحق کی نیویارک میں موجودگی کے باعث بہت مفید ثابت ہوا۔ عزیزی انعام نہ صرف صحیح العقیدہ مسلمان ہیں بلکہ عملی طور پر دوسرے فرائض کے علاوہ تبلیغ دین کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ایک اسلامک سنٹر کا اجرا اور ہفتہ وار مسلمانوں کا اجتماع اور وعظ کا اہتمام ان کے معمول میں شامل ہے۔ میں جتنا عرصہ نیو یارک میں رہا حاضرین نے جن میں اکثریت امریکن نو مسلموں کی تھی مختلف مذہبی موضوعات پر بحث میں حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں میں نے اور عزیزی انعام الحق نے شدت سے محسوس کیا کہ اسلامک سنٹر کے ساتھ اسلامی کتب کی ایک لائبریری کا ہونا بہت ضروری ہے جہاں مانی الاسلام جیسی بلند پایہ تالیفات اور تصانیف کی اشاعت کا بھی اہتمام ہو۔ عزیزی انعام الحق اور میری دلی خواہش ہے کہ اس سلسلہ میں مؤلفِ مرحوم کی دوسری تصانیف کو بھی دوبارہ چھپوا کر سعادت دارین حاصل کریں۔

میں ذاتی طور پر برادرم احسان الحق کا ممنون ہوں جنہوں نے اپنی خاص توجہ اور محنت سے کام لے کر اپنے مطبع نیو فائن پرنٹنگ پریس لاہور میں اس کتاب کی طباعت کا اہتمام کیا۔

آخر میں قارئین سے التماس ہے کہ کتاب سے استفادہ کے بعد مؤلف کے حق میں دعائے مغفرت کرنا نہ بھولیں۔

فقط والسلام

خاکسار حافظ عبدالحق

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

مَافِی الْاِسْلَام

حصہ دوم - باب ہشتم

ضرورت عبادت

انسان کا اشرف کائنات ہونا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں - جس میں ہم نے بیان کیا تھا کہ انسان کی شرافت ذاتی کا مدار کمال علم و عمل پر موقوف ہے - اور کمال علم سے عقاید صحیحہ مراد ہیں - اور کمال عمل سے احکام شریعہ کی پابندی - ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی سوسائٹی کے رسوم و رواج کے رُو سے چند ایک اخلاقی باتیں سیکھ لے اور اس کو اپنے لئے کافی سمجھے - مگر صرف اس حد تک محدود رہنے سے یقیناً وہ انسان کے صحیح معنی سمجھنے سے قاصر ہے - یا یوں کہو کہ اس خیال کا شخص جوہر عقل کو کھو کر انسان نہیں رہا بلکہ زمرۂ حیوانات میں داخل ہو گیا - کیونکہ اگر ہم انسان کو جوہر عقل سے عاری فرض کر کے اسے صرف ایک جاندار متحرک جسم خیال کریں تو ایسے انسان اور دیگر حیوانات میں کوئی مابہ الامتیاز نظر نہیں آتا - ہاں بے شک صورت و شکل میں حیوانات سے ضرور ممتاز ہے - مگر انسان صرف صورت و شکل کا نام نہیں بلکہ انسان جوہر عقل کے ساتھ انسان ہے - جس کے ساتھ اس کی دنیا و

آخرت کی صلاح وفلاح وابستہ ہے۔ اگر یہ نکتہ صحیح طور پر انسان کے ذہن نشین ہو جائے تو یقیناً اتباع شریعت سے وہ کبھی جی نہ چرائے۔

انسان کو عبد کہا گیا ہے۔ اور عبد کا فرض اطاعتِ خداوندی ہے۔ جس کو اصطلاحِ شریعت میں عبادت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اِس لئے حقیقی طور پر انسان وہی شخص کہلا سکتا ہے جو شریعت کے مطابق فرض عبادت کو بجا لائے۔ کیونکہ وہ اسی غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا وَمَا خلقت الجن والا نس الا لیعبدون۔ یعنی میں نے جن اور انسان کو صرف اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ اور پھر فرمایا وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین۔ یعنی انہیں صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ خالصاً لوجہ اللہ فرض عبادت کو بجا لائیں۔ اِس لئے جو شخص اس فرض کے بجا لانے سے پہلو تہی کرتا ہے وہ درحقیقت انسان نہیں۔ کیونکہ صحیح معنی میں کوئی چیز اُسی وقت وہ چیز ہو سکتی ہے جبکہ وہ اپنے اس فعل میں کامل ہو جس کے لئے وہ وجود پذیر ہوئی ہے۔ اور جب اُس میں وہ بات موجود نہ ہو تو اُس چیز سے اُس کا نام اُٹھا لیا جاتا ہے۔ تم روزمرہ سنتے ہو گے کہ مریل اور چسڈی گھوڑے کو کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ یہ تو گھوڑا نہیں ہے یا ناکارہ اور وحشی آدمی کو کہہ دیتے ہیں کہ اس کو آدمی کون کہتا ہے۔ اسی بنا پر کفار نہ تو حق کو سنتے اور نہ زبان سے اِس کا اقرار کرتے اور نہ حق و باطل میں غور کرتے۔ اِس لئے انہیں صمٌ بکمٌ عمیٌ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا۔ حالانکہ وہ کان۔ زبان اور آنکھیں رکھتے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان اُسی وقت اور اُسی قدر انسان کہلائے گا جس وقت اور جس قدر وہ فرض عبادت کو بجا لائے۔ ورنہ نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرمایا۔ اِن ھم الا کالا نعام بل ھم اضل سبیلا۔ یعنی وہ تو چوپائے ہیں بلکہ گمراہی میں چوپایوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ اور دوسری جگہ ان کو شر الدوا

کا خطاب دیا گیا - یعنی زمین پر چلنے پھرنے والے جانداروں سے بھی بدترین وہ لوگ ہیں جو قبول حق سے اعراض کرتے ہیں ۔

نکتۂ لطیفہ حضرات علمائے اُمّت اس امر پر متفق ہیں کہ قرآن مجید کے جمیع معارف وحقائق پر حاوی ہونا طاقت بشری سے خارج ہے - چنانچہ ایک حدیث میں بھی اس امر کی طرف بالفاظ لا تنقضی عجائبہ اشارہ کیا گیا ہے - یعنی قرآن مجید کے معارف وحقائق کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا -

سالہاسال سے فقیر مؤلف کے دل میں سورۂ الرّحمٰن کے ابتدائی آیات الرحمٰن علم القرآن - خلق الانسان - علمہ البیان کے متعلق یہ خلجان چلا آتا تھا کہ ان آیات کی یہ ترتیب کیونکر کی گئی - اور انہی جملوں کو حرف عطف کے ساتھ کیوں بیان نہیں کیا گیا - کیونکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کی ترتیب یوں ہوتی - الرحمٰن - خلق الانسان وعلمہ البیان وعلمہ القرآن - کیونکہ طبعی طور پر پہلے انسان کو پیدا کیا - پھر اُسے کمال نطق کے ساتھ اس خالق حقیقی نے امتیاز بخشا - جس سے وہ قرآن کے معانی کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے -

اتفاقاً ایک دن کتاب تفصیل النشأتین وتحصیل السعادتین تالیف امام ابو القاسم حسین ابن محمد ابن مفضل المعروف بہ راغب اصفہانی کے دیکھنے کا موقعہ ملا - اور ترتیب آیات کا عقدہ حل ہوگیا - امام ممدوح کے حق میں دعائے مغفرت کی اور خدا کا شکر بجا لایا کہ ایک مدت العمر کی مشکل حل ہوئی جو کئی ایک تفاسیر کے دیکھنے سے بھی حل نہیں ہوئی تھی فللحمد للہ علےٰ ذٰلک - چونکہ امام موصوف کی توجیہ ترتیب ہمارے موضوع زیر بحث سے تعلق رکھتی ہے - اس لئے اس کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے ۔

امام موصوف لکھتے ہیں کہ ان آیات کی ترتیب میں ایک لطیف نکتہ مضمر ہے - جس سے ذات باری نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان دین کی پابندی کئے بغیر انسان

نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ اسے حقائق دینیہ کے بیان کرنے کی قدرت حاصل ہوسکتی ہے۔ جملہ علم القرآن سے اس امر کا اظہار فرمایا کہ انسان جب تک تعلیم قرآن سے متصف نہ ہولے تب تک وہ انسان ہی نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان متصف بالقرآن ہو کر ہی انسان کہلا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے متعلق ایک حدیث میں وارد ہوا کان خلقہ القرآن اور اخلاق امور طبعی ہیں نہ کسبی۔ اس لئے اس میں انسان کے پیدا کرنے سے پہلے اس کی حقیقت کاملہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد جملہ علمہ البیان ارشاد فرمایا۔ جس سے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بیان حقیقی جو انسان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے وہ صرف معرفت قرآن پر موقوف ہے۔ اس لئے آیات کی اس ترتیب مخصوص اور حرف عطف کے حذف کرنے اور ہر ایک جملہ کو اپنے ماقبل کا بدل قرار دینے سے اس نکتہ پر آگاہ کیا گیا ہے کہ انسان جب تک عقائد و احکام صحیحہ سے متصف ہو کر مقام عبادت کو حاصل نہ کرلے تب تک وہ نہ تو انسان کہلا سکتا ہے نہ اس کا کلام بیان + علم معانی کا ماہر جانتا ہے۔ کہ اگر ان جملوں میں حرف عطف لایا جاتا تو قواعد نحو کے مطابق ہر ایک جملہ اپنے ماقبل کا بدل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے مسطورہ بالا بلاغت پیدا نہ ہوسکتی ❊

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ بیان مذکورہ بالا سے پایا جاتا ہے کہ کافر جو نہ شریعت کو مانتا ہے اور نہ اس کا متبع ہے انسان نہیں کہلا سکتا۔ حالانکہ قرآن مجید کے کئی ایک آیات میں انسان کا لفظ کافر پہ اطلاق کیا گیا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ تعارف ناس یعنی محاورۂ عامہ کچھ اور ہے اور تحقیقی استعمال کچھ اور۔ اس لئے کافر پر لفظ انسان کے اطلاق کی نفی عقلاً اور شرعاً کی گئی ہے نہ لوگوں کی عام بول چال کے رو سے جس کا مطلب یہ ہے کہ عقل اور شریعت کے رو سے ایسا شخص فی الحقیقت انسان نہیں کہلا سکتا۔ اور اگر کبھی اہل شریعت اس پر انسان کا لفظ اطلاق کر بھی دیں تو وہ

بطور مجاز ہوگا نہ بطور حقیقت - اور لوگوں کا اپنی بول چال میں اسے انسان کہنا اسے انسان نہیں بنا دیتا - کیونکہ لوگ اپنے محاورات میں ایسے کئی ایک لفظ کا استعمال کسی خاص معنی میں کرتے ہیں - مگر شریعت اس استعمال کو صحیح قرار نہیں دیتی - مثلاً عام بول چال میں غنی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو مالدار ہو - مگر ایک حدیث میں اس استعمال کو غلط قرار دیا گیا ہے - حدیث یہ ہے لیس الغنی بکثرۃ المال وانما الغنی غنی النفس - یعنی تونگری کثرت مال کا نام نہیں بلکہ تونگری دل کی تونگری کا نام ہے - اور محاورۂ عامہ کو قرآن مجید نے استعمال کیا ہے - حیث قال عزوجل - ومن کان غنیا فلیستعفف - اس لئے ایسے شخص پر جو متبع شریعت نہ ہو انسان کے لفظ کا اطلاق بطور مجاز ہوگا نہ بطور حقیقت - اور قاعدہ یہ ہے کہ جب اہل بلاغت کسی لفظ کا اطلاق کسی چیز پر مقام مدح میں کیا کرتے ہیں تو اس وقت اس چیز سے فرد کامل مراد لیا جاتا ہے - کلام بلیغ میں اس کی کئی ایک مثالیں پائی جاتی ہیں - مثلاً آیہ ورفعنا لك ذكرك میں ذکر سے مراد ذکر محمود ہے - حالانکہ لغت کے رُو سے اس کا اطلاق محمود و مذموم ہر دو قسم کے ذکر پر کیا جاسکتا ہے - اسی طرح کبھی کسی چیز کو مقام مدح میں اس کی نوع کے لفظ سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں جیسے کہ دیں ہاں وہ شخص انسان ہے یا یہ گھوڑا گھوڑا ہے - گویا اس مخصوص انسان اور مخصوص گھوڑے کے مقابلہ پر دوسرے انسان اور دوسرے گھوڑے انسان اور گھوڑے نہیں ہیں - اس کی تائید میں حدیث موجود ہے - الناس اثنان عالم ومتعلم وما عداھما ھمج - یعنی انسان صرف دو قسم کے ہیں - علم شریعت جاننے والا اور علم شریعت سیکھنے والا - اور ان دونوں کے سوا جتنے لوگ ہیں وہ سب خرمگس ہیں +

واضح ہو کہ انسان سے جتنے افعال صادر ہوسکتے ہیں وہ یا تو طبعی ہیں - جنہیں نہ تو اچھا کہا جاسکتا ہے اور نہ بُرا - اسہو اور خطا کے طور پر جو افعال صادر ہوتے ہیں وہ

بھی اِسی ضمن میں شمار ہوتے ہیں) یا اِرادی خواہ خارجی ہوں یا باطنی۔ ایسے اِفعال کے متعلق اِنسان مدح اور ذم کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔ عبادات اِنہیں افعال کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ عبادات واجب ہوں یا مستحب یا مباح۔ بہرصورت اِن کا ماخذ کتاب اللہ یا سنت صحیحہ یا اجماع اُمت یا قیاس مجتہد ہوگا۔ اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو شریعت کے ہر ایک حکم کا ماخذ کتاب اللہ میں موجود ہے۔ جس پر آیہ ما فرطنا فی الکتاب من شیئٍ شاہد ہے۔ مگر ہر ایک حکم کا ماخذ کتاب اللہ سے اخذ کرنا ہر ایک شخص کا کام نہیں۔ ضرورت اجتہاد پر بحث کرتے وقت انشاء اللہ تعالےٰ اِس امر کو مفصّل بیان کیا جائے گا۔

شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مفہوم عبادت اِس قدر وسیع کر دیا ہے۔ کہ ہر ایک عمل مباح جسے اِنسان رضائے مولےٰ کی نیت پر بجا لائے عبادت میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور اِس کا عامل مستحق ثواب قرار پاتا ہے۔ اِس توسیع کا ماخذ ایک حدیث ہے جو سعد رضی اللہ عنہ کی شان میں وارد ہوئی۔ جبکہ حضور علیہ السلام نے انہیں دیکھا کہ وہ اپنے تمام افعال میں حکم شریعت کو ملحوظ رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا انک لتوجر فی کل شیئٍ حتیٰ اللقمۃ تضعھا فی امراتک۔ یعنی تجھے ہر ایک فعل کا اجر دیا جائے گا حتیٰ کہ اِس لقمہ کا بھی جو تو اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے۔ اِس لیے اِس نکتہ کو خوب سمجھنا چاہیے اور چھوٹے سے چھوٹے عمل کے بجا لانے میں بھی حکم شریعت کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اور یہ امر حضور علیہ السلام اور خواص الناس کے حق میں فرض قرار دیا گیا ہے۔ آیہ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین لا شریک لہ وبذٰلک اُمرتُ وانا اول المسلمین اور نیز آیہ فاستقم کما اُمرتَ ومن تاب معک میں اِسی امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ واللہ ولی التوفیق ؛

تحقیق عبادت

عبادت کی تعریف یہ ہے کہ عبادت ایسے فعل اختیاری کو بولتے ہیں جو جسمانی لذات کے منافی ہو اور جو اطاعت شریعت کی وجہ سے بہ نیت تقرب ذات باری صادر ہو۔ اختیاری کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ غیر کے مسخر و مقہور ہونے سے جو فعل صادر ہوتا ہے وہ عبادت نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے کسی امر ممنوع کا اپنے اختیار سے ترک کر دینا بھی عبادت میں داخل ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا فعل ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور لذات جسمانی کے منافی ہونے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے افعال عبادت نہیں ہو سکتے کھانا۔ پینا اور مباشرت اگرچہ لذت جسمانی میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن بحکم شریعت بجا لانے کی صورت میں وہ عبادات میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اور نیت کی قید کا یہ فائدہ ہے۔ کہ جس فعل سے تقرب الی اللہ کی نیت نہ ہو بلکہ کوئی اور غرض مدنظر ہو وہ عبادت شمار نہیں کیا جاتا۔[1] اور الفاظ "اطاعت شریعت" کا یہ فائدہ ہے۔ کہ جب کوئی شخص کوئی فعل اپنی طرف سے تجویز کرے جس کا شریعت سے جواز ثابت نہیں۔ تو وہ خواہ بہ نیت تقرب الی اللہ کیا جائے عبادت نہیں کہلا سکتا۔ اس تحقیق کے مطابق حقیقت عبادت کا سمجھنا دشوار نہیں۔ کیونکہ جب تک تمام مذکورہ اوصاف کسی فعل میں نہ پائے جائیں وہ فعل عبادت نہیں ہو سکتا ؁

اقسام عبادت

اس امر کو خوب سمجھنا چاہیے۔ کہ عبادت دو قسم پر منقسم ہے اور یہ ہر دو آپس میں لازوم و ملزوم ہیں جس طرح کسی عمارت کے لئے اساس کی ضرورت ہے اسی طرح عمل کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ جس طرح اساس بدوں عمارت مفید نہیں اور عمارت بجز اساس ناممکن ہے اسی طرح علم بدوں

---

[1] ہمارے آجکل کے مسلمانوں میں ایسی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں کہ قوم اور مذہب کی خدمت کو اپنے ذاتی اغراض کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۱۲

عمل کچھ مفید نہیں - اور نہ عمل بدوں علم - قرآن مجید میں کثرت کے ساتھ ایمان اور عمل ہر دو کا اکٹھا ذکر کیا گیا ہے - وجہ یہ ہے کہ ایمان تصدیق قلب کا نام ہے - جو ایک قسم کا علم ہے - اس لئے اکٹھا بیان کرنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے - کہ کمال انسان علم و عمل کے ساتھ وابستہ ہے اور ہر دو میں علم کو اشرف قرار دیا گیا ہے اور اس امر کے متعلق کثیر التعداد آیات - احادیث وارد ہوئی ہیں سو علم کی دو صورتیں ہیں - ایک نظری دوسری عملی - حصہ نظری میں صرف عقائد شامل ہیں - جن میں کسی عمل کی ضرورت پیش نہیں آتی - مثلاً توحید ذات باری - وجود ملائکہ - کتب سماویہ - رسالت - بعث بعد الموت وغیرہ ایسے امور ہیں جن پر ایمان لانا ہر ایک مسلم کا فرض ہے - اور حصہ عملی وہ ہے جن کی کیفیت عمل پر آگاہ ہو کر اُن کا عمل میں لانا بھی ضروری ہے - مثلاً صلوٰۃ - زکوٰۃ - صوم - حج - بر والدین - جہاد وغیرہ ٭

ایک وسوسہ شیطانیہ کا ازالہ

بعض نیا چرہ جہّال کا خیال ہے کہ جب تک کوئی شخص الفاظ نماز کے معانی نہ سمجھتا ہو اُس کی نماز نہیں ہوتی - کیونکہ ایسے نمازی کو کچھ علم نہیں کہ وہ منہ سے کیا کہہ رہا ہے اسی طرح یہ لوگ تلاوت کتاب اللہ کے متعلق بھی یہی شیطانی وسوسہ لوگوں کے دل میں ڈال دیتے ہیں - مگر یہ ایک ملحدانہ خیال ہے - کوئی ان جاہلوں سے یہ تو پوچھے کہ کسی عمل کے شرعی طور پر جواز اور عدم جواز کا فتویٰ شریعت کا ہے - کیا کتاب اور سُنّت میں اس کی کچھ اصل ہے؟ اسی غلط خیال پر بعض بے لگام طبائع اس حد تک غلو کر گئی ہیں کہ وہ نماز کی صورت کو بدل ڈالنے کا مشورہ مسلمانوں کو دینے پر آمادہ ہیں اور اسے نصاریٰ کی نماز کی صورت میں جو گرجاؤں میں پڑھی جاتی ہے لانا چاہتے ہیں ؎

لیبکِ علی الاسلام من کان باکیا[1]

---

[1] جو شخص اسلام کا ماتم کرنا چاہے کرے ۱۲ منہ

ہمیں ایسے بے معنی اور لغو خیال کے رد کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ مذکورہ بالا خیال کوئی معمولی گناہ نہیں بلکہ خدائے تعالیٰ پر بہتان باندھنا ہے۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم[1] سچ تو یہ ہے الناس اعداء ماجہلوا۔ خود تو یہ لوگ بے توفیق ہیں اور ایک رذیل زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ بھلا دوسرے کی بضاعت ایمان کو کیوں غرق کرتے ہیں۔ ع

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

یہ بالکل صحیح ہے کہ الفاظ نماز کے معانی کا سمجھنا نہ سمجھنے کی نسبت افضل ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص نہ سمجھتا ہو۔ تو اس کی نماز ناجائز کیونکر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ نماز ایک عبادت ہے جس میں دو باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ ایک تو خارجی طور پر ارکان یعنی تکبیر تحریمہ۔ قیام۔ قراءت۔ رکوع۔ سجود۔ قعدہ سلام کا بجا لانا۔ دوسرے باطنی طور پر خشوع و خضوع کا پایا جانا۔ سو پہلا امر تو ضروری طور پر موجود ہوتا ہے۔ جس میں کسی کو کلام نہیں۔ رہا خشوع و خضوع سو یہ ایک ایسا امر ہے کہ اس میں خواندہ اور ناخواندہ میں کوئی امتیاز نہیں۔ ایسے کئی ایک صاحب موجود ہیں جو نہ صرف الفاظ نماز کا ترجمہ جانتے ہیں بلکہ تفسیر بھی کر سکتے ہیں۔ مگر نماز میں انہیں خشوع و خضوع نصیب نہیں ہوتا۔ قرآن مجید نے خشوع و خضوع کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ والذین ھم فی صلوتہم خاشعون۔ اور خشوع کے لئے اتنا جاننا کافی ہے کہ نماز پڑھتے وقت حضور رب العالمین میں اس کی ثنا اور حمد اور بندہ کی طرف سے اظہار عبودیت ہوا کرتا ہے۔ سو اتنی بات کو ہر ایک عالم و جاہل جانتا ہے۔ بلکہ اکثر ان پڑھ لوگ نماز میں زیادہ مستغرق نظر آتے ہیں۔ برخلاف ان لوگوں کے جو سرکاری کام

---

[1] چونکہ منہ بڑی بات ۱۲ [2] لوگ جس امر کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں اسکی مخالفت کیا کرتے ہیں ۱۲ منہ

کرتے کرتے جلدی میں اُٹھ کر نماز میں لگ جائیں۔ غالباً انکی نماز شروع سے اخیر تک بیہودہ خیالات کا ایک طومار ہوا کرتا ہے۔ بہرصورت نماز میں اجمالی طور پر مقصد نماز سے آگاہ ہونا کافی ہے۔ اور معاملہ کا فیصلہ ہر ایک کی نیت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انی لا اضیع عمل عامل۔ یعنی خدائے تعالیٰ کے ہاں کسی شخص کا عمل جو اسنے خالصاً لوجہ اللہ کیا ہو ضائع نہیں ہو سکتا ٭

اس کو بذریعہ تمثیل یوں سمجھو کہ ایک ڈاکٹر جو فن طب کا پورا ماہر ہے۔ اور ایک جاہل کسان ہر دو اپنے معدہ میں غذا پہنچا دیتے ہیں۔ غذا معہود طبعی طریق کے مطابق تحلیل ہو کر تمام اعضاء بدن میں حصہ رسدی تقسیم ہوتی ہے۔ جس کی کیفیت ہضم اور ایصال مادہ غذائیہ اور تولید خون صالح کے عمل سے ڈاکٹر تفصیلاً آگاہ ہے اور مذکورۃ بالا جاہل محض اجمالاً اس امر کا علم رکھتا ہے کہ غذا پیٹ میں جا کر ہمارا جزو بدن بنتی ہے اور ہماری زندگی کا انحصار صرف غذا پر ہی ہے۔ مگر ڈاکٹر اور جاہل ہر دو نتیجہ غذا یعنی قوام بدن بغذا میں یکساں طور پر شریک ہیں۔ کیا کوئی عقلمند یہ بات کہہ سکتا ہے کہ چونکہ جاہل کسان کیفیت ہضم غذا اور ایصال مادہ غذائیہ کے طریق کا تفصیلی علم نہیں رکھتا۔ اس لیئے اس کے معدے میں غذا ہضم ہو کر جزو بدن نہیں ہو سکتی۔ عام طور پر تو مشاہدہ اس امر کی تائید کرتا ہے۔ کہ جاہل کسان لوگوں کے معدوں میں غذا ڈاکٹروں کے معدے کی نسبت زیادہ صحیح طور پر ہضم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی صحت ڈاکٹروں کی صحت سے عموماً زیادہ اچھی پائی جاتی ہے ٭

ہم اپنے دعوٰی کی توضیح ایک دوسری مثال سے بھی کر سکتے ہیں کسی سلطنت کے ماتحت مختلف قسم کی رعایا آباد ہوتی ہے۔ رعایائے بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو سلطنت کے قوانین کے اصول اور نظم و نسق ملکی کے تمام محکموں کی تفصیلی کیفیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اور عام ناخواندہ لوگ خواہ شہری ہوں خواہ دیہاتی قوانین سلطنت

کے مفید وغیر مفید ہونے سے یا ان کے اُصول اور نتائج سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ مگر حکومت کے زیر اثر رہ کر ہر دو قسم کے لوگوں کو قوانین ملکی سے یکساں طور پر فائدہ اُٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ اور قانون حکومت بلا استثنائے خاص ہر دو کو یکساں طور پر بحیثیت رعایا ملک اپنے زیر اثر لیتا ہے۔ کیا کوئی سمجھدار ایک آن کے لئے بھی یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ بڑے بڑے مقنن اور ماہران اصول حکومت ان لوگوں کی نسبت جن کو قانون کی تفصیلی کیفیت کا کچھ علم نہیں کچھ زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ رعایا کا جو تعلق حکومت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اُس کی نوعیت مختلف مدارج کے لوگوں کے لئے یکساں قرار دیگئی ہے۔ یہی نسبت خدا کے عاجز بندوں اور اُس خالق حقیقی کے درمیان قائم ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے ان اللہ ینظر الی قلوبکم و نیاتکم ولا ینظر الی صورکم و اجسامکم۔ جس کا ترجمہ مولوی صاحب نے بالفاظ ذیل کیا ہے :-

ما دروں را بنگریم و حال را
ما بروں را ننگریم و قال را

ان لوگوں کا مذکورہ بالا مجدانہ خیال اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئیے کہ مساجد میں جو کچھ لوگ نظر آتے ہیں وہ بھی نماز سے دستکش ہو کر نماز سے فارغ خطی لے لیں۔ کیا ان لوگوں کو یہ علم نہیں کہ پانچ وقت مسجد میں نماز ادا کرنے والے جماعت کی برکت سے بتدریج نماز کے متعلق ضروری مسائل اور نماز کی غرض و غایت سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھگوڑے کیا جانیں کہ جو مسجد کی شکل کو دیکھتے ہی ایسے بھاگتے ہیں جیسے لاحول سے شیطان۔ مگر ان لوگوں کو غالباً یہ خیال کبھی بھولے سے بھی نہ آیا ہوگا۔ کہ جہاں ہمارے تعلیم یافتہ لوگ امتحان کی تیاری میں کمثل الحمار یحمل اسفارا کا مصداق بنکر تو دہ در تو دہ لغو یاتہ طوطے

کی طرح رٹتے ہیں - وہاں الفاظ نماز کے پانچ سات جملوں کے معانی کا جاننا کونسی بڑی بات ہے - مگر حق تو یہ ہے کہ امتحانی کتب میں دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کا نتیجہ تو حصول معاش ہے اور نماز میں کیا رکھا ہے - مفت کی تکلیف اور اپنی وضعداری کا کھو دینا - یہ سب حجتیں نماز نہ پڑھنے کی خاطر ہیں ورلبس +

یہی جواب قرآن مجید کی تلاوت کے متعلق سمجھو - ایک حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ قرآن مجید کے ایک ایک حرف کے بدے پڑھنے والے کو دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اس میں حضور علیہ السلام نے یہ تو نہیں فرمایا کہ بشرطیکہ پڑھنے والا قرآن کے معانی بھی سمجھتا ہو - اور اگر پڑھنے والا معانی نہیں سمجھتا تو جس کو وہ سُناتا ہے وہ تو جانتا ہے - یہی حال نماز کا ہے کہ نمازی اتنا جانتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اظہار عبودیّت کر رہا ہے - اور جن الفاظ میں وہ عبودیت کا اظہار کرتا ہے معبود حقیقی اُسے جانتا ہے - اور اس کا جاننا ثواب کے لیئے کافی ہے اگر کوئی شخص یوں اعتراض کرے کہ آیہ افلا یتدبرون القرآن کا صریح مفہوم یہ ہے کہ قرآن مجید میں غور و خوض کرنا ضروری ہے - اور ناخواندہ لوگ یا جو عربی زبان سے ناواقف ہیں کیا غور و خوض کر سکتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کا سمجھنا ضروری ہے خواہ بذریعہ تلقین علما ممکن ہو - خواہ بذریعہ تعلیم علوم عربیہ - سو ہم دیکھتے ہیں کہ ناخواندہ لوگ حضرات علماء دین سے عقائد و احکام صحیح سیکھ سکتے ہیں اور اسی لیئے علماء کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے - اس امر کا ثبوت کہ دونو طریق پر لوگ قرآن مجید کی تعلیم سے مستفید ہو سکتے ہیں - خود قرآن مجید میں مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر یعنی منکرین قیامت کے دن یوں کہینگے کہ اگر ہم نے کتاب اللہ کو سنا ہوتا یا خود سمجھے ہوتے تو آج دوزخ کی آگ میں نہ جلتے - جس سے صاف معلوم ہوتا ہے - کہ مقصود بالذات شریعت

کا سمجھانا ہے۔ جس طرح ہو سکے صحیح ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ہر ایک شخص کو کتاب اللہ کے خود سمجھنے کی تکلیف دی جائے ورنہ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا کے کیا معنی ہونگے۔

غرض عبادت

عبادت سے غرض صرف یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو پاک کرے اور بجز عبادت کے نفس مختلف قسم کی اندرونی نجاستوں سے کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ایک ایسا اہم امر ہے کہ اس سے کوئی شخص بھی مستثنیٰ نہیں۔ اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنے خالق حقیقی کو پہچانیں اور اُس کا قرب حاصل کریں۔ ذات باری چونکہ بے نیاز ہے اس لئے ہماری عبادت کا فائدہ اُس کی طرف عائد نہیں ہوتا۔ اور اگر ہمارا اس میں کچھ فائدہ نہ ہوتا تو ہمیں تکلیف دینے کا کوئی فائدہ متصور نہیں یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ اور جو شخص بار عبادت کا متحمل نہیں ہوتا وہ کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ اور جنت صرف پاک لوگوں کی جگہ ہے۔ اس لئے جو شخص دوام حیات اور طہارت نفس کو چاہتا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ تقویٰ اور طہارت حاصل کرنے میں غفلت سے کام نہ لے اور زاد آخرت کی تیاری کرے۔ سابقوا الی مغفرۃ من ربکم کے معنی میں غور کرو۔

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے بدن پر کچھ عوارض اور امور موجود ہوتے ہیں یا اگر سر دست موجود نہ ہوں تو بتدریج موجود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے عوارض کو ایک قسم کی نجاست سمجھا گیا ہے اور اسی لئے جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ان عوارض کو اس کے بدن پر سے دُور کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوتا ہے اور ناف اور قلفہ اور عقیقہ اور وہ نجاستیں جو بتدریج پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً میل کچیل جوئیں۔ ناخن۔ موئے زیر ناف۔ موئے زیر بغل وغیرہ جنہیں انسان اپنی زندگی تک دُور کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کے نفس کے ساتھ

بھی ایسے عوارض موجود ہوتے ہیں جو نجاست باطنی کہلاتے ہیں۔ مثلاً جہل، حرص، بخل، بغض اور جلد بازی وغیرہ اور قرآن مجید نے اِن سب نجاسات باطنی کے دور کرنے کا حکم مختلف مواقع پر کیا ہے۔ کیونکہ بجز ان کے دُور کئے طہارتِ نفس حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور بجز طہارت نفس انسان قرب ذات باری حاصل نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی وہ حیات طیبہ کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اور نہ حق و باطل میں کچھ امتیاز کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان باطنی نجاستوں کے دُور نہ کرنے کی صورت میں دُنیا کا مال و دولت اس شخص کے لیئے دُنیا و آخرت میں وبال جان ہو جاتا ہے۔
جس کا اشارہ اِس آیت میں کیا گیا ہے۔ آیہ فلا تعجبك اموالهم ولا اولادهم انما يريد الله ليعذبهم بها في الحيوة الدنيا وتزهق انفسهم وهم كافرون۔ اِس آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ مال اور اولاد اس دُنیا میں بھی کفار کے لئے عذاب الیم کا موجب ہیں۔ جب اِنسان اپنے مقصود بالذات کو سمجھ کر احکام خداوندی کی اطاعت میں آجاتا ہے تو وہ ذخیرہ حسنات کی طرف متوجّہ ہو کر ذات باری سے مغفرت کا انعام حاصل کر لیتا ہے۔ اس تصفیہ اور تزکیہ نفس کا طریق صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر موقوف ہے۔ جس کا اشارہ آیہ خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها میں کیا گیا ہے۔ اور تصفیہ اور تزکیہ نفس کے بغیر انسان حیرت جہالت وساوس و شکوک کے دلدل سے کبھی رہائی نہیں پا سکتا۔ اور نہ وہ سعادت آخرت سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ امراض قلبی ہیں کہ جن کی موجودگی میں خالص الایمان ہونا ناممکن ہے آیہ انما المؤمنون الذين آمنوا بالله ورسوله ثم لم يرتابوا میں جملہ ثم لم يرتابوا۔ اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ اِس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صحیح الایمان صرف وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان لا چکنے کے بعد وساوس

وشکوک پیدا نہ ہوں مگر وساوس وشکوک سے محفوظ رہنے کے لئے کچھ مہلت درکار ہے جو عملی حالت کی اصلاح کے لئے ضروری ہے ؛

یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا روحانی اور جسمانی سنجاستوں کو آدمی کے ساتھ لازم قرار دینے سے کیا فائدہ متصور ہے؟ جبکہ بالآخر ان کا دُور کرنا ضروری ہے تو پہلے ہی سے اگر انسان کے ساتھ ضروری نہ قرار دیجائیں تو ان کے دُور کرنے میں تکلیف نہ اُٹھانی پڑتی۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے کوئی چیز حکمت اور مصلحت سے خالی پیدا نہیں کی۔ گو انسان بعض اوقات کسی امر کی مصلحت کو نہ سمجھ سکے مگر قانون الٰہی کے مطابق اس میں ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت مضمر ہوتی ہے۔ بعض اشیاء ایسی ہیں کہ کسی خاص مخصوص وقت تک ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب وہ ضرورت باقی نہ رہے تو ان کا وجود غیر ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ جیسے ولادت پر بچے کے بدن سے عوارض مذکورہ بالا کا زائل کرنا۔ جن کی ولادت کے بعد کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا جب ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو ان کا ازالہ ضروری ہوتا ہے۔ جیسے بال۔ ناخن وغیرہ یہی حال عوارض روحانی کا سمجھو کہ جب تک وہ حد اعتدال تک رہے تو محمود ہیں ورنہ مذموم ؛

تبصرہ اصلاح نفس ایک اہم مسئلہ ہے جس پر محققین نے بڑے بڑے طویل مباحث قلمبند کئے ہیں۔ چنانچہ ان مباحث کے ضمن میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اصلاحِ نفس فطری طور پر انسان کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ اصلاح کی قابلیت اس میں فطرتاً موجود ہے جس کا اشارہ آیہ انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا اور نیز آیہ وھدینٰہ النجدین میں کیا گیا ہے۔ چونکہ انسان کی فطرت میں خیر و شر ہر دو کی قابلیت ودیعت رکھی گئی ہے اس سے تعلیم و تربیت سے [illegible]

حد تک اس کی اِصلاح ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اِس تعلیم و تربیت کا اثر تمام طبائع پر یکساں نہیں ہو سکتا۔ لیکن باینہمہ اگر ابتدا ہی میں بچوں کو اکتساب سعادت کی طرف متوجہ کیا جائے تو ان کی طبائع میں سعادت کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں اور وہ بتدریج کامل طور پر پختہ ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے یہ خیال کہ آیات و احادیث سے طبائع کا غیر متبدل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا تعلیم و تربیت بے سود ہے صحیح نہیں۔ کیونکہ امور طبعیہ کا غیر متبدل ہونا اگرچہ صحیح ہے۔ مگر کوئی طبیعت انسانی محض شر نہیں پیدا کیگئی۔ اِس لئے جس قدر قابلیت خیر و سعادت کسی طبیعت میں موجود ہو گی اُسی قدر وہ فیض تربیت سے مستفید ہو سکتی ہے۔ حدیث کل میسر لما خلق لہ سے یہ عقدہ بخوبی حل ہو جاتا ہے ٭

حکمتِ احکامِ عبادات

شریعت نے عبادات و معاملات ہر دو کے متعلق ہمیں واضح و انسب احکام بتلائے ہیں۔ عبادات کا منشا صرف تصفیہ و تزکیہ باطن ہے اور جو شخص عبادت و ذکر سے بالکل بے بہرہ ہے وہ اصطلاح شریعت میں شیطان کا ساتھی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور اصطلاح اہلِ حقیقت میں ایسے شخص کو مردہ بولتے ہیں کیونکہ ذکر ہی حیات قلبی کا ذریعہ ہے اور ذکر ہی سے انسان کو اطمینان کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اور ذکر و عبادت ہی سے مقاماتِ رُوحانیہ تک ترقی حاصل ہوتی ہے اور اسی سے انسان کا قلب کشف و الہام کا رُتبہ پا سکتا ہے۔ الغرض بجز عبادت کے اور کوئی ذریعہ تہذیب نفس کا متصور نہیں ہو سکتا کوئی شخص علم و کمال کے خواہ کسی درجہ فضیلت تک ترقی حاصل کرے تاہم بجز ذکر و عبادت کے وہ مردانِ الٰہی کی صف میں شمار کئے جانے کے قابل نہیں۔ ذکر و عبادت کے فضائل

اور اُن کے نتائج حسنہ سے قرآن واحادیث پُر ہیں ۔ پس جو ذکر و عبادت باتباعِ سنت نبوی کیا جائے گا وہ یقیناً نہایت مفید نتائج کا موجب ہوگا ۔ عبادات سے مراد اس تعلق کی نوعیت کا قائم کرنا ہے جو انسان اور اُس کے خالق حقیقی کے درمیان پیدا ہو سکتا ہے ۔ چونکہ ظاہر کو باطن سے تعلق ہے اس لئے ہر ایک عمل ظاہر کے مقابل ایک باطنی عمل بھی موجود ہوتا ہے ۔ بعض ملحدین جو تصوف کا دعوٰی کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ظاہر شریعت اور چیز ہے اور باطن کچھ اور اسلئے عارف کو جو ظاہر سے گذر جاتا ہے احکام شرعیہ کی پابندی ضروری نہیں ہوتی ۔ انہیں اسلام اور اہل اسلام سے کچھ تعلق نہیں بلکہ ایسے لوگ دشمنانِ دین اور حزب الشیطان میں داخل ہیں ۔ کیونکہ عقل ونقل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ معرفت ذات باری کا صرف ایک ہی طریق ہے جس کو اتباعِ سنتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام بولتے ہیں ۔ خود حضور علیہ السلام اور آپ کی جماعت کے اکابر سب کے سب پابند شریعت تھے ۔ اس لئے اگر کوئی شخص نیا طریق اختیار کرے گا جو مخالفِ سنت ہو تو وہ صحیح معنی میں اتباعِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل نہیں رہیگا ۔ چنانچہ اس امر کی تصریح کتب تفسیر و احادیث میں بخوبی ہو چکی ہے ۔

حکمت وضوء

شریعتِ اسلامی میں لفظ طہارت کا مفہوم بہت وسیع ہے چونکہ ہر ایک قسم کی ظاہری اور باطنی طہارت پر حاوی ہے ۔

طہارتِ وضو کی فضیلت میں بہت سی احادیث صحیحہ موجود ہیں ، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ تَوَضَّأَ وَصَلّٰی رَكْعَتَيْنِ لَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهٗ فِيْهِمَا بِشَيْءٍ مِّنَ الدُّنْيَا خَرَجَ مِنْ ذُنُوْبِهٖ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ ۔ یعنی جو شخص وضو کے دو رکعت نماز تحیۃ الوضوء ایسے طور پر ادا کرے کہ اُس کے دل میں کسی قسم کے خیالات دنیویہ کا گذر نہ ہو تو وہ اپنے تمام گناہوں سے اسی طرح پاک ہو جاتا ہے جس طرح کوئی بچہ ابھی اپنی ماں کے پیٹ سے باہر آیا ہو ۔ اسی طرح دیگر بہت سی احادیث موجود

ہیں جن میں طہارتِ وضو کو بجائے خود ایک عبادت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہمیشہ باوضو رہنا موجب ثواب عظیم ہے۔ رات کو باوضو سونا ہر ایک قسم کی شر و وحشت سے محفوظ رہنے کا آلہ ہے۔ چنانچہ وضو شیطان کی روک کے لئے ایک حربہ قرار دیا گیا ہے پس جو شخص ہمیشہ باوضو رہیگا گویا وہ شیطان کے مقابلہ پر ہمیشہ سلاح پوش رہیگا۔ یہ امر تجربہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ظاہر بدن اور لباس کی صفائی سے انسان کو کہاں تک باطن کی صفائی کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بعض آثار میں ملاں وارد ہوا ہے۔ بُنِیَ الدِّیْنُ عَلَی النَّظَافَۃِ۔ یعنی اسلام پاک کی بنیاد ہر ایک قسم کی ظاہری اور باطنی پاکیزگی پر قائم کی گئی ہے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ۔ یعنی باطہارت ہونا نصف ایمان کے برابر ہے۔ چونکہ طہارتِ وضو میں تمام اعضاء و جوارح داخل ہیں اس لئے حضور علیہ السلام نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ وضو سے ہر ایک عضو کے متعلقہ گناہ دور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کوئی عملی گناہ حواس خمسہ کے تعلق سے باہر نہیں جا سکتا۔ پس عبادتِ طہارت سے حضور علیہ السلام کو نہایت لطیف طور پر اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جس طرح ظاہر کے اعضاء کو تم پاک کرتے ہو اسی طرح باطن کی پاکیزگی کو بھی لازم پکڑو۔ کیونکہ صرف ظاہر کی پاکیزگی جبکہ دل مختلف قسم کی خباثتوں سے آلودہ ہو کچھ مفید نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی مہمان کے لئے مکان کی بیرونی آرائش پر بڑا زور دے اور اس کے اندر ہر ایک قسم کی پلیدی اور نجاست بھر رکھی ہو تو اس کا نتیجہ خود ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند کریم کی طرف سے جو انوار و برکات قلبِ مومن پر نازل ہوتے ہیں انکی مناسبت باطنی طہارت کی اصلیت پر مبنی ہے آیہ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ میں غور کرنے سے اس امر کا یقینی ثبوت مل سکتا ہے کیونکہ اگر صرف طہارت ظاہری کو موجب محبت الٰہی قرار دیا جائے۔ اور اس کے ساتھ طہارت باطنی کی ضرورت کو اصل نہ تصور کیا جائے تو پھر محبت الٰہی کا درجہ حاصل کرنا مشکل نہ تھا جس طرح

بدن اور لباس میں کسی قسم کی نجاست کے ہونے سے طبیعتِ انسانی میں ایک قسم کی کراہت اور تشویش پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اندرونی نجاست پاک روح کو اذیت پہنچاتی ہے اور نورِ ایمان کو کم کر دیتی ہے۔ برخلاف اس کے جس طرح ظاہری طہارت سے طبیعت میں ایک قسم کا سرور پیدا ہوتا ہے اسی طرح باطنی طہارت سے روحانی لذت اور ذوقِ ایمان حاصل ہوتا ہے جس کی مقدار ہر ایک شخص کے اخلاص پر مبنی ہے آیہ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ میں غور کرو کہ کس قدر مختصر الفاظ میں اندرونی اور بیرونی گناہوں سے پاک ہونے کی تلقین فرمائی گئی ہے ÷

یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی بڑے معزز آدمی یا بادشاہ کی ملاقات کو جاتا ہے تو وہ حتی الوسع اپنی طرف سے بدن اور لباس کے تمام لوازم نظافت کو پورا کرتا ہے اور ایسا کرنا منجملہ آدابِ دربار قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ نماز سب سے بڑے شہنشاہ خالق السموٰت والارض کے دربارِ عالی میں حاضر ہو کر اس سے ہمکلام ہونے یا مناجات کرنے کا نام ہے اس لئے ہر ایک قسم کی طہارت کا کامل طور پر بجا لانا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ اس امر کی طرف حضور علیہ السلام نے یوں اشارہ فرمایا ہے اَلْوُضُوْءُ مِفْتَاحُ الصَّلٰوۃِ کیونکہ جس طرح بلا رعایتِ آدابِ مجلس شاہی میں کسی کو دخل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح بدون وضوء کے نماز یعنی دربارِ الٰہی میں کوئی شخص حاضر نہیں ہو سکتا۔ سبحان اللہ! کیا پاک مذہب ہے جس کے ہر ایک حکم میں تمام ظاہری اور باطنی رعاتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں جو ایماندار کے لئے موجب تقویت ایمان ہیں ÷

نماز پڑھنے سے پہلے طہارتِ بدن۔ طہارتِ مکان۔ طہارتِ جامہ ضروری ہے چاہئے تو یہ تھا کہ نماز سے پہلے غسل کیا جاتے۔ کیونکہ بادشاہوں کے دربار میں غسل یاء اور خوشبو اور عمدہ کپڑے پہن کر جاتے ہیں تو گویا دربارِ خداوندی اس سے بڑھکر مستحق نہیں ہے ہے اور ضرور ہے۔ مگر خدائے رحیم اپنے بندوں پر کمال درجہ کا مہربان ہے۔

اگر دن رات میں پانچ دفعہ غسل کا حکم ضروری ہوتا - تو ہر موسم میں یہ التزام ایک قسم کا
بار خاطر ہوتا - اور ہر شخص اس کا متحمل نہ ہو سکتا - اس لئے بجائے اس کے وضوء
قائم مقام غسل قرار دیا گیا جس کو ہر شخص آسانی کر سکتا ہے بلکہ درصورت عذر یا تکلیف یا
پانی کے نہ مل سکنے پر تیمم کو وضوء کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے - باقی لباس کا پاک صاف ہونا
مکان کا پاک ہونا اس لئے ہے کہ جس کے سامنے کھڑا ہونا ہے وہ اعلیٰ درجہ کی نفاست اور
پاکیزگی رکھتا ہے اور اس کے سامنے ناپاک کھڑا ہونا سوء ادب میں داخل ہے - جس قدر زیادہ
نفاست و نظافت کی پابندی کی جائے گی اسی قدر اس سے زیادہ قرب حاصل ہوگا اور جس
قدر اس میں کمی ہوگی اسیقدر اس سے بُعد ہوگا +

نماز اصل میں بندہ کا فرض یہ ہے کہ خدا کی عبادت کرے کیونکہ خداوند کریم
جل و علا علاوہ اور صفات کے معبود کی صفت سے بھی موصوف ہے
پس جس طرح اس کے خالق ہونے کی وجہ سے ہم مخلوق اس کے رازق ہونے کی وجہ سے
ہم مرزوق اس کے رحیم ہونے کی وجہ سے ہم مرحوم اس کے رب ہونے سے ہم مربوب
اور اس کے قادر ہونے سے ہم مقدور ہیں علیٰ ہذا اس کے مطلوب ہونے کی وجہ سے ہم
طالب اس کے محمود ہونے سے ہم حامد اور اس کے معبود ہونے سے ہم عابد کہلانے کے
مستحق ہیں - اور یہ ایک ایسا اہم اور زبردست تعلق بندہ کو اپنے مولیٰ سے ہے کہ خداوند
کریم کو جن اور انسان کی پیدائش سے یہی منظور تھا - اللہ تعالےٰ نے فرمایا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ
وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ[1] - یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تمام عبادات سے افضل اور اعلیٰ نماز ہے -
بلکہ یہ تمام عبادات کی اصل ہے اور سب عبادات میں پہلے ہے جس کی نسبت بالاتفاق تسلیم
کیا گیا ہے کہ اظہار عبودیت کے لئے نماز سے بڑھ کر کوئی عمدہ صورت عبادت کی کسی مذہب
میں موجود نہیں - اور تا قیامت نہیں ہوگی - یہ وہ چیز ہے جس کی خوبی کا مخالفین نے

[1] اور نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انسان کو مگر اسلئے کہ وہ عبادت کریں ۱۲ منہ

بھی اقرار کیا ہے۔ صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے کامل طور پر ادا کرنے سے انسان ظاہری اور باطنی پاکیزگی کا مالک ہو جاتا ہے۔ اس میں تمام دیگر عبادات سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ نماز ان اُمور پر مشتمل ہے۔ طہارت۔ قبلہ کی طرف متوجہ ہونا۔ ذکر اور تسبیح۔ استغفار۔ شہادت توحید و رسالت۔ درود شریف۔ دعا۔ اور یہ زبان کی عبادت ہے مگر اس میں روزہ کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں تمام نفسانی خواہشات کو روکنا ہوتا ہے بلکہ بہ نسبت روزہ کے اس میں یہ بات زائد ہوتی ہے کہ آنکھ کو غیر کے التفات سے ہاتھ پاؤں کو حرکت سے۔ زبان کو غیر کے ذکر سے یا غیر تلاوت قرآن مجید سے علیٰ ہذا قوت خیالیہ اور فکریہ کو اپنے کام سے روکنا ہوتا ہے اور یہ امر روزہ میں ضروری نہیں۔ اور اس میں حج کی خوبی بھی موجود ہے۔ اس کی تکبیر تحریمہ بمنزلہ احرام کے ہے قبلہ کی طرف متوجہ ہونا بجائے طواف کے اور قیام بجائے قیام عرفات کے ہے۔ رکوع و سجود اور رکعات ہیں وہ یہ حرکت صفا اور مروہ کی دوڑ کی طرح ہے۔ اور اس میں زکوٰۃ کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ بدن کا ڈھانکنا اور طہارت کا سامان مہیا کرنا واجب ہے اور وقت کو اس کے دنیوی کام اور دیگر فوائد سے باز رکھ کر خدا کی عبادت میں لگانا ہے گویا وہ مال کا ایک حصہ ہے جو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ نیز جمادات کی عبادت بیٹھنا ہے۔ جانوروں کی عبادت رکوع ہے۔ پرندوں کی عبادت ذکر و شہادت و تسبیح ہے جو خوش الحانی سے کرتے ہیں ؎

مرغان چمن بہر صباحے خوانند ترا با صطلاحے

حشرات الارض کی عبادت سجدہ ہے۔ درختوں اور نباتات کی عبادت قیام ہے۔ اور فرشتوں کی عبادت بھی اسی قسم کی ہے۔ اور کروبیوں (ملائکہ مقربین) جن کو مہیمن بھی کہتے ہیں کی عبادت استغراق اور مشاہدہ تجلی ذات حق سبحانہٗ ہے اور نماز ان سب امور پر مشتمل ہے اور چونکہ نماز تمام عبادات بدنیہ و نفسیہ کی جامع ہے اسی لئے اس کا

مرتبہ تمام عبادات سے بڑھکر ہے یہی وجہ ہے کہ جب صحابہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اعمال میں کونسا عمل افضل ہے تو آپ نے فرمایا اَلصَّلوٰۃُ لِوَقْتِہَا۔ یعنی نماز اپنے وقت پر ادا کرنا تمام اعمال سے افضل ہے۔ اب ہم نماز کا مختصر خاکہ کھینچتے ہیں اور اس کے اجزاء میں کلام کرتے ہیں جس سے نماز کے اسرار و برکات و فوائد سے اطلاع ہو جائے گی۔

قیام نماز کے فرائض میں سے ایک قیام ہے یعنی جب نماز کے لئے کھڑا ہو تو دست بستہ مؤدب کھڑا ہو اور ظاہری توجہ قبلہ کی طرف ہوتی ہے جس کی پاک زمین آدمی کے جسم کی پیدائش کی جگہ ہے کیونکہ زمین وہیں سے پھیلی ہے اور بقاعدہ کایہ کل شیئٍ یرجع الی اصلہ[1] اسی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہے۔ ورنہ کعبہ مقصود بالذات نہیں مقصود بالذات صرف ذاتِ باری تعالےٰ ہے۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ تمام مسلمان ایک وقت میں ایک جگہ تو جمع ہو نہیں سکتے مگر ایک ہی جہت کعبہ کی طرف کھڑے ہونے سے گویا سب ملکر اسی طرف کو نماز پڑھتے ہیں اور یہ بھی ایک اجتماعی صورت ہے۔

تکبیر تحریمہ تکبیر تحریمہ سے یہ مقصود ہے کہ میں نے ہر دو عالم سے ہاتھ اُٹھا لئے ہیں اور خدا کی جناب کو تمام موجودات سے بزرگ سمجھتا ہوں اس لئے اَللّٰہُ اَکْبَر کہتا ہے۔ اور پھر زبان سے سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ الخ پڑھتا ہے۔ جو خدا کی پاکیزگی اور حمد و بزرگی اور برکت اور علوِ شان اور توحید پر مشتمل ہے۔ پھر اعوذ باللہ میں خدائے تعالیٰ سے اس بات کی طلب کی جاتی ہے کہ شیطان کی شر سے مجھے بچائے پھر بسم اللہ سے اللہ تعالےٰ کے نام پاک سے مدد مانگی جاتی ہے۔

قرأت اس کے بعد الحمد شریف پڑھتے ہیں۔ اور اس میں اوّل خدا کی تعریف اور تربیت تام اور اس کی رحمت عامہ و خاصہ اور اس کی مالکیت اور

[1] ہر شے اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔

اختیار جزا و سزا کا ذکر کر کے خدا سے اِس ہدایت کے راستہ کی طلب کی جاتی ہے جس پر انعام یافتہ لوگ چلے ہیں۔ اور گمراہوں کے راستہ سے جن پر خدا کا غضب ہوا ہے۔ بیزاری مطلوب ہے۔ اِس کے بعد آمین کہی جاتی ہے کہ خدایا مجھ عاجز کی یہ دعا قبول کر۔ اِس کے بعد کچھ اور حصّہ قرآن کا پڑھا جاتا ہے تاکہ اِس خداوندی حکم نامہ کی قرأت و سماعت سے جو امام و مقتدی بکمال ادب کرتے ہیں یہ معلوم ہو کہ ہم ہر طرح خدا کے مطیع فرمان ہیں ؎

رکوع پھر رکوع کیا جاتا ہے جسکی کیفیت یہ ہے کہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اِس میں خدا کی بڑائی اور پاکیزگی بیان کرتے ہیں جس سے مقصود یہ ہے کہ اے پروردگار تیرے انعام و اکرام اور ہیبت جاہ و جلال نے جو مجھ پر ہے میری پُشت کو دوتا کر دیا ہے اور اُس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا؎

قومہ پھر سر اُٹھایا جاتا ہے۔ جس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اِس حمد و ثنا پر قائم ہیں اور یہ کہا جاتا ہے۔ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَہٗ۔ یعنی جو کوئی خدا کی حمد کرتا ہے خدا تعالیٰ اُس کی حمد سُنتا ہے۔ مطلب یہ کہ اے بندے تم جو ہماری تعریف اور ثنا کرتے ہو ہم نے اُس کو سُن لیا؎

سجدہ اِس کے بعد سجدہ میں گر جاتا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدایا ہم اپنے اشرف اعضاء کو کہ پیشانی ہے تیری جناب کے سامنے خاک پر رگڑتے ہیں جو کہ پست تر چیز ہے۔ اِس لئے ہم تیرے سامنے زمین کی طرح ذلیل ہیں اور یہ بھی مقصود ہے کہ اِنسان مٹی سے پیدا ہوا ہے آخر خاک ہی میں مِل جاتا ہے پس یہ خیال ہمیشہ اِس کو تواضع اور فروتنی کی یاد دلاتا ہے اور تکبّر اور غرور و گھمنڈ کو مٹاتا ہے۔ اور پھر خدا کی پاکیزگی اور علو شان کی تسبیح پڑھی جاتی ہے اور اُٹھتے بیٹھتے اللہ اکبر کہنے سے خدا کی برتری کا اظہار مقصود ہے

جلسہ | پھر جلسہ کرتے ہیں - اس سے مقصود یہ ہے کہ ہم اپنی فروتنی اور خدا کی عظمت بیان کرنے پر ثابت ہیں اور اس میں کبھی دعائے مغفرت وطلب رحمت کرتے ہیں - پھر دوبارہ سجدہ کرکے اللہ اکبر کہہ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدستور قرأت ورکوع وسجود کیا جاتا ہے *

قعدہ | پھر دو رکعت کے بعد دوزانو ہو کر مؤدب بیٹھا جاتا ہے - گویا اس قدر عاجزی کے بعد اس قابل ہو گیا کہ دربار خداوندی میں بیٹھنے کی اجازت ملے - اس وقت بندہ یہ اظہار کرتا ہے کہ قلبی تعظیمات اور بدنی و مالی عبادات کا مستحق صرف حق سبحانہٗ ہے - اس کے بعد بغرض مکافات ہدایت ورہبری حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام پیغام پہنچایا جاتا ہے - گویا کہ روضہ شریفہ کے سامنے کھڑا ہو کر سلام عرض کر رہا ہے اور پھر اپنے اور خدا کے سب فرمانبرداروں اور اپنے ماں باپ اور تمام اہل اسلام کے لئے دعائے مغفرت وہدایت وغیرہ کر کے نماز کے ختم کے لئے دائیں بائیں منہ پھیر کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ (یعنی دونوں طرف کے مومنین اور فرشتوں کو) سلام کر کے فارغ ہوتا ہے - گویا یہ عالم استغراق اور علوی تھا اور مومن کا معراج تھا جس سے فارغ اور واپس ہو کر عالم سفلی میں آگیا اور آکر اس جہان کے لوگوں کو سلام کہتا ہے جس طرح مسافر سفر سے واپسی کے وقت سلام کہتا ہے کبھی صرف التحیات اور تشہد پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور خود - اور ملا کر چار رکعت کے بعد سلام کرتے ہیں - اور پھر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں اور جو اپنی آرزو ہوتی ہے اس کے لئے خدا سے التجا کرتے ہیں - یہ ہے خلاصہ اسرار نماز کا اور جو اس کے علاوہ ہیں وہ خاصان خدا پر خود روشن ہیں اور انہیں وہی جانتے ہیں *

نماز کی تاکید | چونکہ نماز میں بہت سے برکات ظاہری اور باطنی ملحوظ ہیں اس لئے مومن کے لئے یہ بمنزلہ معراج ہے اور شریعت

میں اس کے بجا لانے کی سخت تاکید ہے۔ قرآن مجید میں بیاسی جگہ نماز کا ذکر ہے
ایک جگہ فرمایا وَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ یعنی نماز قائم کرو
اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ احادیث میں اس کی سخت تاکید وارد ہے۔ ہم مختصرؔ یہاں
چند احادیث کا ترجمہ کر دیتے ہیں۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ترک نماز بندہ اور کافر کے درمیان حدِ فاصل ہے یعنی ترک نماز
سے بندہ کفر تک پہنچ جاتا ہے۔ فی الحقیقت کفر اور اسلام میں فارق ہے تو نماز ہے
ورنہ اور بہت سے اُمور میں ان کے ساتھ شرکت ہے۔ بعض علما تو حقیقتاً تارک صلوٰۃ
کو کافر کہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا کہ جو شخص عمداً نماز چھوڑ دے وہ کافر ہوا
مگر بعض علماء اس کی تاویل کرتے ہیں کہ کفر کے قریب ہو جاتا ہے۔ بہرحال یہ سخت
وعید ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا کہ جب تمہاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو ان کو
نماز کا حکم کرو۔ اور جب دس سال کی ہو جائے تو نماز کے ترک پر انہیں مارو۔ اور انکے
بستر سے علیحدہ کر دو۔ فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز ہی کا سوال ہوگا۔

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اوّلیں پرسشِ نماز بود

افسوس کہ شارع علیہ السلام جس امر کی شدّومد کے ساتھ تاکید فرمائیں اُسی سے ہم
غافل اور سخت بے پروا ہوں سچ یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس بڑے فرض سے غفلت
کی وجہ سے سخت تباہ ہیں اور طرح طرح کی ذلت برداشت کر رہے ہیں ؎

اصلاحِ بے نماز

ایمان کے بعد اعمال میں جو درجہ نماز کا ہے وہ کسی اور
عمل کو حاصل نہیں۔ اور اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ مسلمانوں
کو اس کا ایسا خاص اہتمام ہوتا کہ اس میں کوئی نقص باقی نہ رہتا۔ مگر قوم کی کم توجہی
اور غفلت نے اس کو بھی کوتاہیوں سے خالی نہ چھوڑا۔ جن میں سے بعض کا بیان اس

موقعہ پر کیا جاتا ہے۔ اور اس سے پہلے یہ امر بھی واضح کرنے کے قابل ہے۔ کہ اختلال نماز کا وبال اس خاص حیثیت کے اعتبار سے بہ نسبت دوسرے اعمال کے اختلال کے زیادہ ہے کہ نماز فرض ہے اور ہر دن رات میں پانچ بار فرض ہے۔ اس میں کوتاہی کرنا حق تعالیٰ کو پانچ بار دن بھر میں ناخوش کرنا ہے۔ بخلاف دوسرے اعمال کے کہ بعض فرض نہیں یا فرض ہیں تو روزانہ فرض نہیں۔ روزہ سال بھر میں فرض ہوتا ہے اور زکوٰۃ بھی سال بھر میں ایک دفعہ فرض ہوتی ہے۔ اور حج عمر بھر میں ایک بار فرض ہوتا ہے اور زکوٰۃ اور حج سب پر فرض بھی نہیں۔ یہ تفاوت نماز اور دیگر اعمال میں ہے۔ اب رہ گئے امور قابل ترک جو فرض ہیں یعنی معاصی کا ترک کرنا۔ وہ بھی روزانہ بلکہ ہر وقت فرض ہیں۔ مثلاً غیبت کا ترک کرنا ہر وقت فرض ہے۔ اور اس امر میں ایسے قابلِ ترک اُمور بھی مثل نماز کے فرض دائمی ہیں۔ مگر اس پر بھی ان کا اختلال نماز کے اختلال سے دو وجہ سے کم ہے۔ ایک یہ کہ یہ امور ارکانِ اسلام سے نہیں کیونکہ فرائض سب ارکان نہیں تو اس اختلال سے ارکان کی تفویت لازم نہیں آتی۔ گو یہ معصیت ہے اور نماز رکنِ اسلام ہے۔ جس کے اختلال سے ایک رُکن کی تفویت لازم آتی ہے اور رکن کو شارع علیہ السّلام نے ایک خاص مقصودیت اور اہمیت دی ہے۔ اس لیے رکن کا فوت کرنا منشاء شریعت کے برخلاف ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بالکل واضح ہے کہ ترک سہل ہوتا ہے فعل سے کیونکہ ترک میں اکثر کسی اہتمام عمل کی حاجت پیش نہیں آتی۔ اور فعل میں اہتمام کی حاجت ہے اور امر سہل کا واقع ہونا اکثر ہوا کرتا ہے۔ اس لئے اُمور ممنوعہ کا وقوع اکثر متصور ہوگا اور اختلال کم اور جو افعال فرض ہیں اگر پورا اہتمام نہ کیا جائے تو ان کا اختلال اکثر ہوگا اور وقوع کم۔ پس نماز میں اختلال کا احتمال زیادہ ہوا اور اُمور ممنوعہ مفروضہ میں کم۔ اور یہی مدعا تھا۔ پس ثابت ہوگیا کہ تمام اعمال میں خواہ

۔۔۔ وجودی ہوں یا عدمی - نماز میں کوتاہی کرنے کا ضرر اکثر اور اشد ہوگا - اس لئے اس کی اصلاح نہایت مہتم بالشان قرار دی گئی ہے +

اس کے بعد بطور نمونہ کے بعض اُن کوتاہیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو کثیر الوقوع ہیں تاکہ اُن پر تنبہ اور اُن کی اصلاح کی طرف توجہ ہو - سوایک بھاری کوتاہی یہ ہے کہ اکثر لوگ نماز کی پابندی سے بالکل عاری ہوتے ہیں - اس کے معصیت ہونے میں تو کلام کرنے کی ضرورت نہیں - کیونکہ یہ متفق علیہ ہے - البتہ ہم یہاں صرف اُن لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جو اِس کے بجا لاتے میں بیہودہ عذرات پیش کیا کرتے ہیں بعض یہ عُذر کرتے ہیں کہ انہیں دُنیا کی ضرورت سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی - مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض بہانہ بازی و سخن سازی ہے - اصل سبب بے پرواہی اور غفلت ہے - کم فرصتی مانع نہیں کیونکہ پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ جس روز یا جس وقت انہیں فرصت ہوتی ہے تب بھی اُن کو نماز کی طرف توجہ نہیں ہوتی - اگر فی الواقعہ کم فرصتی ہی مانع ہوتی تو فرصت کی حالت میں مانع نہ ہوتی اور وہ نماز پڑھتے - پھر ترک کی کیا وجہ؟ - اس سے معلوم ہؤا کہ اصل مانع بے پروائی ہے - جو ہر دو حالت میں موجود ہے - دوسرے یہی امر مانع ہوتا تو بطور قضا ہی انہوں نے نماز پڑھی ہوتی - کیونکہ قضا کے لئے تو کوئی وقت نہیں اور کسی نہ کسی وقت فرصت ہوتی ہی ہے - جیسے نماز کی پابندی والوں کی عادت ہے کہ اگر کسی روز وقت نکل جاتا ہے تو اہتمام کر کے قضا پڑھتے ہیں - تیسرے اگر بے پروائی سے ترک نہ کرتے تو نہیں نماز کے فوت ہوجانے پر قلق ہوتا جیسا کہ مطالب دنیویہ کے فوت ہوجانے پر مدتوں حسرت باقی رہتی ہے اور اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور تدبیریں سوچی جاتی ہیں - کیا ان بے نمازوں کو ترک نماز پر بھی اس فکر و کوشش اور اس قلق و سوزش میں کبھی دیکھا گیا ہے؟ ان وجوہ سے سبب اصلی کی اچھی طرح تشخیص ہو گئی

جس کے علاج کے لیے دو امر کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ تارک نماز وعید دل میں غور کیا کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو کافر فرمایا ہے خواہ تاویل ہی سے فرمایا ہو۔ اور ایسے شخص کا دوزخ میں جانا۔ اور پھر فرعون۔ ہامان۔ قارون کے ساتھ جانا ارشاد فرمایا ہے۔ اور قیامت میں سب سے اوّل پرسش نماز ہی کی ہوگی۔ اور ان وعیدوں کی تقویت کے لئے دوزخ کے حالات پڑھا اور سُنا کرے۔ انشاء اللہ تعالےٰ بے پروائی جاتی رہیگی۔ **دوسرا** امر یہ ہے کہ اپنے نفس پر جبر کرے کہ بدوں ہمّت کیسا ہی آسان کام ہو دشوار ہوجاتا ہے۔ اور جبر کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کو اپنے اوپر مسلط کردے کہ وہ زبردستی اس کو وقت پر اُٹھا کر کھینچکر نماز پڑھوادیا کرے۔ **دوسری** صورت یہ ہے کہ نماز کے ترک ہونے پر کچھ جرمانہ اپنے نفس پر مقرر کرے۔ جس کی مقدار اتنی ہو کہ نہ بہت قلیل کہ نفس کو کچھ ناگوار ہی نہ ہو اور نہ بہت کثیر کہ اس کا ادا کرنا مشکل ہوجائے۔ جب نماز ترک ہو تو وہ جرمانہ مساکین کو دیدیا کرے اور جرمانہ کی یہ صورت سُنّت کے موافق ہے کہ نسائی میں ترک جمعہ و جماع فی الحیض پر تصدّق کا حکم وارد ہوا ہے۔ دوسروں سے جرمانہ لینا بموجب حدیث الا لا یحل مال امرئ الا بطیب النفس منہ علماء کے نزدیک جائز نہیں۔ یا کوئی بدنی جرمانہ مقرر کرے اس کے بھی دو طریقہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر عبادت کی مشقّت ڈالے۔ مثلاً ایک نماز فوت ہو تو اس کو قضا کرے اور بیس رکعت نفل بھی پڑھے۔ نفس دو چار مرتبہ میں ٹھیک ہوجائے گا۔ **دوسرا** طریقہ یہ ہے کہ اس پر مشقّت کی عادت ڈالے۔ مثلاً ایک نماز قضا ہو تو ایک وقت کھانا نہ کھائے۔ اور اگر دو نمازیں قضا ہوں تو دو وقت کا کھانا نہ کھائے۔ چونکہ یہ امر نفس پر بہت شاق ہے اس لئے جلدی ہی حکم کی اطاعت کرے گا۔ بعض بزرگوں کا یہ معمول تھا کہ جس روز تہجّد قضا ہوجاتا تھا سدن

اپنے بدن پر کئی کئی قمچیاں توڑ ڈالتے تھے۔ اور فرماتے کہ اگر تو پھر ایسا کرے گا۔ تو میں بھی ایسا ہی کروں گا۔ بعض معاصی پر شریعت میں روزہ کے ساتھ کفارہ مشروع ہونا اور خود ترک صلوٰۃ پر فقہاء کا تعزیر کو جائز رکھنا اسی مشقت عادیہ کا ماخذ ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ حالت صحت وحضر و فراغ میں تو نماز کے پابند ہوتے ہیں مگر مرض۔ سفر و شغل میں پابند نہیں رہتے۔ اس کا سبب بھی بجز ضعف ہمت اور بیفکری کے کچھ نہیں۔ اگر آدمی کسی کام کا ارادہ و فکر کرتا ہے تو اس کی صورت کچھ نہ کچھ بن ہی جاتی ہے۔ ادنیٰ سی بات ہے کہ اگر ان حالات میں پیشاب۔ پاخانہ کا دباؤ ہو توکیا اس کی ضرورت سے تھوڑی دیر کے لئے سفر و شغل کو منقطع کرنا نہیں پڑتا۔ یا مرض کی حالت میں اٹھنا نہیں پڑتا۔ پھر بجز اس کے اور کیا وجہ ہے کہ اس کو ضروری سمجھ کر اس کا ارادہ کرتا ہے اور یہ احوال مانع نہیں ہوتے۔ اور نماز کو غیر ضروری سمجھ کر اس کا ارادہ نہیں کرتا اور وہ مانع ہو جاتی ہے۔ اور اس سے زیادہ اور کونسی حالت ہوگی کہ پیشاب۔ پاخانہ کی ضرورت سے عین موانع میں وقت نکل آتا ہے اور نماز کی ضرورت کے لئے وقت نہیں نکل سکتا۔ حالانکہ سفر و مرض میں رعائیتیں اور تخفیفیں بھی بہت دی گئی ہیں۔ مثلاً پانی پر قدرت نہ ہو تو تیمم جائز ہے۔ اگر قیام پر قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔ اور ارکان پر قدرت نہ ہو تو اشارہ سے جائز ہے۔ اگر قبلہ معلوم نہ ہو تو تحری[1] جائز ہے۔ جن کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔ یہاں سے ریل میں سوار ہو کر نمازیں چھوڑنے والے کا عذر اور گھر کے کاروبار میں مشغول ہونے والے کا عذر بے معنی ثابت ہو گیا۔ بالخصوص بیماری میں نماز چھوڑنا اور بھی محل افسوس ہے۔ کیونکہ ہر بیماری پیغام موت ہے۔ گو اس سے صحت ہی

[1] تحری۔ قرائن کو مدِ نظر رکھ کر قبلہ کا پتہ لگانا۔ جہاں جہت قبلہ متعین ہو جائے۔

ہو جائے۔ ایسی حالت میں تو نماز و انابت الی اللہ کا اور بھی زیادہ اہتمام ہونا چاہئے تاکہ اگر مرے تو خاتمہ بالخیر ہو۔ اس میں غفلت سخت موجب افسوس ہے۔ بعض بیمار اس لئے نماز چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کا کپڑا اور بدن پاک نہیں رہتا۔ خواہ بیماری چند روزہ ہو خواہ زیادہ مثلاً سلسل البول وغیرہ۔ سو ایسی صورت دو حال سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یا تو وہ ان کے پاک کرنے پر قادر ہیں یا نہیں۔ اگر قادر ہیں تو عذر کیسا؟ اور اگر قادر نہیں تو وہ معذور ہیں۔ ان کو ایسی ہی حالت میں نماز کا ادا کر لینا ضروری ہے جو شرعاً صحیح اور کامل ہے۔ پھر ان کو اپنی رائے سے اس کو ناجائز اور ضائع سمجھنے کا کیا حق حاصل ہے؟

ایک حالت خاص عورتوں کو ہر ماہ میں پیش آتی ہے جس کے احکام نہ جاننے سے یا جان کر بے پروائی کرنے سے بڑی بڑی پابند اور دیندار عورتوں کی نماز میں بھی خرابی پڑ جاتی ہے اور وہ حالت انقطاع حیض کی ہے۔ حکم تو یہ ہے کہ اگر حیض کے منقطع ہونے کے وقت نماز کا اخیر وقت ہو اور اتنا وقت باقی ہو کہ جلدی جلدی بدون سر میں سرسوں یا کھلی ڈالکر دھوئے یا بدن کا میل اتارے۔ تمام بدن پر پانی ڈالکر کپڑے پہن کر ایک بار اللہ اکبر کہہ سکے تو اس وقت کی نماز بھی اس عورت کے ذمہ فرض ہو جاتی ہے۔ اور گو اس وقت تکمیل کی گنجائش نہیں مگر ادائے فریضہ سے سبکدوش ہو سکتی ہے۔ اور جن نمازوں کا پورا وقت انقطاع کے بعد ملا ہے ان کا تو ادا پڑھنا فرض ہوگا۔ عموماً عورتوں میں بے پروائی دیکھی جاتی ہے کہ اول تو وہ اس کا خیال نہیں رکھتی کہ حیض کس وقت منقطع ہوا۔ ممکن ہے کہ وہ کسی نماز کے اتنے اخیر وقت میں منقطع ہوا ہو جس میں غسل ضروری و تکبیر تحریمہ کی گنجائش ہو اور اس لئے وہ نماز ان پر فرض ہو گئی ہو لہذا ان کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ ہر نماز کے اخیر وقت میں ضرور پاکی و ناپاکی کو دیکھ لیا کریں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ

فلاں وقت کی نماز بھی ہمارے ذمّہ فرض ہوگئی۔ دوسرے باوجود انقطاع کا علم رکھنے پر بھی پورے پورے کئی وقت غسل میں جان بوجھ کر تاخیر کر کے ٹال دیتی ہیں اور پھر غضب یہ ہے کہ ادا نہ کرنے کے گناہ کو اپنے سر تو لیا ہی تھا ان اوقات کی نمازوں کو قضا بھی نہیں پڑھتیں اور اس طرح سے ہر مہینہ ان کے ذمّہ کئی کئی نمازیں چڑھتی چلی جاتی ہیں جن کا مجموعہ عمر بھر میں ایک بڑی مقدار کو پہنچتا ہے۔ اگر ہر مہینہ تین ہی تین نمازیں جمع ہوتی رہیں تو سال بھر میں چھتیس نمازیں اور تیس برس میں ایک ہزار سے زیادہ ہو جاتی ہیں۔ پھر ان کی نہ حیات میں قضا ہے اور نہ مرنے کے وقت ان کے فدیہ کی وصیت۔ آخر انہوں نے قیامت کے لئے کیا جواب تیار کر رکھا ہے؟ اور پھر اس پر یہ گمان کہ ہم نماز کی پابند ہیں۔ جب قیامت کے دن یہ غلطی خلاف توقع ظاہر ہوگی تو اس وقت کیا حاصل ہوگا؟ ان سب کا علاج وہی دو امر ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ یعنی وعیدوں میں غور کرنا اور نفس پر جبر کرنا۔ اور جو غلطی احکام نہ جاننے سے ہے اس کے لئے احکام کا سیکھنا۔ پوچھنا فرض ہے۔ اور چونکہ عورتوں کو اکثر اوقات پوچھنے کا سامان کم میسر ہوتا ہے۔ اس لئے مردوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے متعلقین کو احکام شرعیہ بتلاتے رہیں۔ جو نا معلوم ہوں علماء سے تحقیق کر کے بتا دیں اور عورتوں پر واجب ہے کہ جو صورت پیش آئے گھر کے مردوں کو فرمائش کریں۔ کہ وہ علماء سے پوچھیں اور ان کو بتا دیں۔ اور اگر گھر کے مرد غفلت کریں تو دوسرے شخص کے واسطہ سے تحقیق کریں۔ اگر کوئی توجہ نہ کرے تو خود علماء کے گھر جا کر ان کے محارم یا بیبیوں کے ذریعہ سے دریافت کریں ورنہ گنہگار رہیں گی اور ضروری احکام پوچھنے کے لئے جب جانے کی ضرورت ہو۔ اگر شوہر جانے سے منع کرے تو اس کی اطاعت واجب بلکہ جائز بھی نہیں۔ اور اگر لکھنا آتا ہو تو جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف خط و کتابت کے ذریعہ سے دریافت کر سکتی ہیں۔ اور یہ بات

جبکہ کوئی شوہر اُن کے کہنے سے علماء سے مسئلہ پوچھ کر اُن کو نہ بتلائے ورنہ کسی کو خط لکھنا یا کہیں جانا اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف جائز نہیں ÷

بعض عورتوں کے پابند نہ ہونے کا ایک سبب اَور ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایسی طبائع کم ہیں جو محض خدا کے خوف سے بجا آوریٔ احکام کا اہتمام کرتی ہیں۔ بڑا سبب پابندی کا عادت ہے۔ سو چونکہ عورتوں کو ہر ماہ میں بوجہ ایّام مقررہ کے کئی کئی روز تک نماز پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ اس کا اثر پاک ہونے کے بعد بھی یہ رہتا ہے کہ بعض اوقات نماز میں سُستی ہو جاتی ہے۔ گو اس کا علاج تو یہی ہے کہ خدا کا خوف دل میں پیدا کیا جائے۔ مگر یہ ظاہری علاج ہے جو ایک حد تک کافی ہے۔ فقہا فرماتے ہیں کہ عورت کو حیض کی حالت میں مستحن ہے کہ نمازوں کے اوقات میں وضوء کر کے مصلّے پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر تسبیح و تحلیل میں مشغول رہے۔ اس سے وہ عادت محفوظ رہتی ہے اور جو سُستی ترک عادت کے سبب ہو سکتی ہے اس کی نوبت نہیں آتی ÷

بعض بے نمازوں کا عذر شرعی پیرایہ لئے ہوئے ہے۔ کہتے ہیں کہ نماز بدوں حضورِ قلب ہوتی ہی نہیں۔ اور حضورِ قلب ہم سے ہو نہیں سکتا۔ اس لئے نماز ہی چھوڑ دی۔ درحقیقت اِس استدلال میں اُنھوں نے خلط و تلبیس سے کام لیا ہے کیونکہ جس حضورِ قلب پر نماز کی صحت یا کمال موقوف ہے وہ اور ہے اور جو ہمارے امکان سے خارج ہے وہ اَور ہے۔ لہٰذا یہ استدلال غلط ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضورِ قلب کے مراتب مختلف ہیں۔ ایک مرتبہ وہ ہے جس کو فقہا نیّت کہتے ہیں جس پر صحت نماز کا انحصار ہے یعنی اس کے بغیر نماز ادا ہی نہیں ہوتی۔ اور دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کو خشوع کہتے ہیں جس کی حقیقت انشاء اللہ تعالےٰ مذکور ہو گی جس پر کمال نماز کا انحصار ہے نہ صحت نماز کا۔ یعنی اس کے نہ ہونے سے نماز صحیح تو ہو جاتی ہے

مگر کامل نہیں ہوتی۔ تیسرا مرتبہ وہ ہے جس کو قطع وساوس سے تعبیر کرنا مناسب ہے یعنی اصلاً کسی قسم کا خطرہ نہ آئے۔ اور یہ ایک قسم کا استغراق اور حال ہے۔ اِس پر صحت اور کمال کا انحصار نہیں۔ البتہ فی نفسہٖ محمود حالت ہے گو مقصود نہیں۔ پہلا اور دوسرا مرتبہ اختیاری اور مقدور اور شرعاً واجب العمل ہے اور تیسرا مرتبہ غیر اختیاری اور غیر مقدور اور شرعاً واجب العمل نہیں۔ دونوں صورتوں میں خشوع کا مفہوم ایک نہیں تو پھر عدم حضور کا عذر کیونکر چل سکیگا۔ پھر اُنکے استدلال کے فی نفسہٖ غلط ہونے کے علاوہ ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ اُن کے اس استدلال سے نصّ قطعی لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا کی تکذیب لازم آتی ہے۔ کیونکہ جو مرتبہ حضورِ قلب کا ایسا ہے کہ بدوں اس کے نماز نہیں ہوتی خواہ مرتبہ صحت میں یا مرتبہ کمال میں لامحالہ شریعت میں اس کے حاصل کرنے کا حکم ہوگا اور جس امر کا حکم ہے اس کا داخل وسعت ہونا بہ نص بالا لازم آتا ہے۔ پھر اس کو وسعت سے خارج کرنا نص کی تکذیب ہے۔ پھر ان عقل کے پتلوں سے کوئی پوچھے کہ نماز میں جتنے فرائض موقوف علیہ صلوٰۃ کے ہیں۔ اگر وہ کبھی وسعت سے خارج ہوجاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت اس کا کوئی بدل اس کے قائم مقام کرکے اس کی اجازت دیتی ہے مثلاً قیام فرض ہے اگر قدرت نہ رہے تو قعود اس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا پس اگر اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ حضورِ قلب کا مرتبہ ضروریہ وسعت سے خارج ہے تو ضرور ہے کہ شریعت میں اس کا کوئی بدل ہوگا۔ سو اس کے بدل کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری ہوا۔ پھر ترک کی کیسے گنجائش نکلی؟ یہ اُس وقت ہے جبکہ حضورِ قلب اس کا رُکن ہو اور اگر رُکن نہ ہو تو اس صورت میں ضرور سوچنا چاہیئے کہ نماز بلا حضورِ قلب پڑھتے ہیں تو نماز کے لوازم ضروریہ کا فوت ہونا لازم آتا ہے اور نماز نہ پڑھنے سے خود اصل نماز ہی فوت ہوتی ہے۔ سو نماز کا فوت کردینا اشدّ

ہے یا اِس کے لوازم کا! چونکہ لازم کا وجود بدوں ملزوم نہیں پایا جاتا۔ اور جب ملزوم کو فوت کردیا ہے تو لامحالہ لازم بھی فوت ہوگا۔ کیونکہ نماز پڑھنے میں تو صرف حضور قلب ہی فوت ہوتا ہے اور نہ پڑھنے میں وہ حضور بھی گیا۔ اور نماز بھی بھلا صرف لازم کا فوت ہونا ایک آسان امر ہے یا لازم و ملزوم ہر دو کا؟ اور یہ تیسرا امر جہالت کا نتیجہ ہے۔ ہماری اِس تقریر میں غور کرنا اس کا علاج ہے۔

بعض لوگ اس جہالت میں مبتلا ہیں کہ وہ باوجود دعوئے اسلام کے نماز کو فرض نہیں سمجھتے اور یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔ بعض فلسفیت کے رنگ میں ہیں اور بعض تصوف کے رنگ میں۔ پہلی قسم کے لوگ تو یوں تقریر کرتے ہیں کہ اصل مقصود شارع علیہ السلام کا تہذیب اخلاق ہے۔ حکم صلوٰۃ کے فرض ہونے کے وقت لوگوں میں صفاۃ ذمیمہ کبر و ظلم وغیرہ کا غلبہ تھا۔ نماز کی ہیات و اوضاع و اذکار۔ تواضع اور انکسار کی تعلیم دیتے ہیں۔ اِس لئے انہیں نماز کا حکم دیا گیا۔ ہم چونکہ اب مہذب ہو چکے ہیں لہذا ہم کو نماز کی ضرورت نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ تقریر اس خیال پر مبنی ہے کہ احکام شرعیہ کو مقصود بالذات نہ تسلیم کیا جائے۔ اس میں دو دعوے تمہاری طرف سے ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ نماز مقصود بالذات نہیں۔ دوئم یہ کہ بغیر نماز کے مہذب ہونا ممکن ہے۔ جن کا ثابت کرنا تمہارے ذمہ ہے۔ جن کے جواب پر تم قیامت تک بھی قادر نہ ہوگے۔ کیونکہ حکم نماز مقصود بالذات ہے۔ پس ایسے بے سروپا شبہات سے یہ یقین زائل نہیں ہو سکتا عقلاً و سمعاً ایسا اعتقاد الحاد و زندقہ ہے اور ایسا شخص ہرگز مسلمان نہیں۔ اِس کو نماز سے پہلے تجدید ایمان ضروری ہے۔ اور اِس امر کا کیا ثبوت ہے کہ واقعی یہ لوگ اپنی تہذیب نفس سے فارغ ہو چکے ہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ترفع و تجبر و تعلی و تکبر و ظلم و نخوت و قساوت و غفلت ان مدعیوں میں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے جس کا وجود سلف صالحین کے زمانہ میں

اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا۔ پھر یہ مہذب کیونکر کہلا سکتے ہیں؟ اگر مشروعیت صلوٰۃ کی غایت اسی قسم کے مصالح پر مبنی ہوتی تب بھی یہ لوگ بہ نسبت اِن بزرگوار کے نماز کے زیادہ محتاج ہوتے۔ اس جہل مرکب کا علاج بھی وہی ہے جو اوپر مذکور ہُوا۔ اور اگر یہ کافی نہ ہو تو دیگر محققین سے اپنے شبہات کو رفع کر لینا چاہیئے۔

قسم ثانی کے لوگوں کی یعنی جو تصوّف کے رنگ میں آکر تارکِ صلوٰۃ ہیں تقریر یہ ہے کہ نماز سے مقصود بالذّات قُربِ الٰہی ہے۔ اور نیز دیگر طاعات بھی اُسی قُرب کا واسطہ ہیں اور وہ واسطہ ذِکرِ الٰہی ہے۔ پس اگر کسی کو دوامِ ذِکر نصیب ہو جائے اس کو نماز کی حاجت نہیں رہتی یا نماز ہی سے اگر یہ رُتبہ مل جائے تو نماز کی حاجت داعی نہیں ہوتی اور حصُولِ قرب پہ بھی اگر نماز پر مصار رہے تو بطور فریضہ متصوّر نہیں ہوگی۔ اس حالت میں فرائض اس کے حق میں نوافل ہو جاتے ہیں۔ سو اس کے جواب میں بھی وہی مذکورہ بالا تقریر جو فلاسفہ کے مقابلہ میں لکھی گئی ہے کافی ہے۔ اور اس پر بھی وہی فتویٰ اور وہی علاج عرض کیا جائیگا۔ اور دونوں کو مخاطب کر کے ہم بطور مثال بیان کرتے ہیں کہ جس طرح بعض ادویہ طبیہ میں بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں جو بالخاصیت مؤثر ہوتی ہیں۔ اِس کی نسبت طبیب ماہر فن حکم لگا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ان سب عبادات شرعیہ کو محض اپنی صورتِ نوعیّت و خاصیت کے اعتبار سے خاص ثمرات مثلاً اخلاق مرضیہ حق و نجات و قرب و رضا میں مؤثر مانا جائے تو اس کی نفی کی کیا دلیل ہے۔ ہاں اثبات کی دلیل نصوص آیات و احادیث ہیں جو بلا قید خصوصیت ہر ایک شخص کے حق میں یکساں طور پر وارد ہوئے ہیں۔ جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بذاتہا واسطہ ہیں۔ اور جہاں کہیں بعض طاعات کی حکمت بتلائی گئی ہے وہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکا ذِکر صرف اس غرض سے ہے کہ اس حکم کی حکمت اور ضرورت کو ظاہر کیا جائے۔ اللّٰھمّ اھدنا الصراط المستقیم ؞

فضائل نماز

ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلعم جاڑے کے موسم میں جبکہ درختوں کی پت جھڑ ہو رہی تھی باہر تشریف لائے۔ سو آپ نے درختوں کی دو شاخوں کو پکڑا تو اُس کے پتے جھڑنے لگے۔ تب آپ نے فرمایا کہ ابوذر! عرض کیا یا رسول اللہ! حاضر ہوں۔ فرمایا کہ مسلمان بندہ جب محض خالص نیت سے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ ایسے جھڑ جاتے ہیں جس طرح کہ اِس درخت کے پتے جھڑتے ہیں ✦

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا یہ تو بتلاؤ کہ اگر تمہارے دروازوں کے سامنے ایک نہر جاری ہو اور تم میں سے کوئی ہر روز پانچ دفعہ اس میں نہائے تو کیا اُس کے بدن پر کوئی میل کچیل باقی رہ جاتی ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی کہ نہیں فرمایا کہ یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے کہ ان کے سبب اللہ تعالےٰ گناہوں کو مٹا دیتا ہے یعنی پانچ وقت کا نمازی گناہوں کی میل سے پاک صاف ہو جاتا ہے ✦

جماعت

جماعت سے نماز پڑھنا سنّت مؤکدہ ہے۔ اِس کی بڑی تاکید آئی ہے۔ اُبیّ بن کعب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایک دِن صبح کی نماز پڑھائی۔ سلام کے بعد فرمایا کہ فلاں شخص حاضر ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی کہ نہیں۔ پھر فرمایا کہ فلاں حاضر ہے؟ عرض کیا نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ دو نمازیں (عشاء و صبح) منافقوں پر بہت بھاری ہیں۔ اور اگر تم جانتے کہ اِن دونوں میں کیا ثواب ہے تو تم اِن دونوں کے لئے آتے۔ گو تم کو گھٹنوں کے بل چلنا پڑتا اور پہلی صف فرشتوں کی صف کی طرح ہے۔ اور اگر تم اِس کی فضیلت جانتے تو جلدی آتے (صف اوّل میں) دو مرد کی نماز بہ نسبت اکیلے کے بہتر ہے۔ اور تین کی دو سے بہتر ہے اور جس قدر زیادہ ہوں خدا کے نزدیک بہت عمدہ ہے۔ ایک روایت میں جماعت سے نماز پڑھنے سے پچیس نماز کا اور ایک روایت میں ستائیس نماز کا ثواب آیا ہے۔ اور یہ محلّہ کی مسجد کے لئے ہے اور جامع مسجد میں پانچسَو نماز کا ثواب

اور بیت المقدس اور مسجد نبوی صلعم میں تو پچاس پچاس ہزار نماز کا اور بیت اللہ میں ایک لاکھ نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اللہ اکبر۔ اس میں علاوہ اور بہت سے فوائد وبرکات دینیہ کے دنیوی فائدے بھی ملحوظ ہے ۔ بلا عذر ترک جماعت پر حضور علیہ السلام نے سخت وعید فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ جو لوگ جماعت کے ساتھ شامل نہ ہوں میں ان کے گھر پھونک دوں۔ ہر ایک ایماندار اس وعید کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین رحمہم اللہ العزیز تکبیر تحریمہ فوت ہو جانے پر تین دن اور جماعت فوت ہو جانے پر سات دن تک متواتر اس شخص کی تعزیت کیا کرتے جو تحریمہ اور جماعت کی فضیلت سے محروم رہ جاتا۔ اللہ رے محبتِ دین۔ جزاہم اللہ خیرا ۔

ناظرین کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شریعت اسلامی کے رُو سے کامل الایمان وُہی شخص ہے جو حضور علیہ السلام کی روش سے بلا عُذر سرِ مو تفاوت جائز نہ رکھے۔ جو شخص دلی محبت اور ارادت سے حضور علیہ السلام کی پیروی کرتا ہے وہ چند ہی روز میں اپنے دِل میں حلاوت ایمان محسوس کرنے لگتا ہے۔ نفس اگر بالفرض غفلت وسُستی کی طرف میلان کرتا ہو تو فی الفور استغفار ولاحول پڑھ کر سنّت کو بجا لانا چاہیئے۔ یہ ایک راز ہے جس کو عملی طور پر بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ اور جس نے سمجھا ہے اُسے کسی دوسری چیز سے خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو لذت حاصل نہیں ہوتی ہو مگر یہ حالت بتدریج نفس کو قابو کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ آرام طلبی اور تن آسانی کو ایسے وقتوں میں اختیار کرنا جبکہ اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم سر پر موجود ہو ضعفِ ایمان کا نتیجہ ہے اور ایسا آدمی نورِ عرفان سے ہمیشہ محروم رہتا ہے ۔

اسرارِ جماعت

ذیل میں ان اسرار کو نمبر وار قلمبند کیا جاتا ہے۔ جو باجماعت نماز ادا کرنے میں شارع علیہ السلام کو مدِ نظر ہیں :-

(۱) نماز معافی گناہ کے لیئے عذر پیش کرنے کا نام ہے - چنانچہ کتاب وسنّت میں اس کی تصریح ہو چکی ہے - ظاہر ہے کہ اکیلے شخص کا عذر وہ وقعت پیدا نہیں کرتا جو ایک جماعت کا ؛

(۲) نماز دُعا کا نام ہے جس میں اپنی کام روائی کی التماس پیش کی جاتی ہے - بہت سے لوگوں کا جمع ہونا گویا ایک گونہ سفارش کا کام دیتا ہے ؛

(۳) نماز رحمتِ الٰہی کا ایک وسیع دسترخوان ہے - کریم آدمی کا شیوہ ہے کہ جس قدر زیادہ مہمان اس کے دسترخوان پر موجود ہوں اُسیقدر اُسے زیادہ خوشی ہوتی ہے ؛

(۴) جماعت سے عبادت کا کفّار پر اظہار ہوتا ہے جو اُن پر بمنزلہ حجت تصوّر ہو سکتا ہے اور ان کے دِلوں میں ہیبت وحشمت اسلامی کا سکّہ جم جاتا ہے ؛

(۵) جماعت سے مسلمان باہم ایک دوسرے کے گواہِ عبادت بن جاتے ہیں ؛

(۶) ایک حدیث میں حضور علیہ السّلام یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب چالیس آدمی مِلکر نماز ادا کرتے ہیں تو اُن میں ایک شخص ضرور مغفور ومرحوم ہوتا ہے ؛

(۷) ملائکہ نے آدم علیہ السّلام کے خلیفۃ اللہ ہونے پر یُوں اعتراض کیا تھا کہ اے خُدا کیا تو زمین میں ایک مُفسد کو خلیفہ بناتا ہے - پس اقامت صلٰوۃ کے وقت آسمانوں کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں تاکہ ملائکہ دیکھ لیں کہ ان کا اعتراض درست نہیں تھا ؛

(۸) ممکن ہے کہ اکیلے آدمی کو کسی رُکن کے ادا کرنے میں سہو ہو جائے - بصورتِ جماعت احتیاط ملحوظ رہے گی ؛

(۹) شعائر اللہ کا اظہار موجب عظمتِ دین ہے ؛

(۱۰) انتظار جماعت کا ثواب ؛

(۱۱) باہم ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہونا موجبِ ہمدردی و باعث ازدیادِ محبت ہے ٭

(۱۲) السلام علیکم کا ثواب ٭

(۱۳) ضرورتِ جماعت پر مساجد کی تعمیر جو منجملہ شعائر اللہ ہے ٭

(۱۴) جماعت سے نماز اوّل وقت میں ادا ہوگی کیونکہ تنہا غالباً تاخیر کرے گا جو گناہ ہے ٭

(۱۵) مشابہت بالملائکہ حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ملائکہ اپنی نسبت یوں کہتے ہیں اِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّوْنَ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ٭

(۱۶) مجاہدین سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ٭

(۱۷) حُجّاج بیت اللہ سے مشابہت حاصل ہوتی ہے ٭

(۱۸) امام کی اقتداء سے اطاعت و انقیاد کی عادت ہو جاتی ہے ٭

(۱۹) پابندئ وقت کی عادت ہو جاتی ہے ٭

(۲۰) جماعت بجائے خود ایک زینت ہے ٭

(۲۱) میدانِ حشر میں جمع ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے ٭

ممکن ہے کہ غور کرنے سے کوئی صاحب اور بھی فوائد یا اسرار تجویز کر سکیں مگر تقویتِ ایمان کے لئے کیا یہ کچھ کم ہیں؟

نماز کے متعلق ضروری احکام

اُوپر کے بیان سے اسرار و فوائد نماز معلوم ہو چکے ہونگے کہ نماز بندہ اور مولےٰ کے درمیان تقرّب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اِس لئے ضروری ہے کہ اِس کو عُمدہ طور پر ادا کیا جائے اِس کے تمام فرائض و واجبات و سُنن و مستحبّات کا لحاظ رہے۔ کیونکہ تمام جگہ اَقِیْمُوا

الصّلوٰۃ" فرمایا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو ٹھیک حالت پر قائم کرو اور خضوع و خشوع تو لازمی امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خٰشِعُوْنَ۔ یعنی وہ مومن عذاب سے خلاصی پا گئے جو اپنی نمازوں میں خشوع اور فروتنی کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب نماز میں کھڑا ہے تو اُس کا دل خدا کی طرف متوجّہ ہو۔ معانی کا لحاظ رہے۔ اور یُوں سمجھے کہ میں اپنے رب کو دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو اتنا سمجھے کہ میرا رب مجھ کو دیکھ رہا ہے جیسا کہ آنحضرت صلعم نے حدیث جبریلی میں احسان کے معنی بیان فرمائے ہیں۔ ایسی نماز ہی انسان کو گناہ کی باتوں سے روکتی ہے۔ ایسے پاک نفوس ہی اِس کے قرب کے مستحق ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حالت نماز میں ہوتی یہ تھی کہ گویا ہانڈی کا جوش ہے کہ آپ کے سینہ مبارک سے ظاہر ہو رہا ہے۔ صحابہ کرام وتابعین و تبع تابعین اور آئمہ مجتہدین کی نمازوں کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو جائیگا کہ یہ اللہ کے بندے نمازی تھے ایک نماز ہماری بھی ہے کہ زبان سے کچھ کہہ رہے ہیں اور دِل میں کچھ۔ پھر اِس کا کیا فائدہ اور ایسی نماز بُرائیوں سے کیونکر روک سکتی ہے ؎

بر زباں تسبیح و در دِل گاؤ خر

ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں مگر اس کے آداب کا خیال نہیں۔ صف بندی پُورے طور پر نہیں کی جاتی۔ ابھی پہلی صف پوری ہی نہیں ہوتی کہ دوسری بنا لیتے ہیں۔ حکم یہ ہے کہ جب امام رکوع کرے سجدہ کرے تم اس کے بعد کرو مگر یہاں حال برعکس دیکھا جاتا ہے۔ امام ابھی سجدہ میں جاتا ہی نہیں کہ مُقتدی پہلے سے پہنچے ہوتے ہیں۔ مُقتدی وہ ہے جو اقتداء کرے نہ کہ جو پیش روی کرے۔ اس طرح بیشک نماز نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ نماز سے سخت بے پروائی کی جاتی ہے۔

اوّل تو نمازی ہی کتنے ہیں؟ فی صدی ایک بھی نہ پایا جائیگا۔ اور جو کچھ ہیں بھی۔ تو نماز برباد کن۔ اِلّا مَا شَآءَ اللّٰہُ۔ پروردگار عالم مسلمانوں کو اس بڑے فرض کے صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق دے۔ آمین ؀

نفلی نمازیں

پانچ وقتی نماز جو ہر مسلمان پر فرض ہے اس کا ذکر تو گذر چکا اب ہمیں یہ بیان کرنا ہے کہ فرضی نمازوں کے علاوہ نفلی نمازوں کا ذکر بھی احادیث میں آیا ہے۔ چونکہ اسلام میں عبادات بدنیہ میں سے نماز کا بڑا مرتبہ ہے۔ یہاں تک کہ نماز کو مومن کا معراج کہا گیا ہے۔ اس لئے جس قدر ماثورہ نمازیں ہیں ان کا معلوم کرنا اور اُن پر پابند ہونا اعلےٰ درجہ کی سعادت کا نشان ہے یاد رکھو کہ جس قدر تم کو خدا سے زیادہ تقرّب ہوگا اُسیقدر زیادہ اس کے مقبول ہوگے۔ اور تقرّب کے بڑے وسائل میں سے نفلی نماز ہے جس قدر زیادہ ادا ہوگی اُسیقدر زیادہ تقرّب ہوگا۔ یہاں تک کہ ملقب بہ ولی اللہ ہوجائیگا۔ چنانچہ بخاری میں ابوہریرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ پروردگار نے فرمایا۔ کہ جو شخص میرے ولی سے عداوت پیدا کرے تو میں اس کو اپنے سے لڑائی کا پیغام دیتا ہوں۔ اور سب سے زیادہ محبوب عمل (بندہ کی طرف سے) یہ ہے کہ میرے فرائض کو ادا کرے۔ اور میرا بندہ نوافل پڑھ کر مجھ سے ہمیشہ تقرّب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اس کو دوست بناتا ہوں تو میں اس کے کان ہوجاتا ہوں جن سے وہ سُنتا ہے اور اُس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو ضرور اُس کو دیتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو پناہ دیتا ہوں۔ میں جس کام کو کرتا ہوں اُس میں تردد نہیں کرتا۔ مومن کی طرف سے مجھے تردد ہے کہ وہ موت کو بُرا سمجھتا ہے۔ اور مجھے اس کی بُرائی بُری معلوم ہوتی

ہے۔لیکن اس کی موت کا آنا ضروری اور اٹل امر ہے +

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نوافل پڑھتے پڑھتے خدا کے ولی ہو جایا کرتے ہیں تم نے اولیاء کرام کے حالات دیکھے ہونگے تو تم کو یقین ہو گا کہ یہ لوگ کیسے عبادت و ریاضت وذکر وشغل میں اپنے عزیز اوقات کو بسر کیا کرتے تھے۔یہانتک کہ تمام زمانہ میں خدا کے ولی اور محبوب مشہور ہو جاتے تھے۔اور لوگوں کے دلوں میں عموماً اُن کی محبت اثر کر جایا کرتی تھی۔جیسا کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ جب خداوند کریم کسی بندہ کو اپنا ولی اور دوست بناتا ہے تو خدا کی طرف سے فرشتہ آسمان میں پکار دیتا ہے کہ فلاں بندہ میرا ولی ہے تو بھی اس کو دوست رکھ۔علیٰ ہذا زمین پر بھی فرشتہ پکار دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جہاں کسی ولی اللہ کا گذر ہو جائے ہزاروں بندگانِ خدا اُن کی زیارت و برکت سے مشرف ہوتے ہیں۔آجکل بھی اس گئے گذرے زمانہ میں کوئی بندۂ خدا بزرگوں کے طریقہ پر چلنے والا آجاتا ہے تو دیکھ لو کہ بلا اُن کے طلب اور درخواست و اشتہار ہر طبقہ کے لوگ ان کی خدمت میں نہایت ذوق شوق سے جمع ہو جاتے ہیں۔سبحان اللہ۔اُن بزرگانِ دین کی زندگی اور موت یکساں ہوتی ہے فقط زندگی ہی میں یہ لوگ مرجع انام نہیں ہوتے بلکہ موت کے بعد بھی مرجع عالم ہوتے ہیں۔اور روحانی فیض حاصل کرنے والے فیض یاب ہوتے ہیں۔الغرض عبادت وہ شئے ہے جس کی خوبی اور فوائد سے عابد لوگ ہی جو خالصاً لوجہ اللہ عبادت کرتے ہیں بخوبی واقف ہیں۔نافلہ نمازیں حسب ذیل ہیں :-

نماز تہجد۔نماز اشراق۔نماز ضحیٰ۔نماز بعد از زوال۔صلوٰۃ اوابین۔صلوٰۃ تسبیح۔صلوٰۃ حاجت۔نماز استخارہ۔نماز کسوف۔نماز خسوف۔نماز استسقاء۔نماز خوف۔نماز شب قدر۔نماز نصف شعبان۔نماز جنازہ جو فرض کفایہ ہے +

ان مذکورہ بالا نمازوں کے تفصیلی احکام کتب فقہ و حدیث میں مذکور ہیں۔اس کتاب

میں ان کا بیان باعثِ طوالت ہے ؛

نمازِ جمعہ

شریعت اسلام نے اتفاق کے دائرہ کو وسیع کرنے کی خاطر جمعہ کا دِن مقرر کیا ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ تمام شہر کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں بلکہ اس پاس کے چھوٹے چھوٹے گاؤں کے لوگ بھی آجائیں۔ جمعہ کے متعلق بعض ضروری احکام مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) جمعہ کے روز نماز کے لئے مسجد جامع میں جمع ہونے کی وجہ سے اُس دن کو جمعہ کہتے ہیں۔ گو پنجگانہ نماز کے لئے بھی لوگ مسجد میں جمع ہوتے ہیں مگر نمازِ جمعہ میں زیادہ خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکیلا آدمی نمازِ جمعہ ادا نہیں کرسکتا۔ ایّامِ جاہلیّت میں اس دن کو یوم العروبہ بولا کرتے تھے۔ کعب بن لوی ایّامِ جاہلیّت میں لوگوں کو اُس دن جمع کرکے اُنہیں وعظ و نصیحت کیا کرتا اور جناب پیغمبر علیہ السّلام کے آنے کی خبر دیا کرتا تھا۔ جمعہ کا لفظ اب گویا اِسلامی اِصطلاح ہے۔ سب سے پہلا جمعہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے مسجد قبا میں ادا کیا جبکہ آپ مکّہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منوّرہ تشریف فرما ہوئے تھے بعد ازاں مدینہ منوّرہ میں نازل ہوکر آپ نے دار بنی سالم بن عوف میں پہلا جمعہ ادا کیا ؛

(۲) جمعہ کا دِن نہایت مبارک سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ اس کو مسلمانوں کے لئے عید کا دِن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ عبادات فریضہ اور نوافل کا ثواب جمعہ کے دِن بہت بڑا ہے۔ ایک حدیث میں حضور علیہ السّلام یوں ارشاد فرماتے ہیں خیر یوم طلعت[۵۱] فیہ الشّمس یوم الجمعۃ فیہ خلق اٰدم وفیہ ادخل الجنّۃ وفیہ اُخرج منھا[۵۲] ولا تقوم السّاعۃ الا فی یوم الجمعۃ ؛

---

[۵۱] ترجمہ۔ تمام دنوں میں بہترین دِن جمعہ کا ہے کیونکہ اِسی میں آدم علیہ السّلام کے وجود کی تکمیل ہوئی اور اُسی دِن آپ داخل جنت ہوئے اور اُسی دن جنّت سے نکالے گئے اور قیامت بھی اُسی دِن قائم ہوگی ۱۲ منہ [۵۲] شاید کسی صاحب کو یہ خیال پیدا ہو کہ آدم علیہ السّلام کا بہشت سے نکالا جانا جمعہ کے دِن کیوں موجب فضیلت ہے ؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا یہ نکالا جانا تمام انبیاء و اولیاء کے سلسلہ وجود کا باعث ہوا ۱۲ منہ

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی عبادت کے لئے علیحدہ علیحدہ ہفتہ اور اتوار کے دن مقرر تھے۔ مسلمانوں کی بہت خواہش تھی کہ اُنکے لئے بھی عبادت کے واسطے کوئی دن مقرر ہو۔ چونکہ اکثر احکام شریعت کا نزول مدینہ منورہ میں ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں مشرکین نے ابھی تک توحید کا اقرار نہیں کیا تھا تو دیگر احکام کی تعلیم جو توحید پر مترتب ہو سکتی ہے کیونکر ممکن تھی۔ اس لئے خداوند کریم نے مدینہ منورہ کو یہ شرف بخشا کہ حضور علیہ السلام وہاں تشریف فرما ہوئے اور سب احکام شرعیہ مثلاً وجوب نماز و زکوٰۃ وغیرہ نازل ہونے شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور خدا کا شکر بجا لائے[1]۔

اجابت دُعا روز جمعہ کی خصوصیات میں داخل ہے اور اس خصوصیت کا منبع یہ حدیث ہے۔ اِلْتَمِسُوا السَّاعَةَ الَّتِيْ تُرْجٰى فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ بَعْدَ الْعَصْرِ اِلٰى غَيْبُوْبَةِ الشَّمْسِ[2]۔ گو اس ساعت میں اختلاف کیا گیا ہے مگر عام طور پر بھی جمعہ کا دِن قبول دُعا کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ بزرگانِ سلف خاص خاص وظائف و اوراد جمعہ کے دِن بجا لایا کرتے تھے۔

یہ خیال محض غلط ہے کہ تمام دِن یکساں ہیں اور ان میں بلحاظ برکت و خیر کوئی تفاوت نہیں۔ کیونکہ خداوند کریم نے اپنی حکمت کاملہ سے تمام مختلف قسم کی اشیا میں تفاوت رکھا ہے۔ یہ تو ایسا ہی خیال ہے کہ تمام آدمی یکساں ہیں اور ان میں بلحاظ فضائل ذاتی کوئی تفاوت نہیں۔ یہ سچ ہے کہ مخلوق ہونے کی حیثیت سے یکساں ہیں مگر عوارض میں ہر ایک چیز اپنے نوع کے دیگر افراد سے متمیز ہو سکتی ہے خصوصاً جبکہ نص قرآنی سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند کریم نے اس دن کو برخلاف دوسرے

---

[1] ممکن ہے کہ حضورؐ کے خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے جمعہ کا دِن مسلمانوں کے لئے منتخب کیا گیا ہو کیونکہ جمعہ بھی آخری دن ہے جس میں آدمؑ کے وجود کی تکمیل ہوئی [2] اُس گھڑی کی تلاش کرو جو جمعہ کے دن عصر اور غروب آفتاب کے درمیان وقت میں قبول دعا کے لئے مقرر ہے ۱۲ منہ

دِنوں کے عظیم الثواب نماز کے لئے منتخب کیا ہے اور احادیث میں اُس دِن کے فضائل مذکور ہیں۔ جمعہ کی خصوصیت دیگر ایّام کی نسبت بعینہٖ ماہ رمضان اور لیلۃ القدر کی سی ہے جو بنص قرآن دوسرے مہینوں اور راتوں پر فضیلت رکھتے ہیں ؛

(۳) ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ بموجب حدیث بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلَی النَّظَافَۃِ مقدّس اِسلام میں طہارت ظاہری و باطنی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ جمعہ کا دِن اِس ضروری حکم کی بجا آوری کے لئے حضور علیہ السّلام نے مخصوص فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں یوں وارد ہے۔ مَنِ اغْتَسَلَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ وَغَسَّلَ وَبَکَّرَ وَابْتَکَرَ وَدَنَا وَاسْتَمَعَ وَاَنْصَتَ کَانَ لَہٗ بِکُلِّ خَطْوَۃٍ یَخْطُوْہَا[1] اَجْرُ سَنَۃٍ صِیَامِہَا وَقِیَامِہَا اگر لباس دُنیا تبدیل کر کے خوشبو وغیرہ لگائے تو اَور بھی موجب ثواب ہے ؛

علماء نے اِس امر میں اختلاف کیا ہے کہ غسل جمعہ فضیلتِ[2] یوم جمعہ کی خاطر ہے یا نماز کی۔ کچھ ہو بہ نیت ادائے سنّت موجب ثواب عظیم ہے ؛

غسل اور تبدیل لباس سے ایک مومن کے دِل میں جو نور پیدا ہوتا ہے اُسکی کیفیت وہی جانتا ہے ؛

(۴) جب امام منبر پر کھڑا ہو اور دوسری اذاں ہو جائے تو ہر ایک قسم کے کام کاج کو فی الفور ترک کر دینا چاہئے۔ قرآن مجید میں بیع کا لفظ آیا ہے کیونکہ بیع ضروریاتِ انسانی میں سب سے اہم ہے ورنہ ہر ایک شغل کی ممانعت ہے حضور علیہ السّلام اور خلیفہ اوّل اور خلیفہ ثانی کے زمانہ تک ایک اذاں ہی

---

[1] جو شخص جمعہ کے روز غسل اور سر کے بالوں کو صاف کرے اور نماز کے اوّل وقت میں حاضر ہو کر خطبہ سُنے۔ اور امام کے قریب بیٹھ کر کان لگائے۔ وعظ اور پند جو خطبہ میں ہُوا کرتا ہے اُسے سُنتا رہے تو اُسے ہر ایک قدم کے عوض ایک سال کے روزوں اور رات بھر عبادت کرنے کا ثواب ملتا ہے ۱۲ منہ

[2] اہل مدینہ شروع شروع میں اگر کسی کو بُرے الفاظ سے تعبیر کرنا ہوتا تو کہتے کہ فلاں اس شخص سے بھی بُرا ہے جو جمعہ کے دن غسل نہیں کرتا ۱۲ منہ

مقرر تھی - مگر خلیفہ ثالث کے زمانہ میں جب لوگوں کی کثرت ہوگئی تو مسجد نبوی کے متصل مکان زوراء پر ایک اذان اور بڑھادی گئی ۔

(۵) مسافر - عورت - مریض - غلام - نابینا - قیدی پر جمعہ واجب نہیں لیکن اگر وہ ادا کرلیں تو ادا ہو جائیگا ۔

(۶) جب مسجد میں جائے اور ابھی خطبہ شروع نہ ہوا ہو تو چار رکعت سنت قبل جمعہ ادا کرے - اور اگر خطبہ ہو رہا ہو تو صحیح مذہب یہی ہے کہ دو یا چار رکعت نہ پڑھے بلکہ چپکا بیٹھا سنا کرے - بعض نے دو رکعت کا پڑھنا جائز رکھا ہے ۔

(۷) اثنائے خطبہ میں ہر ایک قسم کا بولنا منع ہے بلکہ احادیث میں یوں وارد ہے کہ دوسرے کو زبان سے منع بھی نہ کرے - چھینک پر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یا کسی کے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کا جواب بھی نہ دے ۔ اگر نیند آجائے تو بہ حکم حدیث اپنی جگہ بدل دے

(۸) بعض لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب مسجد میں آتے ہیں تو لوگوں کے کندھوں پر سے صفیں چیرتے آگے جا بیٹھتے ہیں جس سے اُن کے امن میں ایک گونہ خلل پیدا ہوتا ہے - اس کی سخت ممانعت آئی ہے - چاہیے کہ جہاں موقع بیٹھنے کا ملے وہیں بیٹھ جائے - مگر اس حرکت سے باز رہے - چنانچہ فرمایا مَنْ تَخَطّٰی رِقَابَ النَّاسِ[1] یَوْمَ الْجُمُعَةِ اِتَّخَذَ جِسْرًا اِلٰی جَهَنَّمَ - سب سے اگلی صف میں پہلے آکر رو بقبلہ بیٹھ جانا موجب ثواب عظیم ہے - مگر اگر سو بیٹھنا منع ہے ۔

(۹) اہل السنت والجماعۃ کے نزدیک جمعہ کا وہی وقت ہے جو نماز ظہر کا ۔

(۱۰) سُنّت یہی ہے کہ امام خطبہ منبر پر کھڑا ہو کر پڑھے - پہلے خطبہ کے بعد امام کا نیچے درجہ پہ آجانا اور پھر اُٹھ کر اوپر کے درجہ پہ چلے جانا ممنوع ہے ۔

---

[1] جو شخص جمعہ کے دن نمازیوں کے کندھے پر سے گذر کر آگے جاتا ہے وہ اپنے لئے جہنم کی طرف ایک پل بناتا ہے - ۱۲ منہ ۔

(۱۱) امام کا منبر پر چڑھتے وقت السلام علیکم کہنا ضعیف مذہب ہے ✦

(۱۲) دوسرے خطبہ میں امام کا درود پڑھتے وقت صلی و صام اور قعد وقام میں داہنیں اور بائیں مُنہ پھیرنا بدعت ہے ✦

(۱۳) خطبہ کے وقت ہر ایک قسم کی نماز مکروہ ہے۔ ہاں اگر صبح کی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کی قضا بہ غرض حفظ ترتیب کرلے۔ ہر دو خطبہ میں بحالت وقفہ دُعا کرنا مسنون نہیں۔ بعض نے دِل میں دُعا کرنا جائز رکھا ہے ✦

(۱۴) دوسرے خطبہ کے اخیر پر آیہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ الخ پڑھی جاتی ہے۔ مگر سُنت میں اِسکا کچھ پتہ نہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ خلفائے بنی اُمیہ خطبہ کے اخیر پر جناب علی کرم اللہ وجہہ کے حق میں طعن و تشنیع کیا کرتے تھے جب خلیفہ عمر بن عبد العزیز رضہ جو نہایت متقی اور پارسا شخص تھے خلیفہ ہوئے تو اُنہوں نے حکماً اس بُری روش کا انسداد کردیا۔ اور اس کی جگہ آیت مذکورہ بالا کے پڑھنے کا حکم دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ مسلمانوں کو عدل احسان اور حقوق اہلِ قرابت کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے۔ اور ہر ایک قسم کے فحش فعل بد اور بغاوت سے روکتا ہے تب سے خطباء بدستور پڑھتے چلے آتے ہیں مگر اِس کے پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ قرآن مجید کا خطبہ میں بطور وعظ پڑھنا سب سے افضل ہے ✦

(۱۵) امام کو چاہیئے کہ نماز جمعہ میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون پڑھے یا سورۂ اعلےٰ اور سورۂ غاشیہ۔ مگر بطور لزوم نہیں۔ کبھی کبھی اس روش کو بدل دے ✦

(۱۶) اہلِ حدیث کے نزدیک جو شخص کہ خطیب ہو وہی امام ہونا چاہیئے۔ مگر اہل السنت والجماعت کے نزدیک خطیب غیر امام بھی ہو سکتا ہے مگر باذن خطیب ہونا چاہیئے ✦

(۱۷) جو شخص پیچھے آکر جمعہ میں شامل ہو وہ باقی کی نماز ادا کر سکتا ہے - اور اگر قعدہ میں ملا ہو تو اُسے ظہر پڑھنی چاہیئے - رکوع میں ملنے کی صورت میں اختلاف ہے مگر صحیح مذہب یہ ہے کہ جمعہ نہیں ہؤا - ظہر پڑھے ❖

(۱۸) اگر جمعہ اور عید کی نماز ایک دِن اکٹھی ہو جائیں تو فرض جمعہ ساقط ہو جائیگا لیکن ادا کیا جائے تو موجب ثواب ہے ❖

(۱۹) جمعہ کے دن صدقہ - استغفار اور کثرتِ درود شریف موجب ثواب عظیم ہے ❖

(۲۰) قبل از نماز جمعہ سفر کرنا منع ہے - اگر دوسری جگہ جمعہ مل جانے کا یقین ہو تو ڈر نہیں - سلف صالحین کا دستور تھا کہ نماز جمعہ کے لئے صبح ہی سے اہتمام کرتے اور تمام سُنتیں و مستحبات کی نگہداشت کو ملحوظ رکھتے اور اِس فرض عظیم کے بجا لانے میں حضور علیہ السّلام کی اِس وعید کو کبھی فراموش نہ کرتے من ترک الجمعۃ ثلاثاً من غیر عذر طبع اللہ علی قلبہ[۱] - بلکہ بعض سلف تو جمعرات کو مسجد ہی میں بسر کرتے - تمام رات تلاوت و ذکر و استغفار میں مشغول رہتے اور اِس عبادت کے ساتھ جمعرات اور جمعہ اور ہفتہ یعنی تین دِن کے روزہ کی عبادت بھی ملا لیتے - الغرض ان بزرگواروں نے جمعرات اور جمعہ کو ازبس غنیمت سمجھ رکھا تھا - بعد میں جب لوگوں کی ہمتیں پست ہو گئیں تو عین خطبہ یا جماعت کے وقت مسجد میں آنا شروع ہؤا - اور آہستہ آہستہ جمعہ پڑھنا ہی چھوڑ دیا - اِلّا ماشاءاللہ ❖

ناظرین کو چاہیئے کہ مذکورہ بالا ہدایات کو خوب ضبط رکھیں - اور بہ نیت تقرب الی المنّان پر عمل کریں - تاکہ بموجب فرمان نبوی یہ اعمال گناہ کا کفارہ ہو سکیں - واضح ہو کہ نماز تمام حضور علیہ السّلام کی تعلیم کا اصل اُصول ہے کیونکہ بدون اسکے

[۱] جو شخص بلا عذر تین جمعہ نہ ادا کرے خدا اُس کے دِل کو زنگ آلودہ کر دیتا ہے - ۱۲ منہ

تکمیل ایمان نہیں ہوسکتی۔ آپ کو نماز جان سے بھی زیادہ عزیز تھی - بلکہ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے صرف نماز کی تبلیغ مقصود تھی۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک ایماندار کا ایمان کیونکر ترک نماز کا متقاضی ہوسکتا ہے۔ یہ کیسی ناعاقبت اندیشی اور بے حیائی ہے کہ نماز جیسے ضروری حکم کو بعض لوگ سرسری سمجھ کر ٹال دیتے ہیں - بھلا ان غافلوں سے کوئی یہ تو پوچھے کہ تمہارا یہ طریق غفلت کس کے حق میں وبال جان ہوگا ؎

دریں دیرِ مکافات آنکہ بد کرد
نہ با جانِ کسے یا جان خود کرد

اے ناظرین خدا کے لئے غور کرو اور اپنے تئیں دوزخ کی آگ سے بچاؤ- مرتے وقت پچھتانا کچھ مفید نہیں ہوگا - دُنیا روزے چند است عاقبت کار با خداوند است- خدا ہر ایک مسلمان کو توفیق دے - آمین ؛

روزہ

عربی میں لفظ صوم کے معنی روکنے کے ہیں۔ مگر اصطلاح شرع میں روزہ کے معنی بہ نیّت عبادت دن بھر کھانے پینے اور جماع کرنے سے باز رہنے کو کہتے ہیں ؛

روزہ کیوں مفروض ہوا؟

تمام عبادات شرعیہ میں یہ امر بالاشتراک ملحوظ رکھا گیا ہے کہ نفس کو ہر ایک قسم کی ظاہری اور باطنی آلائشوں سے پاک وصاف کیا جائے - کیونکہ بدوں اس کے خدا کی محبت اور معرفت کا دروازہ نہیں کھلتا - اور جو شخص معرفت ذات باری سے اس عالم میں غافل رہا ہے اُس کے لئے آئندہ زندگی میں کسی قسم کی صلاح وفلاح نہیں - مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی - انسانی زندگی کا اعلیٰ اور اہم مقصد یہی ہے کہ اسے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تکمیل میں صرف کیا جائے - اگر یہ نہیں تو یوں سمجھو کہ پید

بھی نہیں - یہ امر مسلم ہے کہ جس قدر محسوسات اور مادی اشیاء کے تعلقات اور انکے لوازم کا اثر نفس پر کم پیدا ہوگا اُسی قدر امور عقلیہ اور معارف و حقائق کی کنہ تک رسائی حاصل ہوگی - جو لوگ شب و روز تن پروری اور نفس پرستی میں مستغرق اور ہر ایک قسم کی جائز و ناجائز عیش و عشرت میں منہمک رہتے ہیں یقیناً لذتِ معرفت اور نورِ ایمان سے محروم رہتے ہیں - انسان کی حقیقی غایت معرفت ذاتِ باری کا حاصل کرنا ہے اور یہ امر بدلائل عقل و نقل پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ بدوں ریاضتِ نفس یہ بات ممکن نہیں - چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہی رہا ہے کہ اُنھوں نے بذریعہ تعلیم وحی اپنی اپنی اُمتوں کو ریاضت نفس کے طریق بتاتے ہیں - نماز - روزہ حج - زکوٰۃ ایسے اُمور ہیں جن میں بجائے خود ہر ایک ریاضت نفس کا بڑا بھاری ذریعہ ہے - اور غور کرکے دیکھو کہ بدوں اِن اُمور کی پابندی کے نفس کو اسکی بدلگامیوں سے روکنے کا کوئی چارہ نہیں - اگر ان فرائض کی پابندی ایسے طور پر کی جائے کہ اُن کے ظاہری اور باطنی آداب ارکان و شرائط و لوازم کو کما حقہ ملحوظ رکھا جائے جن میں سے اوّل اور ضروری اخلاص نیّت ہے تو کچھ شک نہیں کہ اس کا نتیجہ ایک ایسا عظیم الشان امر ہے جس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں - اور یہی حقیقی صلاح و تقویٰ ہے جس کی ضرورت بار بار آیات قرآنیہ میں مذکور ہوئی ہے - روزہ کو ریاضت نفس میں جس قدر دخل ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں اور اس کی تہ میں جو خوبیاں پوشیدہ ہیں ان کو سوائے ایک خالص الایمان آدمی کے کوئی نہیں سمجھ سکتا - یہ تو ظاہر ہے کہ خداوند کریم اپنے سب بندوں پر سب سے بڑھکر مہربان ہے - اس لئے ممکن نہیں کہ جہاں ہم اس کو کامل الحکمۃ اور وسیع الرحمۃ تسلیم کرتے ہیں ہیں کوئی ایسا حکم دے جو بے نتیجہ اور موجب تکلیف ہو - اور نہ ہی اس کو کوئی ذاتی فائدہ ہماری تکلیف میں مدنظر ہے - وہ غنی ہے اُسے ہماری عبادات کی کیا پروا

وہ حمید ہے اُسے ہماری نمازوں کی کیا ضرورت ؟ بلکہ اس نے محض اپنی رحمتِ کاملہ اور حکمت، بالغہ سے ہمیں ہماری ہی بہتری کے لیے جناب سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے چند باتیں بتلائی ہیں جن کو بظاہر نا عاقبت اندیش جو محض عیش پرستی ہی کو انسانی زندگی کا اعلےٰ مقصد تصوّر کئے بیٹھے ہیں اپنے حق میں بوجھ اور باعث زحمت خیال کرتے ہیں۔ اِس کی ادنیٰ اور روزمرّہ چشم دید مثال یہ ہوسکتی ہے کہ ڈاکٹر اپنی تجویز طبی کے مطابق کسی شخص پر عمل جراحی کرتا ہے۔ جس کو بظاہر مریض کے حق میں موجبِ تکلیف خیال کیا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت کوئی سمجھدار آدمی یہ نہیں کہیگا کہ ڈاکٹر مریض کے حق میں دشمنی اور بدخواہی کر رہا ہے۔ کیونکہ اگر ڈاکٹر ایسا نہ کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہو کہ مریض مرجائے۔ اِس لئے عبادات شرعیہ کو موجب تکلیف سمجھنا اور بظاہر عارضی تکلیف سے جی چُرا کر عاقبت کے دائمی ہولناک عذاب میں مُبتلا ہونا کونسے عاقل کا کام ہوسکتا ہے ؟ ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ روزہ کی مشروعیت دیگر فرائض کی طرح صرف ریاضت نفس کے لئے قرار پائی ہے جو بالآخر اُمور عقلیہ اور لذّات روحانیہ کا موجب ہوتی ہے۔ تصفیہ و تزکیۂ باطن کے لئے روزہ اکسیر ہے مگر اِس کی خوبی کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اِس کو عبادت سمجھ کر بجا لاتے ہیں۔ جو لوگ حیوانوں کی طرح شب و روز شکم پروری اور عیش پرستی کے عادی ہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کے لئے روزہ وبالِ جان ہو۔ چنانچہ ماہ رمضان کی تشریف آوری کا نام سُن کر اُنکے دِل منقبض ہونے لگتے ہیں۔ مگر جنھوں نے اِس کی روحانی کیفیات سے کچھ بھی حصّہ لیا ہے ان سے دریافت کیجیے کہ یہ عارضی اور نام نہاد تکلیف ان کو کس قدر مسرت بخشتی ہے ! اور کس قدر فضول اشغال اور دیگر منہیات اُن سے چھوٹ جاتے ہیں۔ اور باایں ہمہ اِس سے تمدّنی ضرورتوں میں کسی قسم کا خلل نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ کوئی پست خیال یہ کہنے لگے کہ روزہ ضعف اور نقاہت پیدا کرکے

. . . .

آدمی کو کاروبار سے روک دیتا ہے - سو ایسے شخص کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حُسنِ ارادت اور صدقِ نیت کے سامنے یہ خیال خاک بھی وقعت نہیں رکھتا - یہ خیال اس امر کا نتیجہ ہے کہ تم نے حقیقتِ عبادت کو نہیں سمجھا اور نفس کو عیش پرستی کا عادی بنا رکھا ہے - ایسے بھی مردانِ خدا ہیں جو دن بھر کام میں لگے رہتے ہیں اور ساتھ ہی روزہ بھی رکھتے ہیں اور وہ اِس خفیف تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتے - اور بصورتِ معذوری شریعت نے جبر بھی نہیں کیا - ہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ روزہ کس طرح نفس کے مطیع کرنے اور اُسکو قابو میں لانے کا ذریعہ ہو سکتا ہے - سو جو شخص گناہ کی حقیقت اور اس کے بواعث کو سمجھ سکتا ہے وہ جانتا ہے کہ قوائے انسانی کا قوی العمل ہونا اِن قوا کی صحت اور قوت پر موقوف ہے - ظاہر ہے کہ بلا قید اکل و شرب سے جب نفس کو روک دیا جائیگا تو قوا کی روشِ عمل میں بھی کسی قدر کمی واقع ہو جائے گی اور جذباتِ جوانیہ کے جوش میں ایک گونہ رکاوٹ عائد ہوگی - اور یہ امر ذکرِ الٰہی کا واسطہ بن کر روزہ دار کو لذتِ معرفت کی طرف کھینچ لائیگا - اور یہ جو بعض آثار میں آیا ہے کہ اَلْجُوْعُ طَعَامُ الْاَنْبِیَآءِ (بھوک انبیا علیہم السلام کا کھانا ہے) اِس سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ انبیا نفس پرستی سے بالکل پاک ہوتے ہیں بلکہ انہیں اکل و شرب وغیرہ اُمور سے اُسی قدر تعلق ہو سکتا ہے جس سے جسمانی زندگی کا سلسلہ قائم رہ سکے - اِس لئے وہ سب سے بڑھکر رُوحانی کمالات کے مالک ہوتے ہیں - بھلا یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ کوئی خناس کثرتِ اکل و شرب سے ہر وقت خرِ کناس[1] کی طرح لدا پھرے - ایسے آدمی کو جس کا اہم مقصد اکل و شرب ہو نورِ معرفت کیا خاک حاصل ہو گا بلکہ انواع و اقسام کی بیماریاں اسی ایک اکل و شرب کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتی رہیں گی

---

[1] بھنگی کا گدھا جو نجاست کشی کا کام دیتا ہے ۱۲ منہ

اندرون از طعام خالی دار — تا دراں نورِ معرفت بینی

تہی از حکمتی بعلتِ آں — کہ پُری از طعام تا بینی۔

حق یہ ہے کہ جو لوگ انوارِ حکمت کو مشکوٰۃِ نبوّت سے حاصل کرتے ہیں وہ اپنے منعمِ حقیقی کے حکم کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کو کبھی نظرانداز نہیں کرتے۔ اسی مضمون کو جناب پیغمبر علیہ السلام نے ایک موقع پر یوں ظاہر فرمایا ہے اَلْبِطْنَةُ رَأْسُ کُلِّ دَآءٍ[1]۔ اور پھر دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا کُلُوْا فِی بَعْضِ بُطُوْنِکُمْ تَصِحُّوْا[1]۔ الغرض انبیاء علیہم السلام اور جو لوگ اُن کے آثارِ قدم پر چلتے ہیں بالاتفاق پیٹ بھر کے کھانے کو بُرا سمجھتے رہے ہیں۔ یہ تو ایک موٹی سی بات ہے کہ جب پیٹ غیر معمولی بھر جائے تو علاوہ ازیں کہ ایسا شخص کسی جسمانی بیماری کا محلِ خطر ہو تفکّر و تدبّر اور مسائلِ دقیقہ میں غور و خوض نہیں کر سکتا حواسِ خمسہ کُند ہوئے اور جمائی پر جمائی آنے لگی۔ نیند نے غلبہ کیا اور اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ نماز اور دیگر اُمورِ ضروریہ بالکل چھوڑنے پڑے۔ چارپائی پر لیٹا اور اُس وقت کروٹ لی جبکہ آفتاب نکل آیا۔ بھلا ایسی حالت میں ایسے شخص سے کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ فرائضِ انسانی کو خواہ دینی ہوں یا دُنیوی بجا لائیگا؟

موجودہ روزہ بتدریج مفروض ہوا

مؤلف تفسیر احمدی نے روزہ کی تدریجی کیفیّت کو حسبِ ذیل لکھا ہے کہ شروعِ اسلام میں صرف ایک دن کا روزہ فرض تھا۔ یعنی شریعت موسوی کے مطابق صرف یومِ عاشورا کے روزہ کا دستور تھا۔ بعد میں ہر ماہ کے تین دن یعنی تیرھویں۔ چودھویں اور پندرھویں تاریخ کو روزہ کے لئے خاص کر دیا گیا۔ ان ایّام کو ایّامِ بیض کہتے ہیں۔ بعد ازاں بجائے ہر سہ مذکورہ بالا تاریخوں کے ماہِ رمضان کو روزہ کے لئے مخصوص کیا گیا۔ مگر اس میں ہر

[1] پیٹ بھر کر کھانا تمام بیماریوں کی جڑ ہے ۱۲ منہ۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ پیٹ بھر کر کھانا تمام روحانی اور جسمانی بیماریوں کا اصل اصول ہے ۱۲ منہ۔ پیٹ کا کچھ حصہ بھرو اور کچھ خالی چھوڑ دو۔ اسی میں تمہاری صحت ہے۔ ہمارے ہاں بعض اصحاب پورا بھر کر بھی بس نہیں کرتے ۱۲ منہ

ایک شخص کو اختیار تھا کہ اپنی مرضی سے خواہ وہ روزہ رکھے یا بالعوض ایک دن کے نصف صاع گندم کسی مسکین کو دیدے۔ بعض بیچریوں نے ماہ رمضان کے روزہ فرض ہونے پر بھی یہی حکم لگایا ہے۔ مگر صاحب تفسیر رحمانی اور دیگر مفسرین نے اس کو رد کیا ہے۔ روزہ کی بجائے فدیہ کا ادا کرنا ہر ایک شخص کے لئے کسی نے تجویز نہیں کیا۔ صرف وہی لوگ اس حکم میں داخل ہیں جو غایت پیری اور ناتوانی کی وجہ سے روزہ رکھنے سے معذور ہیں۔ ایسے شخص کو شیخ فانی کہتے ہیں۔ جب لوگ روزۂ رمضان کے کسی قدر عادی ہو گئے تو اختیار مذکورہ بالا بھی واپس لے لیا گیا۔ اور روزہ ہر ایک کے لئے فرض قرار پایا۔ مگر قریباً آٹھ پہر کا روزہ رکھنا پڑتا تھا۔ یعنی غروب آفتاب سے عشاء تک افطار اور باقی تمام وقت روزہ۔ بعدازاں جب آیہ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ نازل ہوئی تو روزہ کا وقت طلوع فجر سے غروب آفتاب تک قرار پایا۔ اور پھر اسی پر روزہ کی فرضیت ہمیشہ کے لئے قائم ہوگئی ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ روزہ کا مذکورہ بالا تدریجی صورت میں ترقی کرکے فرض شرعی قرار پاتا بالکل دیگر احکام شرعیہ کے مطابق ہے۔ مثلاً نماز کے لئے پہلے کوئی وقت اور تعیین رکعات وغیرہ نہ تھی۔ مگر آہستہ آہستہ پنجگانہ فریضہ کی صورت میں قرار پائی۔ علیٰ ہذا حُرمتِ خمر ۔

بعض ملاحدہ کا روزہ کے متعلق ایک باطل خیال ملحدین روزہ کو منافی صحت خیال کرتے ہیں

یہ خیال صرف انہیں لوگوں کا ہے جو احکام شرعیہ کو ایک فرضی یا وہمی ضرورت پر مبنی کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ قوم کی ابتدائی حالت بجز ان شرعی پابندیوں کے درست نہیں ہوسکتی تھی۔ اب جبکہ مغرب کی طرف سے نئی ترقی کا ایک تلاطم خیز دریا بہتا ہوا تمام روئے زمین کو سیراب کر رہا ہے ان وحشیانہ رسوم کو بالکل ترک کر دینا چاہیے

روزہ کی نسبت ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صحت میں خلل پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کیوں حضرت جو لوگ گرمی کے دنوں میں جبکہ واقعی روزہ سے روزہ دار کو تکلیف محسوس ہوتی ہے روزہ رکھتے ہیں تو وہ اچھے بھلے ہٹے کٹے نظر آتے ہیں۔ اور آج تک ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کوئی شخص روزہ رکھنے سے بیمار ہوگیا۔ ہاں ایک عارضی معمولی ضعف کا پیدا ہوجانا تو کوئی بڑی بات نہیں اور روزہ رکھنے کا بڑا اہم مقصد بھی یہی ہے کہ قوائے بہیمیہ کے جوش کو کسی قدر کم کیا جائے اور اگر درحقیقت کوئی بیمار ہے تو شریعت اس سے مواخذہ بھی نہیں کرتی بلکہ اس پر قضا لازم ہے تو اس وقت ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ڈاکٹر نے یہ مشورہ دیا ہے۔ اوّل تو اس جواب سے ان لوگوں کی ایمانی طاقت کا اندازہ لگانا چاہیئے کہ احکامِ شرعیہ کے مقابل باآنکہ غیر معذور ہیں ڈاکٹر کی وہی تجویز کو زیادہ قابلِ وقعت سمجھتے ہیں۔ دوم میں ہرگز یقین نہیں کرسکتا کہ کوئی پابندِ شریعت دیسی ڈاکٹر ایک تندرست نوجوان کی نسبت روزہ سے بیمار ہونے کا خیال ظاہر کرے بلکہ کئی ایک ڈاکٹر صاحبان بڑے متقی اور پارسا موجود ہیں جو احکامِ شریعت کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں۔ اور اگر یہ خیال کسی یوروپین یا ہندو یا نیچری مسلمان ڈاکٹر کا ہے تو میرے نزدیک اس لغو خیال کو پاخانہ یا سنڈاس میں پھینک دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ منافیٔ شریعت ہے۔ یاد رکھو کہ شریعت ایک تندرست مسلمان کو کبھی معافی نہیں دیتی معافی کی صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ سفر اور بیماری۔ ہاں اگر کوئی شخص خود بے حیا ہوکر اپنے تئیں قابلِ معافی سمجھ لے تو یہ علیٰحدہ بات ہے۔ مگر یہ معافی شریعت کی طرف سے ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے اپنے نفس کی طرف سے سمجھی گئی ہے۔ جس کی نسبت قرآنِ مجید میں اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وارد ہوچکا ہے۔ کئی ایک نیچری مزاج لوگوں کا دستور ہے کہ روزہ نہیں رکھتے اور گھر میں پوشیدہ طور پر کھاپی لیتے ہیں اور باہر لوگوں کے سامنے روزہ ظاہر کرتے ہیں یعنی جھوٹ کا ایک زائد گناہ اپنے سر لیتے ہیں اور بعض تو

ایسے بے حیا ہیں کہ علی رؤس الاشہاد کھانا پینا شروع کر دیتے ہیں۔

ماہ رمضان اور روزہ کی فضیلت

ماہِ رمضان خیر و سعادت کا مہینہ ہے جس میں ایک ایماندار بہت سی حسنات کا ذخیرہ جمع کر سکتا ہے۔ مثلاً کثرتِ سجود و صدقہ۔ تلاوتِ قرآن شریف اعتکاف وغیرہ ایسے اُمور ہیں جو لازوما قوتِ بہیمیہ کے اثر کو کھو دیتے ہیں۔ اسی نکتہ کو جناب پیغمبرؐ نے حدیث ذیل میں بیان فرمایا ہے اِذَا كَانَ اَوَّلُ لَيْلَةٍ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّيَاطِيْنُ وَمَرَدَةُ الْجِنِّ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ النِّيْرَانِ فَلَمْ يُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ وَفُتِّحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ يُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ وَيُنَادِيْ مُنَادٍ يَا بَاغِيَ الْخَيْرِ اَقْبِلْ وَيَا بَاغِيَ الشَّرِّ اَقْصِرْ وَلِلّٰهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذٰلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ۔ اس حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جناب پیغمبرؐ نے ماہ رمضان کے پورا حق ادا کرنے کے لئے کس قدر ثواب عظیم کا پتہ دیا ہے۔ اور اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ مبارک مہینہ اہل ایمان کے کے لئے روحانی زندگی کا مہینہ ہے۔ البتہ اعتقاد صحیح اور قوتِ ایمان کی ضرورت ہے جو تمام حسنات کا ذریعہ ہیں مگر بداعتقاد کو اس سے خاک بھی حاصل نہیں۔ ایک حدیث قدسی میں حضور علیہ السلام فرماتے ہیں اَلصَّوْمُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ۔ یعنی خداوند کریم فرماتا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں بلا شرکت غیری روزہ دار کو اس کی جزا دیتا ہوں اس میں روزہ کے اعلےٰ درجہ کے ثواب کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ مِّنَ النَّارِ۔ یعنی روزہ دوزخ کی آگ سے بچنے کے لئے ڈھال ہے شاہ ولی اللہ صاحب کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں یوں لکھتے ہیں وَالصَّوْمُ حَسَنَةٌ عَظِيْمَةٌ[1]

[1] روزہ ایک بڑی بھاری نیکی ہے جو روزہ دار کی قوت ملکی (روحانی) کو قوی کرتی ہے اور اُسکی قوۃ بہیمی (حیوانی) کو کمزور بنا دیتی ہے اور آئینہ قلب کی صفائی اور نفسانی خواہشات کا زور توڑنے میں کسی چیز کو اس قدر دخل نہیں اور اسی امر کی طرف حدیث الصوم لی ۔۔ الخ میں اشارہ کیا گیا ہے روزہ اسی قدر گناہوں کو زائل کر دیتا ہے۔ جسقدر قوۃ بہیمی کمزور ہوتی ہے روزہ سے انسان کو عالم ملائکہ سے مشابہت پیدا ہوتی ہے سو قوۃ بہیمیہ کے ضعف پر یہ تعلق مشابہت پیدا ہوتا ہے ۱۲ منہ

يُقَوِّي الْمَلَكِيَّةَ وَيُضْعِفُ الْبَهِيْمِيَّةَ وَلَا شَيْءَ مِثْلُهُ فِي صَيْقَلَةِ وَجْهِ الرُّوْحِ وَقَهْرِ الطَّبِيْعَةِ وَلِذٰلِكَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَلصَّوْمُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ وَيُكَفِّرُ الْخَطَايَا بِقَدْرِ مَا اضْمَحَلَّ مِنْ سَوْرَةِ الْبَهِيْمِيَّةِ وَيَحْصُلُ بِهٖ تَشَبُّهٌ عَظِيْمٌ بِالْمَلٰئِكَةِ فَيُحِبُّوْنَهٗ فَيَكُوْنُ مُتَعَلَّقُ الْحُبِّ اَثَرَ ضُعْفِ الْبَهِيْمِيَّةِ...الخ

روزہ داروں میں اختلافِ مدارج

یہ تو عوام اہلِ اسلام کا روزہ ہے کہ وہ طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے مجتنب رہتے ہیں۔ مگر خاص بندگانِ خدا کا روزہ ہر ایک ممنوع امر سے مجتنب رہنے پر پورا ہوتا ہے۔ گو خارج از رمضان بھی ہر ایک قسم کی برائی سے بچے رہنا صفائے روح کے لئے شرط ہے۔ مگر ماہِ رمضان میں بالخصوص اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ تمام اعضاء کی محافظت کرنا چاہیے کہ وہ کسی ناجائز عمل میں حرکت نہ کریں۔ زبان کو ہر ایک قسم کے فحش۔ جھوٹ۔ غیبت وغیرہ سے اور کان کو ایسی باتوں کے سننے سے اور آنکھ کو ناجائز چیزوں کے دیکھنے سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ اہلِ دل ان دنوں اہلِ دنیا کی مجالس میں آمد و رفت کم کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاں سوائے لغو اور بیہودہ باتوں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص روزہ رکھتا ہے اور لغویات سے نہیں بچتا۔ اسے روزہ سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں۔ پھر فرمایا اگر کوئی تم سے جھگڑنے لگے تو اسے کہہ دو کہ میں روزہ دار ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ اور اس قسم کی باتیں باہم ضدین ہیں جس طرح کوئی شخص نماز میں صرف ظاہری طہارت پر زور دیتا ہے اور طہارتِ قلب کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اور وہ تصفیۂ باطن کی لذت کو نہیں پا سکتا۔ اسی طرح اس روزہ دار کی حالت ہے۔ جو بظاہر اکل و شرب وغیرہ سے تو بچتا ہے مگر دیگر ممنوعاتِ شرعیہ سے پرہیز نہیں کرتا۔ اس لئے وہ لذتِ روحانی کو ہرگز نہیں پا سکتا۔ بھلا خدا کو

کیا ضرورت پڑی کہ بھوکا مرنے پر کسی کو مجبور کرے جس میں خدا کا تو کیا فائدہ ہوگا خود اُس شخص کو بھی کچھ بہرہ نصیب نہیں - روزہ دار کو بڑی احتیاط کرنی چاہیئے کہ ناجائز نظر اور دِل میں بُرے خیال کے پیدا ہونے اور غیبت - فحش جھوٹ وغیرہ کے کہنے سُننے سے حتی الوسع بچا رہے - اور ایسا اوقات ذِکر یا تلاوت قرآن شریف میں مشغول رہے ۔

روزہ کے متعلق بعض ضروری احکام

(۱) ہلال رمضان اگر ۲۹ شعبان کو بوجہ ابر یا مطلع صاف نہ ہونے کے نظر نہ آئے تو دوسرے دن شک کی حالت میں روزہ نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ شعبان پورے تیس دن کا سمجھنا چاہیئے - اِسی طرح ۲۹ رمضان کو بھی اگر ایسی ہی حالت ہو تو تیس دن رمضان کے پُورے کرنے ہونگے ۔

(۲) شروع رمضان سے پہلے شعبان کے اخیر پر ماہِ رمضان سے متصل کسی قسم کا روزہ نہیں ۔

(۳) ہلال شوال کے متعلق دو عدل گواہوں کی شہادت ضروری ہے اور ہلال رمضان صرف ایک شاہد عادل کی شہادت سے بھی ثابت ہوتا ہے اور بعض آئمہ نے یہاں بھی دو عدل کی شہادت کو ضروری قرار دیا ہے ۔

(۴) اگر ایک شہر میں روئیت ہلال ہو جائے اور دوسرے شہر میں نہ ہو تو جس شہر میں نہیں ہوئی وہاں کے لوگوں پر روزہ واجب نہیں - کیونکہ ہر ایک جگہ کا مطلع علیحدہ علیحدہ ہوا کرتا ہے - اِس مسئلہ میں آئمہ کا اختلاف ہے مگر عموماً یہ بات بعید فاصلہ کے شہروں میں واقع ہوتی ہے ۔

(۵) افطار میں حتی الوسع جلدی کرنا چاہیئے اور اگر ہو سکے تو خرما سے ورنہ پانی کے چند جُرعہ سے افطار کرلے ۔

(۶) سحور ذرا دیر کرکے کھانا مستحب ہے یعنی طلوع فجر سے تھوڑی دیر پہلے - بعض وسواس زدہ طبیعتیں ذرا کچھ دیر ہوئی تو کھانا موقوف - مگر شریعت نے ایسا تشدد نہیں کیا - چنانچہ بعض آئمہ کے نزدیک فجر احمر یعنی سرخ فجر یا صبح صادق تک بھی سحور کا وقت آچکا ہے - اور ایک حدیث میں فجر مستطیر کا لفظ آیا ہے جس سے وہ وقت مراد ہے جبکہ سیاہی کے بعد سفیدی ظاہر ہو جائے ؛

(۷) سحری کھانا موجب ثواب ہے حدیث میں آیا ہے۔ فی السّحور بَرَکۃٌ ؛

(۸) سفر میں روزہ کے بارہ میں علماء نے اختلاف کیا ہے - مگر صحیح یہی ہے کہ اگر کوئی تکلیف یا حرج نہ دیکھے تو روزہ افضل ہے ورنہ افطار - بہرصورت مسافر کو شرعی اختیار بروئے نص قرآنی حاصل ہے - مجاہدین اور حاملہ یا شیر دہندہ عورت کو بھی اختیار افطار حاصل ہے ؛

(۹) کسی مرے ہوئے شخص کی طرف سے بھی جبکہ مرنے والا روزہ نہ رکھ سکا ہو روزہ رکھنا جائز ہے - جس طرح اس کا قرض دنیوی ادا کیا جا سکتا ہے - یہ حکم عام ہے - خواہ روزہ ماہِ رمضان کا ہو خواہ اُس نے نذر مان رکھا ہو ؛

(۱۰) پچھنے لگوانے اور قے کرنے اور احتلام سے روزہ فاسد نہیں ہوتا مگر اس مسئلہ میں بھی بعض آئمہ کا اختلاف ہے ؛

(۱۱) بھول کر کسی چیز کے کھانے پینے یا جماع کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا ؛

(۱۲) اگر عمداً ایسا کرے تو بعض کے نزدیک صرف قضا لازم آتی ہے اور دیگر بعض کے نزدیک قضا اور کفارہ ہر دو - اسکا کفارہ وہی ہے جو ظہار کے لئے قرآن مجید میں مذکور ہے ؛

(۱۳) مسواک کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا مگر بعض آئمہ دن کے پچھلے حصہ میں مکروہ کہتے ہیں ؛

(۱۴) سرمہ کا استعمال بعض کے نزدیک مکروہ ہے۔ مگر صحیح یہی ہے کہ کچھ حرج نہیں۔

(۱۵) اپنی عورت کا بوسہ لینے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا مگر جوان آدمی کے لئے پرہیز مولیٰ ہے۔

(۱۶) امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مذہب ہے کہ روزۂ رمضان۔ روزۂ نفل اور روزۂ نذر معین کے لئے نیت آدھا دن گذرنے پر بھی ہوسکتی ہے اور روزۂ قضا اور کفارہ اور نذر مطلق میں رات ہی سے نیت کرنا چاہئے مگر اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے۔ ہر ایک مذہب کے دلائل اپنے اپنے مواقع پر شرح وبسط سے مذکور ہیں۔

(۱۷) اگر نفلی روزہ ہو اور کوئی شخص دعوت پر بُلائے تو روزہ افطار کر دے۔ نذر قضا وغیرہ میں یہ حکم نہیں مگر امام ابوحنیفہؒ صاحب جائز نہیں رکھتے۔ بدلیل لَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ۔

(۱۸) جناب پیغمبر علیہ السلام عموماً ہر جمعہ کو روزہ کیا کرتے۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ صرف جمعہ کے دن روزہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ پہلے یا پیچھے ایک اور روزہ بھی ملا لینا چاہئے۔ مطلب یہ کہ صرف اکیلا جمعہ کا روزہ صحیح نہیں۔

(۱۹) یوم عرفہ کا روزہ موجب ثواب عظیم ہے مگر عرفات میں نہیں۔

(۲۰) یوم عاشورا کا روزہ موجب اجر جزیل ہے۔ قبل از صوم رمضان یہ روزہ واجب تھا۔ چونکہ یوم عاشورا میں اختلاف ہے۔ کیونکہ بعض نویں محرم کو اور بعض دسویں محرم کو قرار دیتے ہیں۔ اسلئے ہر دو دن روزہ کیا جائے تو اچھا ہے۔

(۲۱) ماہ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے موجب اجر عظیم ہیں متواتر ہوں یا متفرق۔

(۲۲) ہر دو عید اور عید اضحیٰ کے تین دن بعد کا روزہ منع ہے۔ ان تین دنوں کو ایام تشریق بولتے ہیں۔

(۲۳) دو دن یا تین دن متواتر روزہ رکھنا اور شام کو افطار نہ کرنا بلکہ رات کو روزہ ہوا اور دن کو بھی پھر تیسرے یا چوتھے دن افطار کیا جائے منع ہے کیونکہ یہ موجب ضعف ہے۔ جناب پیغمبرؐ ایسا کرنے سے مستثنے تھے۔ اِس صورت کو وصال بولتے ہیں ؞

(۲۴) اگر کوئی شخص جنب ہو تو فجر کے طلوع کرنے پر بھی نماز کے لئے غسل کر سکتا ہے اور روزہ فاسد نہیں ہوگا ؞

(۲۵) حیض و نفاس والی عورت کو ان ایام میں روزہ معاف ہے۔ مگر قضا لازم ہے ؞

(۲۶) عورت روزۂ نفل جبکہ شوہر اسکا گھر میں مقیم ہو بدون اجازتِ شوہر نہیں رکھ سکتی۔ مگر جب سفر میں ہو تو عورت کو اختیار ہے ؞

(۲۷) اگر کہیں مہمان ہو تو بدون اجازت صاحب خانہ روزۂ نفل نہیں کرنا چاہیئے ؞

(۲۸) اگر سفر جانا ہو تو گھر سے کھانا کھا کر جا سکتا ہے۔ گویا گھر ہی میں بہ نیت سفر معافی روزہ ہو سکتی ہے لیکن نماز میں قصر نہیں کر سکتا جب تک گھر سے باہر نہ آئے ؞

(۲۹) حقنہ اور سعوط یعنی ناک میں دوائی ٹپکانے سے روزہ جاتا رہیگا ؞

(۳۰) شیخ فانی یعنی ایسا بوڑھا جو روزہ کی طاقت نہ رکھتا ہو نصف صاع گندم یا پورا صاع غلّہ جو کافی روزہ مسکین کو بطور فدیہ دے سکتا ہے۔ لیکن اگر طاقت روزہ رکھتا ہو تو یہ درست نہیں ؞

(۳۱) مسافر اگرچہ رات کو نیت روزہ نہ کرے مگر صبح وقت زوال سے پہلے شہر میں آجائے تو اُسے روزہ کرنا چاہیئے۔ اور اگر صبح کو گھر میں بانیت روزہ موجود ہو

پھر سفر کو چل پڑے تو اُسے وہ روزہ پورا کرنا ہوگا ؎

(۳۲) حیض والی عورت اگر دن کے کسی حصہ میں فارغ ہو جائے تو باقی حصہ دن کا روزہ رکھے۔ اور اگر دن کے کسی حصہ میں حیض شروع ہو جائے اور عورت روزہ دار ہو تو اُسی وقت افطار کر سکتی ہے۔ مگر قضا لازم آئیگی ؎

(۳۳) بحالت شک غروبِ آفتاب افطار درست نہیں اور اگر ایسا کرے تو اُس پر قضا لازم ہوگی ؎

احکامِ مسجد

اسلام میں مسجد کی خاص عزت ہے۔ لغت میں اِس کے معنی ہیں ایسی جگہ کے جہاں سجدہ کیا جائے اور چونکہ یہ جگہ اسی لئے بنائی جاتی ہے کہ یہاں پر خدا کی عبادت کی جائے اِسلئے متبرک اور معظم سمجھی گئی ہے۔ اگر آپ کو اِس کی فضیلت سُننے کا شوق ہو تو آیئے ہم آپ کو خدائے پاک کی کلام مجید اور اُس کے رسول کریم کی احادیث شریف سے اِس شوق کو پورا کئے دیتے ہیں۔ مگر ایسے بیان کے سُننے کا مذاق ہونا شرط ہے۔ کیونکہ یہاں پر ظاہری عمارت کی شان و شوکت کو نقص و فضیلت میں دخل نہیں بلکہ باطنی اور روحانی اور شرعی شرافت کو قرآن شریف میں ہے۔ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ مسجدوں کا آباد کرنا یعنی ان کو تعمیر کرانا یا پہلے کی مرمت کرانا یا اُن میں آکر نماز پڑھنا اور اُن کو آباد رکھنا انہیں مسلمانوں کا کام ہے جو ہدایت یافتہ ہیں۔ گمراہوں کا کچھ کام نہیں ؎

پھر دوسری جگہ فرمایا۔ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ

ف ۱ بے شک خدا کی مسجدیں وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور سوا خدا کے کسی اور سے نہیں ڈرتے۔ بیشک یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہیں۔ ۱۲ منہ

تقوی القلوب - اِس آیت سے شعائر اللہ کی تعظیم پائی جاتی ہے اور مساجد منجملہ اُن مکانوں کے ہیں جنکی تعظیم کا حکم ہے - جیسے کعبہ - عرفات - مزدلفہ - صفا و مروہ وغیرہ - پس مسجدوں کی تعظیم کرنا خاص پرہیزگاروں کا کام ہے ✤

پھر فرمایا - وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْہَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِہَا اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَہُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْہَا اِلَّا خَائِفِیْنَ لَہُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ[2] - اِس سے معلوم ہوا کہ مسجدوں کو برباد کرنے والے اور ان میں ذکر سے منع کرنے والے دُنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ہیں ✤

احادیث اِس میں بکثرت ہیں ✤

(۱) حضرت عثمان رض سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے لئے مسجد بناتا ہے اُسکے لئے خدا جنّت میں گھر بناتا ہے ✤

(۲) ابوہریرہ رض سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے پیارے مکان مسجدیں ہیں اور سب سے بُرے مکان بازار ہیں ✤

(۳) ابوسعید خدری رض سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس شخص کو تم دیکھو کہ مسجد کی خدمت اور آبادی کرتا ہے تو اُس کے ایمان کی گواہی دو - کیونکہ خدا فرماتا ہے - اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ . . . الخ

(۴) بعض مسجدوں کی خاص عزت ہے - جیسا کہ ابن ماجہ نے انس بن مالک رض سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مرد کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا ایک ہی نماز کا ثواب ہے اور محلہ کی مسجد میں پڑھنا پچیس نماز کا ثواب ہے اور جامع مسجد

---

[1] جو شخص خدا کے نشانات کی تعظیم کرتا ہے تو بہتر ہے) کیونکہ انکی عزت کرنا پرہیزگاروں کا کام ہے ۱۲

[2] اِس شخص سے بڑھکر ظالم کون ہے جو خدا کی مسجدوں میں خدا کا نام لئے جانے سے روکدے اور اسکی بربادی کی کوشش کرے - یہ لوگ اس قابل نہیں کہ اس میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے - ان کے لئے دنیا میں ذلت اور آخرت میں بڑا عذاب ہے ۱۲ منہ

میں نماز پڑھنا پانچسو نماز کا ثواب ہے۔ اور بیت المقدس میں ایک نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اور بیت الحرام یعنی بیت اللہ میں نماز پڑھنے سے ایک لاکھ نماز کا ثواب ملتا ہے ؛

اللہ اکبر۔ فضائل تو مختصر طور پر آپ کو معلوم ہو گئے۔ اب ہم اس کے کچھ ضروری مسائل لکھتے ہیں۔ جن پر عام مسلمانوں کو پابند ہونا چاہیئے۔ اور اکثر لوگ ان سے ناواقف ہیں ؛

(۱) مسجد میں جُنب اور حیض والی اور نفاس والی عورت کو جانا منع ہے +

(۲) مسجد کو نجاست وغیرہ سے پاک صاف رکھنا چاہیئے ؛

(۳) جنازہ کے لئے میّت کا داخل کرنا منع ہے۔ ہاں اگر بارش وغیرہ کا عذر ہو تو خیر +

(۴) مسجد میں تھوکنا۔ ناک صاف کرنا۔ وضو کرنا۔ مضمضہ وغیرہ مکروہ ہے۔ ہاں جبکہ کوئی جگہ اس کام کے لئے خاص مقرر ہو اور اس میں نماز نہ پڑھی جاتی ہو جیسا کہ عموماً مساجد میں ہوتا ہے تو خیر۔ جو شخص تھوکے اس کا کفارہ یہ ہے کہ اُس کو مٹی سے ڈھانک دے +

(۵) مسجد میں کوئی کام مثلاً درزی کا کام کرنا یا اُجرت کی کتابت اور بچوں کو اُجرت پر پڑھانا مکروہ ہے مگر مسجد کی حفاظت کے لئے بچوں کا پڑھانا جائز ہے ؛

(۶) جب مسجد میں آؤ تو پہلے دایاں پاؤں اندر رکھو اور یہ دُعا پڑھو اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ اور جب باہر نکلو تو پہلے بایاں پاؤں باہر نکالو اور پڑھو اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ۔ بعض روایت میں یوں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم جب مسجد میں داخل ہوتے تو یہ کہتے۔ رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ اور جب نکلتے تو یہ کہتے۔ رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ وَافْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ فَضْلِكَ +

(۷) مسجد میں آکر وضوء کرکے بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز نفل پڑھو۔ اور اگر بار بار مسجد جانے کا اتفاق ہو تو دن بھر میں ایک دفعہ ہی پڑھنا کافی ہے

(۸) ماتم کے لئے مسجد میں بیٹھنا مکروہ ہے۔ ہاں نکاح کی مجلس کا وہاں بیٹھنا مستحب ہے :

(۹) مسجد میں اور اُس کی چھت پر جماع کرنا یا پاخانہ کرنا حرام ہے :

(۱۰) مسجد میں بُودار چیز کھا کر جانا منع ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جو شخص پیاز وغیرہ کھائے تو وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے :

(۱۱) مسجد میں بیع و شراء ناجائز ہے۔ مسافر کے سوا کھانا۔ پینا اور سونا اور دنیاوی کاروبار یا باتیں کرنا منع ہے۔ بعض حدیث میں ہے کہ مسجد میں باتیں کرنے سے نیکیاں یُوں جاتی رہتی ہیں جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ افسوس کہ عموماً مسلمان مسجدوں میں فضول باتوں سے نہیں رُکتے :

(۱۲) مسجدوں میں چلّانا خصوصاً منع ہے۔ اور خاصکر مسجد نبوی صلے اللہ علیہ وسلم میں ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دو شخصوں کو جو طائف کے رہنے والے تھے مسجد نبوی میں بُلایا اور کہا کہ تم کہاں کے ہو؟ اُنہوں نے کہا کہ طائف کے رہنے والے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم مدینہ کے ہوتے تو میں تم کو مارتا۔ کیونکہ تم رسول اللہ صلعم کی مسجد میں چلّاکر باتیں کرتے ہو :

(۱۳) درجہ میں سب سے بڑھکر مسجد حرام ہے پھر مسجد مدینہ۔ پھر مسجد بیت المقدس پھر جامع مسجد۔ پھر محلّہ کی مسجد۔ پھر شارع عام کی مسجد۔ پھر گھر کی مسجد۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے روضہ اور منبر میں جنّت کا ایک ٹکڑا ہے :

(۱۴) گھروں میں بھی مسجد کی ایک جگہ خاص کرنی چاہیئے تاکہ نوافل پڑھے جائیں اور عورتوں کے کام آئے :

(۱۵) مسجدوں کو معمول سے زیادہ خوبصورت بنانا مکروہ ہے۔ حضرت ابن عباس رض رسول اللہ صلعم سے راوی ہیں کہ مجھ کو مسجدوں کی زینت کرنے کا حکم نہیں ہُوا۔ اس پر ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ تم لوگ مسجدوں کو ایسی خوبصورت بناؤ گے جیساکہ یہود و نصاریٰ بناتے ہیں +

(۱۶) مسجد کی دیواروں سے تیمّم کرنا بظاہر جائز ہے۔ ممانعت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مگر بعض فقہانے منع لکھا ہے ؛

(۵) عید الفطر اہل اسلام کے ہاں دو بڑے تہوار منائے جاتے ہیں اور یہ کچھ اِسلام پر ہی موقوف نہیں۔ بلکہ ہر ایک مذہب و دین میں عیدوں کے دِن مقرّر ہیں۔ اور اِن دنوں کو متبرّک سمجھ کر ان میں خوشی منائی جاتی ہے مگر سبحان اللہ اسلام نے اِن دنوں میں اس خوشی سے جس میں لہوولعب اور بیہودہ اورلغو کھیلیں ہوتی ہیں۔ اپنے ان تہواروں کو پاک رکھا اور اس میں بھی اسلامی عظمت اورخدا کی توحید و عبادت کا اعلان نہ چھوڑا۔ اِس کی اصل یہ ہے کہ ابو داؤد نے حضرت انس رض سے روایت کی ہے کہ جب حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ مدینہ کے لوگ سال میں دو دفعہ جمع ہوکر کھیل تماشا اور عیش و عشرت کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دِن کیسے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم جہالت کے زمانہ میں یعنی قبل از اسلام ان دِنوں میں کھیلا کرتے تھے۔ تب رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ خدانے تم کو ان دنوں سے بہتر دِن دیدئے ہیں اور وہ دِن عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے ہیں۔ اِن دِنوں میں عبادت کو لازمی قرار دیا گیا اور یہ دونوں دِن شعائرالاسلام میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور اِن کی عزّت وحرمت مسلمانوں کا فرض ہے وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ۔ اور شعائراللہ کی عظمت یہی ہے کہ حکم شریعت کے مطابق ان کے تمام متعلقہ احکام

کو سرانجام دیا جائے:

سبحان اللہ۔ کیا پاک مذہب ہے کہ اس کی خوشی منانے کے تیوہار بھی عبادت پر مشتمل ہیں۔ جبکہ دیگر اقوام کے تیوہار عموماً نفس پرستی اور ہر ایک قسم کی لغویت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اسلام نے نفس پرستی کے رُو سے کسی امر کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ جن امور سے شریعت حقہ نے روک دیا ہے۔ ان میں ضرور کسی نہ کسی پہلو میں نفس پرستی کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ عید الفطر کا دن جو ایک ماہ کے بعد افطار کا پہلا دن ہوتا ہے اسلام پاک نے بغرض اظہار سپاس مقرر کیا ہے جس سے ہر ایک شخص جو عید کو محض تنعم پروری کا دن نہ سمجھے ایک روحانی لذت کا احساس کرسکتا ہے کیونکہ شریعت کے ہر ایک حکم کی بجا آوری سے دل میں ایک تازہ نور ایمان پیدا ہوتا ہے اچھا کھانا۔ اچھا پہننا۔ اقارب واحباب سے ملاقات کرنا۔ بغرض اتحاد و محبت دوسروں کے ہاں کھانا بھجوانا اور دوسروں کی طرف سے بھیجنے والے کے گھر میں آنا صبح اُٹھتے ہی غسل کرنا۔ صدقہ دینا۔ نماز پڑھنا وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے ہماری دینی اور دنیوی اغراض کی نہایت عمدہ طور پر تکمیل ہوتی ہے:

عید الفطر کے موٹے موٹے احکام

(۱) اس دن کا غسل مسنون ہے:

(۲) ستھرا لباس پہننا اور بوئے خوش کا لگانا مستحب ہے:

(۳) صدقہ نماز سے پہلے ادا کرنا چاہئے۔ بعد میں ادا کرنے سے صدقۂ فطر تطوع ہوگا نہ صدقۂ فطر۔ یعنی واجب سے نفل بن جائیگا:

(۴) بعض نے صدقہ فطر کو فرض لکھا ہے اور بعض نے واجب۔ بہرصورت وجوب میں کسی کو کلام نہیں۔ صحیحین میں یوں وارد ہوا ہے اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِصَدَقَۃِ الْفِطْرِ۔ یعنی آپ نے صدقۂ فطر ادا کرنے کا حکم دیا:

(۵) صدقۂ فطر مرد۔ عورت۔ چھوٹے۔ بڑے۔ آزاد۔ غلام۔ سب پر واجب ہے ؛

(٦) جو بچہ عید الفطر کی صبح سے پہلے پیدا ہوا ہو اُس پر بھی واجب ہو جائیگا؛

(۷) صدقۂ فطر عید الفطر سے ایک دو دن پہلے دیدینا بھی جائز ہے۔ کیونکہ بحکم آیۂ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ نیک کام میں جلدی کرنا بہتر ہے۔ مگر مناسب یہی ہے کہ عید الفطر کی صبح کو سویرے قبل از نماز عید ادا کرے کیونکہ مساکین کو اگر صبح سویرے مل جائے تو انہیں بھی اغنیاء کے ساتھ مل کر کھانا اور نماز ادا کرنا نصیب ہو جاتا ہے۔ ایک صحیح حدیث میں طُهْرَةٌ لِلصَّائِمِ وَطُعْمَةٌ لِلْمَسَاكِينِ الفاظ وارد ہیں۔ یعنی صدقۂ فطر روزہ دار کے لئے پاکی ہے۔ ہر ایک قسم کی لغو و فحش سے جو روزہ میں اس سے وقوع میں آئے ہوں اور مسکینوں کے لئے کھانا ہے۔ جس سے انہیں بھی اغنیاء کے ساتھ اس عام خوشی میں شریک ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے اَغْنُوْهُمْ عَنِ الطَّوَافِ فِي هٰذَا الْيَوْمِ۔ سبحان اللہ۔ کیا ہمدردی ہے۔ ذرا غور کرنے سے اِس صدقہ کی ضرورت ہر ایک شخص پر واضح ہو سکتی ہے۔ مع ہذا غسل اور تبدیل لباس اور صدقہ کا ادا کرنا اور پھر نماز کے لئے عامۂ اہل اسلام کا اکٹھا ہونا ایک اعلیٰ روحانیت کا اثر ایماندار کے دِل میں پیدا کرتا ہے کیونکہ ظاہری اور باطنی طہارت پر مشتمل ہے ؛

(۸) صدقۂ فطر ایسے شخص پر واجب نہیں جو غنی نہ ہو۔ یہاں غنی سے مراد ایسا شخص ہے جو اپنے مکان۔ لباس۔ اثاث البیت۔ گھوڑے۔ ہتھیار۔ خدمتگار۔ غلام کے علاوہ صاحب نصاب ہو یعنی ضروریات مذکورہ بالا کے علاوہ اِس قدر مال کا مالک ہو کہ اِس پر زکوٰۃ سال کے گذرنے پر واجب ہو جائے۔ مگر جس طرح زکوٰۃ کے لئے ایسا مال ایک شرط ہے جو بڑھوتری ہو سکے اور پورا سال گذرے صدقۂ فطر

کے نصاب کے لئے یہ شرط نہیں۔ یہ مال خواہ کسی قسم کا ہو اور خواہ اس پر سال بھی نہ گذرا ہو البتہ مقدار نصاب کے برابر ہو۔ امام شافعی رح اور بعض دیگر فقہا ایسے شخص پر بھی صدقۂ فطر واجب قرار دیتے ہیں جو صرف ایک دن کے نفقہ سے زیادہ کا مالک ہو اور اگر صرف ایک دن رات کے لئے ہی نفقہ رکھتا ہو تو اس صورت میں وجوب ساقط ہے۔ دلائل کتب میں اپنے اپنے موقعہ پر لکھے ہوئے ہیں ؛

(۹) جس شخص پر صدقۂ فطر واجب ہے اُس کو زکوٰۃ لینا حرام ہے ؛

(۱۰) صدقۂ فطر چھوٹے بچوں اور خدمتی غلاموں کی طرف سے باپ اور آقا ادا کریں ؛

(۱۱) بیوی کی طرف سے امام صاحب کے نزدیک ادا کرنا واجب نہیں بیوی اپنے مال سے ادا کرے مگر دیگر آئمہ کے نزدیک واجب ہے۔ بڑے بچوں کی طرف سے بھی باپ پر واجب نہیں ؛

(۱۲) اگر غلام کافر ہو تو بھی آقا پر واجب ہے کہ اُس کی طرف سے صدقہ ادا کرے مگر بالعکس نہیں ؛

(۱۳) افضل یہی ہے کہ اُن اشیاء میں صدقہ ادا کیا جائے جن میں خود پیغمبر صلعم نے ادا کیا ہے اور وہ اشیاء یہ ہیں۔ گیہوں۔ جَو۔ آٹا۔ ستّو۔ انگور۔ خُرما ؛

(۱۴) اگر گیہوں۔ آٹا۔ ستّو۔ انگور میں ادا کرے تو نصف صاع ادا کرنا ہوگا۔ اور اگر جَو یا خُرما میں ادا کرے تو پورا صاع ؛

(۱۵) جَو کا آٹا یا ستّو اور گیہوں کا آٹا یا ستّو گیہوں سمجھے جائینگے ؛

(۱۶) اگر مناسب سمجھے تو نقد قیمت بھی ادا کر سکتا ہے۔ بعض حالات میں نقد قیمت زیادہ موزوں ہے کیونکہ مسکین اُسے اپنی حسب مرضی صرف کر سکتا ہے ؛

(۱۷) صاع کی مقدار میں آئمہ کا اختلاف ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ آٹھ رطل عراقی

یا چار مُد کے برابر ہوتا ہے۔ جس کو ہمارے ہاں مروجہ سیر کے پیمانہ میں اڑھائی سیر[1] سمجھنا چاہیئے۔ اڑھائی سیر کا وزن کچھ زیادہ ہے مگر احتیاطاً اس زیادتی کا کوئی ڈر نہیں۔ بلکہ اچھی بات ہے کیونکہ وہ زیادتی صدقہ تطوع میں داخل ہے ﴿

(۱۸) اس صدقہ کو مختلف محتاجوں پر تقسیم بھی کر سکتا ہے ﴿

(۱۹) مستحق و محتاج کی خوب چھان بین کرنا چاہیئے۔

(۲۰) عید الفطر کو صبح سویرے کھانا کھائے اور عید الاضحیٰ کو نماز سے فارغ ہو کر ﴿

(۲۱) نماز عید واجب ہے اور بعض آئمہ نے سُنت کہا ہے ﴿

(۲۲) یہ نماز مصلائے شہر میں امام کے ساتھ ادا کرنی چاہیئے ﴿

(۲۳) نماز عید سے پہلے کسی قسم کے نوافل مصلےٰ میں ادا نہ کرے ﴿

(۲۴) اس نماز کا وقت دو نیزہ آفتاب کے اُٹھنے سے قبل از زوال تک ہے ﴿

(۲۵) یہ نماز دو رکعت ہے۔ جب تکبیر تحریمہ ہو جائے تو سُبحَانَکَ اللّٰھُمَّ پڑھے اور تین تکبیریں کہے۔ پھر حسب معمول رکعت کو پورا کرے۔ اور دوسری رکعت کے لئے اُٹھے۔ فاتحہ اور سورۃ کو ختم کر کے پھر تین تکبیریں کہے اور پھر چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع کرے۔ پھر حسب معمول نماز کو پورا کرے۔ بہتر ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ اعلیٰ اور دوسری میں غاشیہ پڑھے۔ حنفاء کا معمول تو یہی ہے۔ مگر بعض آئمہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سات تکبیریں علاوہ تکبیر تحریمہ کے اور دوسری میں پانچ مگر بعض آئمہ کے نزدیک پہلی رکعت میں سات تکبیریں قبل رکوع علاوہ تکبیر رکوع کے وارد ہوئی ہیں ﴿

(۲۶) تکبیر کے وقت ہاتھ کانوں تک اُٹھائے ﴿

(۲۷) نماز کے بعد امام دو خطبے پڑھے جس میں احکام صدقہ وغیرہ عام لوگوں کو بتلائے۔ خُطبہ کا سُننا بہت ضروری ہے۔ اکثر لوگ بغیر سُنے بھاگ نکلتے ہیں۔ یہ منع ہے ﴿

[1] لیکن ایک محقق نے تحقیق کیا ہے کہ صاع کی صحیح مقدار ۶ تولہ کم تین سیر ہوتی ہے سو نظر بہ احتیاط تین سیر ہی سمجھنا چاہیئے مگر ایک تحقیق کے مطابق صاع کی مقدار پونے چار سیر ہے۔ لیکن پہلی تحقیق اقرب الی الصحت معلوم ہوتی ہے۔ منہ

(۲۸) اگر نماز عید فوت ہو جائے تو قضا نہیں پڑھ سکتا ۔

(۲۹) اگر رات کو ہلال کسی وجہ سے نظر نہ آیا ہو اور صبح زوال کے بعد ہلال کی شہادت امام کے سامنے ہو جائے تو نماز عید اس سے اگلے دن ادا کی جائیگی ۔ اس بارہ میں حدیث آ چکی ہے ۔

(۳۰) نماز کے لئے جاتے وقت جس راستہ سے جائے اس کو واپسی پر بدل دے اور آتے جاتے راستہ میں تکبیریں کہے ۔ اور تکبیر یہ ہے ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ ۔

(۳۱) نماز پڑھنے کے لئے پا پیادہ جانا چاہیئے ۔

(۲) عید الاضحیٰ

عید الاضحیٰ بہ نسبت عید الفطر کے بہت بڑا تیوہار ہے ۔ کیونکہ یہ وہ دن ہے جبکہ اس سے ایک دن پہلے لاکھوں بندگانِ خدا یعنی تمام روئے زمین کے چیدہ چیدہ اور مالدار مسلمان مکہ معظمہ کے اُس میدان میں جمع ہوتے ہیں جس کو عرفات کہا جاتا ہے ۔ اور جہاں اس وحدہٗ لاشریک کا ذکر بے شمار مسلمانوں کے دل و دماغ و زبان پر آتا ہے ۔ سبحان اللہ یہ کیسا مبارک میلہ ہے جس سے دنیا کے بڑے بڑے جلسوں اور نمائشوں کو کوئی نسبت نہیں ۔ کیونکہ اُن میں نفس پرستی اور اس میں خدا پرستی اور ان میں خدا سے غفلت اور اس میں خدا کی عظمت پائی جاتی ہے ۔ ان میں حصول لذائذ دنیاوی اس میں شمول فوائد اُخروی ۔

علاوہ اس متبرک جگہ کے ہر ایک شہر اور قصبہ میں اس عید کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے ۔ علاوہ عید کے قربانی دیجاتی ہے جو بجائے خود اسلامی شعار سمجھی جاتی ہے ۔

قربانی

قربانی بھی قدیمی دستور چلا آتا ہے ۔ ہر ایک مذہب میں اس کا دستور ہے جانوروں کا بُتوں کے نام پر چھوڑنا ۔ اُن کے نام پر ذبح کرنا یہ تو بُت پرستوں میں مروج ہی تھا ۔ پہلے زمانہ میں قربانی کی مقبولیت کی یہ صورت تھی کہ جو

شخص کوئی جانور یا کوئی اور شے خدا کے راہ میں دینا چاہتا تھا اس کو آسمانی آگ آکر کھا جایا کرتی تھی - اور جس کی قربانی مقبول نہ ہو اُس کو . . . آسمانی آگ نہ جلاتی - بلکہ جانور کھا جاتے - چنانچہ ہابیل وقابیل کا قصہ مشہور ہی ہے ؛

در اصل قُربانی کا ذبح کرنا اسلام میں جو مروّج ہوا تو یہ ابراہیم علیہ السلام کی سُنت ہے - جن کو خواب میں حکم ہوا کہ سب سے پیاری چیز قربان کرو - آپ نے بہت سے اونٹ قربانی کیے - پھر حکم ہوا - پھر اونٹ قربان کیے - پھر حکم ہوا کہ خاص اپنے بیٹے کو قربان کرو - اس پر آپ نے حکم مانا اور اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کے لیے میدان میں لے گئے اور خدا کے حکم کو بجالائے - مگر وہاں تو صرف امتحان ہی تھا - چھری نے ایک بال بھی نہ کاٹا - آخر جنت سے فرشتہ ایک دُنبہ لایا اور کہا کہ اس کو ذبح کرو غرض یہ وہی سُنت ابراہیمی ہے - چنانچہ فرمایا وفدیناہ بذبح عظیم وترکنا علیہ فی الآخرین - خدا کو قربانی کا خون یا گوشت نہیں پہنچتا بلکہ اس کو تقویٰ اور فرمانبرداری اور اخلاص نیت پسند ہے ؛

اب ہم مختصراً عیدالاضحیٰ اور قربانی کے احکام لکھتے ہیں - عیدالفطر کے بیان میں بھی لکھ آئے ہیں - پھر مختصراً اعادہ کرتے ہیں ؛

احکام عیدالاضحیٰ

(۱) عیدین کی نماز واجب ہے ؛

(۲) عید کے دن غسل اور مسواک کرنا - عمدہ کپڑے پہننا - انگوٹھی پہننا - خوشبو لگانا اور عیدگاہ تک پیدل چل کر جانا اور ایک راستہ سے جانا دوسرے راستے سے واپس آنا سُنت ہے - اگر کوئی سواری پر جائے تب بھی جائز ہے ؛

(۳) عیدالاضحیٰ کے دن عید کی نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھانا سُنت ہے اور بہتر ہے کہ قربانی کا گوشت کھایا جائے - اور اگر کوئی پہلے کھالے تو جائز ہے ؛

(۴) نماز عید جنگل میں جا کر پڑھنا مسنون ہے گو شہر میں جامع مسجد ہو ؛

(۵) چلتے وقت راستہ میں تکبیریں باآوازِ بلند پڑھنا چاہیئے۔ تکبیر یہ ہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ ؂

(۶) یہی تکبیر عرفہ یعنی ۹- ذوی الحجہ کی صبح کی نماز کے بعد جو جماعت سے ادا کیگئی ہو امام و مقتدی پر آخر ایامِ تشریق تک یعنی ۱۳- ذوی الحجہ کی عصر کی نماز تک ہر نماز کے بعد کہنی واجب ہے ؂

(۷) جو شرائط جمعہ کے وجوب کے ہیں وہی عید کے ہیں - فرق یہ ہے کہ جمعہ میں خطبہ نماز سے پہلے ہوتا ہے اور عید میں خطبہ نماز کے بعد ہوتا ہے اور بدوں خطبہ کے نماز عید ہوجاتی ہے ؂

(۸) نماز پڑھنے کا وہی طریق ہے جو عید الفطر کا اور جو وقت اُسکا ہے - وہی وقت اِس کا ہے یعنی سورج نکلنے کے بعد سے زوال تک مگر بہتر یہ ہے کہ یہ عید جلدی پڑھی جائے - کیونکہ بعد میں قربانی کرنی ہوتی ہے ؂

(۹) اوّل تکبیر تحریمہ کہہ کر ہاتھ باندھے جائیں اور سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ ۔ ۔ ۔ الخ پڑھا جائے - پھر تین تکبیریں ہاتھ کانوں تک اُٹھا کر اور چھوڑ کر کہی جائیں - ہر تکبیر کے بعد تین تسبیح کی مقدار سکوت کیا جائے - تیسری خالی تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھے جائیں اور امام قرأت پڑھے اور جب دوسری رکعت پڑھے تو تین خالی تکبیریں بعد قرأت ہاتھ کانوں تک اُٹھا کر کہی جائیں اور چوتھی بلا ہاتھ اُٹھانے کے تکبیر رکوع کہہ کر رکوع میں جائیں - گویا چھ تکبیریں زائد ہوئیں اور دو پہلی رکعت میں اور ایک دوسری رکعت میں اصلی ہیں ؂

(۱۰) گھر میں آکر بعد نمازِ عید چار رکعت نفل پڑھنا مستحب ہے ؂

(۱۱) امام کو چاہیئے کہ خطبہ میں لوگوں کو عید اور قربانی کے احکام سنائے ؂

قربانی کے مسئلے

(۱) قربانی واجب ہے اس شخص پر جو مالدار ہو جس طرح صدقہ فطر واجب ہے

(۲) قربانی کی فضیلت بہت ہے +

(الف) زید ابن ارقم رضی سے مروی ہے کہ صحابہ رضی نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ قربانیاں کیسی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہمیں اس کا کیا ثواب ہے؟ فرمایا کہ اسکے ہر بال کے بدلے ایک نیکی۔ صحابہ رضی نے کہا کہ پشم کا کیا حال ہے؟ آپ نے فرمایا کہ پشم کے ہر بال کے برابر نیکیاں ملینگی +

(ب) حضرت عائشہ رضی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک قربانی کے دن کوئی عمل قربانی سے بڑھکر زیادہ عزیز نہیں۔ کیونکہ بیشک قیامت کے دن قربانی مع اپنے سینگوں اور بالوں اور کھروں کے آئیگی یعنی سب چیزیں نیکیوں کے ساتھ تولی جائینگی اور بے شک اس کا خون خدا کے نزدیک مرتبہ رکھتا ہے قبل اسکے کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ اب تم لوگ اس قربانی کرنے سے خوش ہو جاؤ +

(۳) قربانی صرف اپنی ذات کی طرف سے واجب ہے اولاد اور بیوی کی طرف سے واجب نہیں۔ ہاں اگر زوجہ مالدار ہے تو وہ اپنے خرچ سے کرے +

(۴) مسافر پر قربانی واجب نہیں +

(۵) ہر شخص اپنی طرف سے ایک بکری بکرا یا مینڈھا یا چھترا ذبح کرے اور گائے یا اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ سات آدمیوں کی نیت قربانی کی ہو۔ اگر ایک کی نیت گوشت بیچنے کی ہو تو کسی کی قربانی بھی ادا نہ ہوگی +

(۶) بکری کا بچہ ایک سال سے کم کا اور بھیڑ کا بچہ ۶ ماہ سے کم کا اور گائے بیل

دو برس سے کم کا اور اونٹ پانچ برس سے کم کا قربانی میں جائز نہیں مگر جو بھیڑ کا بچہ چھ ماہ کا ہو اور فربہ اور قوی ہو تو جائز ہے +

(۷) قربانی کا وقت صبح دسویں ذی الحجہ سے بارھویں ذوی الحجہ کے غروب آفتاب تک ہے۔ مگر جو لوگ شہر میں رہتے ہیں اُن کا نماز عید سے پہلے کرنا جائز نہیں۔ البتہ گاؤں والوں کو جائز ہے +

(۸) اندھا یا کانا یا ایسا دبلا جانور جس کی ہڈیوں میں مغز نہ رہا ہو اور ایسا لنگڑا کہ ذبح کی جگہ تک بھی اپنے پاؤں سے نہ چل سکتا ہو اور بیمار جانور جس کی بیماری ظاہر ہو اور جس کا تہائی سے زیادہ کان کٹا ہو یا تہائی سے زیادہ دُم کٹی ہو یا جس جانور کے دانت نہ ہوں وہ قربانی میں جائز نہیں۔ ہاں اگر چھوٹے چھوٹے خلقی ہوں تو جائز ہے جس جانور کی ناک کٹی ہو وہ بھی جائز نہیں۔ جس جانور کے سینگ نہ ہوں یا ٹوٹ گئے ہوں وہ جائز ہے خصّی جانور بھی جائز ہے +

(۹) قربانی کے گوشت سے آپ بھی کھائے اور دوست آشناؤں کو گو وہ غنی ہوں کھلائے اور رکھ چھوڑے مگر بہتر یہ ہے کہ تہائی خیرات کر دے۔ اگر اپنا ہی کنبہ زیادہ ہے تو پھر اُسی میں خرچ کر دے +

(۱۰) قربانی اپنے ہاتھ سے کرنا مستحب ہے اور جو آپ ذبح نہ کر سکے مثلاً عورت ہو تو دوسرے سے اپنے سامنے ذبح کرالے +

(۱۱) بکرا وغیرہ خوب موٹا تازہ ہونا چاہیئے۔ جس قدر عمدہ اور فربہ ہوگا اُسی قدر زیادہ ثواب ہوگا +

(۱۲) قربانی کی کھال قصاب کو مزدوری میں نہ دے بلکہ چاہیئے کہ کھال خیرات کر دے۔ یا اس سے ایسی چیز بنائے جو باقی رہے جیسے مشک یا ڈول۔ اور اگر فروخت کر دے تو اسکی قیمت خیرات کر دے +

(۱۳) حضرت علی مرتضیٰ دو قربانی دیتے تھے ان سے سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلعم نے وصیت کی ہے کہ آپ کی طرف سے میں قربانی دیا کروں اسی بنا پر اگر کوئی اپنے بزرگ کی طرف سے قربانی کرے تو مستحب ہے ۔

(۱۴) جس شخص کو قربانی دینی ہو اُسے چاہیئے کہ یکم ذوالحجہ سے قربانی ذبح کرنے سے پہلے حجامت خط وغیرہ نہ بنوائے ۔

انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات

صدقات کا حکم اسلامی شریعت میں ایک ایسی عمیق حکمت پر مبنی ہے جو انسانی ترقی کی دینی اور دنیوی اصلاح پر مشتمل ہے ۔ عوام الناس اس کی ضرورت کو صرف اس خیال تک محدود رکھتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی انسانی ہمدردی اور قومی اعانت ہے ۔ مگر یہ خیال بمقابلہ اس اعلےٰ حکمت کے جو انسان کی روحانی ترقی کا اصل اصول ہے بہت کم وقعت رکھتا ہے ۔ قرآن مجید سے بتصریح تمام ثابت ہوتا ہے کہ صدقات نفس انسانی کے لیے طہارت باطنی کا موجب ہوتے ہیں ۔ اور طہارت باطنی معارف و حقائق ربانیہ کے انکشاف کے لئے ضروری شرط ہے ۔ کیونکہ جب تک قلب خلاق ردیہ اور عادات رذیلہ سے پاک و صاف نہیں ہو لیتا تب تک انوار معرفت کا پر تو اس پر نہیں پڑ سکتا ۔ آیہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ۔ مذکورہ بالا رائے کی تصدیق کے لیے کافی ہے ۔ اور اس کی توجیہ یوں ہو سکتی ہے کہ بخل و امساک سے بیرحمی اور سنگدلی کا مادہ انسان کی طبیعت میں اور بھی ترقی کر جاتا ہے ۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضور علیہ السلام نے یوں ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالےٰ نے ایمان کو پیدا کیا تو ایمان نے کہا کہ خدایا مجھ کو قوی کر دے ۔ اللہ تعالےٰ نے اس کو حسن خلق اور وجود کے ساتھ تقویت بخشی ۔ اور جب کفر کو پیدا کیا تو کفر نے کہا کہ خدایا مجھ کو قوی کر دے ۔ اللہ تعالےٰ نے اس کو سوء خلق اور بخل کے ساتھ قوت بخشی

اس سے صاف طور پر واضح ہو گیا کہ بخل و امساک منجملہ لوازم کفر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ بخیل کے لئے عدم دخول جنت کی وعید وارد ہو چکی ہے۔ سو کوئی ایسا خلق جسکا نتیجہ سنگدلی اور بیرحمی ہو ہرگز اللہ تعالیٰ کو خوش نہیں کرسکتا۔ چونکہ صدقہ دینے سے نفس کے بخل و امساک کو توڑا جاتا ہے۔ اس لئے اس میں ایک قسم کا انکسار آجاتا ہے اور اس کی صلابت زائل ہو جاتی ہے۔ پس یہی ایک انکسار موجب نزول رحمت باری ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ارحم الراحمین ہے اس لئے وہ سب سے بڑے رحیم آدمی کو زیادہ دوست رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھو۔ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ۔ یعنی مخلوقاتِ خدا پر رحم کرو تاکہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے ؎

خواہی کہ خدائے بر تو بخشد ✦ با خلقِ خدائے کن نکوئی

وہ قرآن مجید میں اپنی نسبت فرماتا ہے یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ۔ یعنی اس کی صفت یہ ہے کہ وہ کھانا دیتا ہے۔ اور وہ خود کھانے کا محتاج نہیں۔ چونکہ انسان کے اعلےٰ کمال کا معیار ہے کہ وہ اخلاق الٰہیہ کے ساتھ مشابہت پیدا کرے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر ایک ایمان دار غربا اور مساکین کو کھانا کھلایا کرے۔ تاکہ یہ مشابہت بروجہ کامل اس کو حاصل ہو اور اس عمل میں نفس کی اندرونی رہزنیوں سے محفوظ رہے کیونکہ نفس صرف مال سے طبعًا مانع ہوتا ہے۔ خود جناب رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام باآنکہ بظاہر سلاطین دنیا کی طرح خزائن و خدم کے مالک نہ تھے بلکہ فقر و فاقہ حضور کے لئے زیب و زین تھے۔ مگر جود و عطا میں مسکینوں۔ یتیموں۔ بیوہ عورتوں مسافروں وغیرہم کے حق میں بارانِ رحمت کا حکم رکھتے تھے ؎

تہیدست سلطانِ پشمینہ پوش ✦ غلامی خرو پادشاہی فروش

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ روحانی ترکہ صحابہ اور آئمۂ اہلبیت علیہم السلام کے

ہاتھ پڑا تھا۔ جس کو وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ بعد میں مسلمانوں میں بھی دنیوی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ اور زر و سیم کو اللہ تعالٰے کے احکام پر ترجیح دی جانے لگی۔ آہستہ آہستہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اب سینکڑوں مسلمان صاحب نصاب موجود ہیں۔ مگر زکوٰۃ جس کی تاکید قرآن و سنت میں بروجہ اتم مذکور ہے ادا نہیں کرتے کبھی کسی درویش یا مسکین کو پیسہ دے دیا یا کھانا کھلا دیا اور سمجھ لیا کہ بس۔ زکوٰۃ ادا ہوگئی۔ نعوذ باللہ منہ ⁎

احکام شریعت کے اسرار و حقائق اس قدر وسیع اور دینی و دنیوی اصلاح پر مشتمل ہیں کہ بجز خواص الناس کے دوسرے لوگ ان سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ صدقات و خیرات کے اسرار و حکم اصلاح نفس اور اصلاحِ تمدن و معاشرت پر مشتمل ہیں یا یوں کہو کہ انسان کے ظاہر اور باطن کی اصلاح میں بڑا بھاری دخل رکھتے ہیں۔ اصلاح نفس جو ایک امر باطنی ہے اور جو معرفت ذات باری کا ایک مضبوط ذریعہ ہے بجز صدقات و خیرات کے ایک ناممکن امر ہے۔ ایثار جو بحکم آیہ وَيُؤْثِرُونَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ مردانِ خدا کی وصف میں آچکا ہے ایک ایسا اہم امر ہے جو انسان کو اس کے کمال حقیقی تک پہنچا دینے میں ایک عظیم الشان اثر رکھتا ہے۔ ایثار کے معنی یہ ہیں کہ اپنی حاجت یا ضرورت کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے بھائی کی ضرورت یا حاجت کو مقدم رکھا جائے۔ چونکہ اس حکم پر عمل پیرا ہونا سوائے خاصانِ خدا کے کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں۔ اس لئے بارگاہِ ربّ العزت میں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کوئی شخص نہیں لگا سکتا۔ الغرض انفاق فی سبیل اللہ ایک ایسا کیمیائی عمل ہے جو اللہ تبارک و تعالٰے کو نہایت ہی محبوب ہے۔ کیونکہ انفاق مال نفس کے لئے ایک ناگوار بوجھ ہے جس کے متحمل ہونے سے وہ ہمیشہ نفرت کرتا رہتا ہے۔ اِس لئے اگر کوئی مردِ خدا انفاق مال کی توفیق رکھتا ہو تو وہ

دیگر اخلاقِ رذیلہ سے بآسانی بچ سکتا ہے۔ اور اسی کا نام اصلاحِ نفس ہے۔ اور فضائلِ انسانی جو اصلاحِ نفس کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہو سکتے معرفت ذاتِ باری کے مقام تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور یہی عرفانِ حقیقی ہے جو غایت کمالِ انسانی سمجھا گیا ہے اور جو انسان کی پیدائش کا مقصود بالذات ہے۔ آیہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا کی یہی صحیح تفسیر ہے۔

اصلاحِ تمدّن و معاشرت ایک ایسا امر ہے جو انسان کی ظاہری زندگی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اسلام چونکہ ظاہر و باطن ہر دو کی اصلاح کا متکفل ہے کیونکہ بحکم آیہ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ انسان کا حقیقی کمال ظاہر و باطن ہر دو کی اصلاح پر موقوف ہے اس لئے ضروری ہے کہ حکم صدقات و خیرات انسانی ہیئت اجتماعیہ کی عمارت کے قائم کرنے کے لئے ایک مستحکم اساس کا کام دے۔ انسانی فطرت میں دفع مضرت اور جلب منفعت کا خیال ایک طبعی امر ہے اور چونکہ تمدّن و معاشرت کا بہترین صورت میں قائم رہنا انہیں دو باتوں پر منحصر ہے۔ اور صدقات و خیرات ان ہر دو امر کی تائید کرتے ہیں۔ اس لئے شارع علیہ السّلام نے صدقات و خیرات کی نسبت نہایت تشدّد کے ساتھ احکام تلقین فرمائے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر صدقات و خیرات کے احکام کی پورے طور پر تعمیل کی جائے تو مسلمانوں میں جن خرابیوں کا مشاہدہ ہو رہا ہے بآسانی دور ہو سکتی ہیں۔ حکم صلہ رحمی کی بجا آوری اسی صورت میں متصور ہو سکتی ہے کہ مستحقین اقارب کے حقوق کو مدنظر رکھا جائے۔ مگر نہایت افسوس کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر اہلِ قرابت میں رابطۂ اخوت منقطع ہو چکا ہے۔

یہ امر نہایت قابلِ توجّہ ہے کہ عام طور پر مسلمانوں میں صدقات و خیرات کے صحیح مصرف کی نگہداشت نہیں کی جاتی۔ شریعت حقّہ نے جہاں صدقات و

خیرات کا حکم دیا ہے۔ ان کے مصارف کی بھی ساتھ ہی تفصیل دیدی ہے مستحق اور غیر مستحق میں امتیاز نہ کرنا ایک بڑا بھاری جرم ہے۔ سب سے پہلے صدقات وخیرات کا مصرف اپنے اقارب ہیں جن کی نسبت قرآن مجید میں متعدد موقعہ پر تاکید کی گئی ہے۔ ان کے بعد دیگر مستحقین۔ سخت تعجب کا محل ہے کہ لوگ عموماً دنیوی مصارف میں محض شہرت ونام آوری کے لئے بیدریغ اپنا مال صرف کردیتے ہیں۔ اور حقوق واجبہ شرعیہ کے ادا کرنے میں غفلت۔ بے پروائی اور تنگدلی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور اسراف وتبذیر سے کسی صورت میں نہیں بچ سکتے۔ اسراف زائد از ضرورت صرف کرنے کا نام ہے اور تبذیر بے محل صرف کرنے کو کہتے ہیں۔ یعنی جہاں صرف کرنا چاہئے تھا وہاں صرف نہیں کیا۔ اور جہاں صرف نہیں کرنا چاہیئے تھا وہاں بیدریغ صرف کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل تبذیر کو اخوان الشیاطین کہا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ۔ عام طور پر لوگ اسراف اور تبذیر میں فرق نہیں کیا کرتے۔ آیات قرآنیہ واحادیث میں صدقات وخیرات کے متعلق پوری پوری تفصیل دی گئی ہے۔ ذیل میں چند ایک آیات اور احادیث کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔ جن سے اس حکم کی اہمیت اور فضیلت کا پتہ لگتا ہے:۔

پارہ چہارم کے شروع میں فرمایا۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ یعنی تم ہرگز نیکی کو نہیں پاسکو گے۔ جب تک کہ تم اپنے عزیز مال سے صرف نہیں کروگے۔ چونکہ نفس طبعاً عزیز چیز کو صرف کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ اسلئے ارشاد فرمایا کہ بمقابلہ محبت الٰہی ورضائے مولیٰ دنیا کی وہ چیزیں جو تمہیں بغایت محبوب ہیں کچھ قدر وقیمت نہیں رکھتیں بلکہ وفاداری اسی کا نام ہے کہ رضائے مولیٰ کی خاطر گرامی اور نفیس چیز کو صرف کیا جائے دیکھو کہ تمہیں جس قدر کسی مہمان کی زیادہ عزت محفوظ ہوتی ہے اسی قدر تم لوازم ضیافت میں زیادہ مبالغہ کرتے ہو۔ خالق حقیقی کا رتبہ تو تمام مخلوق سے کہیں بہت زیادہ ہے

بالخصوص اس حال میں جبکہ سب کچھ اسی کا عطیہ ہے سے

نیاوردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

جب حقیقت حال یہ ہے تو جان جیسی عزیز چیز بھی بمقابلہ رضائے مولے کچھ حقیقت نہیں رکھتی سے

جاں نقد محقر است حافظ از بہر نثار خوش نباشد

یہی وجہ ہے کہ شہداء کا رتبہ بہت بڑا قرار دیا گیا ہے۔ پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۔ (سورۃ توبہ) ترجمہ۔ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو یا رسول اللہ۔ آپ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنائیے۔ جس دن کہ وہ (سونا چاندی) دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائیگا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائینگی (اور ان سے کہا جائیگا) یہ وہی (سونا چاندی) ہے۔ جس کو تم اپنے لئے جمع کرتے تھے۔ پس (اب) جو تم نے جمع کیا تھا اُس (کے مزہ) کو چکھو اس آیت شریفہ میں غور کرو کہ سیم وزر کے جمع کرنے اور اُس میں سے حقوق واجبہ ادا نہ کرنے کی صورت میں کس قدر سخت وعید نازل ہوئی ہے۔ کلام الہی میں جہاں کسی امر پر کوئی وعید عائد کی ہے علمائے اسلام نے اسے کبائر گناہ میں داخل سمجھا ہے۔ عدم انفاق مال بھی منجملہ کبائر کے قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے سلسلہ مواسات واخوت بالکلیت منقطع ہو جاتا ہے جو تعلیم اسلام کا عین منشا ہے اور پھر فرمایا وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ

شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (سورۂ آل عمران) یعنی جو لوگ اللہ کے دئے ہوئے مال میں بخل کرتے ہیں وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ بخل ان کو مفید ہے بلکہ وہ ان کے لئے بُرا ہے۔ عنقریب قیامت کے دن وہ بخل کا مال اُنکے گلے کا طوق بنا دیا جائیگا۔ اس آیت شریفہ کا مفہوم بھی آیہ مذکورہ بالا کا مفہوم ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مال کا حقوق واجبہ میں صرف نہ کرنا کس قدر موجب عذاب قرار دیا گیا ہے۔ یہ عذاب تو عالم آخرت کے متعلق ہے مگر دنیا میں بھی مال نہ صرف کرنے والے کو انواع واقسام کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ ایسے شخص کو نہایت مبغوض رکھتے ہیں اور اس کا مال ناگہانی آفتوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور مرتے وقت جو حسرت ایسے شخص کو لاحق ہوتی ہے اس کا اندازہ بھی وہی شخص کر سکتا ہے جس پر وہ حالت گذرتی ہے اور جس کو کسی بزرگ نے اپنے مقولہ میں یوں ظاہر فرمایا ہے "بمشقت گرد آورد و بخست نگاہ دارد و بحسرت بگذارد" اور اس سے بڑھکر اور کیا عذاب ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص دُنیا سے نامراد جاتا ہے اور اس کے مرنے پر وہ لوگ قابض ہو جاتے ہیں جن کو وہ اپنی زندگی میں ایک حبہ تک دینے کا روادار نہ ہوتا تھا۔ مقصد ذیل پنجابی مقولہ بہت قیمتی ہے "ذرا نہ دیندی مانگواں سبھو دتا چا"۔

انفاقِ مال کے متعلق مختلف احادیث بکثرت وارد ہوئی ہیں۔ ذیل میں صرف انکے ترجمہ پر کفایت کی جاتی ہے ؎

(۱) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر بالفرض میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہوتا تو مجھے اس میں خوشی ہوتی کہ تین دن گذرنے سے پہلے ہی وہ میرے پاس نہ رہتا۔ مگر ہاں اتنا کہ قرض کے لئے اٹھا رکھتا

---

[1] واضح ہو کہ انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم ہر دو قسم کے صدقات یعنی واجبہ اور تطوع (نافلہ) پر مشتمل ہے۔ واجبہ جیسے زکوٰۃ۔ فطرہ۔ کفارہ۔ نذر وغیرہ اور نافلہ کے لئے کوئی مقدار اور وقت مقرر نہیں ۵ ۱۲ منہ

اس کو بخاری نے روایت کیا ہے ⁂

(۲) انہیں سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ اس میں دو فرشتے نہ اترتے ہوں۔ ایک یہ کہتا ہے کہ الٰہی خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ اور عوض دے یعنی اور مال یا اولاد دے۔ اور دوسرا کہتا ہے کہ الٰہی ممسک اور بخیل کا ستیاناس کر دے۔ (بخاری و مسلم)

مولانا روم علیہ الرحمۃ نے اسی کا ترجمہ کیا ہے۔ ؎

گفت پیغمبر کہ در بازارہا ⁂ دو فرشتہ مے کنند ہم ندا

کاے خدا تو منفقاں را دہ خلف ⁂ وے خدا تو ممسکاں را دہ تلف

خاصہ آں منفق کہ جاں انفاق کرد ⁂ حلق خود قربانیٔ خلاق کرد

حلق پیش آورد اسمٰعیل وار ⁂ کارد بر حلقش نراندہ کردگار

(۳) ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوا کہ آپ کعبہ کے سایہ میں جلوہ افروز تھے۔ جب مجھے دیکھا تو فرمایا کہ رب کعبہ کی قسم وہ لوگ خسارہ میں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ حضور پر قربان ہوں وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا کہ بڑے بڑے مالدار۔ مگر ہاں جس نے ایسا کیا یعنی آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں خرچ کر دیا۔ اور یہ لوگ بہت تھوڑے ہیں۔ (بخاری و مسلم) ⁂

(۴) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ سخی خدا کے قریب۔ جنت کے قریب اور لوگوں کے قریب مگر دوزخ سے دور ہے۔ مگر بخیل خدا سے دور۔ جنت سے دور۔ اور لوگوں سے دور۔ مگر دوزخ کے قریب ہے۔ اور بے شک جاہل سخی خدا کے نزدیک، عابد بخیل سے بہتر ہے۔ (روایت کیا اس کو ترمذی نے) ⁂

(۵) ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ دو عادتیں مومن میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ بخل اور بد خلقی۔ (ترمذی)

(۶) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جب خدا نے زمین کو پیدا کیا تو وہ حرکت کرتی تھی۔ پھر پہاڑ پیدا کئے اور اس پر رکھ دئے تو وہ ٹھہر گئی۔ تب فرشتوں نے پہاڑوں کی سختی سے تعجب کیا اور کہا کہ یا الہٰی کیا پہاڑ سے بھی کوئی سخت چیز مخلوق ہے؟ کہا کہ لوہا۔ پھر پوچھا کہ کیا لوہے سے بھی کوئی سخت ہے؟ کہا کہ آگ۔ کہا کہ آگ سے بھی کوئی زیادہ سخت چیز ہے؟ کہا کہ ہاں۔ پانی۔ پھر پوچھا کہ پانی سے بھی کچھ سخت ہے؟ کہا کہ ہوا۔ پھر پوچھا کہ کیا ہوا سے بھی کوئی چیز سخت ہے؟ کہا ہاں۔ ابن آدم ہے جو دائیں ہاتھ سے صدقہ دے اور بائیں کو خبر بھی نہ ہو (ترمذی) *

واضح ہو کہ سلف صالحین انفاق فی سبیل اللہ میں نہایت سرگرمی سے کام لیا کرتے اور اس کو منجملہ باقیات صالحات سمجھا کرتے تھے۔ اس کی وجہ ہے کہ حقیقت توحید اُن پر غالب تھی۔ اور باوجود اہل تعلق ہونے کے توکل ان کا شعار تھا جو اصل ایمان ہے۔ اور وہ خوب جانتے تھے کہ جب کوئی شخص دل سے خدا کی اطاعت میں آجاتا ہے تو خدائے تعالےٰ خود اس کا متولی ہو جاتا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ۔ یہی وہ ایک اصل عظیم ہے جس پر اسلام کی عظیم الشان عمارت کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں توحید پرستی محض زبان تک محدود رہ گئی ہے اور قلوب اسباب پرستی کی دلدل میں پھنس رہے ہیں۔ اس لئے اگر حقیقت توکل کی طرف انہیں توجہ دلائی جائے تو یہ اسباب پرست لوگ ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ اور اہل حق کو یوں ملزم

ٹھہراتے ہیں۔ کہ یہ لوگوں کو پست ہمت بناتے ہیں اور اسباب کی پابندی سے روکتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت یہ لوگ اپنے قصورِ فہم کی وجہ سے حقیقت توکّل کے سمجھنے سے عاری ہیں۔ کیونکہ خدائے تعالےٰ اور اُس کے صفاتِ کاملہ پر اُن کے دِل مطمئن نہیں۔ جو لوگ اسرارِ صدقات سے آگاہ ہیں اور اُس کی دُنیوی و اُخروی منافع کو خوب سمجھتے ہیں وہ انفاق فی سبیل اللہ سے سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً کبھی غافل نہیں ہوتے۔ وَالتَّوْفِیْقُ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ +

۸۔ فریضۂ حجؔ فریضۂ حج کے بیان سے پہلے مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر تاریخ مکہ معظمہ اور بیت اللہ شریف کے متعلق کچھ بحث کی جائے :۔

اِس سب سے مشہور اور سب سے مقدس شہر کے لئے قرآن شریف میں حسب ذیل نام مستعمل ہوئے ہیں :۔

(۱) مَکَّۃَ ۔ کقولہ تعالیٰ ھوالّذی کفّ ایدیھم عنکم وایدیکم عنھم ببطن مکّۃ من بعد ان اظفرکم علیہ ۔ مکّہ کے لغوی معنی کسی چیز کا دُور کرنا۔ یا نکال پھینکنا ہے۔ عرب کا قول ہے تمککت المخ من العظم تمککا (ہڈی سے مغز کا چوسنا) چونکہ اس شہر میں داخل ہونے سے انسان کی گندگی اور آلائش دُور ہو جاتی ہے۔ اِس لئے اِس کا یہ نام پڑ گیا ہے۔+

(۲) بَکَّۃَ ۔ کقولہ تعالیٰ ان اوّل بیت وضع للنّاس للّذی ببکّۃ مبارکًا وھدی للعالمین فیہ ایات بینات مقام ابراھیم و من دخلہ کان اٰمنًا ۔ بکّہ کے لغوی معنی دُور کرنا اور روکنا ہے۔ چونکہ یہ فاجر اور بدکار کو اپنے سے دُور رکھتا ہے۔ اِس لئے اِس نام سے مشرف ہُوا۔ کقولہ تعالیٰ انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا +

بعض علماء کا یہ قول ہے کہ مکّہ اور بکّہ دو مختلف لغات ہیں مطلب ایک ہی ہے کیونکہ عرب میم کو ب کے ساتھ ہم مخرج ہونے کی وجہ سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ مثلاً ضربة لازم کی جگہ ضربة لازب بھی بولتے ہیں۔ بعض کا اس کے برخلاف یہ قول ہے کہ یہ دو علیحدہ اسم ہیں اور ان کے مسمٰی دو علیٰحدہ اختیار رہیں۔ کیونکہ اختلاف اسم اختلاف مسمٰی پر دال ہے۔ اختلاف مسمٰی کے بارہ میں بھی دو علیحدہ اقوال ہیں۔ اوّل یہ کہ مکّہ سے مراد شہر اور بکّہ سے مراد بیت اللہ ہے۔ اس قول میں ابراہیم نخعی اور یحییٰ بن یعقوب متفق ہیں۔ دوم یہ کہ مکّہ سے مراد حرم اور بکّہ سے مراد مسجد ہے اس قول میں زُہری اور زید بن اسلم شامل ہیں۔ مصعب بن عبداللہ زبیری کا قول ہے کہ مکّہ کو ایام جاہلیت میں بوجہ امن و آسایش کے صلاح کہا کرتے تھے۔ چنانچہ ابوسفیان بن حرب بن امیّہ کے شعر ہیں ؎

آبا مطرٍ ھلُمّ الی صلاحٍ ۔۔۔ فیکفیک الندامی من قریشٍ
وتنزل بلدة عزّت قدیماً ۔۔۔ وتأمن ان یزورک ربّ جیشٍ

مکّہ کے اور نام ام رحم (بوجہ اس میں لوگوں کے باہم رحم سے پیش آنے کے) ام زحم (بوجہ زحمتِ اعداء) ام الناس۔ ام الباس اور حاطمہ وغیرہ ہیں۔ قرآن مجید میں اسے ام القریٰ بوجہ قدامت و عظمت کے کہا گیا ہے۔ کقولہ تعالیٰ لتنذر ام القریٰ ومن حولھا ؕ

مذکورہ بالا آیت نمبر ۲ میں لفظ مبارک کی دو تاویلیں ہوسکتی ہیں۔ مکّہ کی طرف قصد کے ثواب کی برکت اور اس میں داخل ہونے والے کے لئے امن کی برکت۔ انسان کیا وحشی تک اس میں مامون ہیں۔ ھدی للعالمین کی بھی دو تاویلیں ہوسکتی ہیں اہل عالم کو توحید کی طرف ہدایت اور حج و صلوٰۃ کی ہدایت فیہ اٰیات بینات مقام ابراھیم ومن دخلہ کان اٰمنا میں مقام ابراہیم میں آیت (علامت) سے مراد

ایک سخت پتھر ہے۔ جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم ثبت ہیں اور برکات مقام کی آیات میں سے مظلوم اور خائف کو امن ملنا۔ دیکھنے سے عمارت مبارکہ کی ہیبت و عظمت کا رُعب دِل پر بیٹھنا طیور کو بوجہ تعظیم اوپر سے اُڑ کر نہ گذرنا اور ظالم و سرکش کو فوری سزا کا ملنا ہے۔

ایام جاہلیت میں بھی عرب اور اصحاب فیل بحالیکہ نہ وہ اہل کتاب تھے نہ اس کے متعلق کسی شریعت کے پیرو تھے۔ اس کی تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ان کے کسی قریبی رشتہ دار مثلاً باپ اور بھائی تک کو بھی قتل کر کے حرم میں داخل ہو جاتا تھا تو اس سے بھی خون بہا اور دیت و انتقام نہیں لیتے تھے۔ یہ سب آیات اللہ تھیں جو خدا نے طبعی طور پر انکے دلوں میں ڈال رکھی تھیں۔ شریعت اسلامی میں امن کے مفہوم میں دو تاویلیں ہو سکتی تھیں۔ اوّل نار دوزخ سے امن دوم قتل و خونریزی کی آگ سے امن۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے حرم کعبہ میں قتل و خونریزی کی قطعاً ممانعت فرمائی ہے۔ حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے وقت ایک خطبہ میں فرمایا :-

اُحِلَّتْ لِی سَاعَۃً مِنْ نَہَارٍ وَلَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ مِنْ قَبْلِی وَلَا تَحِلُّ لِاَحَدٍ مِنْ بَعْدِی ۔

کعبہ

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین۔ حضرت علیؓ سے جعفر بن محمد بن علیؓ نے روایت کی ہے کہ جس وقت اللہ سبحانہٗ وتعالےٰ نے فرشتوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ تو انہوں نے کہا اَتَجْعَلُ فِیْہَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْہَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ۔ یہ بے محل اور معترضانہ کلام سن کر غضب الٰہی جوش میں آیا اور فرمایا تم کچھ نہیں سمجھتے۔ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

اب فرشتوں پر خوف طاری ہوا۔ اور عرش کے گرد لگے طواف کرنے۔ انکی عاجزی اور توبہ محرک رحمت الٰہی ہوئی۔ اور انہیں معاف کردیا۔ اور فرمایا کہ زمین پر بھی ایک ایسا مکان بناؤ۔ جہاں میرے گنہگار بندے طواف کرکے مجھ سے طالب معافی ہوں میں اسی طرح ان کے گناہ معاف کردوں گا +

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السّلام غضب الٰہی کی وجہ سے بہشت سے نکالے گئے اور زمین پر پھینکے گئے۔ تو اُنھوں نے دُعا فرمائی کہ مجھے زمین پر بہشتی عبادت خانہ کے مشابہ ایک عبادت خانہ بنوا دیا جائے۔ تاکہ میں وہاں عبادت کرسکوں۔ دعا بدرجۂ اجابت پہنچی اور فرشتوں نے ایک عبادت خانہ بعینہٖ اسی بہشتی عبادت خانہ کی طرح جہاں حضرت آدم علیہ السّلام جنّت میں عبادت کیا کرتے تھے بنا دیا۔ یہ عبادت خانہ طوفان نوح میں منہدم ہوگیا۔ اس کے بیت اوّل ہونے کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بہرحال یہ ثابت ہے کہ کعبہ سے پہلے دُنیا میں کوئی عبادتخانہ نہ تھا۔ حسنؒ اور دیگر علماء کا قول ہے کہ مکہ سے پہلے اور مکانات بھی دُنیا کے پردہ پر موجود تھے۔ مگر مجاہدؒ اور قتادہؒ کا قول ہے کہ دُنیا میں سب سے پہلا مکان یہی ہے کثرت رائے قول اوّل کے حق میں فیصلہ کرتی ہے اور بہت سے مفسّرین اور مؤرخین کا اتفاق بھی اسی رائے پر ہے۔ جس قاعدہ پر زمانہ حال کے مؤرخ پرانے زمانہ کا حساب لگاتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنبوی سنہ کی بیالیسویں صدی میں یعنی حضرت عیسٰی سے انیسویں صدی ماقبل میں کعبہ بنا تھا۔ اگر اِس حساب کو صحیح مانا جائے تو بھی ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا میں جہاں تک معلوم ہُوا ہے کعبہ سے پہلے کوئی گھر خدا کی عبادت کے لئے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ کعبہ سب سے اوّل بنا تھا +

معتبر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ دُنیا میں نہایت قدیم زمانہ سے ہے مشہور مؤرخ گبن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ کعبہ کی قدامت سنہ عیسوی سے

پہلے کی ہے۔ ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈورس یونانی مورخ نے ثمودیت اور سیبین کے بیان میں ایک مشہور معبد (کعبہ) کا ذکر کیا ہے جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے۔

غرض طوفان نوح کے بعد حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے خانہ کعبہ کی عمارت کی تجدید کی آیہ واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام اس امر پر مامور تھے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد کعبہ بنی جرہم کے قبضہ میں آیا۔ ایک دفعہ ان کے زمانہ میں پہاڑی نالہ سے پانی کعبہ کے اندر داخل ہوگیا۔ اور سب عمارت ڈھ گئی۔ بنی جرہم نے حضرت ابراہیمؑ کی بنیاد پر اُسے تعمیر کرادیا۔ بعد ازاں قوم عمالقہ (بنی حمیر) نے بنی جرہم پر غلبہ پایا اور کعبہ کو از سر نو تعمیر کیا۔ قریش میں سے سب سے اوّل قصی بن کلاب نے کعبہ کی تجدید کی۔ کھجور اور بیری کی لکڑی سے چھت ڈالا۔ اعشیٰ شاعر کہتا ہے ؎

حَلَفْتُ بِثَوْبَیْ رَاهِبِ الشَّامِ وَالَّذِیْ ✽ بَنَاهُ قُصَیٌّ جَدُّهٗ وَابْنُ جُرْهُمٍ
فَاِنْ شَبَّ بَیْنَ الْعَدَاوَۃِ بَیْنَنَا ✽ لیرتحلن منی علی ظھر شیئھم

یہ تعمیر آنحضرت صلعم سے قریباً دو سو سال پیشتر ہوئی تھی۔ آنحضرت صلعم کی چودہ برس کی عمر مبارک تھی کہ پہاڑی نالوں کے سیلاب جنہیں عرب السیول عوارم کہتے تھے کعبہ کی عمارت میں اکثر داخل ہو جاتے تھے جنکی وجہ سے کعبہ کی کچھ دیواریں پھٹ گئیں۔ اب قریش کو اس کی تعمیر کی فکر ہوئی۔ مگر مارے رعب اور ڈر کے کوئی شخص انہدام عمارت کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ انہی دنوں مکہ میں ایک سانپ تھا جس سے لوگ بہت ڈرا کرتے تھے۔ ایک دن وہ نکل کر کعبہ کی دیواروں پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک پرندہ غیب سے آکر اس کو جھپٹا مار کر اڑا لے گیا۔ قریش نے اس میں اپنے ارادہ

کے لئے نیک فال لی اور تعمیر کعبہ کا خیال زیادہ مضبوط ہوگیا۔ اسی اثنا میں ایک رومی عیسائی تاجر کا جہاز بندرگاہ شعیب (جدہ) کے قریب ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ انہوں نے جا کر وہ شکستہ جہاز خرید لیا۔ اب سامان تو ہو گیا مگر انہدام کی جرأت کسی کو نہ ہوئی۔ سب ڈرتے تھے۔ اگر ڈھائیں گے تو خدا جانے کیا آفت آئیگی۔ آخر ولید بن مغیرہ نے اپنا دل کڑا کیا اور کہا کہ میں ڈھانا شروع کرتا ہوں۔ بڈھا تو ہوں ہی۔ اگر آفت آئیگی تو مرنے کو بھی رہا ہوں۔ چنانچہ اس نے دیوار پر چڑھ کر ڈھانا شروع کیا اور حضرت ابرہیمؑ کی بنیاد تک برابر کر دیا۔ عمارت شروع ہوگئی۔ کعبہ کو چار ذرعہ اور ایک بالشت کرسی دی اور اس قدر کرسی پر دروازہ بلند کیا کہ نالے کا پانی اوپر نہ چڑھ سکے اور اس حکمت سے جس کو چاہیں اندر نہ داخل ہونے دیں۔ جب بناتے بناتے اس مقام پر پہنچے۔ جہاں حجر اسود لگانا تھا تو تنازعہ برپا ہوگیا کہ کونسا قبیلہ اسے رکھے۔ ابوامیہ بن مغیرہ نے تجویز کیا کہ جو شخص سب سے پہلے اس راستہ سے آئیگا وہی اسے رکھے گا۔ آخر آنحضرت صلعم جن کی عمر اس وقت چھوٹی تھی تاہم پتھر ڈھونے میں شریک تھے۔ سب سے پہلے اس راستہ سے آئے۔ سب نے خوش ہو کر امین امین (جاہلیت میں حضرت صلعم کو بوجہ دیانتداری کے امین کہا کرتے تھے) کہہ کر چلانا شروع کیا اور حضرتؐ کو فیصلہ کا حکم بنایا۔ حضرت صلعم نے بہ حکم (النبی نبی[1] ولو کان فی بطن امہ) روح القدس سے مؤید ہو کر ایسا فیصلہ کیا کہ سب خوش ہو گئے۔ آپ نے چادر مبارک زمین پر بچھائی اور حجر اسود کو اس پر رکھا۔ سب سرداروں کو بلا کر اس کے کونے پکڑوا دئے۔ سب اٹھا کر وہاں لائے۔ پھر نیچے سے چادر کھسکا لی۔ گویا سارے قبائل نے اس ثواب میں اس تدبیر سے حصہ لیا۔ بعد ازاں سنہ ۶۴ ہجری میں جب یزید خلیفہ ہوا تو عبداللہ بن زبیر نے اس کی بیعت سے انکار کیا۔ اس پر حصین بن نمیر یزید کی طرف سے

[1] نبی نبی ہوتا ہے خواہ وہ ماں کے پیٹ میں ہی کیوں نہ ہو۔

ابن زبیر پر حملہ آور ہوا - اور آخر اُلذکر کو شکست دیکر خانہ کعبہ میں محصور کر لیا - اور
کوہ ابوقبیس پر سے منجنیق سے پتھر مارنے لگا - اس سے دیواروں کو سخت نقصان پہنچا
اتفاق سے انہیں دنوں ابن زبیر کے متعلقین میں سے ایک شخص آگ لے جارہا تھا
ادھر ہوا تیز چل رہی تھی - آگ کی چنگاری اُڑ کر خانہ کعبہ کے پردوں میں جا لگی اور سارا
مکان جل اُٹھا - یزید کی وفات کے بعد حصین بن نمیر واپس چلا گیا اور عبداللہ بن زبیر
کو عمارت کعبہ کی فکر پڑی - اُنہوں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو بلا کر مشورہ کیا مگر جابر بن
عبداللہ و عبید بن عمیر و عبداللہ ابن عباس نے مشورہ ان کے خلاف دیا - ابن زبیر
نے کہا کہ شرم کی بات ہے کہ جب لوگوں کے گھر منہدم ہو جائیں تو انکے بنانے میں جلدی
کرتے ہو مگر خانہ کعبہ کے لئے اس قدر سُستی اور تامل - اگر تم لوگ شریک ہونا نہیں چاہتے
تو تمہاری مرضی - میں تو کل ہی عمارت شروع کر دوں گا - اور جناب رسول کریم کی ایک
حدیث بیان کی کہ لو کانَ لنا سعۃ[1] لبنیتہٗ علےٰ اساس ابراھیم ولجعلت لہ بابین
شرقیا و غربیا - اسود نے پوچھا کہ آپ نے جناب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سے
بھی اس بارہ میں کچھ سُنا ہے ؟ - فرمایا - ہاں - اور یہ حدیث پیش کی ان قومك اقتصروا
فی بناء البیت ولولا حدثان عھد قومك بالکفر لھدمتہٗ واعدت فی ما
ترکوا - یعنی حضرت عائشہ رض سے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تیری قوم نے کعبہ کی تعمیر
میں کوتاہی کر دی - اگر تیری قوم کا زمانہ کفر کے زمانہ سے قریب نہ ہوتا تو جو کچھ انہوں
نے چھوڑ دیا ہے میں پھر کعبہ میں ملا دیتا +

الغرض صبح ہوتے ہی عبید بن عمیر کو بلا بھیجا - مگر وہ اُس وقت خواب میں تھے
قاصد کو واپس کہلا بھیجا کہ ان کو جگا دو - اور خود یہ کہا کہ کیا آپ نے جناب رسول صلعم
کی یہ حدیث نہیں سُنی - ان[2] الارض لتضج الی اللہ من نومۃ العلماء فی الضحیٰ

[1] اگر ہمیں گنجائش ہوتی تو بیت حضرت ابراہیم کی بنیاد پر بناتا اور اس کے دو دروازے مشرقی اور مغربی بناتا ۱۲ من
[2] زمین علماء کے چاشت کے وقت سونے پر چلاتی ہے اور خدا سے فریاد کرتی ہے ۱۲ منہ

غرض عمارت سابقہ باقی کو گرادیا۔ حضرت عباس نے کہلا بھیجا کہ عمارت گرانے سے لوگوں کو بے قبلہ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ بہتر ہو کہ باہر پردہ کر لیا جائے اور کام اندر ہی اندر ہوتا رہے۔ ابن زبیر نے ایسا ہی کیا۔ حجر اسود کو ریشم میں لپیٹ کر ایک تابوت میں رکھ دیا۔ بنیاد کھودتے کھودتے مقام حطیم کے قریب حضرت ابراہیم کی رکھی ہوئی بنیاد نظر پڑی۔ وہاں سے کام شروع ہوا۔ جناب رسول کریم کی حدیث جعلت[۱] لہابابین شرقیا یدخل الناس فیہ وغربیا یخرج الناس منہ کے مطابق دو دروازے بھی بنائے۔ زبیر ابن بکار کا قول ہے کہ عبداللہ بن زبیر کو کھنڈرات میں سے سبز رنگ کی پٹڑیاں ملیں جو ایک قبر پر لگی ہوئی تھیں۔ عبداللہ بن صفوان نے فرمایا کہ یہ قبر حضرت اسمٰعیل کی ہے۔ ابن زبیر نے ان کو وہیں کا وہیں رہنے دیا۔ عمارت تیار ہو گئی۔ مگر تھوڑی مدت بعد عبدالملک بن مروان نے حجاج کو ابن زبیر کے مقابلہ میں بھیجا۔ ابن زبیر مسجد میں پھر محصور ہو گئے۔ منجنیق کے پتھر نے خانہ کعبہ کی دیواروں کو پھر سخت نقصان پہنچایا۔ ابن زبیر بھی اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ بعدازاں حجاج نے خلیفہ عبدالملک کے حکم سے بنیاد قریش پر پھر از سر نو کعبہ کو تعمیر کیا۔ آج تک اسی حالت میں ہے ٭

غلاف کعبہ

غلاف کے متعلق اسلام کے رُو سے جو بحث ہو سکتی ہے وہ اسی قدر ہے ما ھذا لتعید لکعبتنا ولتحسینھا فالاول کفر علی مذھب الاسلام والثانی امر لاباس بہ۔ یعنی یہ کام کس ارادہ سے کیا جاتا ہے۔ کعبہ کی پرستش کے لئے یا خوبصورتی اور آرائش کے لئے۔ اگر پہلی نیت سے کیا جائے تو اسلامی رُو سے کفر ہے اور اگر دوسرے ارادہ سے کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ بروایت ابوہریرہ رض سب سے اوّل چھ سو سال قبل از مسیح

[۱] میں اس کے دو دروازے بناتا ایک شرقی جہاں سے لوگ داخل ہوں دوسرا غربی جہاں سے وہ باہر آئیں

سعد یمانی نے کعبہ پر غلاف چڑھایا۔ بعد ازاں جناب رسول صلعم نے یمنی چادروں اور حضرت ابوبکر رضہ و حضرت عثمان رضہ نے قبطی چادروں کا غلاف چڑھایا (بقول محاذب بن زیاد) خالد بن جعفر نے ریشمی غلاف چڑھایا۔ سلاطین بنوامیہ کے عہد میں اہل نجران کے جنگی لباسوں سے جن پر ریشم کا کام ہوا ہوتا تھا چڑھایا جاتا تھا۔ خلیفہ متوکل علی اللہ نے خانہ کعبہ کی دیواروں کو چاندی سے منڈھایا اور چھت اور چار دیواری کعبہ پر سونے کی پتریاں چڑھائیں اور شہتیروں پر ریشم لپیٹا اور ریشم کا غلاف چڑھایا۔ سلطنت عثمانیہ میں ہر سال ریشم کا لباس خانہ کعبہ پر چڑھایا جاتا رہا۔ اور پرانے غلاف کے ٹکڑے کرکے حاجیوں میں بطور تبرک تقسیم ہوتے رہے ؎

مسجد حرام پہلے یہ حصہ کعبہ کے زائرین کے ٹہلنے کے لئے کھلی جگہ تھی۔ جناب سالتمآب اور حضرت ابوبکر رضہ کے عہد تک اس کے گرد کوئی دیوار نہ تھی۔ حضرت عمر رضہ کے زمانہ میں بوجہ کثرت زائرین انہوں نے ارد گرد کے بہت سے مکانات اس میں ... بڑھا دئے۔ جن لوگوں نے قیمتاً دینا منظور نہ کیا انکے مکانات زبردستی چھین کر ان کو معقول قیمت دیکر راضی کر لیا۔ اور اس کے گرد دیوار بنائی جس پر چراغ رکھے جاتے تھے۔ پھر حضرت عثمان رضہ کے عہد میں اور مکانات خرید کر صحن وسیع کیا گیا۔ مگر بعض نے مکانات بیچنے منظور نہ کئے بلکہ مسجد کے قریب ہر وقت شور کرنے لگے۔ اس پر حضرت عثمان رضہ نے انہیں اس حرکت ناشائستہ سے روکنے کے لئے ان سب کو قید کر لیا۔ اور مکانات منہدم کرکے اور انہیں معقول معاوضہ دے کر راضی کر لیا۔ اور مسجد کا چھجہ بھی بنایا۔ مسجدوں میں چھجہ بنانے کے موجد حضرت عثمان رضہ ہی ہیں۔ بعد ازاں ولید بن عبدالملک نے زیادہ وسیع کیا اور سنگ مرمر کے ستون بنوائے۔ منصور اور مہدی نے بھی مسجد کو حسب ضروریات وسیع کر لیا ؎

اصنام کعبہ کعبہ میں قبل از اسلام بت تھے اور کفار انکی پرستش کیا کرتے تھے

ان میں سے مشہور مشہور کے نام یہ ہیں :-

(۱) اساف و نائلہ - بنی جُرہم نے صفا اور مروہ کی پہاڑیوں پر دو بت رکھے ہوئے تھے - صفا پر اساف بصورت مرد اور مروہ پر نائلہ بصورت عورت استادہ تھے اصل میں وہ دو انسان تھے - بنی جرہم ان کو دیوتا خیال کرتے تھے - مرنے کے بعد اُن کے بُت بنا کر پرستش کرنے لگے - فتح مکہ کے روز رسول خدا صلعم نے انکو اور بتوں کے ساتھ توڑ ڈالا ؛

(۲) نہیک و مطعم - یہ بھی دو بُت صفا اور مروہ پر استادہ تھے ؛

(۳) ہُبَل - یہ ایک بڑا بُت خانہ کعبہ میں تھا - کعبہ کے اندر دائیں طرف جو خزانہ کا کنواں حضرت ابراہیم ؑ کا کھودا ہوا تھا - اس پر یہ بُت کھڑا کیا گیا تھا - اسی سے ابوسفیان نے فتح مکہ کے دن مدد چاہی تھی ؛

(۴) منات - سمندر کے کنارہ پر عمر بن لحی نے نصب کیا ہوا تھا وہ ایک ناتراشیدہ لمبا سا پتھر تھا ؛

(۵) لات - ایک ناتراشیدہ پتھر تھا جس کی نسبت خیال تھا کہ شان باری کے کسی کرشمہ نے اس پتھر میں حلول کیا ہے ؛

(۶) عُزّیٰ - تین درخت تھے - جن میں ذات باری کا حلول سمجھ کر پوجا کیا کرتے تھے ؛

(۷) ذات انواط - یہ ایک سرسبز درخت تھا جسے حُنین کے لوگ پوجتے تھے ؛

(۸) ذوالکفین - یہ بھی ایک بُت تھا جس کو عُمر بن حمیر نے فتح مکہ کے بعد جلایا تھا

(۹) سُواع قبیلہ ہذیل کا مشہور بُت تھا جس کو عمرو بن عاص نے آنحضرت صلعم کے اشارہ سے بعد فتح مکہ توڑا تھا ؛

(۱۰) وَدّ - دومۃ الجندل میں بنی کلب کا بُت تھا ؛

(۱۱) یغوث - بنی مراد اور بنی عطیف کا بُت تھا ۔

(۱۲) یعوق - بنی ہمدان کا بُت تھا ۔

(۱۳) نسر - بنی حمیر آل ذی الکلاع کا بُت تھا ۔

مکّہ میں قریش میں سب سے بڑے اہل الرائے صاحب فضل و تجربہ لوگ ایامِ جاہلیت میں تھے اور بڑی بڑی سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم تھیں۔ کعب بن لوی بن غالب کے پاس سب قریش ہفتہ وار جمع ہوتے تھے۔ جس دن یہ مجلس ہوتی تھی اسے عروبہ کہا جاتا تھا۔ کعب نے اس کا نام بدل کر جمعہ رکھا۔ اس دن وہ قریش کے سامنے لکچر دیا کرتا تھا۔ اور حضرت صلعم کی بعثت کی نسبت اپنے الہام سنایا کرتا تھا۔ یہ الہام اس قدر مدلل ہوتے تھے کہ فوراً دلوں پر اثر کرتے تھے ۔

اس کے بعد ریاست قصی بن کلاب کے قبضہ میں آئی۔ اس نے مکہ میں دارالندوہ بنائی۔ جس میں قریش کے مقدمات فیصل ہوتے تھے۔ پھر یہ مقام ملکی اور معاشرتی امور پر بحث کرنے کے لئے استعمال کرنے لگا۔ قریش جوں جوں زمانہ نبوت کے قریب ہوتے گئے۔ قوت اور تعداد میں بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ تمام عرب تک ان کی فضیلت قبول کی گئی۔ اور یہ بوجہ اس برکت کے تھا جو تقدیر نے ولادت جناب حضرت صلعم کی صورت میں ان پر نازل فرمائی تھی۔ آنحضرت صلعم کی ولادت نے انکی ترقی اور تبرک کو اوجِ فلک تک پہنچا دیا۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ آنحضرت صلعم کفار مکہ کی بے انتہا تکلیفوں اور اذیتوں سے تنگ آ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرما ہوئے آنحضرت صلعم پھر آٹھ سال کے بعد جب اسلام کا غلبہ ہوا تو فتح حاصل کر کے مکہ میں تشریف فرما ہوئے۔ آنحضرت صلعم کے مکہ واپس آنے کے بارہ میں مختلف روایات ہیں۔ اس امر میں کہ آپ صلح سے داخل ہوئے یا امن سے۔ امام ابوحنیفہ و مالک علیہما الرحمۃ کا قول ہے کہ وہ غلبہ اور زورِ شمشیر سے داخل ہوئے۔ مگر آپ نے امن

کو لوٹ اور غارت سے منع فرمایا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلعم ابوسفیان سے معاہدہ کرکے صلح سے داخل ہوئے۔ اس میں یہ شرطیں تھیں کہ جو شخص اپنا دروازہ کھلا چھوڑ دے۔ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو۔ جو کعبہ کے پردہ تلے ہو رہے وہ امن میں رہیگا۔ سوائے ذیل کے چھ اشخاص کے جن کا قتل ہر حالت میں مباح ہوگا +

اوّل۔ عبداللہ بن سعد جو پہلے مسلمان تھا اور آنحضرت صلعم کی وحی لکھا کرتا تھا۔ بعدازاں مرتد و مشرک ہوکر کفار میں جا ملا +

دوم۔ عبداللہ بن خطل۔ بنی تمیم بن غالب میں سے تھا۔ پہلے مسلمان تھا آنحضرت صلعم نے اسے کفار کے پاس مع دو اور انصار کے تصدیق کے لئے بھیجا۔ راہ میں اپنے ایک مسلمان غلام کو قتل کرکے مرتد ہوگیا۔ اس کے پاس دو خوبصورت نوجوان گانے والی لونڈیاں تھیں۔ جو آنحضرت صلعم کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھیں۔ آپ نے ان کو اسی مردود کے ساتھ قتل کرنے کا حکم فرمایا +

سوم۔ حویرث بن نفیہ بن وہب بن عبد قصی۔ یہ آنحضرت صلعم کو مکہ میں سخت ایذا دیا کرتا تھا +

چہارم۔ مقیس بن صبابہ۔ یہ پہلے اسلام لایا تھا مگر ایک مسلمان انصاری کو قتل کرکے مرتد ہوگیا تھا +

پنجم۔ سارہ (بنی عبدالمطلب میں سے ایک شخص کی لونڈی) +

ششم۔ عکرمہ بن ابوجہل جو حضرت صلعم کو مکہ میں سخت تکالیف پہنچایا کرتے تھے +

بیع واجارہ در مکہ فقہا میں مکہ میں مکانات کو بیع کرنے اور کرایہ پر دینے کے بارہ میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رح بیع مکانات

مکہ سے منع فرماتے ہیں لیکن سوائے امام حج کے کرایہ پر دینے کو جائز رکھتے ہیں۔ اور ان کی دلیل یہ حدیث ہے قال رسول اللہ صلعم مکۃ حرام لایحل بیع رباعہا ولا اجور بیوتھا۔ یعنی آپ نے فرمایا کہ مکہ کے منازل کی بیع اور کرایہ پر دیا جانا حلال نہیں ہے ۔

امام شافعی رح بیع اور کرایہ پر دینے کو روا رکھتے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم نے اہل مکہ کے سامنے فرمایا تھا کہ مکہ کی زمانہ اسلام میں وہی حالت رہے گی جو قبل از اسلام تھی۔ آنحضرت صلعم نے بعد فتح مکہ اسی لئے غنیمت اور لوٹ مار سے منع فرمایا ۔

دارالندوہ ہی کو لو۔ اسے معاویہ نے عہد اسلام میں عکرمہ بن عامر بن ہشام بن عبداللہ بن عبدالدار بن قصی سے خریدا اور اسے اپنا دارالامارت بنایا۔ تو پھر حضرت عمر رض اور حضرت عثمان رض نے مسجد کو وسیع کرنے کی خاطر مکہ کے مکانات خرید فرمائے۔ اور انکے مالکوں کو انکی قیمت ادا کی۔ اگر یہ حرام ہوتا تو وہ مسلمانوں کے روپیہ کو حرام کام میں کبھی خرچ نہ کرتے۔ ایسا ہی مکانات کو اجرت پر دینے کو محمول کر لینا چاہیے ۔

حرم تعریف۔ مکہ کے گرد چند میل کے فاصلہ تک وہ قطعہ زمین ہے جہاں سے حاجی لوگ احرام باندھتے ہیں ۔

حدود حرم مدینہ کی طرف سے آتے ہوئے تنعیم کے ورے بنی نفر کے گاؤں سے تین میل کے فاصلہ پر جعرانہ کی طرف سات میل کے فاصلہ پر طائف کی طرف عرفہ کے پاس بطن نمرہ سے سات میل کے فاصلہ پر۔ عراق کی جانب سات میل کے فاصلہ پر پہاڑ کے دامن تک۔ یہ وہ حد ہے جس کی نسبت خداوند تعالیٰ نے تعظیم و تکریم کے الفاظ فرمائے اور اسے سب علاقوں پر افضل اور اعلیٰ

بیان فرمایا کما قال واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا بلداً اٰمنا وارزق اھله من الثمرات - کیونکہ اس سے پہلے یہ جگہ وادِ غیرذی زرع تھی - اس آیت میں حضرت براہیمؑ نے دعا فرمائی کہ یہاں ایسا امن و آرام ہو کہ لوگ بعیش زندگی بسر کر سکیں ۔ خداوند تعالیٰ نے آپکی دُعا کو قبول فرمایا - اور اس مقام کو حرماً اٰمنا یتخطف الناس من حولھم بنادیا اور عیش و عشرت کے تمام قدرتی سامان مثلاً میوے - چشمے - باغ وغیرہ مہیا کردئے ۔

علماء کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ کیا مکہ اور حرم پہلے ہی امن تھے یا حضرت ابراہیمؑ کی دُعا سے ہوئے - ایک فریق کی یہ رائے ہے کہ حرم ہمیشہ سے ظالموں اور جابروں کے خوف و زلزلہ کی دستبرد سے محفوظ ہے - حضرت ابراہیمؑ کی دُعا سے قحط اور خشک سالی سے امن کی استدعا پائی جاتی ہے ۔

سعید بن ابی سعید ابو شریح الخزاعی سے روایت کرتے ہیں کہ جس دن آنحضرت صلعم نے مکہ کو فتح فرمایا تو عرب کے ایک مجمع کثیر کو مخاطب کر کے یوں ارشاد فرمایا - ایھا الناس ان اللہ سبحانہ حرم مکۃ یوم خلق السمٰوت والارض فھی حرام الیٰ یوم القیامۃ لا یحل لامریٔ یؤمن باللہ والیوم الاٰخر ان یسفک بھا دماً او یعضد بھا شجراً وانھا لا تحل لاحد من بعدی ولم تحل لی الا ھذہ الساعۃ غضباً علیٰ اھلھا الا وھی قد رجعت علیٰ حالھا بالامس - الا لیبلغ الشاھد الغائب - یعنی اے لوگو! خداوند تعالےٰ نے مکہ کو اسی دن حرام کیا (قتل وغیرہ حرام قرار دیا) جس دن زمین و آسمان پیدا کیا اور وہ قیامت تک حرام ہی رہیگا - اور کسی مومن کے لئے حلال نہیں ہے کہ اس میں خونریزی کرے یا درخت کاٹے - میرے بعد بھی کسی پر حلال نہیں ہوگا - سوائے اس وقت کے مجھ پر بھی حلال نہیں ہے - کیونکہ اس وقت اس کے اہل پر غضب الٰہی نازل ہے - کل سے پھر اصلی حالت پر ہوگیا ہے

پہلے تھی۔ یہ (حکم) حاضرین غائبوں کو سنادیں +

دوسرے فریق کا قول ہے کہ مکہ دیگر بلاد کی طرح تھا۔ اس میں قتل و خونریزی کی ممانعت نہ تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے قتل و خونریزی حرام ہوئی۔ اسی طرح مدینہ میں آنحضرت صلعم کی دعا سے یہ باتیں حرام ہوئیں +

اشعت نافع سے بقول ابوہریرہ رضہ روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے۔ ان ابراھیم کان عبد اللہ وخلیلہ وانی عبد اللہ ورسولہ وان ابراھیم حرم مکۃ وانی حرمت المدینۃ ما بین لابیتہا عضاھا وصیدھا ولا یحل بھا سلاح لقتال ولا یقطع بھا شجر الا لعلف لعیر۔ (ترجمہ) ابراہیم اللہ کے بندے اور اس کے خلیل تھے۔ اور میں خدا کا بندہ اور رسول ہوں۔ ابراہیمؑ نے تو مکہ میں (خونریزی وغیرہ) حرام فرمائی اور میں مدینہ میں حرام کرتا ہوں۔ اس کے دونوں کنکریوں کے وادیوں کے درمیان کے درختوں اور شکار کو۔ چاہئے کہ اس میں لڑائی کے لئے ہتھیار نہ اٹھایا جائے اور نہ درخت کاٹا جائے مگر اونٹ کے چارے کے لئے +

زمزم یہ مقدس چشمہ اس وقت کی یادگار ہے جبکہ حضرت ہاجرہ رضہ مع حضرت اسمٰعیلؑ کے اس بیابان لق و دق میں پہنچائے گئے۔ حضرت اسمٰعیلؑ بوجہ پیاس سخت بیقرار تھے۔ اور جیسا کہ اضطراب میں قاعدہ ہے۔ انہوں نے اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑیں۔ قدرت الٰہی سے یہ چشمہ نمودار ہوا۔ پانی کے سوتوں سے نہریں جاری ہوگئیں اور سبزی لہرانے لگی۔ قبیلہ بنی جرہم کے لوگ تلاش آب میں پھرتے پھراتے یہاں آپہنچے۔ اور حضرت ہاجرہ رضہ کی اجازت سے یہاں آباد ہوئے۔ مکہ کی آبادی کا زیادہ تر ذریعہ یہی چشمہ تھا۔ کچھ مدت کے بعد یہ چشمہ خشک ہوگیا۔ واقعہ اصحاب فیل کے بعد عبدالمطلب جد جناب رسول علیہ السلام کو خیال ہوا کہ جہاں وہ چشمہ تھا وہاں کنواں کھود کر پانی نکالا جائے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے فساد کو رفع کرکے اسے کھودا

اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ۲۲۳ و ۲۲۴ ہجری میں پھر وہ خشک ہوگیا اسلئے دو ذرعہ اور کھودا گیا۔ مگر ۲۲۵ ہجری میں سخت بارش ہوئی اور اس سے کنوئیں میں بہت سا پانی جمع ہوگیا۔ ہارون الرشید کی خلافت میں بھی توجہ کی آپ دو ذرعہ اور کھودا گیا۔ اور مہدی اور محمد بن الرشید کی خلافت میں بھی گہرا کیا گیا۔ آجکل ہر سال صاف کیا جاتا ہے ؛

فرضیت حج

فریضہ حج منجملہ ارکان اسلام ایک رکن عظیم ہے۔ جناب پیغمبر علیہ السلام حجۃ الوداع کے موقعہ پر میدان عرفات میں جب اپنی راحلہ پر سوار تھے تو آیۃ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا نازل ہوئی۔ اس آیت کو آیت الدین بولتے ہیں حسن اتفاق سے وہ دن جمعہ کا تھا اور یوم عرفہ کا بھی وہی دن تھا۔ چونکہ فریضہ حج کے اثنائے عمل میں یہ آیت شریفہ نازل ہوئی اس لئے اس سے فریضہ حج پر احکام شریعت کے خاتمہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اور دو ماہ کچھ دن اوپر جناب والا کی وفات حسرت آیات وقوع میں آئی۔ حکم حج کی فرضیت بروئے نص قرآنی ثابت ہے حیث قال عز و جل و للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ حدیث شریف میں حکم حج بیت اللہ شریف کے متعلق یوں وارد ہوا ہے۔ من مات ولم یحج فلیمت ان شاء یہودیا و ان شاء نصرانیا اس شدید وعید سے حکم حج کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب جناب خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے فرزند ارجمند اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ ملکر بیت اللہ کی عمارت کی تجدید کی تو آپ کو جناب باری سے حکم ہوا و اذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا و علی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق۔ یعنی تمام لوگوں کو بیت اللہ کے حج کی اطلاع کردو۔ جس پر وہ تمام اطراف عالم سے سوار و پیادہ ہوکر آیا کرینگے جس کی

تعیین بفضلہ تعالٰے باحسن وجوہ ہو رہی ہے اور تاقیامت ہوتی رہیگی۔ انشاءاللہ تعالٰے

فضیلت بیت اللہ

فضیلت بیت اللہ میں آیات واحادیث بکثرت آچکی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے ان اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاوّ ھدًی للعالمین۔ اس آیت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ معبود حقیقی کی عبادت کے لئے دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ یہی بیت اللہ ہے۔ اِس لئے بتقضائے الفضل للمتقدّم دنیا بھر کے عبادت خانوں پر اسکو شرف حاصل ہے۔ جس طرح حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام تمام بنی آدم کے لئے جدِّ اعلیٰ تسلیم کئے گئے ہیں۔ اسی طرح دُنیا بھر کے عبادت خانوں کی اصل یہی بیت اللہ شریف ہے۔ اور چونکہ بموجب بیان سابق حضرت آدم علیہ السلام کی دُعا سے یہ عبادت خانہ بحکم الٰہی قرار پایا تھا۔ اس لئے اس کو بالفاظ مبارکاً وّھدًی للعالمین تعبیر فرمایا یعنی ایسا گھر جو اہل عالم کے لئے منبع برکات وہدایات ثابت ہوگا اور لفظ للعالمین سے اسے تمام اہل عالم کا مرجع قرار دینا بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے الفاظ مثابۃً للنّاس کے یہی معنی ہیں۔ پھر مکہ معظمہ کو البلد الامین کے معزز لقب سے قرآن پاک میں یاد کیا گیا ہے۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ بحکم آیہ من دخلہ کان امنا۔ اس میں داخل ہونے والا ہر ایک قسم کے امن وامان کا مستحق ہوجاتا ہے جسمانی طور پر بھی رجسکا ذکر اوپر آچکا) اور نیز روحانی طور پر بھی۔ کیونکہ بموجب فرمان نبوی فریضہ حج کو خالصًا لوجہ اللہ بجا لانے والا اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا ہی پاک ہوجاتا ہے جیسا کہ نوزائیدہ بچّہ۔ اس توجیہ کے مطابق اس کا مادہ امن ہوگا۔ مگر بعض محققین نے اس کی یہ تحقیق کی ہے کہ لفظ امین اس مقام پر مامدرامانت سے مشتق سمجھنا چاہیے۔ جس میں نہایت باریک طور پر اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ بارامانت جس کا حکم آیہ انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال

فابین ان یحملنھا واشفقن منہا وحملہا الانسان حضرت انسان متحمل قرار پایا اِسی مبارک مقام پر بطور ودیعت رکھا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوالبشر علیہ السلام کے بعد تمام حضرات انبیا علیہم السلام اس مقام سے مستفیض ہوتے چلے آئے جس کی تکمیل یعنی حقیقت توحید کا اتمام بروجہ کمال جناب خاتم النبیین کی ذات گرامی پر ہوگیا۔ خاکسار کے ایک شعر میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حیث قلت ؎

زتاب آفتاب ما جہاں یکسر چراغاں شد
زمینِ مکہ از نورِ احد دارد دمیدن ہا

آیات قرآنی میں بیت اللہ کی عظمت و شان کو مختلف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے جعل اللّٰہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس۔ اس آیہ شریفہ سے بیت اللہ کی عزت وحرمت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ لفظ البیت الحرام ہیں جو ترکیب نحوی کے رُو سے بطور عطف بیان کے لایا گیا ہے اس عزت وحرمت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔ اور جس کی علت یہ ہے کہ جس طرح ملائکہ عرش رب العلمین کے طواف سے شان الوہیت کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح زمین پر بنی آدم اس عظیم الشان معبد کا طواف کرکے جلال وجبروت الٰہی کی شان کا اظہار کرتے ہیں چونکہ ایسی باعظمت وہیبت جگہ میں خلاف رضائے مولیٰ کسی قسم کے فسق وفجور کا ارتکاب موجب سوئے ادب ہے اس لئے حکم ہوا ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم۔ اس آیت میں جو وعید عذاب آچکی ہے وہ اس مقام کی جلالت و شان کا پتہ دیتی ہے ؏

اور ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ اللہ تبارک وتعالےٰ برأت ساکنان

زمین کی طرف دیکھتا ہے جن میں سب سے اوّل اہل حرم ہیں اور اہل حرم میں سے سب سے اوّل وہ لوگ ہیں جو مسجد حرام میں ہوتے ہیں۔ سو ان لوگوں میں سے جو لوگ طواف میں یا نماز میں یا جو متوجہ بہ کعبہ ہوں ان سب کو مغفرت عطا فرماتا ہے ؛

حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے اپنے ایک خطبہ میں اس پاک معبد کی حقیقت کو بیان فرمایا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

"اللہ تعالےٰ نے بیت الحرام کا حج تم پر فرض کیا ہے جو تمام لوگوں کا قبلہ ہے۔ اور جہاں لوگ اس طرح جمع ہوتے ہیں جس طرح مواشی چشمہ پر پانی پینے کے لئے جمع ہوا کرتے ہیں اور وہاں پناہ لیتے ہیں جس طرح کبوتر اپنے آشیانہ میں پناہ لیتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ نے حج بیت اللہ کو ایک ایسا نشان بنایا ہے جس سے عزت و عظمت خداوندی کی وجہ سے بنی آدم کے خشوع و خضوع کا ثبوت ملتا ہے۔ اس نے اپنی خلقت میں سے اپنے حکم کے بندوں کو منتخب کر لیا ہے جو فی الفور لبیک لبیک پکارتے ہیں۔ اس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں۔ اور اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور اس فرض کی بجا آوری میں ان مقامات پر کھڑے ہوتے ہیں جہاں انبیاء علیہم السّلام کھڑے ہوا کرتے تھے اور ملائکہ کرام سے مشابہت پیدا کرتے ہیں جو عرش رب العلمین کے گرداگرد طواف کرتے ہیں۔ اور عبادت الٰہی کی تجارت کر کے بڑے بڑے منافع حاصل کرتے ہیں اور مغفرت الٰہی کے وعدہ کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔ بیت اللہ کو اللہ تعالےٰ نے منجملہ شعائر اسلام کے مظہر فرمایا ہے اور اس کے پناہ لینے والے اسے امن و امان کا گھر بناتے ہیں۔ ایسے حرم معظم کا حج اس نے فرض کیا اور اس کے ادائے حق کو واجب ٹھہرایا۔ اور اس کی زیارت لازم قرار دی۔ چنانچہ اپنی کتاب پاک میں ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جو آمد و رفت کے مصارف

نی ... رکھتے ہیں۔ اور جو شخص باوجود استطاعت کے اس فرض کو بجا نہ لائے تو اللہ تعالیٰ لوگوں کی عبادتوں سے بے نیاز ہے"۔

اسرار فریضۂ حج

انسان کی حقیقت ایک جسم مادی اور رُوح غیر مادی کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور اِن ہر دو میں ایک نہایت لطیف تعلق ہے۔ اگر اِن ہر دو میں سے کسی ایک پر کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے تو دوسری پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ عبادات بدنیہ کا عمل اگرچہ اعضائے بدنی سے پورا ہوتا ہے مگر اِن کا اثر انسان کی رُوح پر یقیناً عائد ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ عبادات خلوص نیت پر مبنی ہوں۔ عام طور پر ہر ایک عبادت میں عظمت وجلال الٰہی اور عجز و انکسار عبودیت کا نقشہ عامل عبادت کے سامنے مدِ نظر ہوتا ہے۔ فریضہ حج جس کی فرضیت کا اوپر ذکر آچکا ہے ایک ایسی عبادت ہے جس میں جلال وجبروت خداوندی کا تصوّر اس درجہ تک غالب ہوتا ہے کہ ایک مومن اس کو ظاہر اور باطن میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اور اپنے غایت خشوع وخضوع کا اظہار کرتا ہے۔ جب احرام باندھا جاتا ہے تو پہلے غسل کر کے نماز پڑھی جاتی ہے۔ اور ایک خاص قسم کا لباس پہنا جاتا ہے جس کو سب لوگ جانتے ہیں۔ یہ طہارت ظاہری اور سادہ لباس انسان کو اس کی اصل فطرت کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ یہ طہارت اور لباس گویا ایک طرح کا اشارہ ہے غسل موت اور کفن کی طرف جو انسان کے اس دُنیا سے علیحدہ ہو کر بارگاہ رب العزت میں حاضر ہونے کے لئے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ سو جس طرح موت کے وقت انسان دُنیا سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح احرام کے وقت۔ یہی وجہ ہے کہ تلبیہ اور تکبیر یعنی لبیک اور اللہ اکبر کہنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اِن کلمات سے بارگاہ رب العزت میں حاضر ہونے اور اس کی عظمت بیان کرنے کا اشارہ پایا جاتا ہے اسی طرح بیت اللہ شریف کے طواف میں اس حکمت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ طواف کرنے والا

گویا اپنی جان نثار کرنے کا عملاً ثبوت دیتا ہے۔ جس طرح پروانہ شمع کے گرد چکر لگاتے لگاتے آخر اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے اور استلام الحجر یعنی حجر اسود کو بوسہ دینا شعائر اللہ کے اظہار عظمت پر مبنی ہے قال اللہ تبارک وتعالیٰ ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب اور حجر اسود منجملہ شعائر اللہ کے قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ بموجب حدیث حجر اسود زمین میں خداوند تعالیٰ کا داہنا ہاتھ ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ حجر اسود کو معبود قرار دے کر ایسا کیا جاتا ہے کیونکہ یہ خیال عین شرک ہے۔ جس طرح کعبہ کو اظہار عظمت کے خیال سے بیت اللہ کہا گیا ہے اسی طرح حجر اسود کو اس کے متبرک ہونے کی وجہ سے یمین اللہ کہا جاتا ہے نہ یہ کہ کسی قسم کے خیر و شر کا اسے مصدر قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عوام الناس کے دلوں سے اسی ظن فاسد کو رفع کرنے کے لئے استلام الحجر کے وقت فرمایا کہ میں تجھے (حجر اسود کو) ایک پتھر سمجھتا ہوں جو کسی قسم کے خیر و شر کا مصدر نہیں ہو سکتا اور اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو میں تجھے ہرگز کبھی بوسہ نہ دیتا۔ قاعدہ ہے کہ مقدس بزرگوں کے ہاتھ کو ملاقات کے وقت بوسہ دیا جاتا ہے۔ چونکہ حجر اسود کو یمین اللہ قرار دیا گیا ہے اسی خیال پر اس سے مصافحہ کیا جاتا ہے اور اسے بوسہ بھی دیا جاتا ہے۔ رہا یہ امر کہ اسے کیوں متبرک قرار دیا گیا ہے۔ سو اس کے متعلق آثار میں وارد ہو چکا ہے کہ وہ جنت سے دنیا میں لایا گیا تھا۔ سنت ابراہیمی کو قائم رکھنے کے واسطے ارشاد ہوا واتخذوا من مقام ابراھیم مصلےٰ۔ اس سنت حسنہ کو قائم رکھنا منجملہ عبادات حج قرار دیا گیا ہے جس سے جناب خلیل اللہ علیہ السلام کی ایک اعلےٰ درجے کے اخلاص نیت کا پتہ لگتا ہے۔ تاکہ زائرین بھی اس حسنہ سے ثواب عظیم کے مستحق قرار پائیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنن کا قائم رکھنا بجائے خود ایک بڑی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ جناب پیغمبر علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے فبھداھم اقتدہ یعنی اپنے سے پہلے حضرات انبیاء علیہم السلام کے قدم بقدم چلا کر۔ چنانچہ یوم عاشوراء کا روزہ بھی اسی حکمت پر مبنی ہے۔ میدان عرفات میں حجاج زائرین کا جمع ہونا منجملہ ارکان حج قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ مقام استجابت دعا کا ہے۔ غور کرو کہ تمام اطراف عالم کے مسلمانوں کا اس میدان میں جمع ہونا بعینہ میدان قیامت میں جمع ہونے کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح قیامت کے دن حق سبحانہٗ تعالٰے کے جلال و جبروت کا کامل ظہور ہوگا اور بحکم لمن الملك اليوم لله الواحد القهار۔ تمام مخلوقات صفات جلال کے تجلیات پر مغلوب و مقہور ہو جائینگی اور کسی کو بولنے تک کی مجال نہیں ہوگی۔ اسی طرح اس میدان میں بھی اس وحدہٗ لاشریک معبود حقیقی کے صفات جلالیہ کا اظہار اور غایت عبودیت کا اقرار کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح میدان قیامت میں اظہار شان جلال کے بعد تجلیات رحمت کا ظہور ہوگا اسی طرح اس میدان میں بھی اللہ تبارک و تعالٰے کے کمال رحمت کا ظہور ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مختلف طبقات ناس جن میں بڑے بڑے حضرات اکابر اولیاء ابدال و اوتاد و اقطاب شامل ہوتے ہیں مجتمع ہو کر نہایت خلوص اور غایت تضرع کے ساتھ بارگاہ ذوالجلال والاکرام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس مجموعی توجہ کا اثر ارحم الراحمین کی رحمت عامہ کے نزول کا یقینی طور پر سبب قوی ہو جاتا ہے۔ اسی خیال پر بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ بڑے سے بڑے گناہ بھی اس موقف عظیم میں بندہ پر سے گرا دئے جاتے ہیں۔ مع ہذا جماعت مسلمین کی اس ہیئت اجتماعی سے مقدس اسلام کی شان و شوکت اور ہیبت و حشمت کا جو نقشہ دلوں پر جم جاتا ہے۔ اس کی نظیر دنیا بھر کے کسی مذہب میں نہیں پائی جا سکتی سعی بین الصفا والمروہ اور رمی الجمرات کی حکمت بھی اسی مذکورہ بالا سنن حسنہ کے

کے قائم رکھنے پر مبنی ہے۔ کیونکہ سعی بین الصفا والمروہ زوجِ خلیل اللہ علیہ السلام سے بحالت اضطرار ظہور میں آئی تھی اس لئے زائرین کو بھی استدعائے رحمت کے خیال پر اپنے تئیں اضطراری حالت میں لانا چاہئے۔ جس میں بار بار آمد و رفت کرنے سے اِس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اگر پہلی بار نزول رحمت نہیں ہُوا تو دوسری دفعہ یا تیسری دفعہ علیٰ ہذا سات دفعہ سعی کرنے پہ نزول رحمت ہوگا عمل رمی جمار چونکہ دفع شیطان کی غرض سے وقوع میں آیا تھا اس لئے زائرین کو اِسی نیّت سے بجا لانا پڑتا ہے۔ اس موقعہ پر ضروری ہے۔ کہ لایعنی خواطر و وساوس کو دِل سے بالکل دُور کر دیا جائے۔ مبادا کہ کسی ضعیف الاعتقاد کو یہ خیال دامنگیر ہو کہ اس عمل سے کیا فائدہ متصوّر ہے؟ چاہ زمزم کی مثال بعینہٖ حوضِ کوثر کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے جس سے قیامت کے دِن اہلِ ایمان سیراب ہونگے۔

الغرض زیارت بیت اللہ شریف میں کئی ایک مختلف قسم کی حکمتیں مضمر ہیں۔ بالخصوص شارع علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی اس پاک زمین کا مشاہدہ جہاں آپ کی ولادت باسعادت ظہور میں آئی اور جہاں منصب نبوّت پر ممتاز ہوئے اور جہاں مختلف قسم کے واقعات مخالف و موافق پیش آئے۔ ایک صحیح الایمان آدمی کے دل میں عہد قدیم کی یاد اور جوشِ عقیدت و محبّت کو تازہ کرتا ہے۔ اور جب مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے توحسنِ عقیدت و جوشِ محبّت کا ایک ایسا ولولہ دل میں اُٹھتا ہے جس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس سعادت سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ اللّٰھم صلِّ علیٰ محمّدٍ وّ علیٰ اٰلِ محمّدٍ۔

زائرین کو چاہئے کہ گھر سے نکلنے سے پہلے آدابِ سفر اور مناسک حج کے متعلق ضروری ہدایات سے آگاہ ہولیں۔

ضرورتِ اجتہاد

شریعتِ اسلام دو حصّوں پر منقسم ہے عقائد اور احکام۔ عقائد سے صرف ایسے اُمور مراد ہیں جن کی تصدیق ہر ایک مسلمان کا فرض ہے اور احکام سے مراد اوامر و نواہی ہیں جو عبادات و معاملات پر مشتمل ہیں۔ شریعت کا اصل ماخذ قرآن شریف ہے۔ احادیث اکثر آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر و تفصیل پر مشتمل ہیں اس لئے قرآن شریف اور احادیث کی نسبت علماء کا اتفاق ہے کہ بالتصریح یا بالاشارہ ہر ایک مسئلہ کا ماخذ یہ دونوں چیزیں ہیں۔ لیکن بالفرض اگر کوئی مسئلہ ایسا ہو جس کا پتہ قرآن و حدیث سے نہ لگ سکے تو اجماعِ اُمّت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اجماعِ اُمت سے ایسے اہلِ علم کا اجماع مراد ہے جو علمِ کتاب و سنّت میں خاص امتیاز رکھتے ہوں۔ ایسے علماء کا کسی خاص مسئلہ کے متعلق متفقہ فیصلہ شرعاً تیسرے درجہ پر حجت سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ امر ہے کہ اس طبقہ کے اصحاب کبھی کسی غلط امر پر متفق نہیں ہوتے۔ اور اگر کوئی مسئلہ کتاب و سنّت اور اجماعِ اُمت سے خارج رہ جائے تو اس کے متعلق مجتہدین شریعت کے فتویٰ پر عمل کیا جاتا ہے اس لئے قاعدہ یہ ہے کہ اگر کتاب اللہ کسی امر کا فیصلہ کردے تو احادیث کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت داعی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر قرآن مجید میں اسکی تصریح موجود نہ ہو تو احادیث نبویہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اور اگر احادیث سے بھی جواب نہ مل سکے تو اجماعِ اُمّت حجت ہے۔ اِس لئے اجتہاد سب سے آخری ماخذ ہے علمائے اُمّت نے اِس امر پر اتفاق کیا ہے کہ اِسلامی شریعت کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جسکی تصریح مذکورہ بالا چاروں ماخذوں میں سے کسی ایک میں نہ آچکی ہو۔

اجتہاد کے لئے چند ایک شرائط ہیں جن کو کتب اُصول میں مفصّل بیان کیا گیا ہے اس لئے مجتہد ایسا شخص ہو سکتا ہے جو مفصلہ ذیل علوم میں مہارت تامہ رکھتا ہو:-

اوّل- آیاتِ قرآنیہ کو لغت اور اصطلاحات شرعی کے طریق پر بخوبی سمجھتا ہو اور اُن کے موارد نزول سے پورے طور پر آگاہ ہو ٭

دوم- علمِ لغاتِ عربیہ یعنی الفاظِ مفردہ اور مرکّبہ کے خواص اور اشتقاق اور محل استعمال سے بخوبی آگاہ ہو ٭

سوم علمِ صرف یعنی الفاظ مفردہ کے اوزان اور انکی مختلف صور متغیرہ سے پورا واقف ہو ٭

چہادم- علمِ نحو یعنی الفاظ کی ترکیب اور مُعرب و مبنی وغیرہ احوال پر کامل اطلاع رکھتا ہو ٭

پنجم علم معانی یا علمِ بلاغت - یہ وہ دقیق علم ہے جس سے کلام کے ان احوال کا پتہ لگتا ہے جن سے کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو سکتا ہے ٭

ششم علم بیان - یہ وہ علم ہے جس سے ایک معنی کو کئی ایک مختلف طریق پر ادا کیا جا سکتا ہے - اِن مذکورہ بالا علوم کے علاوہ مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ آیات کے مختلف قسم کے اقسام میں امتیاز کر سکتا ہو - جنکا اصول فقہ میں پتہ دیا گیا ہے - اور اس کے علاوہ آیاتِ قرآنیہ کے متعلق ناسخ و منسوخ کا پورا علم رکھتا ہو اور احادیث نبویّہ کی مختلف اقسام میں امتیاز کرنے کی کامل استعداد رکھتا ہو جس کے لئے علمِ اسماء الرجال یعنی راویان حدیث کی معرفت اور اصول جرح و تعدیل کی پوری قابلیت درکار ہے - اور سب سے بڑی ضرورت مجتہد کے لئے اس امر کی ہے کہ وہ وجوہِ قیاس میں کامل دستگاہ رکھتا ہو اور مسائل اجماعیہ کا ضبط مجتہد کے لئے ایک ضروری شرط ہے تاکہ وہ اجماع کے برخلاف اجتہاد نہ کر سکے - جب تک مذکورہ بالا علوم میں

یگانہ و ممتاز نہ ہو۔ کوئی شخص مسائل شرعیہ کا استنباط کتاب اور سنّت سے نہیں کرسکتا

غیر مجتہد کیلئے تقلید ضروری ہے

چونکہ ہر ایک شخص کا اس درجہ کی قابلیت رکھنا کہ وہ پایۂ اجتہاد کو پہنچ سکے ناممکن ہے۔ اس لئے بہ حکم آیہ "فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون" ضروری ہے کہ ان بزرگواران امت کی جن کو اللہ تعالےٰ نے یہ رتبہ عطا فرمایا ہے اور جن کو ماہرین کتاب و سنت نے بالاتفاق مجتہد تسلیم کیا ہے تقلید کی جائے۔ اس حد تک تقلید واجب ہے۔ رہا یہ امر کہ ان بزرگواران میں سے کس کی تقلید کی جائے۔ سو اس امر میں صحیح مذہب یہ ہے کہ کسی ایک مجتہد مطلق کی جو صاحب مذہب ہو تقلید کرلینا کافی ہے اور اس امر کا فیصلہ ہر ایک شخص کی اپنی رائے پر موقوف ہے۔ لیکن اس امر پر کوئی دلیل قطعی موجود نہیں کہ فلاں مجتہد کی تقلید واجب ہے۔ البتہ کثرتِ وجوہ فضائل سے ہم افضلیت کا حکم لگا سکتے ہیں۔ علمائے امت نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ مجتہدین صاحب مذہب صرف چار گذرے ہیں۔ امام نعمان بن ثابت ابوحنیفہ کوفی۔ امام مالک ابن انس مدنی امام محمد بن ادریس شافعی۔ اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ان چاروں بزرگواران کے مقتدین اہل السنت والجماعت کہلاتے ہیں۔ اگرچہ ان چار بزرگواروں کے علاوہ بھی چند ایک بزرگواران کو پایۂ اجتہاد حاصل ہوا ہے۔ مگر وہ صاحب مذہب نہیں کہلاتے "ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم" ان چار بزرگواروں کے زمانہ اجتہاد سے پہلے بھی یہی قاعدہ تھا کہ حضرات صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم میں جو حضرات پایۂ اجتہاد رکھتے تھے عوام الناس ان میں سے کسی ایک سے استفادہ اور استفاضہ کرکے عمل پیرا ہوتے۔ کیونکہ اس وقت تک ہوائے نفس اور بدعات کی ہوا نہیں چلی تھی۔ اور دین کے معاملہ میں نہایت احتیاط اور دیانتداری سے کام لیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ یقین کرلیا گیا تھا کہ یہ بزرگواران

جو کچھ فرمائیں گے وہ کتاب اللہ اور سُنّت کے برخلاف نہیں ہوگا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علم کتاب و سنّت سینوں میں محفوظ تھا۔ اور تصنیف و تالیف اور مسائل شرعیہ کے ابواب کی تدوین و ترتیب کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کی جماعت میں باآنکہ بہت سے بزرگواروں کو پایۂ اجتہاد حاصل تھا۔ مگر ان کے اجتہادات کے متعلق کوئی باضابطہ تصنیف و تالیف موجود نہیں۔ مگر حکمتِ خداوندی کا اقتضا تھا کہ زمانہ نبوّت جُوں جُوں بعید ہوتا چلا گیا اس خیال سے کہ مبادا ملحدین علم کتاب و سنّت کو مسخ کر دیں۔ حضرات محدّثین اور مجتہدین کی جماعت میں ایسے بابرکت نفوس اُٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے احادیث کی تنقیح اور مسائل اجتہادیہ کی توضیح ایسے طور پر کر دی کہ آج تک ان کی تحقیق و تدقیق میں سرِمُو فرق نہیں آیا۔ اور ان کی علمی تحقیقات واسطہ درواسطہ حدِ تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔ آج اگر کوئی شخص کفرانِ نعمت کر کے ان کے بے نظیر علمی کمالات کا انکار کرنے لگے تو اس کے انکار کی کیا وقعت ہوسکتی ہے؟ مگر یہ سب کچھ ان بزرگواروں کی حسنِ نیّت اور اخلاص فی الدّین کا نتیجہ ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

اگرچہ بہ حکم عقل یہ امر ناممکن نہیں ہے کہ فیض ازلی کسی صاحب توفیق کو ویسی ہی ہمّت عالی اور قابلیّت علمی اور اخلاص فی الدین عطا فرمادے کہ وہ پایۂ اجتہاد حاصل کرسکے۔ مگر عادتاً دشوار نظر آتا ہے۔ کیونکہ قربِ زمانۂ نبوّت اور جمہور اُمّت کا متبع

کتاب و سنت ہونا اور علوم متعلقہ فن اجتہاد کی گرم بازاری کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے - اور ہر ایک صاحب رائے کا اپنی رائے پر اترانا اور بدعات کا رواج اور اغراض نفسانی کی کثرت اس حد تک ترقی کر گئی ہے کہ ایسے حالات میں ان اسباب کا مہیا ہونا جو بزرگوارانِ سلف کو حاصل تھے متعذر ر بلکہ محال خیال کیا گیا ہے - یہی وجہ ہے کہ زمانہ اجتہاد کے بعد کے اکابر علمائے امت میں سے ایک بھی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو چاروں مجتہدین میں سے کسی ایک کا مقلد نہیں تھا - تقلید کے متعلق یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ مجتہد کو کسی دوسرے مجتہد کی تقلید کرنا صحیح نہیں - اس لئے غیر مجتہد کو عقلاً اور شرعاً واجب ہے کہ وہ مجتہد صاحب مذہب کی تقلید کرے - عقلاً تو اس لئے کہ عمل بالشریعۃ واجب ہے - مگر عمل کے لئے علم کا حاصل کرنا بھی واجب ہے - اور قاعدہ ہے کہ جو امر واجب کسی دوسرے امر پر موقوف ہوتا ہے تو دوسرا امر بھی واجب ہو جاتا ہے - اور شرعاً بہ حکم آیۂ مسطورہ بالا - خاکسار مؤلف عامہ اہل اسلام سے استدعا کرتا ہے کہ عقائد اور احکام دین کے متعلق ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھا کریں کہ سلف صالحین کے سوا موجودہ زمانہ کی مذہبی تحقیق کے مدعیان کی طرف ہرگز متوجہ نہ ہوں - اور جب کبھی کسی دینی مسئلہ کے متعلق صحیح مذہب حاصل کرنا ہو تو سلف صالحین کی روش کو لازم سمجھیں - کیونکہ خیر اسی میں ہے - ؎

دُور است سرِآب دریں بادیہ ہشدار
تا غولِ بیاباں نفریبد بسرابت

موجودہ زمانہ میں اِس قسم کے بہت سے مدعیانِ علمِ دین پیدا ہوگئے ہیں جو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ پڑھکر مفسّر بن بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ انہیں علوم مذکورہ بالا میں بجز ایک معمولی ربط کے کوئی معتدبہ علمی قابلیّت حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کی عملی حالت اتّقاؤ اخلاص پر مبنی ہوتی ہے۔ مگر کتاب و سُنّت کی علم برداری کے دعوائے بے دلیل کے میدان میں وہ سب سے آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں اور سلف صالحین کے حق میں نکتہ چینی اور طعن و تشنیع ان کا مبلغ کمال ہے۔ لاحول ولا قوّۃ الّا باللہ ؏

باب نہم

عصبیّت[1] مذہبی یا قومی

لفظ تعصّب اِن دِنوں بچّہ بچّہ کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔

[1] ناظرین یہ مضمون المنار مصری نے عروۃ الوثقیٰ سے نقل کیا ہے (باقی صفحہ ۱۱۴ پر دیکھ

مغرب سے مشرق تک تعصب کی صدا بلند ہے - جسے دیکھئے تعصب تعصب پکار رہا ہے - کوئی جلسہ ہو - انجمن ہو - دو چار کی صحبت ہو - جہاں کوئی شخصی - قومی - ملکی مسئلہ چھڑا اور لفظ تعصب زبان سے نکلنے لگا - سپیچوں - تقریروں کا انجام و آغاز اکثر اسی لفظ پر ہوتا ہے - کہتے ہیں یہی ہر قسم کے مصائب و آلام کی جڑ ہے - یہی رنج و عنا - بلاد ابتلا کا منبع اور سرچشمہ ہے - یہی قومی - ملکی - شخصی ترقی کا سدِ راہ ہے - غرضیکہ یہ مجموعہ رذائل ہے اور سب بُرائیوں کا نام ہے - جو لوگ کہ نیم مغربی بن چکے ہیں یا یورپین تہذیب پر فدا ہو چکے ہیں وہ سب سے زیادہ تعصب کو بدنام کرتے ہیں - جس کو وہ اپنے خیال میں ذلیل تر سمجھتے ہیں - اور بُرے سے بُرا کہتے ہیں اور دشمن انسانیت گردانتے ہیں - کہتے ہیں - "متعصب ہے متعصب" ان کے نزدیک متعصب کون ہے ؟ وہ شخص جو ان کے طور و طریق - مسلک و مشرب سے کسی قسم کی مخالفت رکھتا ہو - ایسے شخص کی بات تک سُننا اُن کے نزدیک گناہ اور ناقابل کفارہ گناہ ہے - اس شخص کی صورت تک وہ دیکھنے کے روادار نہیں - پھر اس سے جس قدر ناک بھوں چڑھائیں - مُنہ بنائیں اور باتوں باتوں میں اس کی تضحیک و تذلیل کریں سب کچھ روا ہے اور تھوڑا ہے - خدا جانے تعصب کا مفہوم ان کے دل و دماغ میں

بقیہ صـ۱۱۳ کا - جو عرصہ ہوا پیرس سے نکلتا اور مرحوم سید جمال الدین افغانی اور مرحوم محمد عبدہ مفتی مصر کے پُرزور قلموں کا نتیجہ ہوتا تھا - مضمون جس پایہ کا ہے وہ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں ۱۲ منہ

کیا سمایا ہوا ہے اور کیا معنی اِس کے سمجھ رکھے ہیں۔ کہ تعصّب کو اِتنا بُرا سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سب حق و باطل میں تمیز نہ کرنے اور حقیقت کے نہ جاننے کا نتیجہ ہے۔ ورنہ کجا تعصّب اور کجا یہ ہذیان؟

تعصّب کیا ہے؟ واجبات عصبیّت کے بجا لانے کا نام ہے۔ اور عصبیّت کہتے ہیں کسی قوم کی قوّت کو جس سے وہ قوم اپنے جائز قومی حقوق کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اپنے تئیں بلا میں پڑتے دیکھ کر مدافعہ کو اُٹھ کھڑا ہوتی ہے۔ اِس لئے تعصّب انسانیّت ہے۔ ایسی وصف و قوّت کی تحریک پر جس سے آدمی اپنے بچّوں کی حمایت کرتا ہے۔ اور ان کے حقوق کو پامالی سے بچاتا ہے اور انانیت اِس حکم نفس کے تابع ہے جو معارف و معلومات کا نتیجہ ہے۔

تعصّب ہی وہ وصف ہے جس سے قوم ایک شکل خاص میں متشکل ہوتی ہے۔ گویا کہ قومی ہار کی لڑی رشتۂ تعصّب ہی سے مرتبط و منتظم ہے۔ اور تعصّب ہی قوم کا مزاج صحیح ہے۔ یہی بکھرے ہوئے افراد کو ایک نام کے تحت میں لاتا ہے۔ اور مجموعہ افراد سے شخص واحد بناتا ہے۔ جو اپنے طور و اطوار اخلاق و عادات سعادت و شقاوت میں دوسرے اشخاص سے ممتاز ہو۔ یہی تعصّب کی پیدا کردہ وحدت قوموں اور قبائل میں مقابلہ کی رُوح پھونکتی ہے اور ہر ایک کو دوسرے سے برتری حاصل یا ثابت کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور جیسا کہ خودداری اور انانیت شخصیات میں تکمیل

و ترقی کا بہترین ذریعہ ہیں ۔ اسی طرح قومیں بھی تنافس و باہمی انانیت کے ذریعہ سے بقدر طاقت خود تمام لوازمات حیات میں انتہائے درجہ کمال پر پہنچتی ہیں ۔ غرض کہ تعصب ایک رُوح کل ہے اور ہیئت اجتماعیہ قوم اس کا بدن اور افراد قوم کی تمام رُوحیں اس رُوح کل کے حواس ہیں ۔ جب ان حواس میں سے کسی حاسہ کو کسی اجنبی اور غیر کے ہاتھوں امر ناملائم سے رنج و الم کا احساس ہوتا ہے رُوح کلی اس سے منفعل ہوتی ہے اور طبیعت کلیہ مدافعہ کے لئے جوش میں آتی ہے ۔ اسی سے تعصّب عام حمیّت اور جبلّی غیرت کو ابھارتا ہے اور یہی حمیت اور غیرت افراد قوم کو خیانت اور افعال قبیح کے ارتکاب سے جن سے قوم کو نقصان پہنچے اور بُرا انجام پیش آئے روکتی اور ان کی طبعیتوں کو بلند کرتی ہے ۔ اور جس قدر کہ افراد قوم میں اس قسم کا تعصب و اتحاد زیادہ ہوتا ہے اسی قدر قوم میں استقامت طبع اور رسوخِ فضیلت کا مرتبہ زیادہ اونچا ہوتا ہے اور قوم کا ہر فرد بدن صحیح کا عضو سلیم بن جاتا ہے اور جو کام اس کا ہوتا ہے اسے اچھی طرح ادا کرتا ہے جیسے کہ بدن میں سر بلند ہو کر اپنے آپ کو پاؤں سے مستغنی اور برتر خیال نہیں کرتا اور پاؤں باوجود زمین پر رگڑتے رہنے کے اپنے آپ کو ذلیل و خوار خیال نہیں کرتے بلکہ حفظِ بدن کے لئے خوشی خوشی اپنے فرائض ادا کرتے ہیں اور ترفع و تذلل کے خطرۂ بد کو پاس تک نہیں آنے دیتے ؂

جب ضعف تعصب کے باعث قوم کی قوتِ ربط کمزور پڑ جاتی ہے تو اس کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں - رگ وپے بھی بیکار ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ قومی جسم گھلنے اور گلنے لگتا ہے - جیسے کہ اعصاب اور رگ وپے کے سست ہوتے ہوتے ایک دن شخصی بدن فنا ہو جاتا ہے - اسی طرح قومی رُوح بھی تحلیل ہوتی جاتی ہے - اور آخر کار رُوحِ کلی فنا ہو جاتی ہے اور قوم کی ہیئتِ اجتماعیہ اعضائے بدن کی طرح ناپید ہو جاتی ہے - اگر اس کے کچھ اجزار باقی رہے تو وہ اجزار میت کی طرح پراگندہ رہتے ہیں اور عام قاعدہ کائنات کے بموجب کسی اور بدن (قوم) کا جز بنجاتے ہیں یا موت ہی کے قبضہ میں پڑے رہتے ہیں - یہاں تک کہ دوبارہ زندگی میں دوسری روح اُن میں ڈالی جاتی ہے - (سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل) *

جب کسی قوم میں عصبیت کمزور ہو جاتی ہے تو اللہ تعالےٰ اسے سست اور نکمی کر دیتا ہے اور افرادِ قوم رُوح کلی کے بیکار ہو جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کے حال سے غافل ہو جاتے ہیں اور یہ غفلت رفتہ رفتہ سابقہ روابط و تعلّقات کو کاٹتی رہتی ہے اور لوگ ایک دوسرے سے مُنہ پھیرتے اور الگ ہوتے جاتے ہیں - اس وقت غیروں کو مداخلت کا موقع ملتا ہے اور جب تک کہ دوبارہ خدائے تعالےٰ قوم کو قوم نہ بنانا چاہے کوئی اس قوم کی بگڑی کو بنانے والا کھڑا نہیں ہوتا *

ہاں جیسے اور تمام فضائل نفسانی کا وسط درجۂ اعتدال اور اس کے دو اطراف افراط و تفریط ہوتے ہیں ویسے ہی تعصب کے بھی یہ تینوں درجے ہیں - اعتدال و تفریط (کمی) کی حالت میں تعصب اور اس کے نتائج کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ ہم بیان کر چکے - تفریط کی طرح افراط کا درجہ بھی مذموم ہے - جو ظلم و جور پر قوم کو آمادہ کرتا ہے تعصب

میں افراط کرنے والا انانیت سے مدافعت کرتا ہے لیکن بےجا اور بیجا بھی اور وہ اپنی ہی عصبیت کو اعزاز و کرامت کا مستحق سمجھتا ہے اور غیر کو نہایت ذلت اور غیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کا کوئی حق نہیں سمجھتا اور نہ اُس کے عہد و پیمان کا خیال رکھتا ہے اور یوں جادۂ حد اعتدال سے خارج ہو جاتا ہے اور تعصب کا نفع نقصان سے بدل جاتا ہے اور قوم کی آبرو جاتی رہتی ہے بلکہ مجد و شرف کی جڑ کٹ جاتی ہے کیونکہ عدل ہی ہیئت اجتماعیہ کا اصلِ عظیم ہے اور وہی قومی زندگی کا مدار ہے اور جو قوت کہ عدل کی مطیع و منقاد ہو کر نہیں رہتی اسے زوال کا روزِ سیاہ دیکھنا پڑتا ہے یہی افراط تعصب کی حد ہے اور ہر عاقل کے نزدیک ناپسندیدہ و نامحمود ہے ؛

تعصب کا اطلاق جیسے حمیّت قومی پر ہوتا ہے جو نسبی ارتباط اور ایک جگہ رہنے سے پیدا ہوتی ہے اسی طرح صلہ دین و اتحاد مذہب سے لوگوں میں ایک رُوح سی پیدا ہو جاتی ہے اور ابنائے ملّت کی نصرت اور حمایت پر آمادہ کرتی ہے۔ اسے بھی تعصب ہی کہتے ہیں۔ مقلدین فرنگ بھی تعصب کو ہلاکت و تباہی کا باعث اور خرابیوں کا سرچشمہ کہتے ہیں اور ایک آنکھ اسے دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن ان کی یہ نفرت و کراہت کوئی عاقلانہ فعل نہیں۔ کیونکہ وہ اتحاد اور انانیت جس سے بکھرے ہوئے جڑ جائیں اور وحدتِ حاصلہ ان کو دفع نقصان و کسب کمال کی راہ پر لا ڈالے کسی طرح کیوں نہ قائم ہو مختلف اللسان نہیں ہو سکتی۔ دین سے قائم ہو یا نسب سے۔ یہ دونوں ربط و تعلق اقوام مختلفہ میں رہے اور رہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کے عالم میں ایسے مہتم بالشان واقعات و آثار ظہور میں آئے جو انسانی دُنیا کے لئے باعثِ ناز و افتخار ہیں اور جیسے ایک رشتہ دار بحالت تعصب دوسرے رشتہ دار کی مدد کرتا ہے اور ضرورت کے وقت اس کی طرف سے مدافعت پر آمادہ ہوتا ہے ویسے ہی ایک دیندار بھی اپنے ہم مذہب دیندار کی نصرت و اعانت کرتا ہے اور از روئے عقل ان دونوں کی مدافعت و معاونت میں کوئی فرق نہیں

ہے۔ اس لئے مذہبی تعصب بھی جو اصول عقائد نفسانی کے اتفاق و اتحاد سے پیدا ہوتا ہے جب تک کہ اعتدال پر رہے اور اہل مذہب کو غیروں کی ہتک حرمت نقض عہد اور جور و ستم پر آمادہ نہ کرے۔ تعصب نسبی کی طرح مذموم ہے اور فضائل انسانی میں سے بہت بڑی فضیلت ہے اور قومی تعصب سے زیادہ نفع رساں ہی نہیں بلکہ زیادہ مقدس اور برتر ہے اور تمام روابط و تعلقات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ جس وقت کہ مذہبی تعصب مستحکم ہوگا اہل مذہب کو اوج سیادت اور ذروہ مجد و شرافت تک پہنچائیگا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ تمام قواء پر دینی قوت غالب ہو اور قومی خواہشوں پر غالب آجائے۔ یہانتک کہ قومی خیالات کو قریباً مٹادے جیسے کہ مذہب اسلام میں عصبیت مذہبی عصبیت نسبی پر غالب آئی اور قوم کو نسیاً منسیاً کر دیا۔

ہم نے مذہبی عصبیت کو ابھی اس لئے مقدس ترین رابطہ اتحاد قرار دیا ہے کہ وہ جیسے اشخاص و افراد پراگندہ کے اختلاف کو مٹا کر انکے عزم و مقاصد افعال و اعمال کو متحد کرتا ہے۔ اسی طرح وہ ایک قوم کے متعدد قبائل بلکہ اقوام مختلفہ کی منافرت و مفاخرت باہمی کو بھی مٹا دیتا ہے۔ اگرچہ ان کا وطن ان کی زبان انکی عادت کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو اور صورت و شکل میں بتاین کیوں نہ ہو اور ان سب کے مختلف خیالات و ارادات کو ایک نقطہ پر جمع کر دیتا ہے اور یہی مجد و شرافت و ترقی و تمدن اور یادگار کی دیرپا زندگی کی اصل بنیاد ہے۔ یہی بڑا کام مذہبی عصبیت کے سپرد کیا گیا ہے۔ اور تاریخ شاہد حال ہے کہ اس نے اپنا کام پورا کیا اور عقل بھی مانتی ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے اور ہوا ہے۔ یہ امر عظیم الشان رابطہ قومی سے نہ آجتک ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ مگر ان دنوں لوگ ہیں کہ مذہبی تعصب کی برائی پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اور اس غلط خیال میں پڑے ہوئے ہیں کہ حمیت دینیہ جو برادران دینی کی اعانت اور ابتلا میں واحد نجات دہندہ ہے اہل دین کو کمال تمدن

کی طرف بڑھنے اور نورِ علم و معرفت کے حاصل کرنے سے روکتی ہے اور ان کو جہالت کے اندھیرے کنوئیں میں دھکیلتی ہے۔ اور انہیں غیر مذہب والوں پر ظلم و ستم کرنے پر برانگیختہ کرتی ہے۔ ان لوگوں کی رائے میں استیصال مفاسد اور تکمیل مصالح کی کوئی تدبیر ہے تو صرف یہی کہ عصبیت مذہبی کا نام و نشان نہ رہے اور نفوس بشریہ عقائد کی حکومت سے باہر نکل جائیں اور سب سے زیادہ اس تعصب کے ساتھ مسلمانوں کو بدنام کیا جاتا ہے اور تمام من گھڑت نظام تعصب ان کے سر تھوپے جاتے ہیں۔ لیکن جھوٹے ہیں، یہ یاوہ گو اور نادان ہیں نہیں جانتے کہ مذہب ہی نفوس انسانی کا پہلا اور کامل تر معلم ہے جو کسبِ علوم اور توسیع معارف کی ہدایت کرتا ہے۔ اور رحم مجسم ادیب ہے۔ اور داناترین مؤدب ہے جو انسانی ارواح کو آدابِ حسنہ اور اخلاق شریفہ کے زیور سے آراستہ کرتا ہے اور نفوس کو جادۂ عدل و اعتدال پر قائم کرتا ہے اور شفقت و احساس کے رحم کو ابھارتا ہے۔ خصوصاً اسلام جس نے عرب کی خشونت پسند قسی القلب اور وحشی قوم کو پستی سے اٹھا کر معراج کمال پر پہنچایا اور تھوڑی سی مدت میں حکمت و تمدن کے زینہ پر دور تک چڑھا دیا رہا۔ جیسے عصبیت قومی کو افراط لاحق ہوتی ہے بعض اوقات مذہبی عصبیت بھی افراط کو پہنچ جاتی ہے اور ظلم و جور کا باعث بلکہ بعض اوقات ایک مذہب والوں کو دوسرے مذہب والوں کے مٹانے اور نابید کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ جیسا کہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں مغرب نے مشرق پر محض خونریزی اور مخالفین کے مٹانے اور فنا کرنے کے لئے چڑھائی کی نہ کہ فتوحات اور دعوت مذہب کے لئے اور جیسے سپین والوں نے اندلس کے مسلمانوں کے ساتھ کیا اور جیسے ان دونوں واقعات سے پہلے عیسائیوں نے اپنی بڑھتی ہوئی شوکت کے زمانہ میں یہود کو بیت المقدس میں جمع کر کے جلا دیا تھا۔ لیکن مذہبی عصبیت کی یہ افراط چونکہ اصول

مذہب کے خلاف ہے اس لئے زیادہ طول نہیں کھینچتی اور جلد ہی ہی اہل دین ایسے اصول کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں جو امن و رحم و عدل کے فوائد پر مبنی ہیں مسلمانوں میں بھی بعض گروہ گذشتہ زمانہ میں مذہبی تعصب میں افراط پر پہنچ گئے تھے لیکن اس درجہ تک ان کا تعصب کبھی بھی نہیں پہنچا کہ انھوں نے اپنے خلاف مذہب والوں کو بالکل ہلاک کر دیا ہو اور زمین کو ان سے خالی کرنے کے دواعی مدنظر ہوں۔ چنانچہ اسلامی تاریخ میں ایسے واقعات کا کہیں پتہ نشان تک نہیں ہے خصوصاً اس وقت کے بعد سے جبکہ مسلمانوں نے جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکل کر حکمرانی شروع کی۔ ہمارے اس دعویٰ کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ اسلامی ممالک میں اب تک مختلف مذاہب کے لوگ موجود ہیں اور اس زمانہ سے آجتک اپنے اخلاق و عقائد پر کاربند چلے آتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی طاقت کا وہ عنفوان تھا اور غیر مذہبوں کی طاقتیں نڈھال ہو رہی تھیں۔ ہاں مسلمان توسیع فتوحات کے شیفتہ تھے اور مقابل کے ساتھ بشدت و سختی پیش آتے تھے لیکن باوجود اس کے مذاہب کی عزت و حرمت کرتے تھے۔ اور غیروں سے جو عہد و پیمان کرتے تھے اس سے کبھی نہ پھرتے تھے اور جو غیر مذہب والے انکے مطیع و منقاد ہو جاتے تھے انکے حقوق کو پہچانتے اور انکی رعایت کرتے تھے۔ اور کسی حال میں ان پر ظلم و ستم نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہانتک کہ ان کا عقیدہ تھا کہ جو ہمارے ذمہ اور اطاعت میں آگیا جو فائدہ ہمارا ہے اس کا فائدہ ہے اور جو نقصان اسکا ہے وہ ہمارا نقصان ہے۔ غیروں کے ساتھ معاملہ کرتے میں کبھی وہ عدل کو ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ واقعات شاذہ و نادرہ امر خلاف کو ثابت نہیں کر سکتے۔ اسلئے کہ انسانی طبیعتیں کمزور ہیں۔ کسی وقت بتقاضائے بشریت زیادتی بھی ہو جاتی ہے چنانچہ تاریخ شاہد حال ہے کہ ابتدائے اسلام سے آجتک مسلمانوں نے ملیت

واستحقاق کے ہوتے ہوئے غیر مذہب والوں کے لئے بربنائے اختلاف مذہبی انکے تقدم و ترقی میں عوائق پیدا نہیں کئے بلکہ دل کھول کر ان کو اعلیٰ مناصب و مراتب پر مقرر کیا۔ اسلامی طاقت کا شباب تھا اور غیر مذہب والے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے پاتے تھے۔ اور اب بھی یہی حال ہے۔ مغربی سلطنتیں باوجود علم و تمدن کے بڑھ جانے اور ہزارہا سال زمانہ کے آگے نکل جانے کے بھی ابھی اس درجہ کے عدل وانصاف پر نہیں پہنچ سکیں۔ بُرا ہو اُن لوگوں کا جو یہ کہتے اور سمجھتے ہیں کہ مسلمان مذہبی تعصب کی بنا پر اپنے سے غیر مذہب والوں کو ان کے واجب حقوق سے محروم رکھتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی طاقت و جبروت کے زمانہ میں بھی کبھی غیروں کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا۔ الا ماشاء اللہ۔ حالانکہ اس وقت ان کی عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا اور ان کی فتوحات کا چاردانگ عالم میں غلغلہ پڑا ہوا تھا اور انکی طبیعتیں توسیع فتوحات پر مبذول تھیں اور نئی نئی فتحیں حاصل کرتے تھے۔ ان اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ اگر کوئی قبول کرتا تو کرتا نہیں تو بجائے اس کے ایک قاعدہ کے مطابق اس پر مالیہ لگا دیتے جو دوسری سلطنتوں کے خراج کا قائم مقام ہوتا تھا۔ اس مالیہ کی شرطیں بھی ایسی ہی معتدل ہوتی تھیں کہ کسی پر گراں نہ ہوں۔ ان شروط کے ذکر کا موقع نہیں۔ کتب فقہ سے دیکھنی چاہئیں۔ برخلاف اس کے رومی اور یونانی اپنی شوکت کے زمانہ میں جس زمین پر قدم رکھتے وہاں کے باشندوں کو اپنا سابقہ مذہب چھوڑنے اور عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ چنانچہ مصر و شام میں ہی نہیں بلکہ تمام فرنگستان میں بھی اُنہوں نے اپنا یہی قاعدہ برتا۔

سیاق کلام ہم کو اصل بحث سے دور کھینچ لایا ہے اب ہم پھر تعصب کے متعلق بحث شروع کرتے ہیں۔ کوئی عقلمند جو عقل سلیم رکھتا ہے معتدل مذہبی تعصب کو بُرا نہیں کہہ سکتا اور نہ قومی اور مذہبی تعصب میں کچھ فرق بتا سکتا ہے۔ اگر کچھ امتیاز

کر سکتا ہے وہی ہے کہ مذہبی تعصب زیادہ مقدس اور پاک اور زیادہ نفع رساں اور فائدہ مند ہے۔ جو شخص اس کے خلاف کہے ہمارے نزدیک وہ ہرگز عقلمند کہلانے کا مستحق نہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یورپین اور کونسے اصول و دلیل کی بنا پر لوگ قومی تعصب پر تو فخر و مباہات کرتے ہیں اور مذہبی تعصب کو برا کہتے ہیں اور ذلیل خیال کرتے ہیں۔ ذرا بتائیں کہ ان کا یہ قول تمدن و عمران کے قاعدوں میں سے کونسے قاعدہ کی بنا پر صحیح ہے؟ اصل میں مذہبی تعصب کے بدنام ہونے کی علت یہ ہے کہ یورپین اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں بڑا امر یہی تعلق مذہبی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اسلامی عصبیت اعتقاد سے پیدا اور قائم ہوتی ہے اور ان کے دندان آز اسلامی ممالک پر دراز تھے اور اب بھی ہیں اسی لیے انہوں نے مسلمانوں میں تعصب کی برائی کرنا شروع کر دی اور اس رابطۂ مقدس کے ترک کر دینے کو بہترین فضیلت کی صورت میں دکھاتے ہیں تاکہ اس تدبیر سے اسلام کی عالیشان عمارت کی نیو کو کمزور کر کے ایک دن اسے بالکل گرا دیں اور مسلمانوں کی جماعتوں کو الگ الگ کر دیں اسلیے وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں قومیت و جنسیت سوائے دین و اعتقاد کے اور کچھ نہیں۔ اس کوشش میں یورپین قوموں نے بعض ممالک اسلامی میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی اور برابر کوششیں ہو رہی ہیں طرح طرح سے مذہبی عصبیت کی برائی کے خیال مسلمانوں کے دلوں میں بٹھائے جاتے ہیں حتیٰ کہ بہت سے نادان مسلمان خود بھی اپنی جہالت و نادانی سے مذہبی تعصب کو برا سمجھکر اسکے برخلاف اپنی آواز بلند کرتے ہیں اور مسلمانوں کو عصبیت دینیہ سے متنفر و بیزار بنا کر بد خواہوں کی غرض کو پورا کر رہے ہیں۔ حالانکہ عصبیت دینیہ پہلے ہی سے انمیں ضعیف ہو چکی تھی۔ یہ لوگ رہی سہی کو بھی مٹانا چاہتے ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ اسکی جگہ رسم ارتباط بھی جس کی مدح و ستائش میں ہر وقت وہ رطب اللسان رہتے ہیں حمق و سفاہت کی وجہ سے آجتک

پیدا نہیں کی۔ ان لوگوں کی مثال اسی طرح ہے جیسے کوئی کہ قبل اسکے کہ اپنے رہنے سہنے کے لئے جگہ تجویز کرے اپنا گھر منہدم کرے اور پھر ناچار کھلے میدانوں میں پڑکر حوادث سادیہ کا ہدف بنے اور عرضۂ ہلاکت ہو۔

یہ تعصب بھی مغربی لیاقت کا ایک ہتھکنڈا ہے جیسے دول یورپ نے بعد تجربہ چلتا ہوا ہتھیار دیکھ کر اس سے کام لینا شروع کیا ہے اور اب تک اس سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا چکی ہیں۔ مصر و ٹرکی میں بھی اسکی سیاحت کا جال بچھا ہوا ہے۔ علوم جدیدہ اور تمدن مغربی کے دلدادہ امرائے اسلام تو بہت سے اسکا شکار ہو چکے ہیں۔ جو لوگ کہ اسلام کو چھوڑ کر زندیق و دہریے بن چکے ہیں اور صرف صورت و نام کے مسلمان ہیں وہ تو اگر مذہبی تعصب کے متعلق ایسے خیالات فاسدہ رکھتے یا اُن کا اظہار کرتے ہوں تو مزید تعجب نہیں لیکن تعجب ہے اُن مسلمانوں پر جو اسلامی ایمان و عقائد پر قائم ہیں لیکن مذہبی تعصب کو بُرا کہتے ہیں۔ اور متعصبوں کو وسائل تمدن سے کام لینے کے ناقابل سمجھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ خود ان باتوں سے جامعیت اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور اپنی حالت اپنے ہاتھوں بگاڑ رہے ہیں اور مذہبی معتدل تعصب کو معدوم کر کے ملت و قوم کو معدوم کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمان غیروں کے ہاتھ جا پڑیں اور ابدالآباد تک انکی غلامی میں بسر کردیں یا فنا ہو جائیں اور اُن لوگوں سے بھی زیادہ تعجب اہل مغرب پر ہے جو اس قسم کے افکار و خیالات پھیلانے میں انتہائی کوشش کرتے ہیں اور مذہبی تعصب کی مذمت اور متعصبوں کو برا کہتے ہوئے نہیں شرماتے جبکہ خود اس قسم کے تعصب میں سب سے پیش پیش ہیں اور سب سے زیادہ دوامی تعصب پر جمے رہنے والے ہیں چنانچہ ان کے سیاسی قواعد میں سے ایک قانون عملی داعیان دین (پادری) کی مساعدت اور مدافعت ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ سی بات

بھی ہو جائے جس سے اجتماع بشری کو کسی طرح چارہ نہیں - اگرچہ وہ بات دُنیا کے
کسی کنارہ پر کیوں نہ ہو تمام مغرب میں کہرام بچ جاتا ہے اور ہر طرف سے دُہائی
شروع ہو جاتی ہے کہ لُٹ گئے مارے گئے - عیسائی دُنیا پر مصیبت کا آسمان ٹوٹ
پڑا - اتفاق کرو اور آمادۂ تدارک ہو جاؤ - اور ایسا انتظام کرو کہ آئندہ ایسا واقعہ
پیش نہ آئے تاکہ مذہبی جمعیت کو صدمہ نہ پہنچے - اگرچہ دول مغرب قومیت میں مختلف
ہیں - اور ایک دوسری کی دشمن - ایک کی سیاست دوسری کے خلاف ہے اور ایک
دوسری کو نیچا دکھانا چاہتی ہے - مگر جہاں کوئی ایسا قومی واقعہ پیش آیا یا کسی غیر
کے ہاتھوں کسی ایک عیسائی سلطنت کو صدمہ پہنچنے کا احتمال ہوا سب متحد ہو جاتی
ہیں بلکہ جان تک لڑا دیتی ہیں - اگرچہ قضیہ دنیا کے کسی بعید تر حصہ میں کیوں نہ پیش
آئے اور قومی وجنسی تعلقات ہی کیوں نہ منقطع ہو جائیں - برخلاف اسکے روئے زمین
پر فتنہ وفساد کا طوفان آ جائے اور غیر مذہب والوں کے خون میں تمام زمین ڈوب
جائے - ان کی ہمدردی کی رگ حرکت میں نہیں آتی بلکہ اس کی طرف سے تغافل عیسائی
دُنیا کا شیوہ ہوتا ہے - یہانتک کہ اگر دردناک واقعات انتہا تک پہنچ جائیں تو انکی
بلا سے - اس وقت یہ لوگ شفقت فطری و رحم طبعی کے جذبات کو ایسا داب داب
کر بیٹھتے ہیں - گویا غیر مذہب والے انکے نزدیک حیوان سے بدتر اور ناقابلِ
ہمدردی ہیں - اور ہرگز اس انسانی نوع میں سے نہیں جنکو یہ مغربی حمایت و
نصرت کے لائق سمجھتے ہوں - یہ باتیں کچھ یورپ کے مذہبی فرقہ ہی سے مختص نہیں
بلکہ دہرئے جو نہ اللہ کو مانتے ہیں اور نہ کتاب و رسول کو وہ دینداروں سے
بھی اس معاملہ میں آگے رہتے ہیں اور ان کا دینی تعصب سب سے بڑھا ہوا ہے
ہر وقت مذہبی عصبیت کی تقویت میں کوشش کرتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ اہل
مغرب میں جو زیادہ آزاد منش اور مسلم ہمدرد بنی نوع انسان ہوگا وہی مجسم مذہبی

تعصب اور غالی فی الافراط ہوگا اور اس کی بات بات سے رہبانیت ٹپکتی ہوگی اور اس کی رُوح پطرس کی رُوح ہوگی۔ مسٹر گلیڈسٹن کے لیکچروں کو پڑھو اور ان سے سبق لو۔ اگر مغربی مذہبی تعصب اعتدال سے تجاوز نہ کرتا تو ہمیں ہرگز کچھ تعرض نہ ہوتا۔ غضب تو یہی ہے کہ خود مغرب کا مذہبی تعصب تو افراط کی حد سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے اور مشرق کو تعلیم دیتا ہے کہ مذہبی تعصب چھوڑ دو حتیٰ کہ معتدل کا نام بھی نہ لو اور مذہبی "تعصب" کیا معتدل اور کیا غیر معتدل" سب گندہ ناشائستہ اور قابلِ نفرت ہے۔ بغیر اسکے مشرق ترقی نہیں کرسکتا ؎

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

اے اُمتِ مرحوم! دینی عصبیت ہی تیری زندگی ہے۔ اسکی حفاظت کر۔ یہی تیرا خون ہے اپنے ہاتھوں سے نہ بہا۔ یہی تیری روحِ رواں ہے اس کو ہاتھ سے نہ کھو۔ یہی تیری سعادت ہے۔ موت سے ادنیٰ قیمت پر تو اسے ہرگز نہ بیچ۔ تعصب ہی تیرا رابطہ ہے دھوکا میں نہ آ۔ جھوٹی اور بے سروپا باتوں سے نہ ڈر۔ اپنے فہم سے وہم کا پردہ اٹھا دے اور دینی رابطہ کے حبلِ متین کو ہاتھوں بلکہ دانتوں سے مضبوط پکڑ لے۔ اسی رابطہ نے ترکی کو عربی سے عجمی کو ہندی سے مصری کو مغربی سے ملا رکھا ہے۔ یہی رابطہ تو نسبی رابطہ کا قائم مقام ہے اسی کی بدولت تو ایک کی مصیبت کا دوسرے کو احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ دونوں میں بُعد المشرقین کیوں نہ ہو۔ یہی تعلق تو صلۂ رحم سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسی میں ہی تیری عزت ہے اور اسی میں تیری سیادت۔ اس کو سُست نہ کر۔ ہاں عدل و اعتدال سے بھی قدم ہرگز آگے نہ بڑھا۔ تمدن ہی مدارِ نظامِ عالم ہے اور اسی سے ہیئت اجتماعیہ قائم رہتی ہے۔ وہ قوم کبھی بھی کامیاب نہ ہوگی جو عدل کو ذلت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور اس کے اوامر بجا لاؤ

عہد و پیمان پورے کرو اور لوگوں کے حقوق کو پہچانو۔ سب سے اچھا معاملہ رکھو۔ جو مفاد و مضار تمہارے اور تمہارے ابنائے وطن کے مشترک ہیں اگرچہ وہ کسی ہی ملت کے پابند کیوں نہ ہو ان میں ان کا ساتھ دو۔ کیونکہ تمہاری مصلحتیں ان کی مصلحتوں سے اور ان کی مصلحتیں تمہاری مصلحتوں سے ملاتی ہیں اور خبردار مذہبی عصبیت کو ظلم و تعدی کا وسیلہ نہ بناؤ۔ اور غیروں کے حقوق پامال نہ کرو۔ تمہارا دین تم کو ان باتوں سے منع کرتا ہے اور سخت عذاب کی خبر دیتا ہے۔ اور تم اپنی عصبیت کو نہ صرف اتنے پر منحصر اور موقوف کرلو کہ چند آدمی اس کی طرف مائل ہو جائیں بلکہ سب مل کر ایک ہو اور پھر قوت و شوکت۔ حمیت و غیرت میں دوسری قوموں کا مقابلہ کرو اور سبقت کے لئے دوڑو۔ اور اپنی تمام قوت صرف کرو۔ اللہ تمہاری قوت بڑھائیگا اور تم کو ذلیل ہونے کے بعد معزز کرے گا۔ علوم نافعہ اور فضائل و کمالات انسانیہ کے حاصل کرنے میں جان توڑ کوشش کرو اور مقابلہ کے اکھاڑہ میں اتر پڑو اور اپنی عصبیت کو اتفاق و اتحاد کا وسیلہ بناؤ اور اپنے دینی بھائیوں کا ہاتھ پکڑ کر پستی سے اٹھاؤ۔ اسکے ساتھ خود تمہارا رتبہ بلند ہوگا۔ بھلائی اور نیکی پر سب مل جاؤ اور باہم مدد کرو۔ اور گناہ اور ظلم پر ہرگز تلوار نہ اٹھاؤ اور نہ امداد و اعانت کا نام لو بلکہ ایسے ارادہ والوں کو بدی کے ارتکاب سے روکو۔ یہی ان کی مدد ہے اور یہی تمہارا فرض عین ہے ٭

قانونِ شریعت اور رسم و رواج

اگر کوئی عامی مسلمان زبان سے یہ کہے کہ میں شریعت کا نہیں بلکہ رسم و رواج کا پابند ہوں تو ہمارے علماء اس کے ایسا کہنے پر کفر و الحاد اور زندقہ اور ارتداد کا

منسوب کرتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر ہر فرقہ اور طبقہ کے مسلمان قانونِ شریعت کو رسم ورواج پر قربان کرتے ہیں۔ اور کسی کو اس امر کا احساس نہیں ہوتا۔ جو حرام چیز رسم ورواج کے طور پر ناجائز سمجھی گئی ہے اس کو تو مسلمانوں نے کفر واسلام کے مابین حد فاصل قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ ویسی ہی کئی اور چیزیں شرعاً ممنوع اور حرام ہوتی ہیں اور لوگ علانیہ اس کا استعمال کرتے ہیں۔ مگر ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ لحم الخنزیر حرام ہے شرعاً مگر رسم و رواج کی رُو سے اس کے استعمال سے اس حد تک احتراز کیا جاتا ہے کہ مسلمان یہودیوں کی طرح سؤر کا نام لینے سے بھی جھجکتے ہیں۔ شراب بھی حرام ہے جو رواجاً معیوب نہیں۔ بعض مسلمان اسکو شیر مادر کی طرح حلال سمجھکر پیتے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے ایسا کرنے والوں کی سوسائٹی سے اجتناب کیا ہے ؟

قوانین شریعت سے اعراض اور رسم ورواج کی پابندی مسلمانوں کے دلوں میں یہاں تک سمائی ہوئی ہے کہ جہاں اڑھائی روپیہ سینکڑہ زکوٰۃ دینا نہایت مشکل معلوم دیتا ہے اور اس سے بچنے کے واسطے سینکڑوں حیلے حوالے تراشے جاتے ہیں وہاں شادی و مرگ کی تقریبوں پر ناک کٹنے کے خوف سے ہزاروں روپیہ قرض لیکر خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ غور کرو۔ زکوٰۃ دینا خدا کا حکم ہے۔ اور اگر اس حکم کی کما حقہ تعمیل کی جائے تو مسلمانوں کے پاس ایک کثیر رقم جمع ہو جائے جو قومی فنڈ کا کام دے سکے بلکہ یہی ایک قومی فنڈ مسلمانوں کے تمام نہیں تو اکثر قومی کاموں کا کفیل بن سکتا ہے۔ شادی و مرگ پر جو روپیہ خرچ کیا جاتا ہے وہ محض رسم ورواج کی پابندی ہے۔ اور جن رسوم پر یہ روپیہ خرچ کرتے ہیں ان سب کی بنا توہمات پر ہوتی ہے۔ ان میں بعض بدعت پر مبنی ہوتے ہیں اور بعض تو شرک و کفر

یک منتج ہوتے ہیں۔ ان رسوم کی پابندی میں مسلمان روپیہ خرچ کرنے والے خاندان کی بربادی یک کی پروا نہیں کرتے۔ اور نہ انہیں اس بات کا خیال ہوتا ہے۔ کہ آیا ایسی باتوں کی پابندی میں ہمارا ایمان و اسلام قائم رہتا ہے یا نہیں۔ گویا خدا کے حکم کو رسم و رواج کی پابندی پر قربان کیا جاتا ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ؎

یہ بات عام طور پر مشاہدہ میں آچکی ہے کہ لوگ شریعت کے احکام کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن اہل دنیا کی رسم و رواج اور برادری کا بڑا پاس کرتے ہیں۔ دیکھو حکیم سنائیؒ اس واقعہ سے نصیحت کا کیا پہلو پیدا کرتے ہیں ؎

تر ا یزداں ہمی گوید کہ در دنیا مخور بادہ ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا
ز بہر دیں تو نگذاری حرام از حرمت یزداں ولیک از بہر تن ہاتی حلال از گفتۂ ترسا

یعنی خدا نے حکم دیا ہے کہ شراب نہ پیو اور عیسائی (ڈاکٹر) کہتا ہے۔ کہ صفراء میں حلوا نہ کھاؤ۔ حلوہ حلال چیز تھی۔ اس کو تم نے ایک ڈاکٹر کے کہنے سے چھوڑ دیا۔ اور اور شراب جس کو تم خود بھی حرام سمجھتے ہو اور وہ مضر صحت بھی ہے۔ خدا کے کہنے سے نہیں چھوڑتے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ تم خدا کے حکم کو ایک ڈاکٹر کی بات کے برابر بھی نہیں سمجھتے ؎

جھٹکے کا گوشت حرام ہے اور اس کی حرمت سور کے گوشت کی طرح موکد رسم و رواج بھی ہے۔ اسی بناء پر مسلمان جھٹکے کے گوشت کو چھونے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔
اب سوال یہ ہے کہ کیا جھٹکے کے جانور کے چمڑے کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ اکثر مسلمان اس کے چمڑے سے ایسی نفرت کرتے ہیں جیسی سور کے چمڑے سے کی جاتی ہے۔ لیکن بعض آزاد خیال مسلمان اس نفرت کو شریعت کی پیروی پر محمول نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو رسم و رواج کی پابندی پر مبنی سمجھتے ہیں ؎
قدیم سے سنت اللہ یوں جاری ہے کہ جب نئی شریعت آئے تو اس کا ملکی سماج

سے مقابلہ کرایا جاتا ہے اسلئے کہ یہی شریعت کے امتداد اور بعد کے سبب سے اس میں طرح طرح کے افراط و تفریط اور قسم قسم کی کمی بیشی کو دخل ہو جاتا ہے۔ اور اس صورت میں اصلی صراط مستقیم پر لوگوں کو چلانا گویا ان سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور جب ایسی حالت قوم کی ہوا کرتی ہے تو اس وقت خدا کی طرف سے شریعت کی تجدید کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کو مبعوث ہونے کے وقت یہی وقت پیش آتی تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے ہی وقت میں مبعوث ہوئے۔ کہ تمام مذاہب حقہ اور باطلہ میں طرح طرح کی کمی بیشی آگئی تھی اسلئے آپ کو سخت مقابلہ کا موقع ہوا۔ جو لوگ مشرف با اسلام ہوئے۔ گو انہوں نے شریعت کو نہایت نیک نیتی اور سچے اعتقاد سے لبیک کہا۔ اور دل و جان سے اس کے گرویدہ ہوئے۔ مگر عورتوں کے گروہ پر وہ بھی پورا پورا شریعت کا سکہ نہ بٹھا سکے۔ ان کی جہالت اور دینی نقصان نے بعض پرانے رسوم سے ان کو پورے طور پر باز نہ رکھا چنانچہ کسی عزیز و اقارب کے فوت ہونے پر جاہلانہ بین کی رسم بہت کم موقوف ہو سکی چنانچہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سے ان کے متعلقین کے نوحہ و شور و گریہ پر آنحضرت صلعم نے جب دیکھا کہ یہ باز نہیں آتیں تو فرمایا کہ ان کے منہ میں مٹی ڈالدو۔ اور یہ بھی فرمایا کہ یہ جہالت کی رسم میری اُمت سے مفقود نہ ہوئی۔ عرب کی حالت تو پھر بھی بہت کچھ سدھر گئی۔ تمام رسوم قبیحہ شرکیہ وغیرہ دور ہوگئیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ شیطان عرب کے علاقہ سے نا امید ہوگیا ہے کہ اس کی پرستش کیجاوے۔ ہندوستان میں بھی جب اسلام آیا تو اُسنے اگرچہ پورے طور پر اپنا سکہ جمایا مگر بہت سے رسوم کا بقایا صدیوں کے گذر جانے پر بدستور چلا آتا ہے۔ چنانچہ لباس اور شادی اور غمی کے رسوم حتیٰ کہ حقوق اللہ کے ترکہ میں اکثر اہل اسلام قدیم رسوم کے پابند ہیں۔ منجملہ ان کے مسئلہ میراث اور

شادی اور غمی اور لباس قابلِ غور ہیں ؎

میراث

سب سے اہم تم بالشان رواج جو کہ شریعت کے خلاف بعض مسلمانوں میں جاری ہے وہ یہ ہے کہ بیٹیوں اور بہنوں کو میراث سے محروم کیا جاتا ہے - چنانچہ اہلِ اسلام کے زمینداروں میں اسی پر عمل ہے حکومت نے بھی اسی کو قانون قرار دیا - حکومت کو تو اس کی ضرورت نہ تھی - مگر خود مسلمانوں نے ہی اس مخالف شریعت رواج کو نہیں چھوڑا - کیسے غضب کی بات ہے کہ شریعت اسلامی تو بیٹیوں اور بہنوں کو وارث قرار دیتی ہے اور یہ نام کے مسلمان ان کو محروم رکھتے ہیں - حالانکہ قرآن مجید میں میراث کی تقسیم کے بعد ساتھ ہی یہ فرمایا ہے تلك حدود الله ومن يطع الله ورسوله يدخله جنّٰتٍ تجري من تحتها الانهر خالدين فيها وذلك الفوز العظيم ومن يعص الله ورسوله ويتعد حدوده يدخله نارا خالدا فيها وله عذاب مهين[1] پس ایسا برا رواج جس میں حدود اللہ سے تجاوز پایا جائے - اگر صراحتاً اسکو جائز اور صحیح مانا جائے تو بلا شبہ انکار حکم خداوندی لازم آئیگا جس کو شرعی الفاظ میں کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کے دائمی عذاب کی وعید آچکی ہے - اور اگر ناجائز سمجھا جائے مگر محض قوم کا رواج قرار دیکر اس کا اتباع کیا جائے تو فسق میں ضرور داخل ہوگا - بہرحال مسلمانوں کو اس کا ترک لازم ہے اور مسلمان اس رواج کی وجہ سے خود نقصان اٹھا رہے ہیں - بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ باوجود بیٹی کے موجود ہونے کے دور کے رشتہ دار زمین اور جائداد پر قابض ہو جاتے ہیں اور والدین

---

[1] یہ خدائی حدیں ہیں جو کوئی شخص خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت کریگا خدا اُسکو ایسے باغوں میں داخل کریگا جسکے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور یہ بڑی کامیابی ہوگی - اور جو خدا اور اُسکے رسول کی نافرمانی کریگا اور حدود اللہ سے تجاوز کریگا تو اُسکو خدا دوزخ میں ڈالیگا جس میں وہ ہمیشہ رہیگا اور اُسکو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا ؎

ہاتھ ملتے اس دنیا سے چل دیتے ہیں۔ کردنی خویش آمدنی پیش کا مضمون صادق آتا ہے سچ ہے شریعت حقہ کا قانون ایسا بہتر اور عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہونا ممکن نہیں۔ یورپ میں جائداد بڑے بیٹے کے نام ہو جاتی ہے۔ ہمارے بعض نوجوان یورپ کے مہذب تعلیم یافتہ بھی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں یہ قانون جاری ہو۔ مگر افسوس کہ انہوں نے قانونِ قرآنی کا کچھ پاس نہیں رکھا۔ رفتار زمانہ کے مطابق اس میں کانٹ چھانٹ کرنے کی نئے دن تجویزیں سوچتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اس میں بڑی مصلحت یہ تھی کہ ہر ایک وارث اپنے حصہ کا مالک و متصرف ہوتا ہے۔ اسکو ہر طرح کا اختیار ہے۔ اگر اس کو بااختیار نہ بنایا جائے تو بعض دفعہ اس کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور بڑے بھائی کا بیجا تصرف اس کے حق واجب کو پامال کرتا ہے۔ مگر یہ خیال عموماً اظہار کیا جاتا ہے کہ بصورت تقسیم ہر ایک اپنے اپنے حصہ کو برباد کریگا۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا بڑے بیٹے کے نام ہونے سے جیسا کہ بعض کا خیال ہے یہ احتمال اٹھ جاتا ہے۔ بلکہ پھر تو اور بھی قوی احتمال ہے کیونکہ ایک شخص ہی کے نام تمام جائداد ہونے سے پورا احتمال ہے کہ وہ اسکو بُری طرح تصرف[لہ]

[لہ] مگر ایک بداعتقاد نیچری صرف اسی بات پر کٹ حجتی سے باز نہیں آ سکتا۔ کیونکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ بذریعہ قواعد یا قانون ملکی بڑے بیٹے کے اختیارات کو محدود کیا جاسکتا ہے جس سے وہ بیدل پابندی قواعد یا قانون کوئی ناجائز تصرف جائداد مشترکہ میں نہ کریگا اور ممکن ہے کہ وہ بعض نظائر اس قسم کے پیش کرکے اپنے دعویٰ کو مضبوط کرے۔ سو اس کے جواب میں ہم یہ کہینگے کہ بیشک یہ صحیح ہے۔ مگر ذرا غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ یہ صورت بھی کلی طور پر حفظ جائداد کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ یہ امر بہرحال مسلّم ہے کہ شخصی ضرورتیں اور شخصی عزم اور ارادہ اپنے علیحدہ علیحدہ تعداد میں محدود ہوتے ہیں۔ اور ان میں بلحاظ کیفیت اور کمیت کے یکسانیت کا بہت کم خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلئے یہ کبھی قرین قیاس نہیں کہ اختلاف ضرورت اور اختلاف عزم و ارادہ جو فطری امور ہیں اپنے مقتضا پر عمل نہ کریں۔ اور اگر بذریعہ قواعد یا قانون انکے عمل کو روکا جائیگا تو وہ کسی دوسری صورت میں اپنا برا اثر ظاہر کئے بغیر نہیں رہینگے۔ جسکے برے نتائج انسانی اخلاق اور طرز معاشرت میں ظہور پذیر ہو کر سلسلہ اتحاد عامہ کو توڑ ڈالینگے۔ یہ ایک ایسا واضح امر ہے جس سے کوئی سلیم الطبع آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ اور چند ایک نظائر کا پیش کردینا مخصم کیلئے اس وقت حجت ہو سکتا ہے جبکہ اس امر کی خوب چھان بین کرلیجائے۔ بقیہ صـ ۱۳۲

ہیں لائے اور مال صفت دل پر رحم پر عمل کرے۔ اور اگر عدل و رحم کا احتمال بڑے بیٹے میں ہے تو ہر ایک کے لئے کیوں اس احتمال کو ترجیح نہیں دیجاتی کہ وہ مال کو بُری طرح خرچ کرے گا۔ لیکن اگر شریعت کے مطابق ہر ایک مسلمان عمل کرے تو پھر کوئی ضرورت نہیں کہ تمام مال بڑے بیٹے کے قبضہ میں رہے اور چھوٹے کو اس کا دست نگر بنایا جائے جو اپنے باپ سے وہی نسبت رکھتا ہے جو بڑا بھائی۔ اور اگر شریعت کی پابندی نہیں تو پھر چھوٹے وارثوں کو محروم رکھنا محض حماقت ہے۔ بہر حال حدود اللہ کی پابندی لازم ہے جس سے کسی مسلمان کا مسلمان بنا رہنا پایا جاتا ہے۔ صرف وہمی اور خیالی امور کی بنا پر قرانی اور خدائی قانون کا بدل دینا مسلم کی شان سے بعید ہے۔ اور سچ پوچھو تو اسی قانون الہٰی یعنی قرآنی حدود و احکام کے ترک عمل سے مسلمان نکبت

بقیہ حاشیہ ۱۳۲ کہ جو صورت اشتراک جائداد کسی قوم میں مسلم ہو چکی ہے۔ اس میں مذکورہ بالا فطری تقاضے کوئی کسی قسم کے برے نتائج پیدا نہیں ہوتے بلکہ صورت حال ہمارے مطلب کی تائید کرتی ہے کیونکہ تمام قوانین ہمیشہ اسے دن ترمیم طلب قرار پا کر کسی نئی صورت میں بدلتے رہتے ہیں اور جب کسی نئی صورت میں چند ایک غلطیوں کا پتہ لگ جاتا ہے تو اس میں پھر ترمیم یا تنسیخ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ امر کافی حجت ہے اس دعوے کے ثبوت میں کہ مجوزہ صورت اشتراک گو بظاہر چند ایک مصالح پر مشتمل ہو مگر تدریج اسکے برے نتائج جو فطرتاً پیدا ہوتے ہیں بالآخر قومی وبال کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ اور اخلاقی نقصانات کا موجب ہو کر انسانی ہمدردی کو بالکل دور کر دیتے ہیں۔ برخلاف اسکے اگر جب ترکہ کسی متوفی کا بموجب احکام شریعت اسلام تقسیم کیا جاوے تو اس میں ہر ایک شخص اپنی جائداد کو اپنی حسب مرضی استعمال کر سکتا ہے اور اپنی طبعی آزادی کو جو بصورت اشتراک زائل ہو جاتی ہے قائم رکھ سکتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ کیوں بصورت اشتراک جائداد کسی قبیلے کے افراد کو صرف ایک ہی دائرہ میں محدود رکھا جائے۔ کیونکہ حالات طبعی اس امر کے متقاضی ہیں کہ مختلف افراد مختلف طور پر سرمایہ ملکی کو صرف کر کے اپنی دولت بڑھا لیں۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ فائدہ تو ہر ایک کی ضرورت کا پورا کرنا اسی جائداد سے کیا جا سکتا ہے خواہ ایک شخص زیادہ منتفع ہو اور دوسرا کم تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً یہ حیثیت محض فرضی خیال ہے۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو ایک پشت کے بعد اس پر عملدرآمد کرنا مشکل بلکہ محال ہو جائیگا کیونکہ افراد کے بڑھنے پر ان کی ضروریات بڑھینگی اور جائداد کتنی نہیں ہوتی۔ اور اگر کہا جائے کہ افراد کے بڑھنے پر ساتھ ساتھ جائداد میں بھی ترقی ہوتی چلی جائیگی۔ اور اس لئے تمام افراد کی ضروریات خواہ کیسی ہی مختلف ہوں اس جائداد مشترکہ سے پوری ہو سکینگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ یقینی امر نہیں کہ جائداد اسی نسبت سے ترقی کرے جس نسبت سے کسی قبیلہ کے افراد ترقی کرتے ہیں۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو اسی طرح تیسری یا چوتھی نسل کے لوگ اپنے اپنے قویٰ طبعیہ کے عمل میں نہایت ہی ناقابل ہو جائینگے کیونکہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب اسے ضروریات بآسانی میسر آئیں تو مشقت و محنت میں پڑنا گوارا نہیں کرتی۔ یہ بات دوسری یا تیسری نسل تک تو ممکن ہے کہ موخر ہو مگر اس طرح اصلاً نہیں یقیناً الہٰی رضا ہو گی ہر صورت تقسیم جائداد کا اسلامی مسئلہ ایسا جامع اور مکمل ہے جو بیشمار نتائج بہیہ پر مشتمل ہے۔ اور جو قومی ترقی اور انسانی فطری آزادی اور شخصی حقوق کی نگہداشت میں عام اقوام کے قانون تقسیم جائداد سے سبقت لے گیا ہے ۱۲

دادا باپ کے گڑھے میں جا گرے ہیں۔ اور لطف یہ کہ قومی ترقی احکام الٰہی کو ترک کرنے ہی میں سمجھی گئی ہے نعوذ باللہ۔

نکاح

شادی کے موقعہ پر اکثر مسلمان ہند کی رسموں پر عملدرآمد کرتے نظر آتے ہیں۔ جن کا کتاب وسنت میں کہیں پتہ نہیں ملتا۔ شادی پر جو جو بدعات قبیحہ ظہور پذیر ہوتی ہیں ان کا عملدرآمد بڑے بڑے اونچے شریف خاندانوں میں بھی ہے۔ سہرا کا رواج بالکل ہندوؤں سے لیا گیا ہے۔ سہرے کے مضمون کو ہندی شاعروں نے کس کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ مگر عرب میں مطلقاً اب تک اس کو کوئی جانتا تک بھی نہیں۔ علیٰ ہذا کنگنا یعنی گانا باندھنا۔ بنے کی چھڑی یا چھری کا پکڑنا۔ اور جب شادی کے دن قریب ہوں تو تیل چڑھنے کی رسم اور جب دولہا دلہن اپنے سسرال میں جائیں تو دروازہ پر تیل کا گرانا اور عورتوں کا ایسے موقعہ پر فحش الفاظ سے واہیات گیت گانا اور رونمائی کے وقت مقررہ رسوم عمل میں لانا ناچ رنگ اور آتشبازی اور باجے وغیرہ کا جو فضول اور اسراف کے علاوہ برباد کن رسمیں ہیں وغیرہ وغیرہ ان سب بدعات کا ہر ایک مسلمان کو بالعموم اور اہل علم کو بالخصوص انسداد کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ سب بدعات مشرکین سے اخذ کئے گئے ہیں اور اسلام جیسے پاک دین کے لئے موجب ننگ و عار ہیں۔ شریعت نے نہایت سادہ طور پر شادی نکاح کا دستور قائم کر دیا ہے جس پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں کوئی امر ایسا جائز نہیں رکھا گیا جو شرعی یا اخلاقی طور پر ناپسند رکھا گیا ہو۔ اور نہ اس دستور پر چلنے سے کسی کو کسی قسم کی زحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج کل بجاجی

ے بات تو ٹھیک ہے مگر مردوں کو تو ممکن ہے کہ کسی حد تک بچا لیا جائے لیکن عورتوں کو ایسے رسوم قبیحہ سے دور رکھنا اگر ناممکن نہیں تو اسکے دشوار ہونے میں کیا شک ہے درحقیقت ایسے رسوم کی اشاعت عورتوں ہی کے ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے۔ جو کسی کی بھی نہیں سنتا۔ ۱۲ منہ

کی رسم صرف نام آوری کے لئے کی جاتی ہے - گو اس میں شادی والے کا دیوالہ نکل جاتے مگر لوگوں سے واہ واہ اور تحسین آوری کرانے اور اپنی بڑائی قائم رکھنے کو خواہ نخواہ روپیہ قرض لیکر بھی کرتے ہیں مگر سنّت سے صرف اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے نکاح کے بعد دعوتِ ولیمہ فرمائی ہے اور اس میں بھی مختصر کھانا کھجوریں اور میوہ ہوتا تھا - اور بڑی دعوت ولیمہ مسنونہ حضرت ام المومنین زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح میں ہوئی تھی جسمیں روٹی گوشت کھلایا تھا - بہرحال ولیمہ کی رسم سنت کے موافق ہے - مگر وہ بھی اپنی حیثیت کے مطابق ہونی چاہیئے نہ اسراف ہو نہ تبذیر -

نیوتا یا تنبولی کی رسم بھی محض ایک رواج ہے اور بظاہر آیہ ولا تمنن تستکثر کے منافی معلوم ہوتی ہے - البتہ اگر بطور عطیہ بغرض ازدیادِ محبت بلا نیت معاوضہ ایسے موقعپر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ؛

غمی میّت کے دفن کے وقت بعض رسوم خلاف شریعت جاری ہیں مثلاً چھاتیوں کا پیٹنا اور بین کرنا - بالوں کا نوچنا جنکی صریح ممانعت حدیث میں آئی ہے - آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں - لیس منا من ضرب الخدود وشق الجیوب ودعا بدعوۃ الجاھلیۃ (مشکوٰۃ) [1]

اب یہاں سے محرّم کی بدعات کو قیاس کیجیئے امام حسینؓ کی شہادت کے واقعہ پر کیسے ماتم ہوتا ہے - ایسی رسموں کا رواج شریعتِ اسلامیہ کے بالکل برخلاف ہے کیسے اندھیر کی بات ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو یہ فرمائیں کہ جو

[1] یعنی جو عورتیں منہ پیٹتی اور گریبانوں کو پھاڑتی ہیں اور جہالت کے بین کرتی ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں [2] مسلمانوں نے رسوم محرم کو ہندوؤں کے دسہرہ سے پیچھے نہیں رہنے دیا - ۱۲ اور خود ایسے رسوم کو بجا لائیں تو حرام ہو، اگر مسلمان ایسا کریں تو جائز؟ سچ تو یہ ہے کہ اگر حضرات ائمہ اہل بیت زندہ ہوکر مسلمانوں کی ان نازیبا رسوم کا ملاحظہ فرماویں تو یقیناً وہ ان لوگوں کے سلام سے دل پر علانیہ برأت ظاہر کریں - ۱۲ منہ

ایسا ماتم کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ اور مسلمان ہیں کہ ایسے ماتم کو موجب مغفرت و ثواب دارین سمجھتے ہیں۔ ہاں ایسے واقعہ کے ذکر کے وقت یا اپنے کسی عزیز کے فوت ہونے پر صرف آنسو بہانا اور غمزدہ ہونا کچھ مضائقہ نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ تو رحمت ہے ایسے حادثہ سے دل کا نرم ہونا ایک طبعی امر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صاحبزادہ کے انتقال پر آبدیدہ ہو گئے تھے۔ امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اپنے والد کے واقعہ جانکاہ کو یاد کر کے بیہوش ہوجایا کرتے۔ اور بسا اوقات پانی پینے کے وقت گلاس میں آنسو گرایا کرتے تھے۔ اپنے والد ماجد کے پیاسے شہید ہونے کو یاد کر کے روتے۔ باقی رسوم محض نمود کے لئے جو بعض جگہ مروج ہیں کہ اِدھر مُردہ گھر میں پڑا ہے اور اُدھر برادری نے گھیرا کہ اس قدر کھانڈ اور میدہ اور گھی ہو اور حلوہ تیار ہو۔ جو قبل از اُٹھانے مردہ کے ملا اور طالبوں وغیرہ کو کھلایا جائے۔ حالانکہ یہ رسم بھی محض رواج ہے۔ چاہئے یہ کہ اس روز اُس گھر میں کچھ کھایا نہ جائے۔ برادری یا کسی دوست کو اس روز کھانا ماتم کے گھر والوں کے پاس بھیجنا چاہئے۔ چنانچہ یہ دستور بھی ہے اور بعد اس کے البتہ یہ جو رسم تیجا اور ساتا اور چہلم اور ششماہی اور برسی ہے اس کو گو بدعت کہہ سکتے ہیں مگر سیئہ نہیں بلکہ حسنہ[1] کیونکہ اس میں ایصال ثواب مقصود ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ مردہ غریب کی طرح ہوتا ہے اس لئے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورہ اذا السماء انشقت کی تفسیر میں جہاں مُردہ کے حالات لکھے ہیں لکھا ہے کہ پہلے وقت میں مردہ کو ایصال ثواب کی سخت ضرورت ہوتی ہے اس لئے لوگ چہلم بلکہ برس تک ایصال ثواب کرتے رہیں ٭

ہاں البتہ بھاجی کی روٹی جو ایسے موقعوں پر تقسیم ہوتی ہے یہ رسم قبیح ہے

---

[1] دن کا مقرر کرنا ضروری نہیں ۱۲ منہ

اس کو ترک کر دینا چاہیے جس سے مُردہ کو کوئی فائدہ نہیں - اور محض نام و نمود کے لیے کی جاتی ہے - بلکہ مستحقین غربا کو کھانا کھلانا چاہیے ؞

وضع و قطع لباس

وضع و قطع میں ہر ایک قوم کا ایک شعار ہوتا ہے - دیکھو قوم سکھ میں ان کے گرو نے ایک شعار قائم کر دیا کہ تم بال کسی جگہ کے بھی ہوں ہرگز نہ لینا - چنانچہ اس پر وہ سختی سے پابند ہیں کبھی ترک نہیں کرتے - علیٰ ہٰذا ہنود میں چوٹی کا رکھنا - اسلام نے بھی اپنا شعار قائم لیا - اور سنّت ابراہیمی کے مطابق رسم ختنہ اور حجامت اور مونچھوں کا کٹوانا اور داڑھی کا بڑھانا اور لباس کے آداب کا لحاظ رکھنا - مگر مُلکی رواج نے اس پر بھی قابو پایا - ریاستوں میں دیکھو کہ اسی قسم کا رواج مرغوب طبائع ہے - عموماً عمامہ رنگین یا دوہرا عمامہ ریاست کی وضع کا مسلمان باندھتے ہیں - حیدرآباد میں جا کر دیکھو کہ وہاں بھی ریاست کا خاص لباس ہے جو عموماً پہنا جاتا ہے - ہمارے پنجاب میں آجکل خصوصاً مغربیت کا زیادہ زور ہے - اور عموماً لوگ اسی کے دلدادہ ہو رہے ہیں - وضع و قطع لباس عموماً مغربی طرز پر ہوتا جاتا ہے - انگریزی خواں عموماً داڑھی منڈھانے اور مونچھوں کے بڑھانے پر مائل ہیں اور با اینہمہ اس کو گناہ نہیں سمجھتے کوٹ پتلون وغیرہ لباس کے فریفتہ ہیں - سچ ہے الناس علےٰ دین ملوکہم کا مقولہ[1] بہت درست ہے - اور پھر اس میں طرح طرح کی جدّتیں نکلتی جاتی ہیں - غرضیکہ ان لوگوں نے قومی شعار کے فلسفہ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے - چاہیے تو یہ تھا کہ ہر ایک قوم کی وردی جدا ہو جس سے امتیاز ہو سکے مگر نہیں یہاں تو مقصود ہے جدت طرازی - الغرض شریعت نے جو وضع و قطع اور شعار اسلامی مقرر کر دیا ہے اُس کے مطابق چلنا اہل اسلام کا شیوہ ہونا چاہیے - بعض کمینہ فطرت لوگ

لہ یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقہ پر ہوا کرتے ہیں ۱۲ منہ

ایسے بھی ہیں جو داڑھی اور لباس کے متعلق اکثر اوقات استہزا کیا کرتے ہیں عموماً یہ وہ لوگ ہیں جو احکام شریعت کا جوا گردن سے اتار بیٹھے ہیں۔ شرعاً یہ لوگ واجب التعزیر ہیں ؛

اسلام اور حریت

خلاصِ حافظ از آں زلفِ تابدار مباد
کہ بستگانِ کمندِ تو رستگار انند (حافظ)

اس وقت عام خیال یہ ہے کہ مذہب ایک قسم کی قید ہے اور پابندی مذہب بالعموم مانع ترقی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ بعض تعلیم یافتہ مغربی روشنی کے دلدادہ مسلمان بھی اسی خیالِ غلط میں مبتلا ہیں۔ اسی بنا پر آزادی یورپ کی جابجا مدح سرائی ہے۔ اور قید مذہب سے آزادی حاصل کرنے کا سبق دیا جاتا ہے ہمارا مطلب یہاں آزادی کے مختلف پہلوؤں کو بالاجمال دکھلانے کا ہے۔ اور بعض سلف صالحین کے حالات اور ان کی روش زندگی سے اس کا ثبوت دینا ہے کہ اسلام نے کس قدر آزادیٔ خیالات کی عملی قوتیں عطا کیں اور کس طرح زندہ مثالیں ان اصول پر کاربند ہونے کی وجہ سے پیدا کرکے دنیا کو دکھلا دیں۔ اور اپنی صداقت کا عملی ثبوت دیا ؛

آزادی کے مفہوم میں آزادی خیال۔ آزادی قول اور آزادی عمل داخل ہیں اور یہی مہتم بالشان مسائل ہیں جو آجکل بہت زور کے ساتھ معرض بحث میں آرہے ہیں۔

--- آزادی کی بنا مسئلہ مساوات حقوق بنی آدم پر مبنی ہے یعنی ہر ایک انسان

بلا لحاظ رنگ و قوم و ملک حقوق میں مساوی ہے اور فطرتاً سب کو ایک ہی قوائے عقلی اور عملی دیئے گئے ہیں۔ اِن کے تصرف کرنے۔ ترقی دینے اور استفادہ حاصل کرنے کا ہر ایک یکساں حق رکھتا ہے۔ یہی حقوق طبعی یا پیدائشی کے نام سے موسوم ہیں اور آزادی کے مدعیان کو سب سے پہلے یہی حقوق تسلیم کرنا پڑتے ہیں۔

مگر چونکہ انسان مدنی الطبع ہے لہذا عملی تعلقات زندگی میں ہر شخص کے ذاتی حقوق نفع عامہ خلائق کے تابع ہیں۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اگر کسی فرد کی ذاتی آزادی عامۂ خلائق کے خلاف اور مضرت رساں ثابت ہوتی ہے تو وہ شخص اس آزادی سے مستفید ہونے کا بحیثیت مدنی الطبع ہونے کے مجاز نہیں ہو سکتا کیونکہ مدنی الطبع ہونا اس کا امتیازی جوہر ہے۔ اسی اصول پر سرخیل فلاسفہ یعنی ارسطاطالیس نے آزادی کو عمل نیک تسلیم کیا ہے۔ اور اس حد تک ہر شخص کی آزادی کو مقید کیا ہے اور خود غرضی کی مذمت کی ہے کیونکہ خود غرضی انہیں قوانین کی خلاف ورزی کا نام ہے ورنہ فطرت میں ہر انسان اپنے قیام حیات اور جلب منفعت اور آزادانہ عمل توی پر مجبور ہے۔

سوسائٹی اور انسان کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہایت قابل غور و بحث طلب ہے اب سوال یہ ہے کہ عمل نیک سے کیا مطلب ہے اور اس کی شناخت کیا ہے۔ یہ واقعی دلچسپ مسئلہ ہے کیونکہ ہر شخص کی آزادی اسی اصل اصول کی تابع ہے۔ اس جگہ یہ امر ظاہر کر دینا قرین مصلحت ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ آزادی اور پابندی قواعد باہم دو متضاد امر ہیں اور اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو آزادی کسی قانون یا اصول کی پابند نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ خیال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جو آزادی اور مطلق العنانی میں فرق نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کی آزادی حقیقی اور جائز آزادی ایک سلسلۂ قواعد کے تابع ہے۔ جب حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو آزادی مطلق العنانی بن جاتی ہے جو موجب ہلاکت ہے۔

کسی قانون فطرت کے تابع ہونا آزادی میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتا۔ اور جو لوگ کسی معقول جائز قانون (شرعی یا عرفی) کو مانع آزادی خیال کرتے ہیں۔ وہ صراط مستقیم سے انحراف کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے قواعد کسی فرد واحد کے جابرانہ طور پر ذاتی غرض کے حصول کے واسطے وضع نہیں کئے جاتے بلکہ خود حضرت انسان کی ہیئات نفسانیہ کا نتیجہ ہیں جو اسکے لئے موجب صلاح و فلاح ہیں۔ غور و فکر سے ایسے قواعد کا منشا سمجھ میں آسکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کلام الٰہی میں ارشاد ہوتا ہے کہ زمینی اور آسمانی کائنات میں غور کرو کیونکہ ایسا غور و خوض فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ دیکھو حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ جس کو محدث دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں کھولا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک قسم کی آزادی کی حد معین ہے جس کے اندر کوئی شخص آزاد رہ سکتا ہے اور اس حد سے زیادہ تجاوز نہیں کر سکتا یا اینہمہ مذکورہ بالا حد کی آزادی کو انسان مدت العمر میں بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسی حد و غایت کی تکمیل کو ایک مقصد اہم مانا گیا ہے۔ بعض آثار میں وارد ہوا ہے یا بنی آدم ان لکم معالم فانتھوا الی معالمکم وان لکم نھایۃ فانتھوا الی نھایتکم[1]۔ یہ الفاظ صاف طور پر انسان کو ایک حد معین تک محدود رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ انسان کی اعلےٰ سے اعلےٰ ترقی یہ ہے کہ وہ ہیئات نفسانیہ کی حد تکمیل تک رسائی حاصل کرے اور یہ مقام انسان کو اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ قوائے بہیمیہ کو قوائے ملکیہ کے تابع رکھ سکے یعنی مقصود بالذات کی تکمیل میں جن خواہشات کا پورا کرنا حارج و مضر ہو ان سے بچنا چاہئے اور انہیں خواہشات کا نام شرعاً اور عرفاً گناہ ہے۔ اور جو امور حصول مقصود بالذات میں معین ہوں وہ عمل خیر و سعادت ہیں۔ ملاحظہ ہو تعریف بر و اثم جس کو شاہ ولی اللہ صاحب نے بدیں الفاظ قلمبند کیا ہے :۔

[1] اے اولادِ آدم تمہارے لئے حدود کے نشانات ہیں سو انہیں تک محدود رہو اور ایک غایت ہے اس [illegible]

البر کل عمل یفعلہ الانسان قضیۃ الانقیادہ للملاء الاعلےٰ وضمحلالہ فی تلقی الالہام من اللّٰہ وصیرورتہ فانیا فی مراد الحق وکل عمل یجازی علیہ خیراً فی الدنیا والاٰخرۃ وکل عمل یصلح الارتفاقات التی بنی علیہا نظاما للانسان وکل عمل یفید حالۃ الانقیاد ویرفع الحجب والاثم کل عمل یفعلہ الانسان قضیۃ لانقیادہ للشیطان وصیرورتہ فانیا فی مرادہ وکل عمل یجری علیہ شر فی الدنیا والاٰخرۃ وکل عمل یفسد الارتفاقات وکل عمل یفید قضیۃ متضادۃ للانقیاد ویولد الحجب ۔

اس جگہ سے ایک نہایت ضروری امر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مطلقاً ہر خواہش کا فنا کرنا اور اپنے روزانہ زندگی کی خواہشوں کو چھوڑ دینا صحیح اصول زندگی کے خلاف ہے۔ اِسی وجہ سے حدیث شریف میں ارشاد ہے لا رھبانیۃ فی الاسلام اور یہی اسلامی اخلاق کا معیار ہے۔ اسلام کا اصول وہ ہے جو شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے ران السعادۃ الحقیقیۃ ھی انقیاد البہیمیۃ للنفس الناطقۃ واتباع الھوی للعقل وکون النفس الناطقۃ قاھرۃ علے البہیمیۃ والعقل غالب علےٰ الھوی وسائر الخصوصیات مُلغاۃ (حجۃ اللہ البالغہ۔ باب مبحث السعادۃ)۔

یورپ کے بعض فلاسفروں کا بھی یہی خیال ہے اور ہمارے اسلام کے مایۂ ناز حجۃ الاسلام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں پانچویں صدی ہجری ہی میں اس مسئلہ کو بڑے زور شور سے لکھا کہ نعمتِ حقیقی مقصود کو پا لینے کا نام ہے اور دیگر اشیاء مثل مال و دولت وجاہ و حشم وحکومت و اولاد وغیرہ بوجہ مقصود بالذات کے حصول میں معاون ہونے کے نعمت ہیں۔ اور اس کے تفاوت مدارج میں وہی نسبت قرب کے اعتبار سے ہے۔ وسیلے سے مراد وہ امر ہے جو تکمیل ہیئات نفسانیہ میں خارج نہ ہو بلکہ ع

عاشقاں ہردم رضائے دوست میدانند دوست

وعدۂ دیدار چوں آمد بجنت لاجرم ——— عاشقاں جنت برائے دوست میدانند دوست

عاشقانِ جمالِ حقیقی کا تو یہ قول ہے ان کان الجنۃ بدون جمالہ ووصالہ فواویلاہ وان کان الجحیم مع وصالہ وجمالہ فوا شوقاہ

از سرِ کوئش اگر سوئے بہشتم می برند
پائے ننہم کاندریں جا وعدۂ دیدار نیست

نعمتہائے آخروی کو بھی انہوں نے اسی قانون کے تابع کر دیا ہے یعنی مسلمانوں کا مقصد اصلی حصولِ جنت نہیں ہے۔ اور نہ وہ اس کے طالب ہیں چنانچہ حضرت رابعہ بصریہ سے بھی یہی مروی ہے یا یوں کہو کہ اصل مقصد تکمیل ہیئات نفسانیہ ہے جس کو مذہبی اصطلاح میں معرفت۔ رضائے حق کہا گیا ہے۔ کیونکہ باری تعالےٰ کا مقصد خلق انسان سے یہی ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ اسی خیال پر اس آیت میں عبادت کی تفسیر معرفت الہیٰ سے کیا کرتے ہیں۔ عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں حقیقتاً ہر امر جو تحصیل و تکمیل رضائے حق کا موجب ہو داخل ہے اور اسی وجہ سے اہلِ معرفت اور مردانِ خدا کے ہاں ادنیٰ سے ادنیٰ کام مثلاً کھانا پینا وغیرہ بھی مفہوم عبادت میں داخل ہیں۔ کیونکہ وہ خواہش نفس کی خاطر کسی عمل کو بجا نہیں لاتے بلکہ ان کا ہر ایک فعل مقصد حقیقی کے حصول کی خاطر ہوا کرتا ہے ❖

مذہب ایک صراط مستقیم ہے جو اسی مذکورہ بالا اصل عظیم کی بنا پر انسان کی راہنمائی کرتا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ امر معروف و نہی عن المنکر۔ یہی دو اصول اسلام کے راہنما ہیں ❖

آزادی خیال مفہوم آزادی کا پہلا مسئلہ ہے۔ جس میں عقائد حقہ اور ترقی خیالات

بھی شامل ہیں۔ جن کا ثمرہ مختلف حقوق کا اعتراف اور اصلاح تمدن و معاشرت اور نظام اجتماع انسانی کا قائم کرنا ہے۔ حصۂ عقائد میں سب سے بڑا رکن توحید ذات باری ہے۔ جس میں اصولاً و فروعاً ذرا بھی شرک کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ انسانی دماغ کا معراج تو حقیقت توحید کا کما حقہ ادراک کرنا ہے۔ پھر تعلق عبودیت والوہیت کا مرحلہ ہے۔ جس کی بنا پر بحکم نحن اقرب الیہ من حبل الورید بندہ بلا واسطہ بارگاہ رب العزت میں عرض حاجات کر سکتا ہے سے

اتصالے بے تکیف بے قیاس ٭ ہست رب الناس را با جان ناس

پھر معبود بھی کیسا جو ہر وقت حاضر و ناظر اپنی رحمت کاملہ سے ادعونی استجب لکم کا حکم ارشاد فرماتا ہے۔ ہماری ہر حالت کا نگران و متملی ہے مگر ہمارا رجوع کرنا شرط اولین ہے۔ طریق عبادت ایسا نیازمندانہ مخلصانہ اور طرہ یہ کہ باوجود سادہ اور بے تکلف ہونے کے قلب مومن کو نور ایمان سے بھر دیتا ہے۔ کیا کوئی اور مذہب اس سے بہتر طریقۂ عبادت پیش کر سکتا ہے؟ تحصیل علم کی تاکید بحکم اطلبوا العلم ولو کان بالصین مرد و عورت دونوں پر مذہبًا یکساں ہے۔ جس نے بوعلی سینا اور بوحنیفہ شافعی رح جیسے مجتہدین اور احمد و بخاری جیسے محدثین اور غزالی و رازی جیسے متکلمین پیدا کئے۔ جو اسلامی کتب آزادی تعلیم کا مایۂ ناز ہیں۔ تصوف۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ ہیئت۔ ریاضی فقہ سیاست۔ صرف و نحو۔ ادبیات۔ جدل و مناظرہ۔ منطق کیمیا وغیرہ علوم میں مسلمانوں نے دوسری اور تیسری صدی میں کافی ترقی کر لی۔ بغداد۔ غرناطہ۔ قرطبہ۔ شیراز مرکز علوم و فنون تھے۔ یہاں علوم و فنون کے حاصل کرنے میں کسی قسم کے قیود و شرائط عائد نہیں کئے گئے تھے۔ کیونکہ اسلام اشاعت علوم پر اجرت و معاوضہ کو جائز نہیں رکھتا۔ چنانچہ آج تک بھی اکثر حضرات اکابر علما اپنے تلامذہ کو محض خالصًا لوجہ اللہ تعلیم دیتے رہے بلکہ بعض حضرات کی نسبت مروی ہے کہ وہ مفلس تلامذہ کی امداد اپنی گرہ سے کیا کرتے اور اب بھی اسکی

چند ایک مثالیں موجود ہیں۔ حقوقِ مساوات و اخوت بنی آدم جو ترقی کا پہلا زینہ ہے بزرگانِ اسلام نے اِس اصول پر کاربند ہونے کی عملی مثالیں دیں۔ غلام و مالک کا درجہ اسلام نے برابر کر دیا۔ ذمی و مسلم برابر۔ حرمتِ خون دونوں کی یکساں قرار دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے غلامی کی قید سے آزادی دلانے کی پہلی مثال قائم کی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے سفرِ بیت المقدس سے کون ناواقف ہے؟ جس میں آپ نے اپنے ایک غلام کو اپنے ساتھ برابر کا شریک رنج و راحت سمجھا۔ خود پیدل چلتے تھے اور اس کی باری پر اس کو سوار کرتے تھے اور اسی اسلامی شان و شوکت سے بیت المقدس تشریف لے گئے اور عملاً دکھلا دیا کہ اسلام نے ہمیں ایسی پاک روشن زندگی کی تعلیم دی ہے۔ اور اسی تعلیم کا نتیجہ تھا جس نے بے تکلفانہ مخلصانہ طرزِ عمل سے عالم بھر کو مسخر کر لیا۔ آج جو لوگ آزادی کا غلط مفہوم قرار دیکر مغربی اقوام کی مطلق العنانی کو بطور نظیر پیش کیا کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مقدس اسلام نے انسان کے ہر شعبۂ زندگی کے متعلق ایسے احکام پیش کئے ہیں۔ جنکی پابندی سے اگرچہ بظاہر انسان مقید ہوتا ہے مگر اس کے نتیجہ میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے انسان کو ایک آزادی کی ایسی نعمت عطا کی ہے جس کے حصول پر وہ اپنے معبودِ حقیقی کے سوا ہر ایک قسم کی غلامی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتا ہے ؎

مساوات

اسلام نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ ہر شخص خدا کے نزدیک برابر ہے۔ خدا آدمیوں کی صورتوں اور وضعوں کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ ان کے دلوں کو دیکھتا ہے۔ خدا کی رحمت اس کے لئے ہے جو اس کی اطاعت کرے۔ خواہ وہ حبشی غلام ہو اور عذاب اس کے لئے ہے جو نافرمانی کرے خواہ وہ قریشی النسل ہو۔ غنی و فقیر

محتاج و امیر، آزاد و غلام میں کوئی فرق نہیں۔ اور اگر ہے تو صرف تقویٰ سے ہے فرمایا۔ اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد و عورت کر کے پیدا کیا۔ اور تمہیں گروہ اور خاندان بنائے تاکہ تم باہم شناخت کر سکو۔ خدا کے نزدیک تم لوگوں میں زیادہ بزرگ وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ اس ارشاد سے خدا نے افراد میں سے ہر موہوم امتیاز کو اٹھا دیا اور کسی کو کسی پر صاحب تسلط نہیں بنایا۔ بجز اس تسلط کے جس کی حدود کی شریعت نے دفع اذیت و حفظ امن کے لئے تعیین کر دی۔ اس کے علاوہ انسان پر کوئی حاکم اور گماشتہ نہیں ہے ہے تو اکیلا خدا ہے۔ ہم میں اور خدا میں کوئی حجاب یا واسطہ حائل نہیں ہے۔ فرمایا اے پیغمبر تم فقط نصیحت کرنے والے ہو کسی پر مسلط نہیں ہو۔ نہ جوگی ہیں نہ رشی ہیں نہ اسقف نہ پادری نہ موبد نہ پوپ کہ لوگوں کو پروردگار عالم کا مقرب بنائیں۔ اس قاعدہ سے وہ سب روکاوٹیں جو دوسرے مذہب کے پیشواؤں نے عقل اور انسان کی طبعی آزادی کو بیکار رکھنے کے لئے وضع کی تھیں زائل ہو گئیں مثلاً یہ دعویٰ کہ خدا اور بندوں کے درمیان گناہ کی مغفرت کے لئے یہ لوگ واسطہ ہیں یا بعض حرام چیزیں کچھ روپیہ لیکر حلال کر سکتے ہیں۔ اور لوگوں کو مذہبی کتابوں کے پڑھنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اور سب مفاسد جن میں دوسری قومیں اپنی دینی کتابوں کی بعض عبارتوں کی وجہ سے مبتلا تھیں۔ یہ وہ مفاسد ہیں جنکو صحیح یا غلط خیال کر کے ظہور اسلام کے بعد بھی کئی صدیوں تک اسی پر عمل کرتی چلی آئیں۔ ظہور اسلام پر بعض قوموں کو مذکورہ بالا مفاسد کی اصلاح کا خیال پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اسلام نے اپنی پاک تعلیم سے ہر مسلمان کو اس امر کا پابند کر دیا کہ وہ خود خدا کی مقدس کتاب کو پڑھے۔ اور خود غور و خوض سے کام لے جس پر کسی قسم کی قیود و شرائط عائد نہیں کی گئیں۔ مگر دیگر اقوام میں قبل از اسلام اپنی اپنی مذہبی کتابوں کے آزادی بلا امتیاز شخصیت نہیں دیگئی تھی۔ اسلام کورانہ تقلید کی مذمت کرتا ہے

اور یہ حجت کسی کی پیروی کرنے سے روکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے جو اُتارا ہے اُس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس طریقہ کا اتباع کرینگے جس پر ہم نے اپنے آباواجداد کو پایا ہے خواہ ان کے آباو اجداد کچھ نہ جانتے ہوں۔ اور نہ ہی ہدایت پر ہوں۔ اور اس جملہ کے مطابق کہ کہنے والے کی بات میں غور کرکے سچ کو جھوٹ سے الگ کرے اور کہنے والے کو نہ دیکھے حکم دیا کہ میرے ان بندوں کو بشارت دو جو بات سُنتے ہیں تو اُس میں سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں اُن لوگوں کو خدا نے ہدایت کی اور یہی لوگ دانشمند ہیں۔ کونسا اور مذہب ہے جس نے یہ باتیں پیش کی ہوں؟

الغرض صرف اسلام ہی ایک ایسا پاک مذہب ہے جس نے تمام افراد انسانی کو فطرت الہٰیہ کی ایک سطح پر بلا امتیاز شاہ و گدا کھڑا کرکے ایک ہی حکم عام کا پابند ٹھہرایا۔ اور یہی ایک اصل عظیم انسانی دُنیا کی آنے والی نسلوں کے لئے مایۂ فخر و ناز بنتا نظر آرہا ہے اور وہ وقت قریب آرہا ہے کہ دُنیا بھر کے تمام مشیا پھوس مذاہب اسلام کے بحرِ ناپیدا کنار میں داخل ہو کر بے نام و نشان ہو جائیں مگر اس کے لئے ابھی کچھ عرصہ درکار ہے۔ ہاں آثار الہٰیہ نمودار ہو چکے ہیں جنہیں سوا دقیق النظر اصحاب کے کوئی شخص نہیں دیکھ سکتا۔

حقوق الرجال والنساء

ذیل کا مضمون نہایت قابل غور ہے۔ اور غور سے مطالعہ کرنیوالوں کے لئے بہت سے شبہات کے رفع کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

کیا فطرت نے مرد اور عورت کو یکساں حقوق دئے ہیں | اس مسئلہ

کے طے ہونے پر بعض دیگر اہم مسائل کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً مسئلہ تعلیم نسواں حکم پردہ وغیرہ۔ اس موضوع پر بہت سے اصحاب مخالف و موافق لکھ چکے ہیں۔ اور بحکم ؎ کل حزب بما لدیہم فرحون ۰ اپنی اپنی رائے پر جمے بیٹھے ہیں۔ ہم حکم پردہ اور تعلیم نسواں پر آئندہ مفصل بحث کریں گے۔ اس جگہ ہمیں عنوان مذکورہ بالا پر کچھ کہنا ہے ۰

اس عنوان کے متعلق مفصلہ ذیل وجوہ قابل بحث ہیں :۔

(۱) صحیفۂ فطرت یا یوں کہو کہ مظاہر قدرت میں اشیائے موجودات کی گوناگونی کا نقشہ ایک ایسا دلچسپ نظارہ ہے جو ایک عارف محقق کے لئے بیشمار علمی خزانوں کا ذخیرہ ہے۔ اسی بیش بہا علمی ذخیرہ کی دوسری صورت مختلف قوموں کے وہ علوم وفنون ہیں جو ہر ایک قوم کے زمانہ ترقی میں مدون کئے جاتے ہیں اور کئے جا رہے ہیں۔ موجودات کی گوناگونی جس کو عربی زبان میں تنوع الکائنات کہہ سکتے ہیں اثبات توحید کا پہلا زینہ ہے مگر مجھے اس وقت اس پہلو سے بحث کرنا مدِ نظر نہیں۔ یہاں صرف اس امر کو زیر بحث لانا مقصود ہے کہ اشیائے عالم میں ہم ایک ترتیب پاتے ہیں جس سے تمام موجودات مادی باوجود بعض امور میں مشترک ہونے کے اپنے علیحدہ علیحدہ خواص بھی رکھتے ہیں۔ سب سے اوّل ہم جمادی اشیاء کی جماعت بندی کرتے ہیں تو ہمیں بخوبی یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی نوع کی اشیاء میں گو وہ اپنے اوصاف میں مشترک ہوں مگر ان میں قوت وضعف اوصاف کے رُو سے بیّن فرق پایا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا حیوانی جنس کے انواع کی جماعت بندی سے ہمیں واضح ہوجائیگا کہ ایک ہی نوع کے افراد مختلفہ باوجود متشابہ الاوصاف ہونے کے ایک رتبہ میں نہیں ہیں اور یہ ایک ایسا امر ہے جس کی اصلیت سے ہم بروئے مشاہدہ و تجربہ کسی طرح انکار نہیں کر سکتے ۰

؎ ہر ایک فریق اپنے اپنے خیال پر اترا رہا ہے۔ ۱۲

(۲) تذکیر و تانیث کا فرق صرف حیوانی موجودات تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ فرق تمام مادی اشیاء میں پایا جاتا ہے ۔ حیوانات میں تو ظاہر ہے مگر نباتات اور جمادات میں کسی قدر خفی ہے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ فرق ہر ایک قسم کی موجودات میں علیحدہ علیحدہ صورت میں پایا جاتا ہے ۔ نباتات میں علم نباتات کے علماء نے تذکیر و تانیث کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے ۔ اور اشیائے جمادی میں بھی برنے بعض حالات اس امر کی اصلیت کو تسلیم کیا گیا ہے ۔ قرآن مجید اس کی تصدیق کرتا ہے +

اور عقلی دلیل ہمارے پاس اس مسئلہ میں یہ ہے کہ تذکیر و تانیث کا فرق اس اصل پر مبنی ہے کہ عالم کائنات میں ایک شے دوسری شے میں اپنا اثر پیدا کرتی ہے اور اس سے خاص خاص نتائج ظہور میں آتے ہیں ۔ یعنی ایک چیز میں قوت فاعلہ اور دوسری میں منفعلہ موجود ہے ۔ اور اس فعل و انفعال یا تاثیر و تاثر سے کارخانہ قدرت کی گوناگونی کا سلسلہ قائم ہے ۔ اسلئے ایک ہی نوع کی دو چیزوں میں جب ہم یہ بات دیکھ لیں کہ ایک چیز نے اپنی طبعی حالت کے رو سے دوسری چیز میں کسی قسم کا اثر پیدا کیا ہے اور وہ دوسری چیز اس اثر کو قبول کر کے کسی نتیجہ کا مصدر بنگئی ہے تو بلا شبہ ان میں تذکیر و تانیث کا تعلق تسلیم کرنے پر ہم مجبور ہو جائینگے ۔ پس صرف طبعی خاصہ کے مطابق ایک چیز کا دوسری ہم جنس چیز میں اثر کر کے اس کو خاص نتیجہ ضروریہ کا مصدر بنا دینا ۔ امتیاز تذکیر و تانیث کی دلیل ہے ۔ البتہ تذکیر و تانیث کا مفہوم مختلف نوع کی اشیاء میں ایک ہی صورت میں جلوہ گر نہیں ہوگا ۔ بلکہ اس صورت میں جو ہر ایک نوع کے ساتھ حکیم مطلق نے خاص کر دی ہے +

(۳) ماسبق سے اتنا تو معلوم ہو چکا ہے ۔ کہ ایک ہی نوع کے افراد میں

بلحاظ قوت وضعف اوصاف کے فرق ہوتا ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے جس میں کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ مگر کیا کسی نوع کے مذکر و موئنث میں بھی بلحاظ قوت وضعف اوصاف کے فرق ہوتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں کسی قدر انسانی جسم کی بناوٹ اور اس کے قوائے کے طریق عمل کی طرف رجوع کرنا چاہئے گو بعض اہل فلسفہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ انسانی قوائے فطری کی قوت و ضعف انسانی جسم کی بناوٹ پر منحصر ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تجربہ نے کسی حد تک اس خیال کی تصدیق کردی ہے اور عملدرآمد میں اس کلیہ کو بطور امر واقع کے تسلیم کرلیا گیا ہے۔ کہ انسان کی جسمی بناوٹ کو قوائے فطریہ کی قوت وضعف میں پورا پورا دخل ہے۔ یہ مسئلہ کہ دماغ میں مختلف قوائے ذہنیہ کے لئے مختلف مقامات مقرر ہیں اکثر حکمائے یونان کا خیال تھا۔ اس خیال کو اہل عرب نے حکمائے یونان سے حاصل کیا۔ موجودہ زمانہ میں علمائے یورپ میں سینٹ آسٹن وغیرہ بھی اس کے قائل ہوئے ہیں۔ مگر مجھے اس موقعہ پر اس خیال کی تصدیق و تکذیب کرنا مقصود نہیں کیونکہ میرے موجودہ مبحث سے خارج ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دماغ کی قدرتی بناوٹ اور اس کی حالت ذہنی ہمارے فطری افعال پر پورا پورا اثر رکھتے ہیں الغرض جسمانی ساخت کو انسانی حرکات اور ارادوں میں بڑا دخل ہے۔ اس خیال کو قریباً تمام اہل فلسفہ اور اہل تشریح ابدان کے علماء تسلیم کرچکے ہیں۔ اب ہم نئی تحقیقات کے رو سے ہی اس اصل کی صحت کو مرد اور عورت کے قوائے فطریہ پر جانچتے ہیں +

پانچ سال کی عمر تک مرد اور عورت کا تناسب اعضاء چنداں بدلتا نہیں۔ پانچ سال کے بعد مرد اور عورت کے اعضاء میں کسی قدر فرق ہونا محسوس ہوتا شروع ہوتا ہے۔ اور فطرت تذکیر و تانیث کے اختلاف کو زیادہ ظاہر کرنا شروع

کردیتی ہے۔ جوانی میں جب اعضا، پوری وسعت حاصل کر چکتے ہیں، یہ فرق بدرجہ غایت محسوس ہوتا ہے۔ عورت اور مرد کے قد ہیں ۹۰۔ اور ۱۰۰ کی نسبت لڑکپن تک رہتی ہے۔ جوانی میں مرد اور عورت کی نسبت اوسطاً ۱۶۔ اور ۱۵ کی ہوتی ہے۔ وزن کے متعلق کوئی نسبت قائم نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ عورت ۱۹ برس اور مرد ۱۹ برس کے بعد بیقاعدہ ترقی گوشت و اعصاب میں کرتے ہیں۔ مگر یہ مانی ہوئی بات ہے کہ عورت کا وزن مرد سے کم رہتا ہے +

پیدائش کے وقت مرد کا وزن عورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ ہڈیاں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ اعصاب زیادہ چست حرکت کی لیاقت رکھتے ہیں۔ عورت میں اعضا، کی گولائی مرد سے زیادہ ہوتی ہے اور گوشت اور ہڈیوں کی نشیب و فراز چربی سے ہموار ہوتی ہے۔ مرد کے اعصاب عورت سے بہت زیادہ زبردست ہوتے ہیں۔ جنکی وجہ سے مرد کی طاقت عورت سے نہ صرف ذاتی بلکہ اضافی حیثیت سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بچپن میں مرد اور عورت کی طاقت کا تناسب ۳۔ اور ۲ کا ہوتا ہے۔ جوان ہوکر ۹۹ اور ۵۵ کی نسبت ہوجاتی ہے اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ تو دس برس کا بچہ ہاتھوں پر کھڑا ہوجاتا ہے اسی عمر کی لڑکی نہیں ہوسکتی۔ عورت میں خون کم اور پتلا ہوتا ہے۔ یعنی خون کی گولیاں جنکو کارپس کلسر کہتے ہیں عورت میں کم اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ اس کی مقررہ تعداد مرد میں پچاس لاکھ گولیاں فی مکعب ملی میٹر عورت میں پینتالیس لاکھ گولیاں فی مکعب ملی میٹر ہیں اور مرد میں بڑی ہوتی ہیں۔ مرد اور عورت کے دماغ کے وزن میں ۱۴ اور ۱۲ کی نسبت ہوتی ہے۔ اور یہ نسبت تقریباً ماں کے پیٹ سے لیکر آخر وقت تک رہتی ہے۔ دل کا وزن مرد اور عورت کا ۱۰۔ اور ۷ کی نسبت رکھتا ہے۔ اور عورت میں بہ نسبت مرد کے دل زیادہ حرکت کرتا ہے۔ اور اس لحاظ سے

عورت کی نبض فی منٹ ۸۰ دفعہ حرکت کرتی ہے۔ مرد کی ۷۰ دفعہ اور عورت بہ نسبت مرد کے جلدی جلدی سانس لیتی ہے۔ چونکہ عورت کا قد چھوٹا وزن کم۔ دل و دماغ کم وزن کم۔ خون پتلا اور کم ہوتا ہے۔ اِس لئے اسکی خوراک بہ نسبت مرد کے بہت کم ہونی چاہیئے اور یہ در اصل ایسا ہی ہے۔ یہ سب امور عورت کی کمزوری پر دال ہیں۔

ہر روز کے تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ دُنیا کی کشمکش زندگی کی کفالت و آرام خوف و اُمید و خوشی پر تحمل کرنے اور ان تمام حالتوں میں جن میں انسان کی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ اعصاب جسمانی و دماغی مدد دیتے ہیں۔ جس شخص کے اعصاب زیادہ مضبوط اور محفوظ ہوتے ہیں وہ اپنی حالت دوسرے شخص سے زندگی کی کشمکش میں زیادہ لائق ہوتا ہے۔ اختلافات جسمانی کا کچھ اثر عورت اور مرد کی زندگی میں ظاہر ہوتا ہے وہ ہر شخص اپنے ملاحظہ میں لا سکتا ہے۔ ہر ایک شخص یہ بات جانتا ہے کہ عورت کمزور ہوتی ہے اور مرد طاقتور۔ عورت قد میں اوسطاً کم ہوتی ہے۔ مرد لمبا ہوتا ہے۔ لیکن اگر زیادہ غور کیا جائے۔ تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جذبات۔ حواس و حرکات میں بھی عورت اور مرد میں فرق ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ مرد کو اپنے اعضاء کی مضبوطی حرکات کی چُستی و تیزی۔ طاقت کی زیادتی اور اعصاب کی زبردستی سے اس بات کا یقین دل میں ہوتا ہے کہ انسان کی دو نو نوعوں میں زیادہ کار آمد میں ہی ہوں۔ اور یہ تعلیم فطرتی اور موروثی طور پر مرد کے دماغ میں موجود ہے اِسلئے جو ترجیح اس کو قدرت کاملہ نے فی الحقیقت دی ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھانا اور عورت کو حتی الامکان اس سے معطل رکھنا جزو مردانگی سمجھتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ قوت فیصلہ۔ ضبط۔ نفاست۔ مذاق اور رائے کی صحت میں مرد عورت پر فائق ہے۔ مگر جذبات و احساس میں عورت مرد پر غالب

ہے۔ جسمانی خواہشیں مثلاً بھوک۔ پیاس وغیرہ عورت میں کم ہوتی ہیں اور مرد میں زیادہ۔ کیونکہ مرد کے اعضاء وسیع ہیں اور غذا کا تقاضا بڑی شدت سے کرتے ہیں۔ عورت بھوک۔ پیاس کا تحمل خوب کرتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر عورت کو غش آجاتا ہے اسلئے کہ عورت کا احساس بہت تیز ہے بوجہ غفلت اعصاب اس میں جذبات کا تحمل نہیں ہے۔ عورتوں میں بعض قدرتی لیاقتیں ایسی موجود ہیں جو اس کمی کی تلافی کر دیتی ہیں۔ عورتیں زندگی کے انقلابات کو بہت اچھی طرح سہار لیتی ہیں۔ اور اپنی گذران اپنے میلان طبع اور مشاغل کو ان انقلابات کے موافق بنا لیتی ہیں۔ اگرچہ مرد بھی اس سے عاری نہیں لیکن عورت اس کام کے لئے بنائی گئی ہے اور مرد کو نبنا پڑتا ہے۔ مثلاً بیاہی ہوئی لڑکیاں جلدی اپنے سسرال کی خو بو اختیار کر لیتی ہیں اور مرد گھر داماد بنکر مشکل سے گذارہ کرتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مرد کی طبیعت تشریح طلب اور جزو بین ہوتی ہے وہ جو کچھ دنیا میں دیکھتا ہے اُسکو ایک اصول کے ماتحت لانا چاہتا ہے مگر عورت اپنے اصول کو ایک دوسرے اور غالب اصول کے ماتحت کر لیتی ہے۔ اور اس ذریعہ سے اس کمزور مخلوق کی زندگی آرام سے گذر جاتی ہے

(۵) مختلف اقوام کا خیال بھی اس امر کی تائید کرتا ہے۔ کہ مرد اور عورت کے قوار فطریہ اپنی عملی کارروائی میں ایک ہی معیار نہیں رکھتے بلکہ ہر زمانہ میں مرد اور عورت کے کارنامے علیحدہ علیحدہ حیثیت میں رکھے گئے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عورت میں وہ سب قوار فطریہ جو مرد میں پائے جاتے ہیں موجود ہوتے ہیں۔ مگر ہمیں عموم تناسب میں گفتگو کرنا مناسب ہے جنکی نسبت تاریخی شہادتیں برابر اس امر کی تائید کرتی ہیں کہ عورت فطرتاً اپنے طریق عمل میں مرد کے طریق عمل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی خاص عورت کسی

خاص وصف میں ایسا کمال رکھتی ہو۔کہ اکثر مرد بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکتے ہوں۔ مگر اس امر سے ہمارے دعویٰ افوقیت مرد میں کچھ فرق نہیں آتا۔کیونکہ مقابلہ جنس مرد کا جنس عورت سے ہے نہ کسی خاص مرد کا کسی خاص عورت سے۔اور ہم بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہر ایک وصف مرد میں بدرجہ کمال موجود ہوتا ہے اور عورت میں بدرجہ ناقص بلکہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ مرد میں وہ قویٰ فطریہ بدرجہ کمال موجود ہوتے ہیں جو قوت فاعلہ کے ذیل میں آسکتے ہیں مگر وہ قوا فطریہ جو قوت منفعلہ کے ذیل میں شمار ہوتے ہیں عورت میں بدرجہ کمال موجود ہوتے ہیں اور مرد میں بدرجہ ناقص اور مرد کی فوقیت کے ثابت کرنے کا مدار صرف اسی امر پر ہے کہ وہ قوتِ فاعلہ میں عورت کی نسبت زیادہ کمال رکھتا ہے۔کیونکہ فوقیت کسی کمال پر موقوف ہوتی ہے اور کمال قوتِ فاعلہ کا نتیجہ ہے نہ قوت منفعلہ کا۔مثلاً وصف شجاعت میں جب مرد اور عورت کی نسبت گفتگو کی جائے تو ہم برُوئے تجربہ اس امر کو پایہ ثبوت تک پہنچا سکینگے کہ جنس مرد کے کارنامے لاکھوں گنا جنس عورت کی نسبت بڑھے ہوئے ہیں۔علیٰ ہٰذا جب وصف استقلال رائے میں گفتگو کریں تو بھی مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔کیونکہ تجربہ اس امر پر شاہد ہے کہ عورت بہت جلد اپنے مرکز رائے سے ہٹ جاتی ہے۔اور یہ امر مسلم ہے کہ وصف شجاعت اور استقلال رائے ہر دو قوت فاعلہ کا نتیجہ ہیں نہ قوت منفعلہ کا۔کیونکہ قوتِ منفعلہ کا عمل یہ ہے کہ وہ کسی خارجی چیز کے اثر سے صاحب قوت کے اثر کو قبول کرنے کا موقعہ دے۔چنانچہ شجاعت کی ضد جبن اور استقلال رائے کی ضد تغیر الرائے کا مادہ عورت میں بڑھا ہوا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا امر ہے جو بالکل روزمرہ تجربہ و مشاہدہ میں پایہ ثبوت تک پہنچ چکا ہے۔اخلاقی کمزوری عورت میں مرد کی نسبت بالعموم ہے۔چونکہ معترض اس مقام پر اعتراض پیش کرسکتا

ہے کہ صدیوں کی طرز معاشرت نے جو عورتوں کو محدود الاختیار رکھا ہے اور عورتوں کو ایسا بنا دیا ہے - اگر مردوں کی طرح انہیں وسیع اختیار دیا جائے تو عورتیں بھی مردوں کی طرح ہر ایک وصف میں کامل ثابت ہوں - اسلئے ہم صرف اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ تک محدود نہیں رہتے بلکہ اس امر کے متعلق ہم ایسے زمانے کے تاریخی کارناموں کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں عموماً انسانی تمدن و طرز معاشرت کے قواعد کی پابندی مرد اور عورت کو یکساں طور پر کرنا ضروری تھی - یا یوں کہو کہ جو جائز اختیارات مرد کو حاصل تھے وہی عورت کو بھی حاصل تھے - مگر اس زمانہ کے کارناموں کی فہرست میں بھی مردوں کے نامور لوگوں کی تعداد عموماً عورتوں کی نسبت بڑھی ہوئی نظر آتی ہے - ایسے تاریخی نظائر کے متعلق میرے خیال میں اہل عرب کی تاریخ کی طرف ہمیں رجوع کرنے سے زیادہ سہولت ہوگی - کیونکہ انسان کی مفصل تاریخ مل سکنے کا زمانہ ڈیڑھ دو ہزار برس سے زیادہ متجاوز نہیں ہو سکتا اور اس سے پہلے زمانے کے تاریخی حالات پر ایک عام تاریکی کا کمبل تنا ہوا ہے - اور اگر کچھ حالات مل سکتے ہیں تو وہ نہایت ہی مشتبہ ہیں - اور آسمانی کتب زیادہ تفصیل نہیں کرتیں - اہل عرب کو میں نے اسلئے مخصوص کیا ہے کہ منجملہ دیگر اقوام کے یہ زیادہ عاری تھے - اسلئے قرین قیاس ہے کہ فطری جذبات کا ظہور بروجہ کمال ہوتا ہوگا چنانچہ تاریخ اسکی مؤید ہے - ایسے حالات میں یہ بالکل صحیح ہے کہ مرد اور عورت کو بلا لحاظ کسی قسم کے قانون ملکی اور احکام شرعی کے اپنے طبعی مقتضیات کے اظہار کا موقع ملتا ہوگا - پس ایسی صورت میں مرد اور عورت کے کمالات کا مقابلہ بھی صحیح ہو سکتا ہے - کیونکہ زمانہ تہذیب و ترقی میں اس زمانہ کو معترض قطعی تسلیم نہیں کر سکتا بلکہ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مذہبی احکام کی پابندی نے مرد اور عورت میں فرق پیدا کر دیا ہے اور اگر انہیں یکساں حقوق

دئے جاتے تو یکساں کمالات کے مالک ہوتے ۔

اس قسم کا مقابلہ صرف اہلِ عرب ہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہر ایک قوم کی ابتدائی حالت میں جبکہ تہذیب و ترقی کا پرتو ان پر نہ پڑا ہو ممکن ہے کیونکہ تمام قومیں ابتدائی حالت میں قریبًا قریبًا ایک سی ہوتی ہیں۔ مگر اہلِ عرب بالخصوص اپنی فطری حالت کے صدیوں تک پابند رہے ہیں اور کسی قسم کی بیرونی حکومت سے متاثر نہیں ہوئے جو انہیں انکی طبعی روش سے علیحدہ کر دیتی اور انکی طبعی روش جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے یہ تھی کہ مرد اور عورت کے فرائض میں ایک نمایاں حد فاصل قائم تھی۔ جس سے ایک فلسفی دماغ کا آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اس حد فاصل کا قائم کرنا کسی ملکی یا مذہبی دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ اس قانونِ فطرت پر مبنی تھا جس کو خداوند کریم نے اپنی حکمت کاملہ کے رو سے مرد اور عورت کی جسمانی اور روحانی تربیت کے لئے ایک خاص تناسب پر قائم کیا ہے۔ یہ خیال کہ صرف کسی ناترقی یافتہ زمانہ میں مرد اور عورت کے فطری قویٰ کو یکساں حالت میں تسلیم نہیں کیا گیا۔ ہر ایک زمانے کے مردوں اور عورتوں پر امتحانًا دیکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جن ممالک میں علوم و فنون کو آج پوری ترقی حاصل ہے اور عورتوں کو بلا امتیاز مردوں کے ساتھ ملکر یکساں طور پر ترقی کرنے کا حق حاصل ہے وہاں بھی مرد اور عورت کے عملی نتائج ایک ہی درجے پر تسلیم نہیں کئے گئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فطرت ہر ایک کو اسکی طبعی حالت سے آگے متجاوز نہیں ہونے دیتی۔ اسلئے ہمارا یہ دعویٰ　　کہ مرد اور عورت کے حقوق کو یکساں ملحوظ نہیں رکھا جانا چاہئے عین منشار فطرت کے مطابق ہے اور جو شخص اس بداہت کا انکار کرتا ہے اس کو چاہئے کہ دلیل پیش کرے محض یا وہ گوئی سے کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی۔ یقینًا ہمارے دعوے کا منکر ایک ایسے پہلو کو اختیار

کرتا ہے جس کے ثبوت سے وہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ہم بالمشاہدہ اس امر کا یقین رکھتے ہیں کہ ایک ہی نوع کے افراد کائنات میں گوناگونی تمیز کا ہونا فطرت کے لا انتہا ہی عجائبات کا یقینی ثبوت ہے۔ تو کیونکر ہم اس امر کو صحیح تسلیم کر سکتے ہیں کہ ایک ہی نوع کے مذکر و مونث کی فطرت میں کچھ تفاوت نہیں رکھا گیا۔ ان ھذا لشیئ عجاب ۔

(۵) اب آؤ ذرا اہل فلسفہ کی بکواس سے ہٹ کر جناب باری عز اسمہ کے کلام پاک سے اس دعوی کے متعلق دلائل کا پتہ لگائیں جو بمضمون انہ لقول فصل وما ھو بالھزل قطعی فیصلہ ہے اور جس پر ہمارا ایمان کوہ ہمالیہ کی جڑوں سے بھی کہیں زیادہ مضبوط ہے ولوکرہ الکافرون۔ قرآن پاک میں مرد اور عورت کی فطرت کو بالکل واضح الفاظ میں متفاوت بیان کیا گیا ہے اور جس میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔

(۱) باآنکہ احکام شرعی کی پابندی کی مرد اور عورت کو یکساں تکلیف دی گئی ہے مگر جابجا خطاب امر و نواہی مردوں کو کیا گیا ہے اور اسی خطاب میں عورتیں بھی داخل سمجھی جاتی ہیں۔ یاایھا الذین امنوا۔ اقیموا۔ اتوا۔ اتقوا۔ یتقون۔ متقین۔ اسجدوا ارکعوا۔ لاتقربوا قولوا۔ لاتکن خلوا۔ وغیرہ ذالک۔ صرف مذکر صیغے ہیں۔ مگر عورتیں اس مفہوم میں شامل ہیں اور یہ امر صحیح طور پر دلالت کرتا ہے کہ مرد کو عورت پر فضیلت ہے۔ اور منشاء فضیلت تفاوت فطرت کے سوا اور کیا ہے۔ بعض مواقع پر عورتوں کو علیحدہ بھی خطاب ہوا ہے۔ مگر وہ محل ہی بالخصوص عورتوں کی تصریح کا تھا۔

(۲) ایک مرد کی شہادت کو وہی وزن دیا جاتا ہے جو دو عورتوں کی شہادت کو اس کی وجہ بجز عورت کے ضعیف الفطرۃ ہونے کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور

باایں ہمہ عورت کی نسبت علیحدہ حکم دیا کہ اگر ایک اوائے شہادت میں غلطی کرجائے تو دوسری اُسکو یاد دلائے۔ مگر مرد کی نسبت بالتصریح ایسا نہیں کہا جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ عورتوں کو قواء دماغیہ مردوں کے برابر نہیں دئے گئے ۔

(۳) تقسیم وراثت میں مذکر اور مؤنث کی نسبت حصص کو للذکر مثل حظ الانثیین کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اس حکم میں گو دیگر اسرار مخفی ہیں۔ جو ہمارے اس بحث سے غیر متعلق ہیں۔ مگر مرد کے فطرۃً قوی الاستحقاق ہونے پر نص ہے جس سے اس کی ترجیح عورت پر ثابت ہوتی ہے ۔

(۴) طلاق کا اختیار صرف مرد ہی کی ذات تک محدود ہے اور یہ مرد کی فضیلت پر صریح طور پر دلالت کرتا ہے اور اس حکم میں جو بیشمار مصالح مدنظر ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عورت مرد کی نسبت ضعیف الفطرۃ ہے بات بات پر بگڑ کر غیر مستقل الرائے ہو جاتی ہے مگر مرد وسیع حوصلہ اور زیادہ انجام بین ہوتا ہے اسلئے سوا مجبورانہ حالت کے کبھی طلاق پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر ہمارے بعض کج اندیش اور ناواقفان شریعت کی رائے پر عمل کرکے طلاق کا اختیار مرد اور عورت کو یکساں طور پر دیا جاوے۔ تو غالبًا اسّی فیصدی عورتیں ہیں جو نکل بھاگیں گی[1]۔ اور اس کی وجہ بجز ان کی کمزوری فطرت کے اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ وہ حالات جن میں عورت کو بھی طلاق حاصل کرنے کا اختیار حاصل ہے وہ خاص صورتیں ہیں۔ ان سے ہمارے دعویٰ میں فرق نہیں آتا۔

(۵) قرآن مجید نے کسی عورت کے نبی ہونے کی خبر نہیں دی۔ اور نہ کسی دیگر آسمانی کتاب میں کسی عورت کا نبی ہونا مذکور ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ نبوت

---

[1] بعض ایسے حضرات یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر تعلیم نسواں کی ترقی ہوجاوے تو عورتوں کو اس قسم کی خودسری کا موقع نہیں ملیگا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ فطرت کو بدلنا محال ہے ہمیں کئی ایک ایسی مثالیں معلوم ہیں کہ لکھی پڑھی مہذب عورتیں بدکار ثابت ہوئی ہیں۔ ممالک مغربی کی حالت کو دیکھو تو جہاں تہذیب کا آفتاب چڑھا ہوا ہے مگر اولاد الزنا کی وہ کثرت ہے کہ توبہ ہی بھلی معلوم

ایک منصب عظیم ہے جس کے انصرام کے لئے تمام قوا رفطریہ کا بروجہ اکمل مخلوق ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام ظاہری اور باطنی قوا ر میں اپنے دیگر ابنائے جنس سے بڑھے ہوئے تھے۔ کتب سیر و احادیث میں اس کی بہتیری مثالیں ملینگی ؛

(۶) قرآن مجید میں صاف لکھا ہے الرجال قوامون علے النساء جس سے بالکل مسئلہ زیر بحث کی توضیح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مردوں کو عورتوں پر مسلط کرنا اور انہیں ان کی ہر ایک قسم کی بہبودی کا متکفل قرار دینا اس امر کی صاف دلیل ہے کہ مرد کو عورت پر فطرۃً فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ کامل کو ناقص پر غالب رکھنا بالکل قانون فطرت کے مطابق ہے مگر برعکس کبھی نہیں ہوتا ؛

(۷) قرآن مجید میں لکھا ہے ولا تنسوا الفضل بینکم۔ ان الفاظ سے تو قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ مرد کو خداوند کریم نے عورت پر فضیلت بخشی ہے ؛

(۸) قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے اَوَمَنْ ینشؤ فی الحلیۃ وھو فی الخصام غیر مبین۔ اس آیت سے بھی حسب شرح صدر وہی بات ثابت ہوتی ہے ؛

(۹) قرآن مجید فرماتا ہے نساؤکم حرث لکم۔ ان الفاظ میں مرد اور عورت کی جو حیثیت بیان کی گئی ہے وہ لفظ حرث (کھیتی) سے بخوبی ظاہر ہے کیونکہ مالک اور مملوک کا تعلق صاف طور پر مرد کی فضیلت پر شاہد ہے ؛

(۱۰) قرآن مجید فرماتا ہے اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ گو یہ جملہ حکایتاً جناب باری نے ارشاد فرمایا ہے مگر اس کی تصدیق میں تجربہ و مشاہدہ کافی دلیل ہے جس سے عورت کی کمزوری

لہ کفار فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے انکے اس خیال کے رد میں خداوند تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ عجیب جاہل لوگ ہیں کہ اپنے لئے تو بیٹا پسند کرتے ہیں اور خدا کے لئے بیٹی حالانکہ خدا بیٹے اور بیٹی ہر دو سے بری ہے اور اس آیت میں فرمایا کہ اناث کو جو زیوروں میں پرورش پاتی ہیں اور قوت بیانیہ سے بالکل بے بہرہ ہوتی ہے خدا کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ یعنی اول تو خدا کی اولاد قرار دینا اور پھر اولاد بھی بیٹیاں جو فطرتاً ناقص ہوتی ہیں ۱۲ منہ

فطرت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ قرآن نے شیطان کے کید و مکر و حیلہ کو ضعیف کیا ہے ✦

(۱۱) قرآن مجید نے نعمائے بہشت کے بیان میں حور کا بیان کیا ہے۔ جن کا وعدہ متقی اور پرہیز گار لوگوں کے لیئے ہوا ہے۔ مگر کہیں عورتوں کے لیئے نوجوان خوبصورت شوہروں کا ذکر نہیں آیا۔ گو ضمناً یہ امر ثابت ہے کہ پاکباز نیک عورتوں کو نیک مردوں کے ساتھ رہنا ہوگا۔ مگر مردوں کے لیئے بالاہتمام اس امر کا ذکر کرنا مرد کی فضیلت کو ظاہر کرتا ہے ✦

(۱۲) سلسلہ بنی آدم کے آغاز میں پہلے مذکر کا وجود ہے اور عورت کا بعد والفضل للمتقدم ✦

مذکورہ بالا وجوہ ایسے ہیں جو میرے دعوٰے کے ثبوت میں حجت قاطعہ ہیں جس میں کسی کو کلام کا موقع نہیں ملسکتا۔ اب ناظرین ذرا انصاف کریں کہ ہم قرآن مجید کی سنیں جسکی تائید میں تجربہ اور مشاہدہ بھی موجود ہیں یا کسی لغو گو کی بکواس کو جو نہ تو شریعت آسمانی سے ثابت ہے نہ بروئے فطرت انسانی۔ اور غور کرو تو شریعت اور فطرت کوئی دو چیزیں نہیں بلکہ وہ فی الحقیقت ایک ہی ہیں تتبع آیات سے ممکن ہے کہ کوئی صاحب اور بھی وجوہ تجویز کرسکیں ✦

ایک دفعہ ایک نیچری نے اپنے ایک مضمون میں عورت کو مرد پر فضیلت دیتے ہوئے قرآن مجید کی آیت ولیس الذکر کالانثیٰ[1] کو بیان کیا تھا۔ اوّل تو یہ لوگ ہمیشہ ایک ٹیڑھی بات پیش کرنے کے عادی ہیں اور ملحدانِ یورپ کے مقابلہ کلام الٰہی حجت تسلیم کرکے اللہ اور اللہ کے رسول برحق کے کلام کی تکذیب کرنا اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ دوم بڑی بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو بلا علوم عربیہ حل کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود بھی گمراہ ہو جاتے ہیں

[1] یعنی مذکر مؤنث کی طرح نہیں ۱۲ منہ

اور بیچارے ناواقفوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ؛

اِن الفاظ سے ہرگز مدعی کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا - یہ آیت عمران والد مریم کی بیوی کے قصہ میں وارد ہوئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ والدہ مریم علیہا السلام نے نذر مان رکھی تھی کہ خدایا اگر میرے ہاں بیٹا ہوگا تو میں اسے بیت المقدس کی خدمت میں لگا دونگی - تقدیر الہیٰ سے لڑکی (مریم) پیدا ہوئی تو آپ کو رنج ہوا اور دل میں کہا کہ خدایا یہ تو لڑکی ہے اب کیا ہو - اس پر خداوند کریم نے بطور اظہار امر واقعہ اس امر کو بیان کیا ہے کہ عمران کی بیوی اظہار افسوس کرتی ہے - مگر اسکو یہ معلوم نہیں کہ جس مذکر معروض کی وہ اُمید کرتی تھی یہ مونث (لڑکی) اس سے کہیں بہتر ہے - کیونکہ جو مصلحت خداوند کریم کو اس لڑکی کے پیدا کرنے میں مدنظر تھی وہ لڑکا ہونے کی صورت میں پیدا نہ ہوتی - اس لئے خداوند کریم کی حکمت کاملہ اسی کی متقضی تھی - گویا مطلب یہ ہے کہ یہ خاص لڑکی جو پیدا ہوئی ہے بہ نسبت اس خاص لڑکے کے جس کی خواہش زوجہ عمران کرتی تھی بھلی ہے - مدعی نے الف ولام عہد کی حقیقت کو تو سمجھا نہیں مگر غلط استدلال سے عوام الناس کو دھوکا دینے بیٹھ گیا - الغرض اس آیت سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ مطلق عورت کو مطلق مرد پر فضیلت ہے - بلکہ خاص مونث اور خاص مذکر کا مقابلہ کیا گیا ہے اور اس لئے ہم نے شروع مضمون میں لکھدیا ہے کہ مرد کو عورت پر فضیلت دینے میں جنس کا مقابلہ جنس سے کرنا مقصود ہے نہ کسی خاص مرد کا کسی خاص عورت سے - کیونکہ یہ امر بالکل واضح ہے کہ سینکڑوں ایسی لطیف الفطرت عورتیں ہیں جو سینکڑوں جاہل اور کمزور فطرت مردوں پر فضیلت رکھتی ہیں مگر اس سے ہمارا دعویٰ باطل نہیں ہوتا ؛

مذکورہ بالا سطور سے ہم اس نتیجہ تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں کہ جب مرد

اور عورت کی فطرت ایک نہیں بلکہ ہر دو میں نمایاں تفاوت موجود ہے۔ تو کیسے یہ ہو سکتا ہے کہ تمدن و معاشرت کی ضرورتوں میں ہر دو کے حقوق کو یکساں خیال کیا جائے بلکہ جس فطرت نے ہمیں ان میں ایسے تفاوت کا علم دیا ہے وہی فطرت ہمیں یہ بھی سبق دیتی ہے کہ ہر دو کے حقوق میں ایک حد فاصل قائم ہونی چاہیے۔ اور اگر تم اس تفاوت حقوق کو تسلیم نہیں کرتے اور ہر دو کو بلا امتیاز ایک ہی ترقی کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہو تو کوشش کرو کہ مرد بھی بچے جنا کریں۔ اور اگر تم اس امر کو قواعد فطرت کے رو سے ناممکن خیال کرتے ہو تو باقی کے دوسرے صفات خلقیہ میں ہر دو کو کیوں مساوی رکھتے ہو

اسلام میں رہبانیت نہیں

جس شخص نے قبل از اسلام مروجہ مذاہب اہل عالم پر کبھی غور کیا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ شریعت اسلام کے احکام خواہ عبادات کے متعلق ہوں خواہ معاملات کے متعلق سب میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ نہ تو کوئی ایسا حکم شدید ہو کہ بجز خاص خاص طبائع کے اس کی پابندی سے عام طور پر بعض افراد معذور ہوں اور نہ ایسا نرم اور آسان ہو کہ نفس کو اس کے بجا لانے میں وہ ضروری مشقت برداشت نہ کرنا پڑے جو نفس کی بے اعتدالیوں کی روک تھام کے

لہ ممکن ہے کہ کوئی کج فہم یہ اعتراض کرے کہ یہ تو قیاس مع الفارق ہے کیونکہ مرد میں تو بچہ جننے کی فطرتی قابلیت ہی نہیں اور عورت میں ہے۔ تو ہم کہینگے کہ قیاس مع الفارق نہیں کیونکہ جس طرح کسی معدوم محض کو بذریعہ حیلہ و تدبیر ہم وجود میں نہیں لا سکتے اسی طرح ناقص فطری کو ہم کامل نہیں بنا سکتے۔ اسلئے جہاں فطرۃً مرد بچہ نہیں جن سکتا عورت اپنے فطری نقصانات کو تعلیم و تربیت سے بدرجہ کمال پورا نہیں کر سکتی۔ گو مرد اور عورت کے قویٰ میں تشابہ پایا جاتا ہے مگر تفاوت کمال فطری اور نقصان فطری میں ہے۔ پھر عورت کو چونکہ تولید لازمی ہے اور بچہ قریباً دو ڈھائی سال تک اسکا خون چوستا رہتا ہے۔ اسلئے اسکے فطری نقصان میں اور بھی زیادتی ہو جاتی ہے اور خون کو جسقدر انسانی قوائے فطریہ کی طاقت میں دخل ہے اسے اصول طب جاننے والے بخوبی جانتے ہیں ۱۲ منہ

لئے واجب ہے۔ شریعت اسلامی انہیں احکام پر مشتمل ہے جن پر سابقہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں مشتمل تھیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ احکام جن میں کچھ شدت تھی یا کسی امت نے انہیں اصلی صورت سے کسی دوسری صورت میں بدل دیا تھا۔ اسلام نے انہیں دنیا کے سامنے سہل کر کے پیش کیا یا متبدل احکام کو انکی اصلی صورت میں ظاہر کیا۔ حاصل یہ ہے کہ اسلامی احکام شریعت نہایت معتدل اور متوسط واقع ہوئے ہیں قال اللہ تعالےٰ "وکذالک جعلنکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علے الناس"

دین و دنیا کے تعلقات کو اسلام نے اس خوبی کے ساتھ جمع کیا ہے کہ کوئی اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم اس سے بہتر احکام نہیں بنا سکتی۔ دنیا پرست قوموں نے دین کو فراموش کر دیا اور آخرت سے انکار کر کے حظوظ نفسانی میں مبتلا ہو گئیں۔ اور تارکان دنیا نے انسانی قوتوں کو معطل چھوڑ دیا جس سے وہ تمدن اور اخلاق کی ضرورتوں کو جن کے بغیر تکمیل نفس نہیں ہو سکتی بالکل اندا ز کر دیتے ہیں۔ اسلام ان ہر دو قسم کے خیالات کو برا سمجھتا ہے۔ اگر دنیا پرست لوگ دماغی اور جسمانی قوتوں کو عمل میں لا کر حصول لذات کے پیچھے لگے رہتے ہیں تو کچھ شک نہیں کہ روحانی قوتوں کو ضرور معطل چھوڑ دیتے ہیں اور روحانیت کے مقامات سے بالکل محروم رہتے ہیں اور اسلئے انہیں معرفت ذات باری سے کچھ تعلق نہیں۔ ایسی قومیں حیوانات اور جمادات سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتیں یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے مولےٰ سے عمر بھر نا آشنا رہ کر بالآخر مردار ہو جاتے ہیں اور "من کان فی ھذہٖ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ" کا صحیح مورد ہیں۔ برخلاف انکے تارکان دنیا کی یہ حالت ہے کہ بظاہر ترک دنیا کرتے ہیں مگر در حقیقت نہ تو دنیا ان سے چھوٹتی ہے اور نہ وہ دنیا کو چھوڑ سکتے ہیں ترک دنیا محض ایک لفظ ہے جس کا مصداق ناممکن ہے۔ ہر ایک قوم میں ایسے لوگ ہوتے آئے ہیں جو ترک دنیا کی تعلیم دیتے رہے اور باوجود قطع تعلقات کے

اپنے مصارف زندگی کا بوجھ دوسروں کے سر پر ڈالتے رہتے ہیں۔ غور کرنے سے
معلوم ہوگا کہ اصولِ تمدّن کے رُو سے ایسے لوگ بہت مضر ثابت ہوتے ہیں۔
کیونکہ تمدّن کی فطرت میں امداد و استمداد کا مفہوم داخل ہے۔ اور یہ لوگ غیروں
سے استمداد تو کرتے ہیں مگر کسی قسم کی امداد نہیں کرتے۔ اِس لئے اُن کا وجود کسی
صورت میں بھی نوعِ انسان کے لئے مفید نہیں ہے۔ اِس قسم کی بے معنی رہبانیت
اہلِ کتاب نے اختیار کر لی تھی، جس پر اللہ تعالیٰ نے بالفاظ "ورھبانیۃ ابتدعوھا
اہلِ اسلام کو اِس سے روک دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ان لوگوں
نے اپنی فطرت سے اس کو رواج دینا شروع کر دیا۔ اللہ تعالےٰ کو فطرتِ انسانی
کا دینی اور دنیاوی کمالات میں ترقی کرنا منظور تھا۔ اور رہبانیت سے
قوائے فطریہ کا معطل چھوڑنا لازم آتا ہے۔ اور جو مذہب اِس قسم کی تعلیم دے انسانی
کمالات کے لئے سخت مضر ثابت ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ بعض اہلِ اسلام بھی اپنی
جہالت سے رہبانیت کے مؤید ہیں اور اِس کو معرفت ذات باری کا ذریعہ گردانتے
ہیں۔ حالانکہ تعلیم قرآن وسنّت کے منشاء کی صریح خلاف ورزی ہے۔ قرآنی تعلیم
نہایت زور کے ساتھ ایسے غلط خیال کو رد کرتی ہے۔ قرآن مجید اور سنّت میں
جہاں دُنیا اور دُنیا کی لذّتوں اور آرائشوں کی مذمّت وارد ہے وہاں یہ سمجھنا کہ
اسلامی شریعت قطع تعلّقات کا حکم دیتی ہے سراسر جہالت اور سخت نادانی ہے
بلکہ اِس مذمّت کا اصل منشاء یہ ہے کہ وہ لوگ جو دُنیا کی لذّتوں میں مبتلا ہو کر
آخرت کو بھول جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فرائض وسُنن کی پابندی
نہیں کرتے اِس امر سے آگاہ ہو جائیں کہ دنیوی لذّتیں فی الحقیقت انسان کے
لئے کوئی حقیقی کمال نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ سب عالم آخرت کی صلاح و فلاح کے
اسباب ہیں۔ چونکہ غفلت انسانی فطرت میں داخل ہے اِس لئے بار بار ان

تاپائدار لذتوں کے انجام سے انسان کو آگاہ کیا گیا تاکہ وہ چشم بصیرت سے اپنے مقصود بالذات کو دیکھ لے اور ان اسباب سے بروجۂ شریعت متمتع ہو۔ سو اس خیال پر دُنیا کی مذمت واقعی صحیح خیال ہے۔ مگر یہ مطلب نہیں کہ تم دُنیا سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ جاؤ۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ جس شخص کو سامانِ معیشت بافراغت میسر نہیں آتا وہ ہمیشہ امورِ دین میں ادھورا یا بالکل قاصر رہتا ہے۔

ابن جوزی رحمہ اللہ اپنی کتاب تلبیس ابلیس میں ایسے جاہل تارکانِ دُنیا کی نسبت لکھتے ہیں کہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو قرآن و سُنت سے بیخبر ہوتے ہیں کسی سے دُنیا کی مذمت سُنکر اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ دُنیا کو ترک کر دیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ اُس دُنیا سے جس کی مذمت کی جاتی ہے کیا مراد ہے؟ ایسے لوگ اس خیال پر دُنیا کو ترک کر دیتے ہیں کہ آخرت میں انہیں نجات ملجائیگی۔ سو وہ یونہی وحشیوں کی طرح مُنہ اُٹھا کر پہاڑوں میں نکل جاتے ہیں اور جمعہ و جماعت اور محفل علم سے علیٰحدہ ہو کر وحشی بن جاتے ہیں اور شیطان انکے ذہن میں یہ بات جما دیتا ہے کہ یہی زُہد کی حقیقت ہے اور اس روش کے ساتھ جب کسی بزرگ کی نسبت بھی ایسا سُن پاتے ہیں تو اُن کا یہ خیال اور بھی پُختہ ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسا شخص اپنی اولاد کی بھی کچھ پروا نہیں کرتا اور والدین کی بھی کچھ نہیں مانتا۔ اور ان سب کے حقوق کو نظر انداز کرکے عزلت اختیار کر بیٹھتا ہے۔ حالانکہ حقوق العباد نہایت ضروری ہیں جن کی نسبت قرآن و سنت میں بڑی تاکید آچکی ہے مگر یہ سب خرابی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ایسے شخص کو علم نہیں ہوتا۔ اگر وہ کسی اہل شریعت کے پاس بیٹھا ہوتا تو اس امر کو سمجھ لیتا کہ دُنیا فی حد ذاتہا کوئی بُری چیز نہیں بھلا وہ چیز کیونکر بُری ہو سکتی ہے جس کی نسبت اللہ تعالےٰ بار بار اپنے بندوں

پر اظہار احسان کرتا ہے اور انسان کے لئے ایسے اسباب اس میں موجود ہیں
جن سے وہ اپنی دینی و دنیوی زندگی کی اصلاح کرسکتا ہے بلکہ حصول معرفت
الٰہی کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ علم و عبادت بدوں اسکے ممکن نہیں۔ ہاں
مذموم امر فقط یہ ہے کہ انسان اسبابِ دنیوی میں خلاف شریعت تصرف کرے
جس سے نفس کو محض حصولِ لذت اور رعونت مدِنظر ہو جیسے اکثر اہلِ دُنیا کا وتیرہ
ہے۔ ایسے شخص کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اِس طرح بے زاد و توشہ جنگلوں اور
پہاڑوں میں چلے جانا خلاف شریعت امر ہے۔ جناب رسول اکرم صلے اللہ علیہ
وسلم قبل از بعثت غار حرا میں اپنا زاد و توشہ گھر سے لیجا کر عبادتِ الٰہی میں مشغول
ہوا کرتے۔ موسیٰ علیہ السلام جب خضر علیہ السلام کے ملنے کو گئے تو مچھلی وغیرہ
اپنی غذا کا سامان ساتھ لے گئے۔ اصحاب کہف جب ظالم مشرک سے بھاگ کر
ایک غار میں جا چھپے تو انکے پاس اپنے زاد کے لئے دراہم موجود تھے بعض سلف
سے مروی ہے کہ وہ عبادت کے لئے پہاڑ پر چلے گئے تو سفیان ثوری رحمہ اللہ
آئے اور انہیں ساتھ شہر کو لے گئے۔ بعض زاہدوں کی نسبت مروی ہے کہ انہوں
نے حلوا کھانا ترک کر رکھا تھا محض اس خیال پر کہ مجھ سے اس نعمت کا شکر ادا
نہیں ہو سکتا۔ خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ نے سن کر کہا کہ یہ شخص احمق ہے۔ کیا یہ
سرد پانی کا شکر ادا کرسکتا ہے؟ سفیان ثوری علیہ الرحمۃ جب سفر کو جاتے تو اپنے
ساتھ گوشت بریاں، ورقالودہ اور نفیس غذا لیجایا کرتے۔ کیا کہیں ایسی باتوں
سے زہد باطل ہو سکتا ہے؟ انسان کو یہ یقین کرلینا چاہئے کہ نفس بمنزلہ سواری
کے ہے۔ اس کے ساتھ اعتدال سے سلوک کرنا چاہئے تا کہ منزل پر لے پہنچے
ضروری ہے کہ مفید چیزوں کو بروجہ شریعت حاصل کرے اور مضر سے بچتا رہے
مثلاً پیٹ بھر کر کھانا منع ہے، کیونکہ قرآن مجید نے اس کی ممانعت کی ہے اور

حصول لذت کا دلدادہ نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس سے بالآخر بدن کو اذیت پہنچتی ہے اور دین میں بھی مضرّ ہے ؛

بعض لوگ زہد کے مفہوم میں ان امور مسنونہ کو بھی ترک کر دیتے ہیں جو انسان کے کمال کا موجب ہیں۔ مثلاً عام طور پر نکاح اور خانہ داری کو منافیٔ محبت الٰہی خیال کیا گیا ہے اور کئی ایک جاہل متصوفہ اپنے معتقدین کو انہیں خیالات کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسے خیالات مخالفت قرآن و حدیث پر مبنی ہیں۔ قرآن مجید نے بیوی کو مردوں کے لئے بطور اظہار احسان کے ذکر فرمایا ہے قال اللہ تعالیٰ جعل لکم من انفسکم ازواجا ۔۔۔ الخ یعنی اللہ تعالےٰ نے تمہیں میں سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تم ان سے آرام پاؤ اور تم میں مودت اور رحمت پیدا ہو۔ غور کرو کہ انسانی تمدن و معاشرت کی صحت کے لئے نکاح کس قدر مصلحتوں اور خوبیوں کا جامع ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں کہاں تک شریعت اور عقل کے پیچھے لاٹھی لئے پھرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں بروایت حضرت ابو ہریرۃؓ مروی ہے کہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک دینار وہ ہے کہ تم خدا کی راہ میں صرف کرتے ہو۔ ایک دینار وہ ہے کہ تم صدقہ کرتے ہو۔ ایک دینار وہ ہے کہ غلام کے لئے خرچ کرتے ہو۔ اور ایک دینار وہ ہے جو تم اپنے اہل و عیال پر صرف کرتے ہو۔ سب سے افضل وہی دینار ہے جو تم اپنے اہل و عیال پر صرف کرتے ہو۔ اور حضرت عمرؓ کی نسبت مروی ہے کہ آپ فرمایا کرتے کہ اگر میں ایسی حالت میں مرجاؤں کہ اپنی محنت و سعی سے روزی تلاش کر رہا ہوں تو مجھ کو اس سے زیادہ پسند ہے کہ خدا کی راہ میں غازی ہو کر مروں ؛

بھلا نکاح کی مصلحت کو شریعت حقہ کیونکر نظر انداز کر سکتی تھی جبکہ خود حضورؐ کی سنت میں نکاح کو بتاکید اکید ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا " تناکحوا تناسلوا "

یعنی نکاح کرو اور نسل بڑھاؤ ؛

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض متصوفہ ترک نکاح کی تلقین کرتے ہیں اور خود بھی نکاح سے محترز رہتے ہیں تاکہ زاہد مشہور ہوں اور عوام الناس ایسے صوفی کی بہت تعظیم کیا کرتے ہیں جس کے ہاں بیوی نہ ہو۔ چنانچہ بارہا ایسے لوگوں سے سنا گیا ہے کہ فلاں بزرگ نے عمر بھر کبھی عورت کی شکل بھی نہیں دیکھی حالانکہ یہ رہبانیت ہے جس کو اسلامی شریعت قطعاً جائز نہیں رکھتی ؛

مگر تعجب خیز یہ امر ہے کہ انہیں حضرات میں سے بعض لوگوں کی نسبت نہایت شرمناک واقعات گوش زد ہوتے ہیں اور بالآخر ذلیل ہو کر اپنی عاقبت تباہ کر لیتے ہیں چونکہ قانون شرعی کی مخالفت کرتے ہیں اور قوائے فطریہ کو ان کے مقتضیٰ سے روکتے اس لئے ضروری ہے کہ وہ ایسی پاداش میں مبتلا ہوں۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ کم علم اور جاہل متصوفہ نے حقیقت شریعت کو نہ سمجھ کر اس قسم کے بیہودہ خیالات لوگوں کے ذہن نشین کر دئے ہوتے ہیں اور شریعت پر عامل ہونے کو زہد کا منافی قرار دیتے ہیں حالانکہ زہد کی حقیقت صرف یہ ہے کہ دُنیوی لذات میں پڑ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے دور نہ جا پڑے اور بجز محبت الٰہی کے کسی دوسری چیز سے ایسی وابستگی پیدا نہ کر لے جس سے مقاصد شرعیہ میں خلل آئے۔ اگر جاہل اور کم علم لوگ اس قسم کے خلاف شریعت خیالات کو رواج نہ دیتے تو تصوف کبھی بدنام نہ ہوتا۔ حالانکہ اوائل متصوفہ کی تعلیم میں ایسی باتیں ہرگز نہیں ملتیں بلکہ وہ جابجا اس امر کی تصریح کرتے ہیں کہ محافظت باطن کے ساتھ ظواہر احکام شریعت کو لازم سمجھنا چاہئے۔ جب تک کسی امر کا کتاب و سنت کے معیار پر موازنہ نہ کیا جائے اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ابو سلیمان دارانی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میرے دل پر بہت سی باتیں اپنے اجتہاد اور مکاشفہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر جب تک میں ان ہر دو گواہ عدل (کتاب و سنت) کی شہادت نہیں لے لیتا انکو کوئی اعتبار نہیں دیتا

اِسی طرح حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ہمارا علم (تصوف) کتاب و سنّت کے ساتھ مضبوط کیا گیا ہے۔ اور جس علم پر کتاب و سنّت شاہد نہیں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔ بہر صورت عام متصوفہ کی ایسی باتیں جو قرآن و سنّت کے مخالف ہوں محض جاہلانہ حُسنِ ظن سے قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتیں ۔

ناظرین یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ وبا اِسلام میں کچھ تو فلسفہ الٰہیات کی تعلیم سے داخل ہوئی اور کچھ نصاریٰ سے۔ مگر علمائے کتاب و سنّت نے ہمیشہ اِس قسم کے بدعات کو روکا ہے اور ایسے لوگوں کی سخت مخالفت کی ہے۔ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ سب سے پہلے کتاب و سنّت کا فیصلہ طلب کرے کیونکہ کوئی امر کتاب و سنّت سے باہر نہیں اور صحابہ کے حالاتِ زندگی سے آگاہ ہونا اس بارہ میں رہبرِ کامل کا کام دیتا ہے۔" والتوفیق من اللہ تعالیٰ ۔

اِس امر کا سراغ لگانا بہت دشوار ہے کہ دُنیا میں رہبانیت کی ابتدا کب ہوئی۔ کہتے ہیں کہ پہلے پہل یہود کے فرقہ اسینیہ نے (گو موجودہ بائیبل میں پہلے دو فرقوں کا ذکر ہے مگر یوسیفس مؤرخ یہودی نے جو ۳۷ ہجری میں پیدا ہوا تھا فرقہ اسینیہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ تمام تین فرقے تھے۔ فریسیہ۔ صدوقیہ۔ اسینیہ) معرفِ طلبین میں رہبانیت کی بُنیاد ڈالی تھی۔ بعد ازاں نصاریٰ نے اسے از سرِ نو زندہ کیا۔ نصاریٰ میں رہبانیت کی پہلی مثال ملک مصر میں ملتی ہے۔ انطونی اعظم[1] نے تاشتہ ہ طیوہ[2] نے گھر بار چھوڑ کر بحیرۂ قلزم کے متصل کوہ قلزم پر سکونت اختیار کی۔ اس راہب کی کوشش سے لیبیا کے ریگستان اور طیبوہ کی چٹانوں اور دریائے نیل کے شہروں میں راہبوں کی آبادی جلد جلد قائم ہو گئی۔ اس کے مُرید ملک حبشہ میں بھی پھیل گئے قریباً ۳۳۰ء میں پولوس

[1] انطونی اعظم ایک سو پانچ برس کی عمر میں ۳۵۶ھ میں مرا۔ [2] مصر کے حصہ علیا میں طیوہ ایک شہر تھا جسکے ایک سو دروازہ تھے اب صرف اس کے کھنڈر باقی ہیں ۱۲ء

طیوسی کے مرید پخومیوس نے جزیرہ تابنّیہ واقعہ دریائے نیل میں راہبوں کے لئے سب سے پہلی خانقاہ بنائی - اسی نے راہبوں کے لئے قواعد تیار کئے - اور اس کی راہبہ بہن نے عورتوں کے لئے الگ خانقاہ بنائی - پخومیوس کی کوشش سے اس جزیرہ میں راہبوں کی تعداد ایک ہزار چار سو ہوگئی - اس کی دیکھا دیکھی راہب آمون نے بھی سکندریہ کے جنوب کی طرف کوہ نطرون پر ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور تھوڑی سی مدت میں پانچہزار راہب وہاں جمع ہوگئے - پھر مکاریوس راہب نے جبال نطرون و دریائے نیل کے درمیان بہت سی خانقاہیں بنائیں - اس طرح زن و مرد کی ایک تعداد کثیر نے رہبانیت اختیار کرلی - صرف شہر اوکسی رنکس کی خانقاہوں میں دس ہزار عورتیں اور بیس ہزار لوگ رہتے تھے - مصر میں رہبان کی کثرت کا اندازہ اس امر سے لگ سکتا ہے کہ شاہ ویلنس[1] کو فوجی خدمت کے لئے آدمی نہیں مل سکتے تھے اس لئے اس نے حکم دیدیا تھا کہ آئندہ راہبوں سے بھی فوجی خدمت لی جایا کرے +

ملک شام و ایشیائے کوچک اور بحیرۂ اسود کے جنوبی سواحل نے بھی رہبانیت میں مصر کا اقتدا کیا - ہلاریون (متوفی ۳۷۱ء) جس نے سکندریہ میں تعلیم پائی تھی اور اعظم مذکور کے ساتھ دو ماہ تک مصر کے جنگل میں بھی رہا تھا اپنے وطن فلسطین میں آکر ۳۲۸ء میں پندرہ برس کی عمر میں غازا کے جنوب کی طرف صحرا میں راہب بن بیٹھا اور اس نے بہت سی خانقاہیں بنائیں - جب وہ فلسطین کی خانقاہوں کا معائنہ کیا کرتا تھا تو دو تین ہزار راہب اس کے ساتھ ہوا کرتے تھے - اور یستاتیوس اسقف سبسطیہ نے آرمینیا میں رہبانیت کو ترقی دی - باسیلیوس (متوفی ۳۷۹ء) نے ۳۶۰ء میں صوبہ پانتس[2] میں رہبانیت کی بنیاد ڈالی اور بحیرۂ اسود کے جنوبی

[1] ویلنس ایک رومی شاہنشاہ تھا جو ۳۷۸ء میں قتل ہوا +
[2] ایشیائے کوچک کا شمال مشرقی صوبہ پانتس کہلاتا ہے +

سواحل پر بہت سی خانقاہیں بنائیں اور ان کے انتظام کے لیئے قواعد تیار کیئے۔

مشرق کی طرح مغرب میں بھی رہبانیت کی بڑی اشاعت ہوئی۔ اثناسیوس اسقف اسکندریہ (متوفی ۳۷۳ء) جب آریوس[1] کے عقیدہ کی مخالفت کے سبب دوسری دفعہ جلاوطن ہوا تو اُس نے ۳۴۰ء میں روما میں رہبانیت کو پہلے پہل رواج دیا۔ ۳۷۱ء میں مارٹن باشندہ تور نے ملک غالیہ[2] میں رہبانیت قائم کی۔ جب وہ مرا تو دو ہزار مرید اس کے جنازہ کے ساتھ تھے۔ مارٹن کے ہم عصر کاسیانوس نے جو اوائل عمر میں جرمانوس کے ساتھ بیت اللحم کی خانقاہ میں رہا تھا ۴۱۵ء میں مرسیلیا[3] میں خانقاہیں بنائیں۔ بحیرہ روم میں بھی لیراں[4] سے لیپاری تک تمام جزائر میں رہبان آباد تھے۔ اسقف امبروس (متوفی ۳۹۷ء) نے میلان واقعہ اطالیہ میں ایک خانقاہ بنائی اور وہیں اغسطینوس[5] کو عیسائی بنایا۔ اغسطینوس نے اپنے وطن میں آکر شمالی افریقہ میں رہبانیت قائم کی اور اس کے لئے قوانین بنائے جو بعد میں یورپ کی ہزارہا خانقاہوں کا دستور العمل بنے۔ پیلاجیوس[6] (متولد ۳۶۰ء) ان قوانین کو روما سے انگلستان میں لایا۔ یہ راہب خانقاہ بینگور واقعہ صوبہ ویلز

---

[1] اریوس (متوفی ۳۳۶ء) کا عقیدہ تھا کہ ابن اللہ مخلوق ہے ازلی نہیں مگر خدا نے اسے الوہیت میں شریک کرلیا ہے [2] زمانہ سابق میں غالیہ یورپ کے ایک ملک کا نام تھا جس میں موجودہ فرانس۔ بلجیم۔ ہالینڈ کا کچھ حصہ۔ جرمنی۔ سوئٹزرلینڈ اور شمالی اطالیہ شامل تھا [3] مرسیلیا یعنی مارسیلز فرانس کا بندرگاہ ہے۔ رومیوں کے زمانہ میں یہ شہر ایسا مشہور تھا کہ سرو دانشمند ملک غالیہ کا ایتھنز اور یونانی حکمت و تعلیم کہلاتا تھا [4] فرانس کے جنوبی ساحل کے نزدیک دو جزیروں کا نام ہے ایک کو سینٹ مارگرٹ اور دوسرے کو سینٹ ہونورٹ کہتے ہیں۔ سینٹ ہونورٹ میں اب تک جنید کتبہ رہبان کی ایک خانقاہ ہے۔ جزیرہ لیپاری صقلیہ کے شمال میں واقع ہے [5] اغسطینوس جو مسیحی کلیسائے لاطینی میں سب سے بزرگ سمجھا جاتا تھا۔ ۱۳۔ نومبر ۳۵۴ء میں نومیدیا واقع شمالی افریقہ کے قصبہ تغاستہ میں پیدا ہوا۔ اس نے قرطاجنہ میں جو نومیدیا کے مشرق میں ہے تعلیم پائی وہاں سے معاش کی تلاش میں روما گیا بعد ازاں میلان میں علم معانی و بیان پر مقرر ہوا۔ اور وہیں ۳۸۷ء میں عیسائی ہوگیا [6] دوسرے عیسائیوں کی طرح اغسطینوس کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت آدم کا گناہ موروثی ہے جو انسان پیدا ہوتا ہے گناہ اسکے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ بیٹے مسیح کی الوہیت پر ایمان لانا تمام گناہوں کا کفارہ ہے کیونکہ وہ سب کے گناہوں کے لیے مصلوب ہوئے۔ پیلاجیوس نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ انسان بیگناہ پیدا ہوتا ہے جیسے کہ آدم۔ آدم کے گناہ کا اثر صرف آدم پر ہوا۔ موت گناہ کا کفارہ نہیں ہو سکتی۔ آدم کا گناہ انکی نسل کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔

میں رہتا تھا۔ جہاں دو ہزار سے زیادہ راہب تھے۔ اسی خانقاہ سے آئرلینڈ کی وحشی اقوام میں رہبانیت پھیلی۔ سینٹ پیٹرک (متوفی ۴۶۳ء) کے زمانہ میں وہاں کئی خانقاہیں اور مدارس قائم ہو گئے۔ سینٹ بینیڈکٹ باشندہ نرسیا (متوفی ۵۴۳ء) نے اوائل عمر میں رہبانیت اختیار کی اور وکووارو واقعہ اطالیہ کی خانقاہ کا سجادہ نشین مقرر ہوا۔ مگر اس خانقاہ کے رہبان کی ریاضت کو کچھ سخت نہ پایا۔ اس لئے اسے چھوڑ دیا اور چند سال میں بارہ خانقاہیں بنائیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تقریباً ۵۲۹ء میں اس نے نیپلز کے قریب مونٹ کاسینو کی بڑی خانقاہ بنائی۔ ۵۱۵ء میں اس نے ایک کتاب موسوم بہ "قوانین خانقاہ" لکھی۔ یہ قوانین بعد میں رہبان کے تمام مغربی فرقوں میں رائج ہو گئے۔ سینٹ آغسطین جو ۵۹۶ء میں پوپ گریگوری کے حکم سے چالیس راہبوں کو ساتھ لے کر انگلستان کو عیسائی بنانے آیا تھا۔ فرقہ بینیڈکٹیہ کا ایک راہب تھا سینٹ کولمبا (متوفی ۵۹۷ء) نے رہبانیت اختیار کر کے ملک آئرلینڈ میں ۵۴۶ء میں خانقاہ ڈیری اور ۵۵۳ء میں خانقاہ ڈرو بنائی۔ جب ۵۶۳ء میں وہ جلاوطن ہوا تو اپنے بارہ مریدوں کے ساتھ جزیرہ ایونا میں پہنچا اور وہاں ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی خانقاہ ایونا سے کولمبا نے سکاٹ لینڈ کے تمام شمالی حصہ اور شمالی اور مغربی جزائر میں مذہب عیسوی کی منادی کی اور ہر جگہ خانقاہیں بنائیں۔ اس کے ہم عصر و ہم وطن کولمبانوس (متوفی ۶۱۵ء) تقریباً ۵۸۳ء میں فرانس میں پہنچ کر اینگرے اور لکسایا اور فونتین کی خانقاہیں بنائیں۔ فرانس سے ۶۱۰ء میں وہ سوئٹزرلینڈ پہنچا۔ اس کے ایک ہمراہی نے خانقاہ سینٹ گال بنائی۔ وہاں ۶۱۲ء میں اطالیہ پہنچ کر کولمبانوس نے خانقاہ بوبیو بنائی۔ ایونا کی خانقاہ سے رہبانیت آئس لینڈ میں بھی پہنچ گئی ÷

راہبوں کی تین قسمیں تھیں۔ سینوبیطہ جو ایک ہی اتالیق کے ماتحت اکٹھے رہا کرتے

تھے انکورِیٹہ[۱] جو سوسائٹی سے دُور علیحدہ مجاہدہ پسند کرتے تھے سیرالبیطہ[۲] جو ایک جگہ قیام نہ کرتے تھے بلکہ ملک بہ ملک پھرا کرتے تھے رہبان کی خواب و خورش اور لباس و عبادت کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں مگر ان کی عام حالت کا اندازہ ایڈورڈ گبن کے بیان ذیل سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ صلیبوں اور زنجیروں کی تکلیف دہ بوجھ کے نیچے دب جاتے تھے اور ان کے لاغر اعضاء بھاری سخت لوہے کے طوقوں اور کنگنوں اور دستانوں اور ٹانگوں کی بکتر میں جکڑے ہوتے ہوتے تھے۔ مردوں اور عورتوں میں سے بعض ایسے وحشی ون بن تھے مشہور جنکے ننگے جسم فقط ان کے لمبے لمبے بالوں سے ڈھکے ہوتے وہ اپنے آپ کو اس ناشائستہ اور خستہ حالت پر لانا چاہتے۔ جس میں وحشی انسان اور دیگر حیوانات میں تمیز نہیں ہو سکتی اور انکورِیٹہ کے ایک بڑے فرقہ کا نام راتعیہ[۳] اس لئے پڑ گیا ہے کہ وہ الجزیرہ[۴] کے کھیتوں میں عام ریوڑ کے ساتھ چرا کرتے تھے۔ وہ اکثر کسی جنگلی حیوان کا بھٹ چھین لیتے تھے جنکے ساتھ وہ بے تکلف مشابہت ظاہر کرتے تھے۔ یا وہ کسی اندھیری غار میں چھپ جاتے جسے ہاتھ کی محنت یا قدرت نے چٹان کو کرید کر بنایا ہوتا۔ طیوہ کی سنگ مرمر کی کانوں میں اب تک اس کے مجاہدہ کی یادگاریں[۵] کندہ ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سب سے کامل راہب بہت سے دن بغیر خوراک کے اور بہت سی راتیں بغیر خواب کے اور بہت سے سال بغیر کلام کے گذار دیتے تھے۔ قابل تعریف وہ انسان رہیں اس نام کی ہتک کرتا ہوں[۶] سمجھا جاتا تھا جو ایسی عجیب طرز کا حجرہ یا نشستگاہ تجویز کرتا جس میں وہ نہایت ہی بے آرامی کی حالت میں موسموں کی شدت کا نشانہ بنتا۔

---

[۱] منش (قدیم رشتوں) قریباً ۳۲۵ء رہبان چرنے والے رہبروں کی طرح میں ایک رسالہ لکھا ہے [۲] جو ملک دریائے دجلہ و فرات کے مابین ہے اسے الجزیرہ کہتے ہیں انگریزی میں میسوپوٹیمیا بولتے ہیں [۳] یہ قدیم سریانی حروف میں ہیں جو حبشہ کے عیسائیوں میں مروج تھے [۴] سیمون رہبان کے فرقہ اسطوانیین کا بانی ہے جو تمام عمر کسی ستون کی چوٹی پر گذارتے تھے اور نیچے نہ اُترتے تھے ۱۲ منہ

رہبانیت کے اِن سورماؤں میں سے سیمیون اسطوانی (متوفی ۴۵۹ء) کی ذہانت اور نام ایک ہوائی مجاہدہ کی عجیب ایجاد کے سبب ہمیشہ باقی رہیگا۔ تیرہ سال کی عمر میں یہ نوجوان شامی راہب بھیڑوں کی جگہ گلہ بانی چھوڑ کر ایک ریاضت پسند خانقاہ میں داخل ہوا۔ طویل و دشوار شاگردی کے بعد جس میں وہ کئی بار تاپاک خودکشی سے بچا اس نے شہر انطاکیہ کے مشرق کی طرف تقریباً تیس یا چالیس میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ پر سکونت اختیار کی۔ پتھروں کے ایک دائرہ کے اندر جس سے اس نے اپنے تئیں ایک بھاری زنجیر سے جکڑا ہوا تھا۔ وہ ایک ستون[1] پر چڑھ گیا جو سطح زمین سے بتدریج نو فٹ سے ساٹھ فٹ اونچا بنایا گیا تھا۔ اس آخری بلند جگہ میں اس شامی انکوریطہ راہب نے تیس موسم گرما کی حرارت اور اتنی ہی موسم سرما کی برودت کا مقابلہ کیا۔ عادت اور مشق نے اسے سکھا دیا تھا کہ اس خطرناک حالت کو بغیر ڈر کے دورانِ سر کے کیونکر قائم رکھے اور عبادت کے مختلف اوضاع کو بتدریج کیونکر بجالائے بعض دفعہ وہ حالتِ قیام میں اپنے بازو پھیلا کر صلیب کی شکل بنائے ہوئے عبادت کیا کرتا تھا۔ مگر جس مشق کا وہ نہایت ہی عادی تھا وہ یہ تھی کہ اپنے لاغر جسم کو اسقدر جھکاتا تئیں کہ پیشانی پاؤں پر آ لگتی۔ ایک شوقین تماشائی اس کی مشق کو ایک ہزار دو سو چوالیس دفعہ گن کر بے حد حساب سے عاجز رہ گیا اس کے سرین پر ناسور[2] کی شدت نے اس کی آسمانی زندگی کو کم کر دیا۔ مگر اس میں خلل انداز

---

[1] اوگیریس مؤرخ (متولد ۵۳۶ء) لکھتا ہے کہ اس ستون کی چوٹی کا محیط دو ہاتھ یعنی ۳ فٹ تھا مگر اس قدر تنگ محیط درائت واقعات اور فن حمارت کے قواعد کے خلاف ہے۔ جن لوگوں نے اسے نیچے سے دیکھا وہ آسانی سے دھوکا کھا گئے ہونگے ۱۲ منہ

[2] مجھے اس قدیم بہتان کو چھپانا نہ چاہئے جو اس ناسور کی اصلیت کے بارہ میں مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن شیطان نے فرشتہ کی شکل میں اس سے آکر کہا کہ الیاس کی طرح آپ آتشیں رتھ میں بیٹھکر آسمان پر چلیں اُس ولی نے سنتے ہی قدم اٹھایا اور شیطان نے اُسکے غرور کے سبب اس کو سزا دینے کا موقع پا لیا ۱۲ منہ

نہ ہو سکی - اس صابر راہب نے جان دیدی مگر ستون سے نیچے نہ اُترا - اگر کوئی شہزادہ متلوّن مزاجی سے ایسا عذاب دے تو اسے ظالم خیال کرینگے - مگر ظالم کے اختیار سے باہر ہے کہ مظلوموں کو طویل و المناک زندگی کی سزا دے - یہ اختیاری شہادت بتدریج حواس ظاہری و باطنی کو ضرور ہی نیست و نابود کردیتی ہوگی - اور یہ بھی قیاس میں نہیں آسکتا کہ وہ خبطی جو اپنے آپ کو عذاب دیتے ہیں دیگر اشخاص سے محبت رکھنے کے قابل ہیں - سنگدلی اور بیرحمی ہر ایک مکان و زمان کے راہبوں کا مابہ الامتیاز ہے - ان کی سخت بے پروائی جس میں ذاتی دوستی سے شاذ و نادر تخفیف ہو سکتی ہے مذہبی نفرت کے سبب اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور ان کے بے رحم جوش نے تفتیش[ٹ] کے پاک عہدے کو سختی سے سرانجام دیا ہے +

راہب اولیا جن کو دیکھکر فلسفی کے دل میں صرف حقارت و رحم پیدا ہوتا ہے ادنےٰ و اعلےٰ ان کی تعظیم بلکہ قریباً عبادت[ٹ] کرتے تھے فرانس اور ہندوستان سے زائرین کے لگاتار گروہ سمیون کے مقدس ستون کو سلام کرتے تھے - اقوام شرقیین اس کی دعا کا شرف حاصل کرنے کے لئے مسلح ہو کر آپس میں جھگڑتیں - عرب فارس کی ملکہ نے شکریہ کے ساتھ اس کی فوق العادۃ پارسائی کا اعتراف کیا اور قیاصرہ تھیوڈوسیوس اصغر ملک و ملت کے نہایت ہی ضروری کاموں میں اس فرشتہ سیرت راہب سے مشورہ لیتا تھا - اس کی لاش بطریق مشرق کے سردار کل چھ[ٹ] اسقف - اکیس[ٹ] نوابوں

ٹ چھٹی صدی مسیحی میں یروشلم میں ان نفس کش راہبوں کے لئے ایک شفاخانہ بنایا گیا جو حواس جاتے رہتے تھے ۱۴
ٹ محکمہ تفتیش کو رومن کیتھولک پوپ انوسینٹ سوم نے بارھویں صدی مسیحی کے اخیر میں بدعتیوں کی تعزیر و قتل کیلئے قائم کیا تھا - فرانس - اٹالیہ - پرتگال و ہسپانیہ میں یہ محکمہ قرون جاری رہا اس محکمہ کی کارروائی میں رہبان کے دو فرقہ دو مینیقیہ وغیرہا نے بہت مدد دی - انکے ظلم و ستم کی تفصیل کے لئے ایک علیحدہ کتاب چاہئے - فقط ہسپانیہ میں بتیس ہزار آدمی زندہ جلائے گئے تھے ٹ چنانچہ قرآن مجید میں ہے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا لا الٰہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون (ترجمہ) انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو پروردگار بنا رکھا ہے اللہ کے سوا اور مسیح ابن مریم کو حالانکہ انہیں حکم دیئے گئے تھے کہ بندگی کریں ایک معبود کی نہیں کوئی معبود مگر وہ پاکی ہے اسکو اس چیز سے کہ شرک کہتے ہیں - انتہیٰ - رہبان اپنے حجروں سے نکلکر حج بیت المقدس کو جایا کرتے تھے (باقی صفحہ ۱۷۵ پر)

یا حکام فوجداری اور چھ ہزار سپاہ کے باقاعدہ جمگھٹے کے ساتھ کوہ طیلینب سے نقل کی گئی۔ اور اہل انطاکیہ نے اسکی ہڈیوں کو اپنی عالیشان آرائش اور محکم پناہ سمجھ کر انکی تعظیم وتکریم کی ان نئے ہر دلعزیز انکو رابطہ راہبوں نے بتدریج حواریوں اور شہیدوں کی شہرت کو بھی مات کر دیا۔ مسیحی دُنیا انکے مزارات کے آگے سجدہ کرتی تھی اور وہ معجزے جو ان کے تبرکات کی طرف منسوب کئے جاتے تھے کم از کم تعداد و مدت میں انکی زندگیوں کے رُوحانی سوانح سے زیادہ تھے مگر ان کے سوانح کے سُنہری افسانہ کو اُن کے اہل غرض بھائیوں کی چالاک خوش اعتقادی زیب وزینت دیدیتی تھی۔ اور بھولے بھالے لوگ آسانی سے مان جاتے تھے کہ کسی مصری یا شامی راہب کا نہایت ہی خفیف وہم دُنیا کے ابدی قوانین توڑنے کے لئے کافی ہے۔ یہ خدا کے پیارے چھُونے یا بولنے یا دُور کے پیام سے پُرانی بیماریوں کا علاج کر دیا کرتے تھے اور نہایت ہی سرکش جن بھوت کو آسیب رسیدہ ارواح یا اجسام سے نکال دیا کرتے تھے۔ وہ جنگل کے شیروں اور سانپوں کو بیدھڑک بلایا کرتے یا رعونت سے حکم دیا کرتے۔ خشک تنے کو پھونک مار کر سبز کر دیتے۔ پانی کی سطح پر لوہا ٹھہرا دیتے۔ مگرمچھ کی پیٹھ پر دریائے نیل کو عبور کر جاتے۔ اور تفریح طبع کے لئے آگ کی بھٹی میں چلتے تھے۔ اِن مبالغہ آمیز قصّوں نے جن سے نظم کی بندش معلوم ہوتی ہے مگر اعلےٰ لیاقت ظاہر نہیں ہوتی عیسائیوں کے عقل وعقیدے اور اخلاق پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ خوش اعتقادی نے انکے باطنی قوٰی کو بگاڑ دیا اور نکما کر دیا۔ اُنہوں نے تاریخی شہادت میں تحریف کر دی اور باطل پرستی نے آہستہ آہستہ فلسفہ اور سائنس کی مخالف روشنی کو بُجھا دیا۔ مذہبی عبادت کا ہر ایک طریق جس پر یہ اولیا چلتے تھے اور ہر ایک مخفی مسئلہ جس پر ان کا عقیدہ تھا کلام ربانی کی منظوری سے مستند بنایا جاتا تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۴ جب واپس آتے تو بچے ان کو مس کرتے اور تبرک کے لئے انکے کپڑوں کو پھاڑ لیتے تھے جیسا کہ شاعر جاہلی امرؤ القیس کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

فادرکنہ یاخذن بالساق والنسا　　کما شبرق الولدان ثوب المقدس　۱۲ منہ

اور راہبوں کی غلوانہ و زنانہ حکومت سے تمام مردانہ خوبیاں دب گئیں ؛
دُنیا اس طرح رہبانیت میں مبتلا تھی کہ جناب سیدنا و مولانا محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین سید اولادِ آدم صلے اللہ علیہ وسلم ایسی شریعت کے ساتھ مبعوث ہوئے جو افراط و تفریط سے خالی اور رہبانیت سے پاک ہے۔ چنانچہ آیات و احادیث ذیل سے ظاہر ہے :۔

آیات
(۱) ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (ترجمہ) پھر ہم ان کے قدموں پر اپنے پیغمبروں کو پیچھے لائے۔ اور مریمؑ کے بیٹے عیسےٰؑ کو پیچھے لائے۔ اور اس کو انجیل دی۔ اور ہم نے اُن لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اس کی پیروی کی شفقت اور رحمت ڈال دی۔ اور اُنہوں نے رہبانیت کو اپنی طرف سے نکالا ہم نے اُس کو اُن پر فرض نہیں کیا تھا مگر خدا کی رضامندی ڈھونڈھنے کے لئے تھی۔ پس اُنہوں نے اس کی رعایت نہ کی جیسے کہ چاہیئے تھی۔ پس ہم نے اُن کو جو اُن میں سے ایمان لائے اُن کا ثواب دیدیا۔ اور اُن میں سے بہت فاسق ہیں انتہیٰ۔ (حدید ۴ع) ؛

(۲) وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (ترجمہ) اور تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں کیگئی۔ (حج ۱۰ع) ؛

(۳) يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (ترجمہ) اللہ تعالےٰ تم سے آسانی چاہتا ہے اور تم سے سختی نہیں چاہتا (بقر ۲۳ع) ؛

(۴) وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوْا

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (ترجمہ) اور اللہ کے رستہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ اور نیکی کرو۔ تحقیق اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے (البقرہ ۲۴ع)

(۵) وَجاھدوا فی سبیل اللہ حق جہادہ ھو اجتبٰکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج (ترجمہ) اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرو جیسا کہ چاہئے۔ اس نے تم کو برگزیدہ کیا اور دین میں تم پر کچھ تنگی نہ کی (حج۔ ۱۰ع)

(۶) قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق (ترجمہ) کہدو کہ کس نے حرام کی ہے اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالی ہے اور روزی میں سے پاکیزہ چیزیں؟ (اعراف۔ ۴ع)۔

(۷) یاایھا الذین اٰمنوا لا تحرموا طیبٰت ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (ترجمہ) اے ایمان والو! پاکیزہ چیزیں جو اللہ نے تمہارے واسطے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کرو (اپنے اوپر) اور حد سے نہ نکلو تحقیق اللہ تعالٰے حد سے نکل جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ انتہٰی (مائدہ۔ ۱۲ع) امام بغوی نے معالم التنزیل میں اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ ایک روز نبی صلعم نے وعظ فرمائی۔ اور قیامت کا ذکر کیا۔ پس لوگوں پر رقت طاری ہوگئی اور رومے اور صحابہ میں سے دس بزرگ عثمانؓ بن مظعون جمحی کے گھر میں جمع ہوئے اور وہ یہ ہیں۔ ابوبکر صدیقؓ۔ علیؓ ابنؓ ابی طالبؓ۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ سلمان فارسیؓ۔ عبداللہ بن عمروؓ ابوذر غفاریؓ۔ سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ۔ مقداد بن اسودؓ۔ معقل بنؓ مقرنؓ۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا اور اس پر اتفاق کیا کہ رہبانیت اختیار کریں اور کمبل پہنیں اپنے آلات تناسل کاٹ ڈالیں۔ صائم الدہر ہنیں۔ تمام رات عبادت میں قیام کریں اور فرش پر نہ سوئیں۔ نہ گوشت اور چربی کھائیں۔ نہ عورتوں کے پاس جائیں۔ نہ خوشبو لگائیں اور دنیا میں سیاحت کریں۔ یہ خبر نبی صلعم کو پہنچی۔ آپ عثمان بن مظعون کے گھر تشریف

لیگئے مگر اُس کو نہ پایا - پس آپ کی بابت خولہ (ام حکیم بنت ابی امیہ) سے جو عطارہ یعنی عطر فروش تھی دریافت کیا کہ مجھے عثمان بن مظعون اور اُسکے ساتھیوں کی نسبت جو خبر پہنچی ہے کیا وہ سچ ہے؟ خولہ نے جھوٹ بولنا بُرا سمجھا اور یہ بھی گوارا نہ کیا کہ اپنے خاوند کی خبر ظاہر کردے - پس یوں عرض کی یا رسول اللہ! اگر عثمان نے آپ کو خبر دی تو بے شک اُس نے سچ کہا - پس حضرت رسالت مآب واپس چلے آئے - جب عثمان بن مظعون گھر آئے تو اُن کی بیوی نے سارا ماجرا کہہ سُنایا - اس پر وہ اور اُس کے ساتھی جناب رسالتمآب کی خدمت میں آئے - آپ نے فرمایا - کیا مجھے خبر نہیں دیگئی کہ تم نے فلاں فلاں امر پر اتفاق کیا ہے؟ اُنھوں نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! مگر ہم نے نیکی کے سوا اور نیت نہیں کی - آپ نے فرمایا کہ مجھے اِس بات کا حکم نہیں ملا - پھر یوں ارشاد فرمایا ان لانفسکم علیکم حقا فصوموا وافطروا وقوموا وناموا فانی اقوم وانام واصوم وافطر وآکل اللحم والدسم وآتی النساء ومن رغب عن سنتی فلیس منی یعنی تمہارے نفسوں کا تم پر حق ہے - پس روزہ رکھو اور افطار کرو اور قیام کرو اور سوؤ - کیونکہ میں قیام کرتا ہوں اور سوتا ہوں اور روزہ رکھتا ہوں اور افطار کرتا ہوں اور گوشت اور چربی کھاتا ہوں اور عورتوں کے پاس جاتا ہوں - اور جس نے میری سنت سے روگردانی کی پس وہ مجھ سے نہیں ہے - پھر لوگوں کو جمع کیا اور اُن سے خطاب کیا اور فرمایا ما بال اقوام حرموا النساء والطعام والطیب والنوم وشہوات الدنیا انی لست آمرکم ان تکونوا قسیسین ورھبانا فانہ لیس دینی ترک اللحم والنساء ولا اتخاذ الصوامع وان سیاحۃ امتی الصوم ورھبانیتہم الجہاد واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وحجوا واعتمروا واقیموا الصلوۃ وآتوا الزکوۃ وصوموا رمضان واستقیموا یستقم لکم فانما ھلک من کان قبلکم بالتشدید شددوا علی انفسہم فشدد اللہ علیہم فاولئک بقایاھم

فی الدیارات والصوامع فانزل اللہ ھذہ الایۃ یایھا الذین امنوا لا تحرموا طیبٰت ما احل اللہ لکم یعنی کیا حال ہے ان قوموں کا جنہوں نے عورتوں ۔ طعام خوشبو ۔ نیند اور دُنیا کی شہوتوں کو حرام کر دیا ۔ تحقیق میں تم کو حکم نہیں دیتا کہ قسیس اور راہب بنجاؤ ۔ کیونکہ میرا دین گوشت اور عورتوں کو ترک کر دینا نہیں ۔ اور نہ حجروں میں بیٹھنا ۔ تحقیق میری اُمت کی سیاحت روزہ رکھنا اور انکی رہبانیت جہاد کرنا ہے ۔ اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ ۔ حج کرو عمرہ بجا لاؤ ۔ نماز قائم کرو ۔ زکوٰۃ دو ۔ رمضان کے روزے رکھو اور استقامت اختیار کرو تمہارا حال درست رہیگا ۔ جو تم سے پہلے تھے وہ سخت گیری ہی سے ہلاک ہوتے ۔ انہوں نے اپنی جانوں پر تشدد کیا ۔ اللہ نے ان پر تشدد کیا ۔ انہی کا بقایا خانقاہوں اور حجروں میں ہیں ۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی یاایھا الذین امنوا لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم ۔

احادیث (۱) عن ابی ھریرۃ عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ فسددوا وقاربوا وابشروا واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیٔ من الدلجۃ (رواہ البخاری) ترجمہ ۔ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ دین آسانی ہے اور ہرگز کوئی شخص دین کے ساتھ غالیہ نہیں کر سکتا (یعنی عمل آسان واجب کو چھوڑ کر عمل دشوار غیر واجب اختیار نہیں کرتا مگر یہ کہ دین اسپر غالب آتا ہے (یعنی وہ عاجز ہو جائیگا حتیٰ کہ واجبات کو بھی ادا نہ کر سکیگا ۔ پس طریق مستقیم اختیار کرو ۔ اور اعتدال رکھو اور اپنی جانوں کو (ثواب عمل) کی خوشخبری دو اور مدد چاہو (امر عبادت میں) دن کے اوّل و آخر میں اور تاریکی شب کے کچھ حصہ میں ۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ۔ (مشکوٰۃ باب القصد فی العمل)

(۲) عن انس ابن مالک قال دخل النبی صلعم فاذا الحبل ممدود بین الساریتین

فقال ما هذا الحبل قالوا هذا حبل لزينب فاذا فترت تعلقت فقال النبي صلعم لا حُلّوه ليصلّ احدكم نشاطه فاذا فتر فليقعد (یعنی انس بن مالک سے روایت ہے کہ نبی صلعم داخل ہوتے (مسجد میں) ناگاہ ایک رسی دو ستونوں کے درمیان باندھی ہوئی دیکھی۔ پس آپ نے دریافت کیا کہ یہ رسی کیسی ہے؟ صحابہ نے عرض کی کہ رسی زینب کی ہے۔ پس جب (نماز شب سے) تھک جاتی ہے تو اسے پکڑ لیتی ہے پس نبی صلعم نے فرمایا یہ رسی نہ رہنے دو (ایسا نہ کرو) اس کو کھول دو۔ چاہیے کہ تم میں سے ایک اپنی مدت نشاط تک نماز پڑھے۔ جب تھک جائے تو چاہیے کہ بیٹھ جائے (بخاری کتاب التہجد باب مایکرہ من التشدید فی العبادۃ) ۔

(۳) عن عبد الله بن عمرو بن العاص قال قال رسول الله صلے الله عليه وسلم يا عبد الله الم اخبر انك تصوم النهار وتقوم الليل فقلت بلى يا رسول الله قال لا تفعل صم وافطر وقم ونم فان لجسدك عليك حقا وان لعينك عليك حقا وان لزوجك عليك حقا وان لزورك عليك حقا وان بحسبك ان تصوم من كل شهر ثلثة ايام فان لك بكل حسنة عشر امثالها فاذا ذلك صيام الدهر كله فشددت علىّ قلت يا رسول الله انى اجد قوة قال فصم صيام نبي الله داؤد ولا تزد عليه قلت وما كان صيام نبي الله داؤد قال نصف الدهر وكان عبد الله يقول بعد ما كبر يا ليتني قبلت رخصة النبي صلے الله عليه وسلم (ترجمہ عبد اللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے مجھے فرمایا اے عبد اللہ کیا مجھے خبر نہیں دیگئی کہ تو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو عبادت کے لئے قیام کرتا ہے۔ میں نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا ایسا نہ کر۔ روزہ رکھ اور افطار کر اور رات کو قیام کر اور سو بھی۔ کیونکہ تجھ پر تیرے جسم کا حق ہے۔ اور تجھ پر تیری آنکھ کا حق ہے اور تجھ پر تیری عورت کا حق ہے اور تجھ پر تیرے مہمان کا حق ہے اور تجھے کافی ہے

کہ ہر مہینہ میں تین روزے رکھے۔ پس البتہ ہر نیکی کے عوض تیرے لئے ویسی ہی دس نیکیاں ہیں۔ اسی طرح سے تیرے لئے تمام صوم دہر کا ثواب ہے۔ پس میں نے اپنی جان پر تشدد کیا اور مجھ پر تشدد کیا گیا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا تب اللہ کے نبی داؤد کا روزہ رکھ اور اس سے زیادہ نہ کر۔ میں نے دریافت کیا کہ اللہ کے نبی داؤد کا روزہ کیا تھا۔ فرمایا صوم دہر کا نصف (ایکدن روزہ رکھنا دوسرے دن نہ رکھنا) اور عبداللہ بن عمرو بن عاص بوڑھے ہو کر کہا کرتے تھے۔ کاش میں نبی صلعم کی رخصت کو قبول کر لیتا۔ (بخاری کتاب الصوم باب حق الجسم فی الصوم) *

(۳) عن ابی جحیفۃ قال اٰخی النبی صلعم بین سلمان و ابی الدرداء فزار سلمان ابا الدرداء فرأی ام الدرداء متبذلۃ فقال لھا ما شانکِ قالت اخوک ابو الدرداء لیس لہ حاجۃ فی الدنیا فجاء ابو الدرداء فصنع لہ طعاما فقال کل فانی صائم قال ما انا بآکل حتی تاکل فاکل فلما کان اللیل ذھب ابو الدرداء یقوم قال نم فنام ثم ذھب یقوم فقال نم فلما کان من اٰخر اللیل قال سلمان قم الاٰن فصلیا فقال لہ سلمان ان لربک علیک حقا ولنفسک علیک حقا ولاھلک علیک حقا فاعط کل ذی حق حقہ فاتی النبی صلعم فذکر ذٰلک لہ فقال النبی صلعم صدق سلمان۔ (ترجمہ) ابوجحیفہ رضہ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے سلمان اور ابوالدرداء کے درمیان بھائی چارا کرا دیا۔ پس سلمان ابوالدرداء کو ملنے گئے ام درداء کو پرانے محنت کے کپڑوں میں دیکھ کر پوچھا کہ تیرا کیا حال ہے؟ اُس نے کہا تیرے بھائی ابوالدرداء کو دُنیا کی کوئی حاجت نہیں۔ پس ابوالدرداء آگئے اور اُس کے لئے کھانا تیار کیا اور کہا کھائیے کیونکہ میں روزہ دار ہوں۔ سلمان نے کہا۔ میں نہیں کھانے کا۔ حتیٰ کہ تو بھی کھائے۔ پس ابوالدرداء نے کھایا۔ جب رات ہوئی

تو ابو الدرداء عبادت کے لئے قیام کرنے لگے۔ سلمان نے کہا سو جا۔ پس وہ سو گئے۔ پھر قیام کرنے لگے۔ سلمان نے کہا سو رہو۔ جب آخیر رات ہوئی تو سلمان نے کہا اب اُٹھ۔ پس دونوں نے نماز پڑھی۔ سلمان نے اُس سے کہا تیرے رب کا تجھ پر حق ہے تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیرے اہل کا تجھ پر حق ہے۔ پس ہر ایک حقدار کو اس کا حق ادا کر۔ پس نبی صلعم کی خدمت میں آیا اور آپ سے یہ واقعہ ذکر کیا۔ نبی صلعم نے فرمایا کہ سلمان نے سچ کہا۔ (بخاری۔ کتاب الصوم باب التنکیل لمن اکثر الوصال) ۴۵

(۵) عن انس قال جاء ثلاثۃ رھط الی ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسألون عن عبادۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلما اُخبروا بھا کانھم تقالوھا فقالوا این نحن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقد غفر اللہ ما تقدم من ذنبہ وما تاخر فقال احدھم اما انا فاصلی اللیل ابدا وقال الآخر انا اصوم النھار ابدا ولا افطر و قال الآخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الیھم فقال اُانتم الذین قلتم کذا وکذا اما واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی متفق علیہ۔ (ترجمہ) انس سے روایت ہے کہ (صحابہ میں سے) تین شخص نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات کے پاس آئے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال پوچھتے تھے۔ پس جب انہیں آنحضرتؐ کی عبادت کی مقدار سے خبر دی گئی گویا اُنہوں نے اس مقدار کو کم سمجھا۔ پس اُنہوں نے کہا ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت ہے۔ حالانکہ تحقیق اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخشدئے ہیں؟ پس ان میں سے ایک نے کہا لیکن میں تو ہمیشہ تمام رات نماز پڑھا کرونگا۔ دوسرے نے کہا میں دن کو ہمیشہ روزہ رکھا کرونگا اور کبھی افطار نہیں کرونگا۔ تیسرے نے کہا میں عورتوں سے کنارہ کشی کروں گا۔ پس میں کبھی نکاح نہیں کرونگا۔ نبی صلعم

اُن کی طرف تشریف لائے اور پوچھا کیا تم ہو جنہوں نے ایسا ایسا کہا ہے! دیکھو خدا کی قسم! میں تمہاری نسبت خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہوں اور زیادہ پرہیزگار ہوں - مگر میں روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں بھی رکھتا اور نماز پڑھتا ہوں اور سوتا ہوں اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں - پس جو میری سُنت سے برگشتہ ہُوا وہ میری پیروی کرنے والوں سے نہیں ہے - متفق علیہ (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) ؂

(۶) عن انس قال کان رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلّم یفطر من الشہر حتی نظن ان لا یصوم منہ شیئاً ویصوم حتی نظن ان لا یفطر منہ شیئاً وکان لا تشاء ان تراہ من اللیل مصلیاً ... ولا نائماً الا رائیتہ رواہ البخاری (ترجمہ) انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کبھی کسی مہینے میں روزے نہیں رکھتے تھے یہاں تک کہ یہ گمان ہوتا تھا کہ آپ اس مہینہ سے کچھ روزے نہیں رکھینگے اور کبھی روزے رکھتے یہانتک کہ یہ گمان ہوتا کہ آپ اس مہینہ سے کچھ دن بھی افطار نہیں کرینگے اور آنحضرت ؐ کی یہ حالت تھی کہ (اے مخاطب) تو نہ چاہتا کہ آپ کو رات میں نماز پڑھتے دیکھے مگر یہ کہ تو آپ کو نماز پڑھتے دیکھتا اور تو نہ چاہتا کہ آپ کو خواب کرتے دیکھتا مگر یہ کہ آپ کو خواب کرتے دیکھتا - اسے بخاری نے روایت کیا ہے (مشکوٰۃ - باب القصد فی العمل) مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کا عمل افراط و تفریط سے خالی تھا - نہ تو یہ حالت تھی کہ آپ ہمیشہ افطار کریں جو تفریط ہے اور نہ یہ کہ ہمیشہ صائم رہیں - جو افراط ہے اسی طرح رات کو نماز بھی پڑھتے اور آرام بھی فرماتے ؂

(۷) عن عائشہ رض قالت رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم خذوا من الاعمال ما تطیقون فان اللّٰہ لا یمل حتی تملوا متفق علیہ (ترجمہ) عائشہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - اعمال میں سے وہ اختیار کرو جنکی تم

طاقت رکھتے ہو۔ کیونکہ خدا (ثواب دینے سے) ملول نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ تم (اِس عمل کے جاری رکھنے سے) ملول نہ ہو جاؤ۔ متفق علیہ (مشکوٰۃ۔ باب القصد۔ فی العمل)

(۸) عن مسروق قال قالت عائشۃ صنع النبی صلعم شیئاً فرخص فیہ فتنزہ عنہ قوم فبلغ ذالک النبی صلعم فخطب فحمد اللہ ثم قال ما بال اقوام یتنزہون عن الشیء اصنعہ فواللہ انی اعلمھم باللہ واشدھم لہ خشیۃ (ترجمہ) مسروق سے روایت ہے کہ عائشہ رضی نے کہا نبی صلعم نے کچھ عمل کیا۔ پس اِس کی رخصت دیدی ایک قوم نے اس عمل سے احتراز کیا۔ یہ خبر نبی صلعم کو پہنچی۔ پس آپ نے خطبہ پڑھا اور اللہ کی حمد کی۔ پھر فرمایا کیا حال ہے ان لوگوں کا جو احتراز کرتے ہیں اس چیز سے جو میں کرتا ہوں؟ اللہ کی قسم البتہ میں انکی نسبت زیادہ عالم باللہ اور اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہوں (بخاری۔ کتاب الادب۔ باب من لم یواجہ الناس بالعتاب)

(۹) عن انس ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کان یقول لا تشددوا علٰی انفسکم فیشدد اللہ علیکم فان قوم شددوا علٰی انفسھم فشدد اللہ علیھم فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیار رھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم رواہ ابوداؤد) ترجمہ۔ انس رضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنی جانوں پر تشدد نہ کرو کیونکہ اس طرح اللہ تم پر تشدد کریگا۔ پس جس قوم نے اپنی جانوں پر تشدد کیا اللہ نے انپر تشدد کیا۔ حجروں اور خانقاہوں میں انہیں سخت گیروں کے باقی ماندہ ہیں۔ رہبانیت کو انہوں نے اختراع کیا ہم نے اسے انپر فرض نہ کیا تھا۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

(۱۰) عن عباد بن یعقوب الرواجنی انبانا عیسی بن عبد اللہ بن محمد بن علی

بن علی ثنی ابی عن ابیہ عن جدہ عن علی قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان اللہ یحب ان یؤخذ برخصہ کما یحب ان یؤخذ بعزائمہ ان اللہ بعثنی بالحنیفیۃ السمحۃ ودین ابرٰھیم ثم قرأ وما جعل علیکم فی الدین من حرج فقال لی ابی یا بنی ماحرج قلت لا ادری قال الضیق (ترجمہ بحذف اسناد) حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ دوست رکھتا ہے کہ اسکی رخصتوں پر عمل کیا جائے (عزیمت اصل حکم پر عمل کرنا) جیسا کہ وہ دوست رکھتا ہے کہ اس کی عزیمتوں پر عمل کیا جائے۔ تحقیق اللہ تعالےٰ نے مجھے سچے آسان دین ابراہیم کے ساتھ بھیجا ہے وَمَا جَعَلَ علیکم فی الدین من حرج (اور اُس نے دین میں تم پر کچھ تنگی نہیں کی) پس مجھ سے میرے باپ نے کہا اے میرے بیٹے! حرج کے کیا معنی ہیں؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا۔ کہا تنگی۔ اس حدیث کو حاکم مستدرک میں لایا ہے۔ (کنز العمال جزء ثانی صفحہ ۱۳۶)۔

(۱۱) ان لکل امۃ سیاحۃ وسیاحۃ امتی الجھاد فی سبیل اللہ ولکل امۃ رھبانیۃ ورھبانیۃ امتی الرباط فی نحو العدو۔ (ترجمہ) آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ہر اُمت کے لئے سیاحت ہے۔ اور میری امت کی سیاحت اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا ہے اور ہر اُمت کے لئے رہبانیت ہے اور میری اُمت کی رہبانیت دشمن کے مقابلہ میں سرحد پر گھوڑوں کا (جہاد کے لئے) باندھ رکھنا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے۔ (کنز العمال جزء ثانی صفحہ ۲۵۴)۔

(۱۲) لکل نبی رھبانیۃ ورھبانیۃ ھذہ الامۃ الجھاد فی سبیل اللہ (ترجمہ) آنحضرت صلعم نے فرمایا ہر نبی کے لئے رہبانیت ہے اور اس امر کی رہبانیت اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے اپنی مسند میں انس سے روایت کیا ہے۔ (کنز العمال جزء ثانی صفحہ ۲۵۵)۔

(۱۳) عن عائشۃ ان النبی صلعم دخل علیہا وعندھا امرأۃ فقال من ھذا
قالت فلانۃ لاتنام تذکر من صلاتہا فقال مہ علیکم من العمل ما تطیقون
فواللہ لا یمل اللہ عزوجل حتی تملوا وکان احب الدین الی اللہ ما دام علیہ صاحبہٗ
(ترجمہ) عائشہ رضہ سے روایت ہے کہ ایک عورت (خولا) تھی - آپ نے پوچھا یہ کون ہے
عائشہ رضہ نے جواب دیا فلاں عورت ہے جو سوتی نہیں اور اس کی نماز کی درازی کا ذکر
کرتی تھی - آپ نے فرمایا چھوڑ - تم پر وہ عمل لازم ہے جس کی (مداومت کی) تم طاقت
رکھتے ہو - اللہ کی قسم! اللہ عزوجل (ثواب دینے سے) ملول نہیں ہوتا یہانتک کہ تم
(مداومت سے) ملول نہ ہوجاؤ - اور اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب وہ طاعت ہے جسپر
طاعت کرنیوالا ماومت کرے - (نسائی - باب احب الدین الی اللہ عزوجل) ؛

(۱۴) عن ابن عباس قال بینا النبی صلعم یخطب اذا ھو برجل قائم فسأل
عنہ فقالوا ابو اسرائیل نذران یقوم ولا یقعد ولا یستظل ولا یتکلم ویصوم
فقال النبی صلعم مروہ فلیتکلم ولیستظل ولیقعد ولیتم صومہ رواہ بخاری -
(ترجمہ) ابن عباس رض سے روایت ہے کہا جبکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلّم خطبہ پڑھ رہے
تھے - ناگاہ آپ نے ایک کھڑے شخص کو دیکھا - پس اسکی نسبت دریافت فرمایا صحابہ رض
نے عرض کی ابو اسرائیل ہے جس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہیگا - نہ بیٹھے گا اور نہ
سایہ میں آئیگا اور نہ کلام کرے گا بلکہ روزہ رکھے گا - پس نبی صلے اللہ علیہ وسلّم نے
فرمایا کہ اسے حکم دو - پس چاہیئے کہ وہ کلام کرے اور سایہ میں آئے اور بیٹھے اور اپنا
روزہ پورا کرے - اس کو بخاری نے روایت کیا ہے (مشکوۃ - باب فی النذور) ؛

(۱۵) عن ابی امامۃ قال خرجنا مع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم فی
سریۃ فمر رجل بغار فیہ شیء من ماء وبقل فحدث نفسہ بان یقیم فیہ
ویتخلی من الدنیا فاستاذن رسول اللہ صلعم فی ذلک فقال رسول اللہ صلعم

انی لم ابعث بالیہودیۃ ولا بالنصرانیۃ ولکنی بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ والذی نفس محمد بیدہ لغدوۃ او روحۃ فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما فیہا ومقام احدکم فی الصف خیر من صلوٰۃ ستین سنۃ۔ رواہ احمد۔ (ترجمہ) ابو امامہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلعم کے ساتھ ایک لشکر میں (جہاد کے لئے) نکلے۔ پس ایک شخص ایک غار پر گذرا جس میں کچھ پانی اور سبزی تھی۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ میں اس میں قیام کروں اور دُنیا سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ پس اس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس امر کی اجازت طلب کی۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں یہودیۃ و نصرانیۃ لے کر مبعوث نہیں ہوا بلکہ میں آسان سچے دین کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلعم کی جان ہے البتہ صبح کو یا شام کو اللہ تعالےٰ کے راستہ میں چلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ کسی کا (جہاد کی) صف میں کھڑے ہونا اس کی ساٹھ سال کی نماز سے بہتر ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا۔ (مشکوٰۃ۔ کتاب الجہاد)

(۱۶) عن سعد بن ابی وقاص قال رد رسول اللہ صلعم علےٰ عثمان بن مظعون التبتل فلو اذن لہ لاختصینا متفق علیہ (ترجمہ) سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے عثمان بن مظعون کو عورتوں سے کنارہ کشی کی اجازت نہ دی۔ اگر اسے اجازت مل جاتی تو ہم البتہ از خود خصی ہو جاتے (مشکوٰۃ کتاب النکاح)

(۱۷) عن عثمان بن مظعون قال یا رسول اللہ صلعم ائذن لنا فی الاختصاء فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لیس منا من خصی ولا اختصی ان خصاء امتی الصیام فقال ائذن لنا فی السیاحۃ فقال ان سیاحۃ امتی الجہاد فی سبیل اللہ فقال ائذن لنا فی الترہب فقال ان ترہب امتی

الجلوس فی المساجد انتظار الصلوٰۃ رواہ فی شرح السنۃ (ترجمہ) عثمان بن مظعون سے روایت ہے کہ اس نے کہا یا رسول اللہ صلعم ہمیں خصی ہونے کی اجازت دیں۔ پس رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہمارے طریق پر نہیں جو دوسرے کو خصی کرے اور نہ ہی وہ جو از خود خصی ہو جائے۔ تحقیق میری اُمت کا خصی ہونا روزہ رکھنا ہے۔ پس عثمان بن مظعون نے عرض کی کہ آپ ہمیں آفاق گردی ہی کی اجازت دیدیں۔ آپ نے فرمایا میری اُمت کی آفاق گردی خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ پس عثمان بن مظعون نے عرض کی کہ آپ ہمیں رہبانیت ہی کی اجازت دیدیں۔ آپ نے فرمایا میری اُمت کی رہبانیت مسجدوں میں نماز کے انتظار کے لئے بیٹھنا ہے۔ اس حدیث کو امام بغوی نے شرح السنۃ میں روایت کیا ہے۔ (مشکوٰۃ۔ باب المساجد و موضع الصلوٰۃ) مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ہین مکن خود را خصی رہباں مشو — زانکہ عفت است شہوت را گرو
بے ہوا نہی از ہوا ممکن نبود — غازی بر مُردگاں نتواں نمود
پس کلوا از بہرِ دامِ شہوت است — بعد ازاں لاتسرفوا آں عفت است
چونکہ رنج صبر نبود مر ترا — شرط نبود پس فرو ناید جزا
حبذا آں شرط و شادا آں جزا — آں جزائے دلنواز جاں فزا

(۱۸) ان ھٰذا الدین متین فاوغل فیہ برفق ولا تکرھوا عبادۃ اللہ الی عبادہ فان المنبت لا یقطع سفرا ولا یستبقی ظھرا (ترجمہ) آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ یہ دین متین ہے پس اس میں نرمی کے ساتھ چل اور اللہ کی عبادت کو اسکے بندوں پر ناگوار مت کر۔ کیونکہ اپنی سواری کو تکلیف مالایطاق دینے والا نہ تو سفر کو طے کرتا ہے اور نہ سواری کی پیٹھ باقی چھوڑتا ہے (اسے ہلاک کر دیتا ہے) اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عائشہ صدیقہ رضہ سے روایت

کیا ہے۔ (کنز العمال جزو ثانی ص) :

احادیث مذکورہ بالا کے علاوہ اور احادیث بھی اس مضمون کے متعلق ہیں جنکے نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ تفسیر روح البیان میں آیہ نمبر کے ذیل میں مذکور ہے کہ حاصل کلام یہ ہوا کہ رہبانیت میں افراط اور لذات وطیبات سے احتراز تمام اعضائے رئیسہ یعنی دل ودماغ میں ضعف پیدا کرتا ہے۔ دل ودماغ کے ضعف سے قوتِ فکریہ میں خلل آجاتا ہے۔ قوتِ فکریہ کے اختلال سے کمالات متعلقہ قوتِ نظریہ بالکل فوت ہوجاتی ہیں۔ اور کمالات متعلقہ قوۃ علمیہ میں نقصان آجاتا ہے۔ کیونکہ ان کا کمال قوتِ نظریہ کے کمال پر موقوف ہے۔ علاوہ ازیں ایسی رہبانیت دُنیا کی خرابی اور انقطاع نسل وزراعت کا موجب ہے۔ لہذا حکمت الٰہیہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ طیبات کا استعمال جائز ہو بشرطیکہ اعتدال ملحوظ رہے جیسا کہ ولا تعتدوا سے ظاہر ہے۔ ماکولات کی طرح عبادات وریاضات میں بھی اعتدال ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ محدث دہلوی نے مشاق فی العبادۃ کے تین قبائح بیان کئے ہیں :۔

اہمال ارتفاقات۔ ملال نفس۔ اشتباہ فی الدین۔ وہ لکھتے ہیں فمن المقاصد الجليلة فى التشريع ان يسد باب التعمق فى الدين لئلا يعضوا عليها بنواجذهم، فيأتى من بعدهم قوم فيظنوا انها من الطاعات السماوية المفروضة عليهم ثم تأتى طبقة اخرى فيصير الظن عندهم يقينا والمحتمل مطمئنا به فيظل الدين محرفا وهو قوله تعالى رهبانية ابتدعوها ما كتبنا ها عليهم وايضا فمن ظن من نفسه وان اقر بخلاف ذلك من لسانه ان الله لا يرضى الا بتلك الطاعات الشاقة وانه لو قصر فى حقها فقد وقع بينه وبين تهذيب نفسه حجاب عظيم وانه لو فرط فى جنب الله فاندبواخذ

بما ظن و يطالب بالخروج عن التفريط فى جنب الله حسب اعتقاده فاذا فقد انقلبت علومه عليه ضارة مظلمة فلم تقبل طاعاته لهنة فى نفسه و هو قوله صلے الله عليه وسلم ان الدين يسر و لن يشاد الدين احد الا غلبه ؎

ترجمہ یہ امر شریعت کا ایک مقصد اہم خیال کیا گیا ہے کہ احکام دین میں نہایت باریک غور و خوض سے کام نہ لیا جائے تاکہ لوگ اس پر نہایت شدت کے ساتھ عملدرآمد کرنا نہ شروع کر دیں - کیونکہ بعد کے آنے والے لوگ یہ گمان کرنے لگینگے کہ انکے خود تجویز کردہ امور آسمانی شریعت کے احکام میں داخل ہیں - اور پھر انکے بعد کے طبقہ کے لوگ اُن تجویز کردہ احکام کو جو محض ظن پر مبنی تھے یقینی اور قطعی خیال کرنے لگینگے - سو اس طرح دین کی اصلی صورت قائم نہ رہیگی - اور قرآن مجید میں اس قسم کی تشدد آمیز رہبانیت کے متعلق آیۂ رهبانية ابتدعوها میں ممانعت وارد ہوئی ہے اور نیز جو شخص اپنے دلمیں یہ خیال کرے کہ خدائے تعالیٰ سوائے عبادات شاقہ کے رضی نہیں ہوتا اور اگر وہ عبادات شاقہ کے بجالانے میں کوتاہی کریگا تو اُسکے اور رضائے تعالےٰ کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جائیگا اور ایسی کوتاہی کی صورت میں اسے مواخذہ کیا جائیگا اور وہ یہ اعتقاد کرے کہ اُسے اس تفریط کی بابت مطالبہ کیا جائیگا تو ایسے شخص کے حق میں اُسکے علوم موجب مضرت ثابت ہونگے اور اسکے عبادات نفس کی اُس برائی کیوجہ سے قابل قبول نہیں رہینگے کیونکہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ دین ہر ایک قسم کی آسانی کا نام ہے اور جو شخص دین کو خود بخود اپنے اوپر سخت بنا لیتا ہے تو بالآخر وہ مغلوب ہو جاتا ہے یعنی احکام کی سختی کی وجہ سے بالآخر اس کو مغلوب ہونا پڑے گا ؞

رہبانیت کی نسبت کافی لکھا جا چکا ہے مگر مجھے ترجمہ خواناں اہل ظواہر کیطرف سے اندیشہ ہے کہ کہیں نادانی کے سبب اس مضمون کو پڑھکر تصوف کے برخلاف بیجا بدظنی نہ پھیلائیں لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کی نسبت چند ضروری امور کو سوال و جواب کی صورت میں پیش کیئے جائیں - واللہ هو الهادی ؞

(۱) سوال - کیا اصل تصوف قرآن و حدیث سے ثابت ہے؟

جواب :- حدیث جبرئیل میں جو بخاری و مسلم میں موجود ہے حقیقت اسلام و ایمان کے بعد احسان کا ذکر ہے - جس کی تفسیر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمائی ہے ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک یعنی احسان و اخلاص یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے - پس اگر تو اس حال پر نہیں کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے تو یوں عبادت کر کہ وہ تجھکو دیکھ رہا ہے - (مشکوٰۃ کتاب الایمان) اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اعمال ظاہری و عقائد کے علاوہ ایک اور کمال ہے جسے احسان سے تعبیر کیا گیا ہے - یہ احسان اصل تصوف کی طرف اشارہ ہے - اور اثبات ولایت کی قوی دلیل ہے - شیخ عبدالحق دہلوی اس حدیث کے تحت میں لکھتے ہیں - بدانکہ مبنائے دین و کمال آں بر فقہ و کلام و تصوف است وایں حدیث شریف بیان ایں ہر سہ مقام کردہ - اسلام اشارت بہ فقہ است کہ متضمن بیان اعمال و احکام شرعیہ فرعیہ است وایمان بہ اعتقادات کہ مسائل اصول کلام اند و احسان اشارت بہ اصل تصوف کہ عبادت از صدق توجہ الی اللہ است و جمیع معانی تصوف کہ مشائخ طریقہ بآں اشارت کردہ اند بایں راجع است و فقہ و تصوف و کلام لازم یکدیگر اند ہیچ یکے بے دیگرے تمامیت نپذیرد و صورت نہ بندد - تصوف بے فقہ صورت نہ بندد زیرا کہ احکام الٰہی بے فقہ شناختہ نشود و فقہ بے تصوف تمام نشود زیرا کہ عمل بے صدق توجہ تمامیت نپذیرد و ہر دو بے ایمان صحیح نگردند بر مثال روح و جسد کہ ہیچ کدامی بے دیگرے وجود نگیرد و کمال عمر نپذیرد و ازینجا فرمود امام مالک رح من تصوف ولم یتفقہ فقد تزندق و من تفقہ ولم یتصوف فقد تفسق و من جمع بینہما فقد تحقق کمال جامعیت این است باقی ہمہ زیغ و ضلال است والتوفیق من اللہ الکریم المتعال (اشعۃ اللمعات) - ترجمہ - جان لے کہ دین اور اسکے کمال کی بنیاد فقہ و کلام و تصوف

پرے اور اس حدیث شریف نے ان تینوں مقاموں کا بیان کر دیا ہے۔ اسلام اشارہ ہے فقہ کی طرف جو احکام و اعمال شرعیہ فرعیہ کے بیان پر مشتمل ہے۔ اور ایمان اشارہ ہے اعتقادات کی طرف جو اصول کلام کے مسائل ہیں اور احسان اشارہ ہے اصل تصوف کی طرف جس سے مراد صدق توجہ الی اللہ ہے اور تصوف کے تمام معانی جن کی طرف مشائخ طریقہ نے اشارہ کیا ہے۔ اسی معنی کی طرف راجع ہیں۔ اور فقہ و تصوف و کلام ایک دوسرے کے لازم ہیں۔ ان میں سے کوئی بغیر دوسرے کے کمال کو نہیں پہنچتا۔ اور پایا نہیں جاتا۔ فقہ کے بغیر تصوف نہیں پایا جاتا کیونکہ احکام الٰہی فقہ کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔ اور تصوف کے بغیر فقہ تمام و کامل نہیں ہوتی کیونکہ عمل بغیر صدق توجہ کے کامل نہیں ہوتا اور فقہ و تصوف دونوں ایمان کے بغیر صحیح نہیں ہوتے جیسا کہ جسم و روح جو ایک دوسرے کے بغیر موجود نہیں ہوتے اور کمال نہیں پاتے۔ اسی سبب سے امام مالک رحنے فرمایا ہے کہ جو شخص صوفی بنا اور فقیہ نہ ہوا۔ پس تحقیق وہ زندیق بن گیا اور جو فقیہ ہوا اور صوفی نہ بنا پس تحقیق وہ فاسق ہو گیا۔ اور جو دونوں کا جامع ہوا پس تحقیق وہ درست ہوا۔ کمال جامعیت یہ ہے۔ باقی سب کجی اور گمراہی ہے۔ والتوفیق من اللہ الکریم المتعالی۔ انتھیٰ ؛

۲ - سوال - اصل تصوف کو آپ نے حدیث سے تو ثابت کیا۔ قرآن سے بھی ثابت کریں ؟

جواب - او امر و نواہی احادیث حقیقت میں قرآن کے امر و نواہی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب (ترجمہ) اور جو چیز رسول تم کو دے اس کو لے لو اور جس سے وہ تم کو منع کرے تم اس سے باز آ جاؤ۔ اور اللہ سے ڈرو۔ تحقیق اللہ سخت عذاب والا ہے۔ (سورہ حشر) عن عبد اللہ بن مسعود قال لعن اللہ الواشمات والمستوشمات

والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغیرات خلق اللہ فجاءته امرأۃ فقالت انہ بلغنی انک لعنت کیت وکیت فقال مالی لا العن من لعن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ومن ھو فی کتاب اللہ فقالت لقد قرأت ما بین اللوحین فما وجدت فیہ ما تقول قال لئن کنت قرأتیہ لقد وجدتیہ - اما قرأت وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا قالت بلیٰ قال فانہ قد نھیٰ عنہ متفق علیہ (ترجمہ) عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہا لعنت کرے اللہ تعالےٰ خوبصورتی کے لئے بدن گودنے والی اور گدوانے والی اور بال نُچوانے والی اور بہ تکلف دانتوں میں فرق و فاصلہ پیدا کرنیوالی عورتوں پر اور اللہ کی پیدائش کو تغیر دینے والی عورتوں پر - پس ایک عورت نے آپ کے پاس آکر کہا مجھے خبر پہنچی ہے کہ تو (عورتوں کو) ایسی ایسی لعنت کرتا ہے پس آپ نے فرمایا میں کیونکر لعنت نہ کروں ان پر جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو - اور جو کتاب اللہ (قرآن) میں ملعون ہو - پس اس عورت نے کہا البتہ مینے قرآن کو اوّل سے آخر تک پڑھا ہے - میں نے اس میں وہ نہیں پایا جو تو کہتا ہے - آپ نے فرمایا کہ اگر تو قرآن مجید پڑھتی تو بے شک اسے پالیتی - کیا تو نے نہیں پڑھا - وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا ؟ اس عورت نے کہا ہاں - آپ نے فرمایا - پس تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افعال مذکورہ بالا سے منع فرمایا ہے - متفق علیہ (مشکوٰۃ باب الترجل) اس حدیث سے ہمارا مطلب روز روشن کی طرح واضح ہوگیا پس اصل تصوف قرآن ہی ثابت کرتا ہے - لہذا جو شخص تصوّف کو بُرا کہتا ہے وہ خود بُرا ہے۔

۳ - سوال - صوفی کی وجہ تسمیہ کیا ہے ؟

جواب - فی التعرف انما سموا صوفیۃ لقرب اوصافھم من اوصاف اھل الصفۃ الذین کانوا علے عھد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وقال بعضھم للبسھم الصوف او لصفاء اسرارھم او الصفاء معاملتھم او انھم فی الصف الاول بین یدی اللہ تعالیٰ

: ی من السابقین المسارعین فی الخیرات والمبادرین فی الطاعات ثم قال واما من نسبہم الی الصفۃ والصوف فانہ عبر عن ظاہر احوالہم وذلک انہم قوم ترکوا الدنیا وخرجوا عن الاوطان وھجروا الاخدان وساحوا فی البلاد واجاعوا الاکباد واعروا الاجساد ولم یأخذوا من الدنیا الا مالا یجوز ترکہ من ستر عورۃ وسد جوعۃ فلخروجہم عن الاوطان سموا غرباء ولکثرۃ اسفارھم سموا سیاحین ولقلۃ اکلہم سموا جوعیۃ ومن تخلیتہم من الاملاک سموا فقراء ولِلبسہم الثوب الخشن من الشعر والسرنۃ سموا صوفیۃ ثم ھذا کلہا احوال اھل الصفۃ الذین کانوا علیٰ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہم کانوا غرباء فقراء مہاجرین خرجوا من دیارھم واموالہم ووصفہم ابوہریرۃ وفضالۃ بن عبید فقالا کانوا یخرون من الجوع حتی یحسبہم الاعراب مجانین وکان لباسہم الصوف حتی ان کان بعضہم لیعرق فیہ فیوجد منہ ریح الضان اذا اصابہ المطر ؛

(ترجمہ) کتاب تعرف میں ہے کہ صوفیہ اس سبب سے نام رکھا گیا ہے کہ انکے اوصاف اہل صفہ کے اوصاف سے قریب ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھے۔ اور بعض نے یہ وجہ تسمیہ بیان کی ہے کہ وہ صوف پہنتے ہیں یا انکے اسرار صاف ہیں یا اُن کا معاملہ صاف ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالے کے سامنے پہلی صف میں ہیں یعنی نیکیوں میں سبقت لے جانیوالوں اور اطاعت میں جلدی کرنے والوں میں سے ہیں۔ پھر صاحب تعرف نے کہا ہے کہ جس نے ان کو صفہ یا صوف کی طرف منسوب کیا۔ پس اس نے ان کے ظاہر کو بیان کیا۔ کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کو ترک کر دیا ہے۔ پس وہ اپنے گھروں سے نکلے اور دوستوں سے جدا ہوئے اور شہروں میں پھرے اور پیٹوں کو بھوکا رکھا اور جسموں کو ننگا رکھا اور انہوں نے دنیا سے نہ لیا مگر اسقدر کہ جس کا ترک جائز نہیں یعنی ستر عورت اور بھوک کی روک۔

پس وہ اپنے گھروں سے نکلنے کے سبب غربار کہلائے اور سفروں کی کثرت کے سبب سے سیاح اور کم کھانے کے سبب جوعیہ اور اپنے املاک چھوڑنے کے سبب فقرار اور بالوں یا پشم کے سخت کپڑے پہننے کے سبب صوفیہ کہلائے اور یہ سب اہل صفہ کے احوال ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھے کیونکہ غربار و فقرار و مہاجرین تھے جو اپنے گھروں اور مالوں سے ہجرت کر گئے تھے اور حضرت ابوہریرہ رضہ اور فضالہ بن عبید نے ان کا حال بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ بھوک سے گر پڑتے تھے یہانتک کہ بدوی ان کو دیوانہ خیال کرتے تھے اور ان کا لباس صوف تھا۔ یہانتک کہ بعض کو اس میں پسینہ آجاتا تھا۔ پس بارش سے بھیگ کر اس میں بھیڑ کی بُو آتی تھی (مرقاۃ۔ جزر ثانی صفحہ ۵۷۴)۔

۴۔ سوال۔ اہل صفہ کا مزید حال بیان کرو؟

جواب۔ مختصر نہایہ میں ہے کہ اہل صفہ فقرار مہاجرین تھے جو مسجد نبوی کے متصل ایک سایہ پوش جگہ میں رہتے تھے۔ قاموس میں ہے کہ اہل صفہ اسلام کے مہمان تھے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے صفہ میں رات بسر کیا کرتے تھے اور بخاری پر سیوطی نے جو حاشیہ لکھا ہے اس میں ہے کہ ابونعیم نے حلیہ میں سو سے زیادہ ان کو شمار کیا ہے اور صفہ مسجد نبوی کے آخر میں ایک مکان تھا جو ان غربار کے اترنے کے لئے بنایا گیا تھا جن کو کوئی جائے پناہ نہ ملتی تھی۔ اور وہ مقاتل[1] تھے۔ ابن حجر نے کہا۔ کہ صفہ مسجد کے آخر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فقرار اصحاب کے لئے بنایا گیا تھا جو اہل نہ رکھتے تھے۔ اور وہ کبھی زیادہ ہو جاتے تھے۔ یہانتک کہ ان کا شمار قریباً دو سو تک پہنچتا تھا۔ اور کبھی کم ہو جاتے تھے۔ کیونکہ وہ جہاد اور تعلیم قرآن کے لئے بھیجے جاتے تھے (مرقاۃ جزر ثانی صفحہ ۵۷۴)

مرقاۃ میں دوسری جگہ (جزر خامس صفحہ ۵۲) لکھا ہے کہ اہل صفہ مہاجرین میں سے

[1] یعنی جہاد فی سبیل اللہ کیا کرتے تھے۔ ۱۲ منہ۔

چار سو تھے جو تعلیم قرآن کیلئے اور لشکروں میں کفار سے جہاد کرنے پر آمادہ تھے۔ اور ابوہریرہ رضوان کا ناظر ونقیب اور ان کے حال کا خبر گیراں اور رقیب تھا۔ اور وہ مسجد نبوی کے اخیر میں صفہ میں پناہ گزین تھے۔ اور اُن کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی ہے للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبہم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفہم بسیمٰہم لا یسئلون الناس الحافا۔ (ترجمہ) صدقہ اُن فقیروں کے لیئے ہے جو اللہ کے راستے میں روک دیئے گئے ہیں۔ وہ زمین میں چل نہیں سکتے۔ ترک سوال کے سبب جاہل ان کو دولتمند جانتا ہے تو ان کو ان کے چہرے سے پہچانتا ہے وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے (سورہ بقرہ ع) وہ متوکل تھے۔ چھوارے کی گٹھلیاں ان کی خوراک تھی۔ عن ابی ہریرۃ قال لقد رایت سبعین من اصحاب الصفۃ ما منہم رجل علیہ رداء اما ازار اماکساء قد ربطوا فی اعناقہم ومنہا ما یبلغ نصف الساقین ومنہا ما یبلغ الکعبین فیجمعہ بیدہ کراھۃ ان تری عورتہ رواہ البخاری (ترجمہ) ابوہریرہ سے روایت ہے کہا البتہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر آدمیوں کو دیکھا کہ ان میں سے کسی پر چادر نہ تھی۔ (ان پر یا تو) آزار (یا جامہ) تھا یا (صرف) کمبلی جس کو اپنی گردنوں پر لپیٹ لیتے تھے کمبل و آزار میں سے بعض دو تو پنڈلیوں کے نصف تک اور بعض ٹخنوں تک پہنچتے تھے۔ پس ان کو ہاتھ سے جمع کر لیتے تھے۔ اس خوف سے کہ کہیں انکے جائے ستر غیر کو نظر آجائیں۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ (مشکوٰۃ۔ باب فضل الفقراء وما کان من عیش النبی صلے اللہ علیہ وسلم) تفسیر روح البیان میں للفقراء الذین احصروا الایۃ کے تحت میں لکھا ہے عن ابن عباس رض وقف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یوما علے اصحاب الصفۃ فریٰ فقرھم وجھدھم وطیب قلوبہم فقال ابشروا یا اصحاب الصفۃ فمن لقی اللہ من اُمتی علے النعت انتم علیہ راضیا بما فیہ فانہ من رفقائی (ترجمہ) ابن

عباس رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن اصحاب صفہ کے پاس ٹھہر گئے۔ آپ نے ان کا فقر اور ان کا مجاہدہ اور ان کی خوشدلی دیکھی پس فرمایا اے اصحاب صفہ خوش ہوجاؤ۔ میری اُمّت میں سے جو شخص اللہ سے اس طریق پر ملیگا جس پر تم ہو اس حال میں کہ وہ راضی ہو اس چیز سے جو اس طریق میں ہے۔ وہ بے شک میرے رفیقوں میں سے ہوگا۔ انتہیٰ ؀

۵۔سوال ۔ صوفیہ کرام کے اکثر خانوادے صوف پہنتے ہیں۔ ان کے اس فعل کے جواز کی کیا دلیل ہے ؟

جواب ۔ بخاری میں حدیث مغیرہ بن شعبہ میں ہے قال کنت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفر فقال امعك ماء فقلت نعم فنزل من راحلتہ فمشی حتی توارٰی عنی فی سواد اللیل ثم جاء فافرغت علیہ الاداوۃ فغسل وجھہ ویدیہ وعلیہ جبۃ شامیۃ من صوف فلم یستطع ان یخرج ذراعیہ منہا حتی اخرجہما من اسفل الجبۃ ۔ (ترجمہ) ایک سفر میں میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا تیرے پاس پانی ہے ؟ میں نے عرض کی ہاں۔ پس آپ اپنی سواری سے اُترے اور پیدل چلے یہانتک کہ رات کی تاریکی میں مجھ سے پوشیدہ ہو گئے۔ پھر آئے۔ پس میں نے کوزے سے آپ پر پانی ڈالا۔ آپ نے اپنا منہ اور دونوں ہاتھ دھوئے اور آپ پشم کا شامی جبہ پہنے ہوئے تھے۔ (آستینوں کی تنگی کے سبب) آپ اپنے ہاتھ مبارک اس جبہ میں سے نہ نکال سکے۔ یہانتک کہ آپ نے ان کو جبہ کے نیچے سے نکالا۔ انتہیٰ ۔ عن عائشۃ قالت خرج النبی صلے اللہ علیہ وسلم غداۃ وعلیہ مرط مرحل من شعر اسود فجاء الحسن بن علی فادخلہ ثم جاء الحسین فدخل معہ ثم جاءت فاطمۃ رضہ فادخلہا ثم جاء علی فادخلہ ثم قال انما یرید اللہ لیذہب عنکم الرجس اہل البیت ویطہرکم تطہیرا رواہ مسلم (ترجمہ) عائشہؓ

سے روایت ہے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک صبح کو نکلے اور آپ پر سیاہ بالوں کی ایک منقش چادر تھی۔ پس حسنؓ بن علیؓ آئے۔ آپ نے اُسے چادر میں داخل کر لیا۔ پھر حسینؓ آئے۔ پس حسن کے ساتھ داخل ہو گئے۔ پھر فاطمہؓ آئیں۔ آپ نے اُسے بھی داخل کر لیا۔ پھر علیؓ آئے آپ نے اُسے بھی داخل کر لیا۔ پھر فرمایا انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطهرکم تطهیرا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (مشکوٰۃ باب مناقب اہل البیت) یہ پہلے آ چکا ہے کہ اصحاب صفہ کا لباس صوف تھا۔ علامہ سیوطی نے درمنثور میں ابن عباس رضؓ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے صوف پہنا۔ وہ حضرت آدم و حوا ہیں جس وقت کہ وہ بہشت سے زمین پر گرائے گئے۔ کتاب تعرف میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مر بالصخرة من الروحاء سبعون نبیا حفاة علیهم العباء یؤمون البیت العتیق (مقام رَوحاء[1] کے پتھر کے پاس سے ستر نبی ننگے پاؤں سے ننگے عبا (کمبلی) پہنے ہوئے اور خانہ کعبہ کو جاتے ہوئے) اور حسنؓ نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ بالوں کا کپڑا پہنتے تھے۔ درختوں کے پتّوں پر گذارہ کرتے تھے۔ اور جہاں شام ہوتی وہیں رات بسر کرتے۔ ابوموسیٰ اشعری نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ صوف پہنا کرتے تھے حسن بصری نے کہا کہ میں ستر صحابہ سے ملا جو جنگ بدر میں شامل ہوئے تھے۔ ان کا لباس بجز صوف کچھ نہ تھا۔ (مرقاۃ جزء رابع ص ۳۱۶) عن ابن عباس قال سرنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم بین مکة والمدینة فمررنا بواد فقال ای واد هذا فقالوا وادی الازرق قال کانی انظر الی موسیٰ فذکر من لونه وشعره شیئا واضعا اصبعیه فی اذنیه له جوار الی الله بالتلبیة مارا بهذا الوادی قال ثم سرنا حتی اتینا علی ثنیة هذا قالوا هرشی اولفت فقال کانی انظر الی یونسؑ

[1] حرمین شریفین کے درمیان مدینہ منورہ سے تیس یا چالیس میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے (قاموس)

علیٰ ناقۃ حمراء علیہ جُبۃ صوف خطام ناقتہ خلبۃ مارا بھذا الوادی ملبیا۔ (مشکوٰۃ)
(ترجمہ) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم مکہ و مدینہ کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے۔ پس ہم ایک وادی سے گذرے۔ آپ نے فرمایا یہ کونسی وادی ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی وادی ازرق۔ فرمایا گویا کہ میں موسیٰ کو دیکھتا ہوں۔ (پس آپ نے اُن کے رنگ اور بالوں کا کچھ وصف بیان کیا) اس حال میں کہ وہ اپنی دو انگلیاں اپنے دو کانوں میں رکھے ہوئے ہے وہ لبیک کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے آگے تضرع کر رہا ہے (اور) اس وادی میں گذر رہا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا۔ پھر ہم چلے یہاں تک کہ ہم ایک گھاٹی پر آئے۔ پس آپ نے فرمایا یہ کونسی گھاٹی ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ ہرشیٰ یا لفت۔ پس فرمایا گویا کہ میں یونس کو دیکھ رہا ہوں۔ سرخ ناقہ پر سوار پشم کا جبہ پہنے ہوئے۔ اُس کے ناقہ کی مہار درخت خرما کی چھال کی ہے۔ اس حال میں کہ وہ اس وادی میں لبیک کہتے ہوئے گذر رہا ہے۔ انتہیٰ۔ (مشکوٰۃ۔ باب بدء الخلق وذکر الانبیاء علیہم السلام)

۲۔ **سوال**۔ خاندان نقشبندیہ نے کیسا لباس اختیار رہے؟

جواب۔ روی البیہقی عن ابی ہریرۃ وزید بن ثابت انہ صلے اللہ علیہ وسلم نہی عن الشہرتین دقۃ الثیاب وغلظتہا ولینہا وخشونتہا وطولہا وقصرہا ولکن سداد فیما بین ذالک واقتصاد وھذا ھو المختار عند السادۃ النقشبندیۃ (ترجمہ) بیہقی نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دو شہرتوں سے منع فرمایا۔ یعنی کپڑوں کی باریکی و موٹائی اور انکی نرمی و درشتی اور درازی و کوتاہی سے۔ مگر (امر فرمایا) انکے درمیان راستی اور اعتدال کا۔ مولانا علی القاری فرماتے ہیں کہ یہی مختار ہے مشائخ نقشبندیہ کے نزدیک۔ انتہیٰ۔ (مرقاۃ جزء رابع ص۴۱۶)

۷۔ سوال ۔ مجاہدہ وکثرت عبادت کا شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب ۔ مجاہدہ وکثرت عبادت شرعاً مستحن ہے لیکن بشروط ذیل :۔

اوّل ۔ ملال خاطر نہ ہو ۔ کیونکہ ملال کے وقت عبادت وغیر عبادت میں تمیز نہیں ہو سکتی ۔ چنانچہ حدیث نمبر ۲ کے الفاظ لیصل احدکم نشاطہٗ سے ظاہر ہے +

دوم ۔ تکلیف مالا یطاق نہ ہو جیسا کہ حدیث نمبر ۷ سے ظاہر ہے +

سوم ۔ اس سے وہ عبادت فوت نہ ہو جائے جو اہم ہو مثلاً حضور جماعت ونماز جنازہ واشاعت بہ تدریس وتصنیف وغیرہ ۔ یہ ماخوذ ہے حدیث ذیل سے ۔ عن ابی بکر بن سلیمان بن ابی حثمۃ قال ان بن الخطاب فقد سلیمان بن ابی حثمۃ فی صلوۃ الصبح وان عمر رضؓ غدا الی السوق ومسکن سلیمان بین المسجد والسوق فمر علی الشفاء ام سلیمان فقال لھا لم ار سلیمان فی الصبح فقالت انہ بات یصلی فغلبتہ عیناہ فقال عمر لان اشہد صلوۃ الصبح فی جماعۃ احب الی من ان اقوم لیلۃ رواہ مالک رحم ابوبکر بن سلیمان بن ابی حثمہ سے روایت ہے کہا کہ عمرؓ بن خطاب نے سلیمان بن ابی حثمہ کو نماز فجر میں نہ پایا ۔ اور عمرؓ بازار کی طرف گئے ۔ اور سلیمان کا گھر مسجد اور بازار کے درمیان تھا ۔ پس ان کا گذر سلیمان کی ماں شفا پر ہوا ۔ آپ نے کہا میں سلیمان کو نماز فجر میں نہیں دیکھا ۔ شفا نے کہا کہ وہ رات بھر نماز پڑھتا رہا ہے ۔ پس اس پر نیند غالب آگئی ۔ عمرؓ نے فرمایا ۔ نماز فجر کی جماعت میں حاضر ہونا میرے نزدیک قیام شب سے بہتر ہے ۔ انتہیٰ ۔ (مشکوٰۃ ۔ باب الجماعۃ وفضلھا) +

حضرت سیدنا قطب الاقطاب غوث پاک سید عبدالقادر جیلانیؓ فرماتے ہیں ینبغی للمومن ان یشتغل اولا بالفرائض فاذا فرغ منہا اشتغل بالسنن ثم یشتغل بالنوافل والفضائل فمالم یفرغ من الفرائض فالاشتغال بالسنن حمق ورعونۃ وان اشتغل بالسنن والنوافل قبل الفرائض لم یقبل منہ واھین فمثلہ کمثل رجل ید عوہ الملک الی خدمتہ فلا یاتی الیہ ویقف بخدمۃ الامیر الذی ھو غلام الملک وخادمہ

دتحت ید ہ وولایتہ عن علی بن ابی طالب قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان مثل مصلی النوافل و علیہ فریضۃ کمثل حبلی حملت فلما دنی نفاسہا اسقطت فلا ھی ذات حمل ولا ھی ذات ولادۃ وکذلک المصلی ولا یقبل اللہ لہ نافلۃ حتی یودی الفریضۃ ومثل المصلی کمثل التاجر لا یحصل لہ ربحہ حتی یاخذ رأس ماله فکذلک المصلی بالنوافل ولا یقبل لہ نافلۃ حتی یودی الفریضۃ وکذلک من ترک السنۃ وتشغل بالنوافل لم توبت من الفرائض ولم ینض علیہا ولا یوکد امرہا فمن افرائض ترک الحرام والاشراک باللہ عزوجل خلقہ والاعتراض علیہ فی قدرہ وقضائہ واجابۃ الخلق وطاعتہم والاعراض عن امر اللہ و طاعتہ قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ اللہ (ترجمہ) مومن کو چاہئے کہ فرائض میں پہلے مشغول ہو جب فرائض سے فارغ ہو سنتوں میں مشغول ہو پھر عبادت نافلہ میں مشغول ہو پس جب تک فرائض سے فارغ نہ ہو سنتوں میں مشغول ہو جانا جہالت و رعونت ہے۔ پس اگر فرائض سے پہلے سنتوں اور نوافل میں مشغول ہو تو وہ اس سے قبول نہ کیے جائینگے اور وہ خوار کیا جائیگا۔ پس فرائض کو چھوڑ کر سنن و نوافل ادا کرنے والے کا حال اُس شخص کا سا حال ہے جسے بادشاہ اپنی خدمت کے لیے بلائے۔ پس وہ بادشاہ کے پاس نہ آئے۔ اور اس امیر کی خدمت میں قیام کرے جو بادشاہ کا غلام وخادم اور اس کے دست قدرت و تصرف میں ہو۔ حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہا فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص کے ذمے فرض ہو اور وہ نوافل پڑھے تو اس کا حال اُس حاملہ عورت کے حال سا ہے کہ جب جننے کا وقت آئے تو وہ اسقاط کر دے۔ پس (باعتبار انتفاء مقصود) نہ تو وہ حاملہ عورت ہے اور نہ جننے والی ہے۔ یہی حال ہے مصلی مذکور کا۔ اللہ اس سے نماز قبول نہ کریگا۔ یہانتک کہ فرض ادا کرے۔ اور مصلی مذکور کا حال اس سوداگر کے حال کے مانند ہے کہ اس کو منافع نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ اپنا راس مال پا لے۔

اسی طرح نوافل پڑھنے والے کے نوافل قبول نہیں کئے جاتے یہانتک کہ وہ فرض ادا کرے - اسی طرح اس شخص کا حال ہے جو سنت کو ترک کرے - اور ان نوافل میں مشغول ہو جو فرائض کے ساتھ رواتبہ ودائمی نہیں اور شارع کی طرف سے ان پر تصریح نہیں کیگئی اور نہ انکی نسبت تاکید کیگئی ہے - پس منجملہ فرائض کے ہے حرام قول وفعل کا - اور اللہ عزوجل کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک ٹھہرانی اور اس کی قضاوقدر پر اعتراض کرنی اور اس کی معصیت میں مخلوق کی فرمانبرداری کرنی اور اللہ تعالے کے امروطاعت سے روگردانی کرنا کو ترک کرنا - نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ کی نافرمانی کرکے کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں - انتہیٰ (فتوح الغیب مقالہ چہل وششم) ؛

چہارم - اس کی وجہ سے کوئی حق شرعی مثلاً حق اولاد یا حق زن یا حق مہمان وغیرہ فوت نہ ہوجائے - جیساکہ حدیث نمبر ۳ سے ظاہر ہے ؛

پنجم - رخصت شرعی کو باطل اور عامل رخصت کو بے عمل نہ سمجھے جیساکہ حدیث نمبرہ کے الفاظ کا نہم تقالوھا سے ظاہر ہے ؛

ششم - اس میں غیر واجب کو واجب اور غیر حرام چیز کو حرام کرنا لازم نہ آئے جیساکہ حدیث نمبر ۱۷ سے ظاہر ہے ؛

ہفتم - ارکان عبادت کو پورے طور پر بجا لائے یہ جائز نہیں کہ پانسو یا ہزار رکعت پڑھے مگر یوں ادا کرے کہ جیسے مرغ چونچ مارتا ہے یا قرآن مجید مقدار میں زیادہ پڑھے مگر بغیر ترتیل کے یہ ماخوذ ہے ان احادیث سے (۱)

عن عبدالرحمن بن شبل قال نھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن نقرۃ الغراب وافتراش السبع وان یوطن الرجل المکان فی المسجد کما یوطن البعیر رواہ ابو داؤد (ترجمہ) عبدالرحمن بن شبل سے روایت ہے کہا منع فرمایا رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وسلم نے کوّے کی طرح چونچ مارنے اور درندہ کی طرح ہاتھ پھیلانے اور اونٹ کی طرح مسجد میں خاص مکان اختیار کرنے سے ۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے ۔ (مشکوٰۃ باب السجود)

(۲) عن یعلی بن مملك انہ سأل ام سلمۃ زوج النبی صلے اللہ علیہ وسلم عن قرأۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم وصلاتہ فقالت وما لکم وصلاتہ کان یصلی ثم ینام قدر ما صلے ثم یصلی قدر ما نام ثم ینام قدر ما صلے حتی یصبح ثم نعتت قرأتہ فاذا ھی تنعت قرأۃ مفسرۃ حرفا حرفا رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی (ترجمہ) یعلیٰ بن مملک سے روایت ہے کہ اس نے ام سلمہ زوج النبی صلے اللہ علیہ وسلم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت اور نماز کی بابت پوچھا۔ پس ام سلمہ رضہ نے کہا ۔ تم کیا پوچھتے ہو آنحضرت ؐ کی نماز کی نسبت ۔ آپ نماز پڑھتے تھے پھر اسی قدر سوتے تھے پھر بمقدار خواب نماز پڑھتے تھے ۔ پھر بمقدار نماز سوتے یہاں تک کہ صبح کر دیتے ۔ پھر ام سلمہ رضہ نے آنحضرت صلعم کی قرأت کی کیفیت بیان کی ۔ پس انہوں نے بتلایا ۔ قرأت کو بیان کرتے کرتے حرف حرف جدا جدا ۔ انتہیٰ (مشکوٰۃ باب صلوٰۃ اللیل) ؁

ہشتم ۔ اس پر مداومت کرے اور بے عذر ترک نہ کرے عن عبداللہ بن عمرو بن العاص قال قال لی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا عبداللہ لا تکن مثل فلان کان یقوم من اللیل فترك قیام اللیل متفق علیہ (ترجمہ) عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے ۔ اس نے کہا کہ مجھ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عبداللہ تو فلاں شخص کی طرح نہ ہو جو رات کو قیام (عبادت) کرتا تھا ۔ پس اس نے رات کا قیام ترک کر دیا ۔ متفق علیہ ۔ (مشکوٰۃ ۔ باب التحریض علے قیام اللیل) ؁

آیت رہبانیت میں الفاظ فما رعوھا حق رعایتھا بھی اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی سبب سے مشہور ہے کہ تارک الورد ملعون یعنی ورد و وظیفہ کا ترک کرنے والا ملعون ہے۔ وہ جو آیا ہے کہ صاحب الورد ملعون سو وہ ریاکار کے حق میں ہے (دیکھو مرقاۃ جزو ثانی صفحہ ۱۴۱)۔

نہم۔ دوسرے مسلمانوں کے ملال کا باعث نہ ہو۔ یہ ماخوذ ہے حدیث ذیل سے: عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی احدکم للناس فلیخفف فان فیھم السقیم والضعیف والکبیر واذا صلی احدکم لنفسہ فلیطول ما شاء۔ متفق علیہ (ترجمہ) ابوہریرہ سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جب تم میں سے کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو چاہیے کہ تخفیف کرے کیونکہ ان میں بیمار و کمزور و بوڑھے ہیں اور جب تم میں سے کوئی اکیلا نماز پڑھے تو دراز کرے جس قدر چاہے۔ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ۔ باب ما علی الامام)۔

دہم۔ یہ مجاہدت و کثرت باعث نہ ہو اس اعتقاد کا کہ یہ کثرت افضل ہے جناب رسالتمآب اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اعمال قلیل سے۔ جس شخص میں یہ شروط موجود ہوں وہ احق ہے تشدد فی العبادات کا اور عُبّاد سلف بے شک ان شروط کے جامع تھے۔ ورنہ میانہ روی و توسط مناسب ہے جس میں افراط و تفریط نہ ہو[1]۔

۸۔ سوال۔ کیا بیعت صوفیہ کرام کی کچھ اصل ہے؟

جواب۔ بعض نادان لوگ خیال کرتے ہیں کہ بیعت قبول خلافت میں منحصر ہے اور بیعت صوفیہ کرام بے اصل ہے۔ مگر ان کا یہ خیال سراسر باطل ہے۔ بیعت صوفیہ کرام کی اصل قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ سورہ ممتحنہ میں ہے۔

---

[1] تفصیل در بارہ ہر دو قسم کے اقامۃ الحجۃ علی ان الاکثار فی التعبد لیس ببدعۃ مولوی ابی الحسنات عبدالحی لکھنوی ۱۲ منہ

یا ایھا النبی اذا جاءک المؤمنات یبایعنک علی ان لا یشرکن باللہ شیئا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یأتین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبایعھن واستغفر لھن اللہ ان اللہ غفور رحیم۔ (ترجمہ) اے نبی جس وقت مسلمان عورتیں تیرے پاس اس بات پر بیعت کرتی ہوئی آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائینگی اور نہ چوری کرینگی اور نہ زنا کرینگی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کرینگی اور نہ بہتان لائینگی جس کو باندھ لیں۔ اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں کے درمیان اور نہ نافرمانی کرینگی تیری کسی امر معروف میں پس تو ان کی بیعت قبول کر اور اللہ تعالے سے ان کے لئے بخشش مانگ۔ بے شک اللہ تعالے بخشنے والا مہربان ہے۔ انتہیٰ ؀

عن ابی جریر بن عبداللہ قال بایعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والنصح لکل مسلم متفق علیہ (ترجمہ) جریر بن عبداللہ سے روایت ہے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نماز قائم رکھنے اور زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر بیعت کی۔ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق) ؀

عن مجاشع قال اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بابن اخی نقلت بایعنا علی الھجرۃ فقال مضت الھجرۃ لاھلھا قلت علی م تبایعنا قال علی الاسلام والجھاد (ترجمہ) مجاشع سے روایت ہے کہا میں اپنے بھتیجے کے ساتھ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ پس میں نے عرض کی کہ آپ ہم سے ہجرت پر بیعت کرلیں۔ پس آپ نے فرمایا کہ ہجرت اہل ہجرت کے لئے گذر چکی میں نے عرض کی کہ آپ ہم سے کس بات پر بیعت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اسلام اور جہاد پر۔ (بخاری۔ باب البیعۃ فی الحرب علی ان لا یفروا) ؀

عن ام عطیة قالت بایعنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فقراء علینا ان لا یشرکن باللہ شیئاً و نھانا عن النیاحة۔ الحدیث (ترجمہ) ام عطیہ سے روایت ہے اس نے کہا ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ پھر آپ نے ہم پر پڑھا ان لا یشرکن باللہ شیئاً اور ہمیں نوحہ کرنے سے منع فرمایا۔ الحدیث (بخاری باب قولہ اذا جاءك المؤمنات یبایعنك) ٭

عن عبادة بن الصامت قال بایعنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعة فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وعلی اثرة وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ وعلی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومة لائم (متفق علیہ) (ترجمہ) عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہا ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی آسانی اور دشواری اور رنجی اور خوشی میں سمع وطاعت پر اور برگزیدگی پر (یعنی غنائم وغیرہ میں آپ جو اوروں کو ہم انصار پر ترجیح دینگے تو ہم صبر کرینگے) اور اس امر پر کہ ہم امیر سے نہ جھگڑینگے اور اس بات پر کہ ہم جہاں بھی ہونگے حق کہینگے اور امر دین میں کسی ملامت کرنے والی کی ملامت سے نہ ڈرینگے (متفق علیہ (مشکوٰۃ کتاب الامارة والقضاء) ٭

اس بارہ میں اور احادیث بھی ہیں جو بخوف طوالت یہاں نقل نہیں کی گئیں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں کہ طریقت کا طلب کرنا اور کمالات باطنی کے حاصل کرنے کی کوشش واجب ہے۔ کیونکہ حق تعالےٰ فرماتا ہے یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ (ترجمہ) اے مومنو! اللہ کی نامرضیات سے پرہیز کرو کمال پرہیزگاری۔ فعل امر وجوب کے لئے آتا ہے اور کمال تقوی بغیر ولایت کے متصور نہیں۔ جب طلب طریقت واجب ہوئی تو پیر کامل کی تلاش بھی واجب ہوئی مولانا روم فرماتے ہیں ~

ہیچ نکشد نفس را جز ظلِ پیر
دامنِ آں نفس کش محکم بگیر

۹۔ سوال۔ خرقہ درویشی کی اصل کیونکر ثابت ہے؟

جواب:۔ خرقہ وبیعت کی نسبت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں لکھتے ہیں کہ اصل اس کی سنت ثابتہ ہے۔ خرقہ کی اصل تو لباس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے کہ جب حضورؐ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضؓ کو امیر لشکر کیا تھا تو عمامہ عطا فرمایا تھا اور بیعت کا وجود خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مستفیض ویقینی ہے جو پوشیدہ نہیں۔ بعض نے خرقہ کی اصل اس گلیم سیاہ کو بیان کیا ہے جس میں آیہ تطہیر کے نازل ہونے پر جناب رسالتمآب نے حضرت علیؓ وفاطمہؓ وحسنؓ وحسینؓ کو لے کر فرمایا انما یرید اللہ ۔۔۔ الآیہ۔ عن ام خالد بنت سعید قالت اُتی النبی صلے اللہ علیہ وسلم بثیاب فیھا خمیصۃ سوداء صغیرۃ فقال ائتونی بام خالد فاتی بھا تحمل فاخذ الخمیصۃ بیدہ فالبسھا قال ابلی واخلقی ثم ابلی واخلقی وکان فیھا علم اخضر او اصفر فقال یا ام خالد ھذا سناہ وھی بالحبشیۃ حسنۃ قالت فذھبت العب بخاتم النبوۃ فزجر ابی فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دعھا رواہ البخاری (ترجمہ) ام خالد بنت سعید سے روایت ہے کہا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کپڑے لائے گئے جن میں ایک مربع سیاہ گلیم تھی۔ آپ نے فرمایا ام خالد کو میرے پاس لاؤ۔ پس وہ اٹھا کر لائی گئی۔ آپ نے اس گلیم سیاہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ام خالد کو پہنا دیا (اور دعا کے طور پر) فرمایا تو اسے کہنہ و بوسیدہ کیجو۔ پھر کہنہ و بوسیدہ کیجو۔ اور اس گلیم سیاہ میں ایک نشان تھا پس آپ نے فرمایا اے ام خالد یہ سناہ ہے اور سناہ زبان حبشہ میں حسنہ یعنی اچھی کو کہتے ہیں۔ ام خالد نے کہا پس میں خاتم نبوت کے ساتھ کھیلنے لگی۔ پس میرے باپ نے

مجھے جھڑک دیا۔ پس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے کچھ نہ کہو۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ (مشکوٰۃ۔ باب اسماء النبی صلے اللہ علیہ وسلم وصفاتہ) اس حدیث کے تحت میں مولانا علی القاری مرقاۃ میں لکھتے ہیں وقد اشار الشیخ الصمدانی شہاب الدین السہروردی قدس سرہ فی عوارفہ ان استاد المشائخ الصوفیۃ فی لبس الخرقۃ بھذا الحدیث اقول ولعلہ اراد الباس الخرقۃ التبرک دون الباس خرقۃ الاجازۃ (ترجمہ) شیخ صمدانی شہاب الدین سہروردی قدس سرہ نے عوارف میں اشارہ کیا ہے کہ خرقہ پوشی میں مشائخ صوفیہ کی سند یہ حدیث ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ علیہ الرحمۃ کی مراد شاید خرقہ تبرک کا پہنانا ہے۔ نہ کہ خرقہ اجازت کا پہنانا۔ انتہیٰ ٭

۱۰۔ سوال۔ شمار اذکار کے لئے تسبیح کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

جواب۔ عن سعد بن ابی وقاص انہ دخل مع النبی صلے اللہ علیہ وسلم علی امرأۃ وبین یدیھا نوی او حصی تسبح بہ فقال الا اخبرک بما ھو ایسر علیک من ھذا او افضل سبحان اللہ عدد ما خلق فی السماء الحدیث (ترجمہ) سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک عورت پر گذرا اور اس عورت کے آگے چھوہارے کی گٹھلیاں یا سنگریزے تھے جن کے ساتھ وہ تسبیح کر رہی تھی۔ پس آپ نے فرمایا دیکھ میں تجھے وہ چیز بتاتا ہوں جو اس سے آسان یا افضل ہے سبحان اللہ عدد ما خلق فی السماء الحدیث۔ (مشکوٰۃ۔ باب ثواب التسبیح والتحمید والتھلیل والتکبیر) علامہ علی القاری رحمہ اللہ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں وھذا اصل صحیح لتجویز السبحۃ بتقریرہ صلے اللہ علیہ وسلم فانہ فی معناھا اذ لا فرق بین المنظومۃ والمنثورۃ فیما یعد بہ ولا یعتد بقول من عدھا بدعۃ وقد قال المشائخ انھا سوط الشیطن

وروی اینه ما رئی مع الجنید سبحۃ فی یدہ حال انتہائہ فسئل عنہ فقال شیئ وصلنا بہ الی اللہ کیف نترکہ ولعل ھذا احد معانی قولہم النہایۃ ھی الرجوع الی البدایۃ (ترجمہ) اور یہ حدیث تسبیح کے جائز کرنے کے لئے اصل صحیح ہے - کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اسکو برقرار رکھا اسلئے کہ تسبیح اُس کے حکم میں ہے - کیونکہ جس چیز کے ساتھ شمار کیا جائے اُس کے پروئے ہوئے اور بے پروئے میں کچھ فرق نہیں - اور جس شخص نے تسبیح کو بدعت کہا اُس کے قول کا اعتبار نہیں - مشائخ نے کہا ہے کہ تسبیح شیطان کا کوڑا ہے - اور روایت ہے کہ حضرت جنیدؒ کے پاس انتہائی حال میں تسبیح دیکھی گئی - پس اُس کا سبب دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا یہ وہ شے ہے جس کے ذریعہ ہم اللہ تک پہنچ گئے ہم اسے کیونکر چھوڑ دیں اور صوفیہ کے قول النہایۃ ھی الرجوع الی البدایۃ یہ (نہایت بدایت کی طرف رجوع کرتا ہے) کے معانی میں سے ایک معنی شاید یہ بھی ہیں - انتہیٰ ؛

عن یسیرۃ وکانت من المھاجرات قالت قال لنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم علیکن بالتسبیح والتہلیل والتقدیس واعقدن بالانامل فانھن مسئولات مستنطقات ولا تغفلن فتنسین الرحمۃ - رواہ الترمذی وابوداؤد - (ترجمہ) یسیرہ سے روایت ہے اور یہ عورت مہاجرات میں سے ہے - کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا - تم تسبیح وتہلیل وتقدیس کو لازم پکڑو اور عقد انامل سے شمار کرو - کیونکہ انگلیوں سے (قیامت کے دن) سوال کیا جائیگا اور وہ گویا کی جائینگی - اور تم غافل نہ رہو ورنہ رحمت سے محروم کی جاؤگی اس کو ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے (مشکوٰۃ - باب ثواب التسبیح والتحمید والتہلیل والتکبیر) ؛

مولانا علی القاریؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

وفیہ جواز عد الاذکار ومأخذ سبحۃ الابرار - وقد کان لابی ہریرۃ خیط فیہ
عقد کثیرۃ یسبح بہا وزعم انہا بدعۃ غیر صحیح لوجود اصلہا فی السنۃ ولقولہ صلی اللہ
علیہ وسلم اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم (ترجمہ) اور اس میں شمار
ذکار کے جواز اور نیکوں کی تسبیح کا ماخذ ہے - اور حضرت ابوہریرہ رضؓ کے پاس ایک
ڈورا تھا جس میں بہت سی گرہیں دی ہوئی تھیں - وہ اس سے تسبیح کیا کرتے تھے -
اور یہ زعم کہ یہ بدعت ہے صحیح نہیں کیونکہ سنت میں اس کی اصل موجود ہے - اور
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں -
ان میں سے جس کا اقتدا کروگے ہدایت پا جاؤگے - انتہی - ملا علی قاری دوسری
جگہ یوں لکھتے ہیں وصح انہ علیہ السلام کان یعقد التسبیح بیمینہ وورد انہ قال واعقدن
بالانامل فانہن مسئولات مستنطقات وجاء بسند ضعیف عن علی رض مرفوعا نعم
المذکر السبحۃ وعن ابی ہریرۃ انہ کان لہ خیط فیہ الف عقدۃ فلا ینام حتی یسبح
بہ وفی روایۃ کان یسبح بالنوی قال ابن حجر والروایات بالتسبیح بالنوی والحصی
کثیرۃ عن الصحابۃ وبعض امہات المؤمنین بل راٰھا علیہ السلام واقر علیہا
قیل وعد التسبیح بالانامل افضل من السبحۃ وقیل ان امن الغلط فہو اولی و
الا فہی اولی. (ترجمہ) اور صحیح ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام دائیں ہاتھ
سے تسبیح کرتے تھے اور یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم عقد انامل سے شمار کیا کرو
کیونکہ انگلیوں سے سوال ہوگا اور وہ گویا کی جائینگی اور ضعیف سند کے ساتھ حضرت علی رض
سے مرفوعاً روایت ہے کہ ذکر کرنے کا اچھا آلہ تسبیح ہے - اور ابوہریرہ رض سے روایت ہے
کہ ان کے پاس ایک ڈورا تھا جس میں ہزار گرہیں تھیں - وہ نہ سوتے تھے - یہانتک کہ
اس کے ساتھ تسبیح کر لیتے اور ایک روایت میں ہے کہ وہ چھوہارے کی گٹھلیوں کے
ساتھ تسبیح کرتے تھے - ابن حجر نے کہا کہ صحابہ اور بعض امہات المؤمنین سے چھوہارے

کی گٹھلیوں اور سنگریزوں کے ساتھ تسبیح کرنے کی روایات بہت ہیں بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا اور برقرار رکھا۔ کہا گیا ہے کہ عقد انامل سے شمار کرنا تسبیح کے ساتھ شمار کرنے سے افضل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر غلطی کا اندیشہ نہ ہو تو عقد انامل بہتر ہے ورنہ تسبیح کے ساتھ شمار بہتر ہے۔ (مرقاۃ جزو ثانی صـ۲۳۲) ؀

مندرجہ بالا سوالات وجوابات بطور مشتے نمونہ از خروارے لکھے گئے ہیں۔ اہل انصاف ان سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ صوفیہ کرام کا طریق کسی امر میں بے سند نہیں اسی وجہ سے حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے علمنا ھذا مشید بالکتاب والسنۃ۔ یعنی ہمارا یہ علم (تصوف) قرآن وحدیث کے ساتھ محکم ہے۔ بخوف طوالت ہم اس مضمون کو یہاں ختم کرتے ہیں وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علے سید المرسلین وعلے آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ؀

التصوّف

تغیر حقیقت تصوّف

دُنیا میں کئی ایک ایسی صداقتیں موجود ہیں جنکی اصلی صورت پر مختلف قسم کے اختراعات کا غبار اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ اب ان کی شناخت بھی آسان کام نہیں رہا۔ تصوّف جس کی اصلیت سے کسی مسلمان کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اپنی حقیقت اصلیہ کے متغیر ہو جانے کی رو سے مذکورہ بالا صداقتوں سے ہرگز باہر نہیں جا سکتا۔ کیونکہ جس طرح کسی دوسرے سلسلہ کی ابتدائی حالت اس کے مابعد کی حالت سے آہستہ آہستہ بہت دُور جا پڑتی ہے۔ اسی طرح تصوّف کی وہ حالت جو قرون اولے کے

بزرگانِ دین میں موجود تھی۔ موجودہ زمانہ کی حالت سے نہایت متفاوت ہے۔۔

اگر دلیر اور جری الفطرت آدمی جو اندھی تقلید کے پھندے سے نکل چکا ہو اور تعصب کی زد سے بالکل محفوظ ہو۔ تصوف کی حقیقت اصلی اور اس کی موجودہ حالت میں موازنہ کریگا تو اسے واضح ہو جائیگا کہ بہت ہی اقل امور میں ہر دو باہم مشابہ ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد جو سلف صالحین کا خالص نمونہ کہلا سکیں صرف انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے مگر اس امر کی صداقت معلوم کرنا چاہو تو بعض متصوفہ حال سے آثارِ خیرات و برکات اور انکے طریق امر پر نظر کرو۔ اور اس تغیر و انقلاب کی وجہ بجز اسکے اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اہلِ ہوا نے دنیا طلبی کے لئے ہر ایک زمانہ میں اپنی اغراض نفسانی کی پیش رفت میں ایسی ایسی باتوں کو مذہبی پیرایہ میں پیش کرنا شروع کر دیا جنکی کتاب اللہ اور سنت صحیحہ میں کوئی اصل نہ تھی۔ رفتہ رفتہ وہ باتیں ایسی راسخ ہوگئیں کہ جزو دین سمجھی گئیں۔ چونکہ ان باتوں کے ماننے والے اپنے جاہل پیشواؤں کی بات کو بمنزلہ وحی سمجھتے رہے۔ اس لئے انہوں نے خود کتاب اللہ اور سنت صحیحہ میں غور کرنا بالکل ترک کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف مختلف انقلابات میں اس درجہ کو پہنچ گیا کہ اس کی شکل لوگوں کو ہوا ہو کر نظر آنے لگی۔ اور ہر کس و ناکس کا عرضہ طعن بنکر مذموم اور قبیح سمجھا جانے لگا۔ ورنہ تصوف، جو گو لفظی پہلو میں بزمانہ نبوت موجود نہ تھا۔ مگر اس کی حقیقت بزرگانہ صحابہ خصوصاً اصحاب صفہ[1] میں برابر جلوہ گر تھی۔ اور بعد کے اکابر اسلام یعنی تابعین اور تبع تابعین یکے بعد دیگرے برابر اس دولت بے بہا کے مالک چلے آئے حتیٰ کہ یونانیوں کی حکمت اشراق یعنی فلسفہ الٰہیات نے اسلام میں ابتری پھیلانا شروع کر دی۔ اور اکثر متصوفہ کی توجہ اس کی طرف منجذب ہوگئی۔ جس کی بڑی زبردست نظیر فرقہ باطنیہ[2] کے لوگ تھے

---

[1] بعض صحابہ جو مسجد نبوی کے متصل ایک مکان میں ذکر و عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے ۱۲ منہ

[2] باطنیہ جنکو قرامطی بھی بولتے ہیں وہ لوگ ہیں جو احکام شریعت کے ظاہر کی نسبت یہ خیال رکھتے ہیں کہ انکا ایک باطن بھی ہے اسلئے وہ نصوص ظاہری کی تاویل اپنے اصول مسلمہ پر کرتے ہیں اور انکے اصول فلسفہ الٰہیات سے اخذ کئے گئے ہیں جو قریباً سب مخالف شریعت ہیں۔ بعض غالی متصوفہ نے دین حنیف میں ان اصول کو داخل کرکے بدنام کیا۔ فرقہ باطنیہ کی تفصیل تفسیر حقانی دیباچہ دیکھو

نتیجہ یہ ہوا - کہ اُصول تصوّف جن کا اقتباس غور نبوّت سے کیا گیا تھا ملاحدہ یونان کے اُصول سے ایسے مل جُل گئے اور اس پر اسقدر رسائل تالیف کئے گئے - کہ ایک ایسے شخص کے لئے جو کتاب اللہ و سنّت صحیحہ سے محض ناواقف ہو ہر دو میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا - یہیں تصوّف اور اہلِ تصوّف کی حقیقت اصلیہ کا ظاہر کرنا نہایت ضروری نظر آتا ہے کیونکہ اس بداعتقادی کے زمانہ میں لوگ محض سوئے ظن کی وجہ سے طلب کمال سے محروم رہ گئے ہیں - اور لوگوں کی رائے اور تحقیق کو دین سمجھ چکے ہیں ایک بڑی مشکل یہ آ پڑی کہ بعض اکابر علمائے اسلام نے جنکی طبائع پر فلسفیت غالب تھی - اُنھوں نے یہ کوشش کرنا شروع کر دی کہ ملحدین فلسفہ کے اُصول الٰہیات کو شریعت اسلامیہ کے اصول سے تطبیق دیں چنانچہ اس امر عظیم کی پیش رفت کے لئے اُنھوں نے اصطلاحات فلاسفہ کا مفہوم آیات و احادیث سے نکالنا چاہا - اگر کسی شخص کو اس امر کی تصدیق کرنا ہو تو وہ اسلامی زمانہ کی کتب حکمت اشراق کو مطالعہ کر کے دیکھ لے - مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اہل فلسفہ نے عقول عشرہ[لہ] کا ایک ڈھکوسلا بنا رکھا ہے جو انکے اس اصل پر مبنی ہے کہ الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد (ایک علت سے ایک ہی معلول صادر ہو سکتا ہے) اس لئے جب اسلامی زمانہ کے بعض اہل فلسفہ نے اس اصل کی شریعت اسلامی سے مطابقت کرنا چاہی - تو حدیث اوّل ما خلق اللہ العقل سے جا لپٹے اور اہل تصوّف نے حدیث اوّل ما خلق اللہ نوری کو جا لیا - اور فلسفہ اور شریعت اسلامی کو ملا کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک ہی حقیقت واحدہ کو مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا حقیقت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ وہی ہے جسکو دوسرے الفاظ میں اہل فلسفہ عقل اوّل کہتے ہیں - حالانکہ اوّل تو یہ ہر دو علمائے حدیث کے نزدیک ثابت نہیں مگر بایں ہمہ ہم کہتے ہیں کہ ہر دو حدیث مذکورہ بالا میں

[لہ] وہ کہتے ہیں کہ ذات باری واحد ہے - اسلئے اسنے اسقدر مختلف اشیاء کو بدوں وسائط کیسے پیدا کیا ہوگا - پس ضروری ہوا کہ اسکے پہلے عقل اول کو پیدا کیا ہو - اور عقل اوّل نے عقل ثانی کو علی ہذا القیاس عقل عاشر کا نام عقل فعال ہے جسکو مدبر عالم مانا گیا ہے مگر یہ باطل خیال محض صفات باری کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے جس کو قرآن مجید نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے ۱۲ منہ

اولیت حقیقی و اضافی کے اعتبار سے کوئی اشکال عائد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حمد اور بسم اللہ ہر دو کے لئے کسی امر کے آغاز میں کہنے کا حکم ہے۔ مگر ایک میں اولیت حقیقی ہے اور دوسرے میں اضافی ہے۔ بہر صورت خواہ مخواہ اہل فلسفہ کی اصطلاحات اور انکے مفہوم کو اسلامی تعلیم وحی سے مطابقت دینے کا خیال بعض اسلامی مصنفین کو دامنگیر ہو گیا تھا جس پر انہیں طرح طرح کی تاویلات رکیکہ سے کام لینا پڑا۔ اگر صرف اسلامی اہل فلسفہ ہی ایسا کرتے تو کوئی بات نہ تھی۔ تعجب ہے کہ بعض متاخرین متصوفہ نے بھی اسی بارہ میں غلو کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ حالانکہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ہٹ کر کسی دوسرے کے دروازہ پر جانیکی انہیں کچھ ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ متصوفہ قرون اولے نے ایک قدم بھی اِس صراطِ مستقیم سے انحراف نہیں کیا۔

مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہو گیا ہو گا کہ عام طور پر تصوّف اور اہل تصوّف کے مطعون ہونے کے دو سبب تھے۔ اوّل متصوفہ جاہل جو کتاب اللہ اور سنّت سے بالکل بے بہرہ تھے یا ناکافی واقفیت رکھنے کی وجہ سے افراط و تفریط میں امتیاز نہ کر سکے اور معتقدات باطلہ پر مذہبی رنگ چڑھا کر اپنے دام افتادوں کو ان پر معتقد ہونے کی ہدایت کرنے لگے۔ اور چونکہ خود کتاب و سنّت سے ناواقف تھے اس لئے ان کے متبعین کو بدرجہ اولیٰ اس طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ ملا۔ اور اگر کسی عالم علمِ دین نے بدعات و منکرات سے روکنا چاہا تو اس کو ظاہر پرست وہابی ملحد وغیرہ کہا گیا *

دوم متصوفہ اہل فلسفہ جنہوں نے یونانیوں کی حکمت اشراق کو قرآن و سنّت کے ساتھ خلط کر کے ایک عجیب و غریب معجون مرکب تیار کی۔ اور اصطلاحات فلسفہ کا مفہوم آیات و احادیث سے اخذ کرنا چاہا۔ واضح ہو کہ اس مرض میں اچھے اچھے اکابر علمائے اسلام بھی مبتلا ہوتے ہیں۔ جن کی تصانیف بعد میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔ اور اب بھی بعض اس مذاق کے لوگ اسی عزت سے دیکھتے ہیں *

غالباً ناظرین کے لئے کوئی زیادہ موجب دلچسپی نہ ہوگا۔ اگر میں ہر دو گروہ کی بعض باطل پرستیوں کا مفصل ذکر کرنے لگوں اور نہ ہی یہ موقع اس قدر تفصیل کا متحمل ہے اس لئے مناسب ہے کہ تصوف کی اس حقیقت کو ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے جو از روئے کتاب وسنت ہرگز قابل اعتراض نہیں بلکہ اسلامی تعلیم کا روح رواں ہے اور جس کے اختیار کئے بغیر کوئی شخص کامل الایمان نہیں ہو سکتا۔

لفظ تصوف کا اشتقاق[1]

لفظ تصوف کے اشتقاق میں بھی مختلف اقوال ہیں بعض نے اس کو لفظ صوف سے مشتق بتایا ہے۔ پس صوفی صوف پوش کو بولتے ہیں۔ مگر نہ صرف صوف پوشی بلکہ اہل تصوف کے آداب ظاہری و باطنی سے آراستہ ہونے کا نام تصوف ہے اور یہی قول اقرب الی الصواب ہے کیونکہ صوفی جس کی نسبت لفظ صُوف کی طرف کیگئی ہے از روئے ترکیب لغوی بالکل صحیح ہے۔ برخلاف اس کے اگر بقول بعض تصوف کا مادہ صفۃ یا صفا یا صف قرار دیا جائے تو قیاس لغوی یہ چاہتا ہے کہ انکی طرف نسبت کرنے سے الفاظ صفی صفائی یصفی حاصل ہوں نہ کہ صوفی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض اکابر ملت مثلاً حضرت شیخ عبد القادر گیلانی قدس سرہٗ اور امام محمد غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس لفظ کو صفا سے مشتق کیا ہے۔ اور اگر یہ اشتقاق صحیح تسلیم کر لیا جائے تو لامحالہ اس کو باب مفاعلہ کا صیغہ ماضی مجہول یعنی صوفی قرار دینا پڑیگا جس کو کثرت استعمال سے بیکار یا ر بڑھا گیا اور مجھے اس توجیہ پر ایک گونہ اسلئے یقین ہے کہ بعض اکابر کے کلام میں

[illegible]

[2] غنیۃ کی عبارت یہ ہے فہو فی الاصل صوفی علی وزن فوعل ماخوذ من المصافات یعنی اذ صافاہ الحق عز وجل ولهذا قیل صوفی کان صافیا من آفات النفس خالیا من مذمومها سالکا لحمید مذاهبه ملازما للحقائق غیر ساکن بقلبه الی احد من الخلائق یعنی صوفی دراصل فوعل کا وزن اور مصافات سے مشتق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صاف کیا ہو۔ یعنی جو شخص نفس کی آفتوں اور مذموم سکی برائیوں سے صاف اور مذہب نیک پر ہے اور اسکا دل بجز اللہ تعالیٰ کے کسی چیز پر آرام نہ پائے ملامت

اس کی تائید میں یہ شعر موجود ہے ؎

وَلَيْسَ يُنْتَحَلُ بِالتَّصَوُّفِ غَيْرُ فَتًى
صَافَى فَصُوْفِيَ حَتّٰى سُمِّيَ الصُّوْفِيُّ

حضرت پیر صاحب کے الفاظ امام صاحب کے الفاظ سے اقرب الی الصحت ہیں کیونکہ پیر صاحب فرماتے ہیں وھو ماخوذ من المصافاۃ اور امام صاحب فرماتے ہیں۔ وھو ماخوذ من الصفا یعنی پیر صاحب نے براہ راست باب مفاعلہ سے مشتق کیا ہے اور امام صاحب نے مصدر ثلاثی مجرد سے اسلئے ہماری مذکورہ بالا توجیہ کے لئے پیر صاحب کی عبارت کافی تائید کرتی ہے ۔

حقیقت تصوّف

لفظ تصوّف کے اشتقاق کی نسبت اسکی حقیقت میں اور بھی زیادہ اختلاف ہے مگر تمام تعریفات پر جو مختلف مشائخ رحمہم اللہ سے مروی ہے غور کرنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ سب کا مآل واحد ہے حقیقت تصوّف کے بہت سے ارکان و شرائط اور آداب و لوازم ہیں۔ کسی نے کسی جزو اعظم کو مدِ نظر رکھکر اس کی تعریف کی ہے اور کسی نے اُس کے شرائط و آداب و لوازم کو بطور تعریف لفظی کے ظاہر کر دیا ہے۔ چونکہ کسی شے کی تعریف سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت کا ہمیں علم ہو جائے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں ۔ کہ جن اصحاب نے شرائط و آداب و لوازم کو تعریف تصوّف میں بیان کیا ہے۔ انکی تعریفات بھی بطور اجمال کسی قدر افادہ کرتی ہیں۔ کیونکہ تعریف لفظی سے بھی عموماً کسی حقیقت کو دوسرے حقائق سے تمیز حاصل ہو جاتی ہے۔ کما ھو مصرح فی موضعہ ۔

لہ آپ کی عبارت یہ ہے - تجرید القلب للہ واحتقار ماسواہ وھو ماخوذ من الصفا لصفیتہ القلوب - یعنی تصوف دل کو محض اللہ تعالے کے لئے علیحدہ کر لینے اور اس کے ماسوا کو حقیر جاننے کا نام ہے - اور وہ صفا سے مشتق ہے - کیونکہ وہ دلوں کو صاف کرتا ہے ۱۲ منہ

ذیل کی عبارات میں غور کرو :-

(ا) تصوف[1] تمام اخلاق رذیلہ سے علیحدہ ہونے اور تمام اخلاق فاضلہ سے متصف ہونے کو بولتے ہیں ؛

(ب) حالات واردہ کا منتظر اور ادب شرعی کے ساتھ لازم رہنا تصوف ہے ؛

(ج) اپنے اوقات کو ایسے امور میں لگانا جن کا ان اوقات میں پورا کرنا نہایت ضروری ہے - (امور سے مراد ذکر عبادات ہیں یا ان کے اسباب ضروریہ) ؛

(د) تصوف تمام تعلقات سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالےٰ کے حضور میں حاضر رہنے کو بولتے ہیں - قطع تعلقات سے مراد تعلقات کا دِل سے اُٹھا دینا ہے - نہ سلسلۂ اسباب کی ضروری پابندی ظاہری سے علیحدہ ہونا ؛

(ہ) تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ تجھے اپنی ہستی سے زندہ کردے ؛

(و) تصوف اللہ تعالےٰ کے ساتھ مِل کر بیٹھنے کو کہتے ہیں - اس حال میں کسی قسم کی فکر دامنگیر نہ ہو ؛

(ز) تصوف حقائق و معارف کے حاصل کرنے اور اہل دُنیا سے بکلی ناامید ہو جانے کو کہتے ہیں ؛

(ح) تصوف نفس کو لوازم عبودیت کی مشق کرانے کا نام ہے ؛

(ط) تصوف اخلاق حسنہ کا نام ہے - اور جو شخص اِس سے زیادہ حقیقت تصوف کو بیان کرے وہ زائدیات کہتا ہے جو داخل تصوف نہیں ؛

(ی) تصوف ظاہر و باطن میں آداب شرعیہ کے ساتھ قائم ہونے کو بولتے ہیں اس طرح کہ ان کا اثر ظاہر سے باطن پر اور باطن سے ظاہر پر پہنچ جائے - اِن

[1] یعنی اعتقادات صحیحہ اور فرائض و سنن کی پابندی کرنے کے بعد - اسلئے کوئی کافر یا بدعتی مسلمان کسی ایسے اخلاق سے متصف نہیں ہوسکتا ۱۲ منہ

بر دو جہت پر حاوی ہونے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو کمال حقیقی حاصل ہو جاتا ہے (لہٰ)۔ تصوف اللہ تعالیٰ کے ساتھ صدق برتنے اور مخلوقات کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے کو کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا تعریفات کے علاوہ اور بھی کئی ایک تعاریف کتب تصوّف میں مسطور ہیں۔ مگر ناظرین کو حقیقت تصوّف کے سمجھنے کے لئے اسی قدر کافی ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ صرف الفاظ کا اختلاف ہے ورنہ مآل سب کا ایک ہی ٹھہرتا ہے یعنی معتقدات صحیحہ کے حاصل کرنے کے بعد تمام احکام شریعت فرائض و سنن و نوافل کی کامل پابندی کرنا اور نفس کو اس حد تک شریعت کا پابند بنانا کہ خواہش نفس کے آثار بالکل منقطع ہو جائیں تا آنکہ رفتہ رفتہ دل کو حقیقی اطمینان کا درجہ حاصل ہو جائے یعنی بجز ذکر خدا کوئی چیز اس کو لذت نہ دے اور نہ اس کو مرکز اطمینان سے جنبش دے سکے اسی حالت کو جب زیادہ ترقی دی جائے تو طہارت کلی کا رتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اگر غیر اللہ سے ایسے شخص کا تعلق بظاہر نظر آئے۔ تو یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ اللہ ہی کے لئے ہے یعنی خواہش نفس اسے نہ تو کسی کی مخالفت پر آمادہ کرتی ہے۔ نہ اسکی محبت پر بلکہ اُس کی کسی سے مخالفت اسکی غیرت ایمانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کا کسی چیز یا شخص سے محبت کرنا حکم قرآنی کا متبع۔ الغرض تصوّف کا اصل منشا نفس کے آثار کو بالکلیت محو کر کے اس کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ و رضا کے تابع بنانا سمجھو ایک عارف کامل اور مقرب بارگاہ حق کی اس عبارت میں غور کرو جس کا ترجمہ یہ ہے کہ طریقہ صوفیائے کرام کی پہلی شرط یہ ہے کہ بجز اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت کے تمام اشیاء کے خیال سے فضائے دلکشائے قلب کو پاک و صاف کر دیا جائے۔ اور اس طریق کا آغاز بیان سے ہوتا ہے۔ کہ قلب ذکر الٰہی میں مستغرق ہو جائے۔ اور یہ استغراق، ذکر اس طریق میں سلوک کرنے کے ساتھ وہی نسبت رکھتا ہے جو تکبیر

سحربہ کو آغاز بلذ سے نسبت ہے اور اس طریق کا انتہائی مرحلہ یہ ہے کہ آثار نفس بالکلیت محو ہو کر متصف بہ اوصاف الٰہی ہو جائے جس کو اصطلاح تصوف میں فنا فی اللہ کہتے ہیں۔

شریعت اور حقیقت

اس امر کا واضح کر دینا نہایت ضروری ہے کہ مرتبہ حقیقت محض مذکورہ بالا طریق تصفیہ و تزکیہ سے حاصل ہو سکتا ہے اور تصفیہ اور تزکیہ کامل اتباع شریعت کا نتیجہ ہے - یعنی ورعؔ اور تقویٰؔ میں یہانتک استقامت پیدا کرے کہ رخصتؔ سے تجاوز کر جائے اور جب اس پایہ کو حاصل کرے تو اس پر اسرار حقیقت کا انکشاف ہونے لگتا ہے - اور یہ طریق عین منشائے شریعت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا - اسی مقام پر ایک عارف کامل لکھتے ہیں کل طریقة تخالف الشریعة فهی کفر و کل حقیقة لا یشهد لها الکتاب والسنة فهو الحاد وزندقة - یعنی جو طریق مخالف شریعت حقہ ہے وہ کفر ہے اور جس حقیقت پر کتاب اللہ وسنت صحیحہ شاہد نہیں وہ الحاد زندقہ ہے - چنانچہ دوسرے موقعہ پر اسی امر کو یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ طالب صادق کو سب سے اوّل شریعت کے اوامر و نواہی سے آگاہ ہونا ضروری ہے - اور تقویٰ اور طہارت کا پابند ہونا جس کو طریقت بولا کرتے ہیں پابندی شریعت کا نتیجہ ہے - اور ان مراتب کے بعد وصول الی المقصد یعنی نور تجلی کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے - جس کا نام حقیقت ہے در اصل یہ ہر سہ مراتب شریعت ہی کے کمال اتباع کا نتیجہ ہیں - یعنی رسم و عادت کے طور پر پابندئ شریعت سے گذر کر حقیقی تقویٰ و طہارت کو حاصل کرنا جس سے ذکر میں لذت اور لذت سے استغراق اور محویت ہونے لگے - اس کو یوں بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ طہارت شریعت بذریعہ

سلہ تخلقوا باخلاق اللہ سلہ تقویٰ حلال وحرام میں امتیاز کرنیکا نتیجہ ہے اور ورع جائز اور مباح اشیاء کے ترک کو کہتے ہیں - اس خیال پر کہ انکے استعمال سے کسی ناجائز کے ارتکاب کا اندیشہ ہو یہ خواص کا درجہ ہے سلہ رخصت سے مراد اصطلاح شرعی نہیں بلکہ ان اشیاء سے بے طرف ہونیکا نام ہے جنکو شرعاً جائز سمجھا گیا ہے مگر اہل طریقت کے ہاں منع ہے مثلاً شرعاً بعد ادائے زکوٰۃ زر و سیم کا جمع کرنا کوئی گناہ نہیں مگر اہل طریقت کے ہاں حرام ہے یا شرعاً غیبت [illegible] مگر اہل طریقت کے ہاں [illegible]

وضو اور غسل کے اور طہارت طریقت ہوائے نفس کے ترک کرنے پر حاصل ہوتی ہے اور طہارت حقیقت تمام غیر اللہ سے قلب کو پاک کر دینے پر منحصر ہے۔ یہی بزرگ اس قدر لکھنے کے بعد فرماتے ہیں فمن ذعم ان العبود من حجب البشریۃ والوقوف علی اسرار الطریقۃ والحقیقۃ بما یخالف الشریعۃ فقد طغی وغلبت علیہ الضلالۃ والنیان واستھوتہ الشیاطین فی الارض حیران حتی القتہ فی اودیۃ الھجران واھلکتہ فی قیعان الخسران۔ یعنی جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ آثار بشریت سے گذرنا اور اسرار حقیقت پر مطلع ہونا۔ کسی طریق مخالف شریعت سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ شخص خدا کا سرکش ہے اور وہ ضلالت و نسیان کے گڑھے میں پڑا ہے اور شیاطین اسے ادہر اُدھر سراسیمہ کر رہے ہیں حتی کہ وہ ناکام ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور بالاخر وہ زیان اُٹھا کر دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

فنا فی اللہ

مذکورہ بالا فقرات میں فنا فی اللہ کا لفظ مستعمل ہوا ہے جسے اس کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض ناواقفان اہل طریق کے اکثر اصطلاحات پر نکتہ چینی کیا کرتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی علم یا کوئی فن آج تک دنیا میں بلا اصطلاحات مروج نہیں ہوا۔ تفسیر حدیث فقہ اصول تاریخ حساب۔ ہندسہ طب وغیرہ سب کے سب اصطلاحات پر مبنی ہیں۔ اور اصطلاحات کا بڑا فائدہ یہ ہوا کرتا ہے کہ بجائے اسکے کہ بار بار ایک لمبی عبارت کا اعادہ کیا جائے۔ صرف ایک ہی لفظ سے وہ کام لیا جاتا ہے۔ جس طرح ضمائر کے استعمال کا رواج بغرض اختصار ہر ایک زبان میں پایا جاتا ہے تصوف بھی ایک علم ہے جس میں مجاہدت و ریاضت اور کیفیات و واردات قلبی سے بحث کی جاتی ہے۔ اس لئے دیگر علوم کی طرح یہ بھی چند اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ جب تک ہمیں ان اصطلاحات کا علم نہیں ہوگا۔ ہم اس طریق کے اکابر کا کلام نہیں سمجھ سکیں گے۔ گو نفس تصوف محتاج اصطلاحات نہیں مگر افادہ غیر کے لئے اس کی ضرورت سے ہرگز انکار نہیں ہو سکتا۔ ان سطور سے ناظرین

پر بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ حضرات آئمہ متصوفین رحمھم اللہ نے شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والتحیۃ کو وصول الی الحق کا موقوف علیہ تسلیم کیا ہے اور بجز کامل اتباع شریعت کے کوئی شخص صفائی قلب کا رتبہ نہیں پا سکتا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ طعن کرنے والوں نے تصوّف اور اہل تصوف کی حقیقت کو مخالف شریعت حقہ خیال کرکے گاہ و بیگاہ حد اعتدال سے تجاوز کیا ہے۔ اور یہ نہیں سمجھا کہ حقیقی تصوّف صرف اسی طریق حق کا نام ہے جو حضور علیہ السلام سے اکابر مشائخ تک پہنچا۔ مگر طعن کرنے والے اصحاب کسی حد تک معذور بھی ہیں۔ کیونکہ انہیں اہل تصوّف میں اس قسم کی مثالیں بھی نظر آئیں جنھوں نے بلا لحاظ احکام شریعت بہت سے بدعات منکرہ کو اس طریق میں داخل کر لیا۔ بلکہ اصل حقیقت کو چھوڑ کر چند ایک مختلف فیہ امور کو انہوں نے اپنے طریق کا نشان قرار دیا حالانکہ طریق تصوف اس قسم کی جعل سازیوں سے بالکل پاک و صاف ہے۔ ان سطور سے مجھے اس امر کا واضح کرنا مد نظر ہے کہ طریق تصوّف کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے کوئی علیحدہ طریق نہیں۔ جس پر کسی قسم کا اعتراض عائد ہو سکے۔ جو لوگ سلوکِ طریقت کے لئے شیخ کامل کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں وہ فنافی الشیخ اور فنافی الرّسول اور فنافی اللہ ہر سہ اصطلاحات کا عموماً استعمال کیا کرتے ہیں۔ اور یہ الفاظ کامل اتباع شیخ کامل اتباع سنّت اور کامل تخلق باخلاق اللہ کے مفہوم سے زیادہ اور کچھ ظاہر نہیں کرتے۔ میرے خیال میں یہ مفہوم ہرگز مخالف شریعت نہیں۔ کیونکہ جب تک ہم صلاح و تقویٰ کے لئے اپنے لئے کامل عملی نمونہ نہ پائیں افراط و تفریط کا اندیشہ برابر رہتا ہے۔ کچھ شک نہیں۔ کہ کتاب و سنّت سے زہد و تقوٰی کا علم حاصل کرنا کچھ اور چیز ہے۔ اور اس کو کسی مرد خدا یعنی عارف کامل کی عملی حالت سے اخذ کرنا اور چیز ہے۔ پہلی صورت صرف قال ہی قال ہے اور دوسری میں قال و حال ہر دو ہے۔ اگر اس کا ثبوت چاہو تو کسی ایک عالمانِ کتاب و سنّت کی حالت میں غور کرکے دیکھ لو کہ وہ شریعت کے تمام اوامر و نواہی

کا علم رکھتے ہیں۔ مگر رذائل نفسانی سے ہرگز پاک نہیں ہوتے۔ اور اگر کوئی شخص اس امر کا مدعی ہے کہ ہر ایک آدمی بغیر کسی عارف کامل کی مصاحبت کے صرف رسمی عبادات سے تصفیہ و تزکیہ حاصل کر لیتا ہے تو میں اسے کاذب سمجھتا ہوں۔ مجھے کئی ایک ایسے علماء کا تجربہ ہے جو علم و فضل میں مسلم ہیں اور اوامر و نواہی کے بھی پورے پورے پابند ہیں مگر رذائل نفسانی یعنی غصہ۔ حسد۔ غرور۔ حرص۔ شہوت۔ ریا۔ بخل وغیرہ سے ہرگز محفوظ نہیں۔ برخلاف اس کے بعض ایسے کم علم لوگوں کا بھی مجھے علم ہے۔ جو کسی کامل کی مصاحبت سے مذکورہ بالا رذائل سے محفوظ ہیں ؎

تا نیفتد بر تو مردے را نظر	از وجود خویش کے یابی خبر

اس معاملہ میں حجت بازی سے کام نہیں چلتا۔ اور یہ مان لینے کی بات ہے۔ صورت انکار اور تو کچھ نہیں مگر انسان فیض باطنی اور حقیقت فہمی سے کوسوں دور جا پڑتا ہے۔ اور رسمی عبادات میں عمر کھو دیتا ہے۔ جن میں چاشنی محبت اور ذوق عرفان تام کو بھی نہیں ہوتے۔ تعجب ہے کہ جسمانی امراض کے لئے تو ڈاکٹر اور طبیب کے پاس لوگ دوڑے جاتے ہیں مگر روحانی امراض کے لئے کسی عارف کامل کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتے۔ اگر کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کا علم بھی موجب اصلاح و فلاح ہوتا تو تمام علمائے دین عارفانِ کامل بنگئے ہوتے ؎

اگر ژالہ ہر قطرہ دُرّ شدے

چو خر مہرہ بازار ازو پُر شدے

سو جس طرح کتب طب سے ہر ایک شخص بلا تعلیم اُستاد و تجربہ مستفید نہیں ہو سکتا اسی طرح کتاب و سنت کے علمی اور عملی کمال کے لئے اساتذہ فن اور مشائخ کامل کی ضرورت ہے۔

الغرض محض اصطلاحاتِ قوم کو ان کے معانی اصلیہ پر محمول نہ کرنے سے لوگوں

نے بسا اوقات بہت سی صداقتوں کا انکار کر دیا ہے۔ اور جب کبھی کوئی جاہل صوفی مقابلہ پر کمر باندھتا ہے تو یہی معاملہ تکفیر و تفسیق تک پہنچ جاتا ہے۔ مگر ضد اور تعصب کو چھوڑ کر اگر حق پژوہی کی نیت سے کسی حقیقت کا پتہ لگایا جائے تو ممکن نہیں کہ کسی کو مجال انکار ہو۔ اسی مضمون کو ایک امام کتاب و سنّت نے اس مختصر جملہ میں بیان کیا ہے واذا فہمت المعانی فلا مشاحۃ فی الالفاظ یعنی جب تو معانی مطلب کو سمجھ چکے تو ان کو جن الفاظ سے تو چاہے تعبیر کرے ؛

انکار

جس طرح انبیاء علیہم السلام کی حقیقتِ نبوّت کو عامۂ جہال نہ سمجھ کر اکثر تکذیب کر دیا کرتے تھے۔ اسی طرح متصوفہ کرام رحمہم اللہ کا بھی انکار کرنے والے ہر ایک زمانہ میں موجود رہے ہیں۔ چنانچہ ابن جوزی جیسے محدّث نے بھی بڑے زور شور سے بڑے بڑے اکابر اہلِ عرفان حتیٰ کہ جنید اور شبلی جیسے آئمہ طریق پر بھی حملہ کر ہی دیا۔ اور بدیں الفاظ طریق قوم کا انکار کیا ولعمری لقد طوی ھولاء بساط الشریعۃ طیًّا فیا لیتھم لم یتصوفوا یعنی مجھے اپنی جان کی قسم ہے۔ کہ ان لوگوں (متصوفہ) نے شریعت کی بساط کو لپیٹ دیا ہے۔ اے کاش کہ یہ لوگ طریق تصوّف کو اختیار نہ کرتے۔ مگر میں کہتا ہوں۔ کہ اس قسم کے الفاظ لوگ ائمۂ علیہم الرحمۃ کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ گو یہ غلطی محض حقیقت نافہمی کا نتیجہ تھی۔ ورنہ انہیں لوگوں میں سے کئی ایک اکابر آئمہ دین انکار کے بعد اقرار پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی دیباچہ لواقح الانوار میں لکھتے ہیں ان الانکار علی ھذہ الطائفۃ لم یزل علیھم فی کل عصر وذلک لعلو ذوق مقامھم علی غالب العقول ولکنھم لکمالھم لایتغیرون کمالا یتغیر الجبل یعنی اس گروہ کے برخلاف ہر ایک زمانہ میں برابر انکار رہتا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس مقام تک ان لوگوں کو ترقی ہو جاتی ہے۔ عامہ عقول ان کے سمجھنے

سے قاصر ہوتی ہیں۔ مگر یہ لوگ اِن منکرین کی کچھ پرواہ نہیں کیا کرتے بلکہ پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہتے ہیں۔ امام موصوف نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں طریق تصوف کے متعلق ایک دلچسپ بحث لکھی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ ناظرین کے پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ اہلِ تصوف کا طریق انبیاء و اصفیاء علیہم السلام کے قدم بقدم چلنا ہے اور یہ اس وقت تک ہرگز مذموم نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ صریح آیات و احادیث اور نیز اجماع امّت مرحومہ کے مخالف نہ ہو۔ اور اگر کوئی بات ہر سہ معیار مذکورہ بالا کے مخالف نہ ہو اور کسی کی سمجھ میں نہ آسکے تو اس کو اختیار ہے کہ اس پر عامل ہو یا اس کو ترک کر دے۔ اور انکار کرنے کی وجہ بجز سوئے ظن کے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تصوف سے مراد وہ حقیقی نورِ علم ہے جو کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ پر بروجہ کمال عمل کرنے سے اولیاء اللہ کے دلوں میں چمکا کرتا ہے۔ سو جو شخص ظاہر و باطن میں کامل اتباع کریگا اس پر ایسے معارف و حقائق و اسرار و دقائق کا افاضہ ہوگا۔ جس کی وصف سے امام قاصر ہیں پس تصوف آدمی کے متبع کتاب و سنّت ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس صورت میں کہ اس کے اعمال ہوائے نفس اور دیگر اغراض نفسانی سے بالکل پاک و صاف ہو جائیں۔ اِس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے علم معانی و بیان جو بجز علمِ نحو کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس مثال سے علمِ نحو اور معانی کے جاننے والے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ مسائل نحو اور مسائل معانی میں بڑا فرق ہے۔ یعنی نحو چند ایسے علمی مسائل کا نام ہے۔ جن سے ہم صحت کلام کی استعداد حاصل کرتے ہیں۔ اور علم معانی میں مسائل دقیقہ کا بیان ہوتا ہے۔ جن سے صرف مذاق صحیح والے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ اعمال صالحہ کی عملی صورت بتلاتے ہیں۔ اور تصوف انہیں اعمال کی روحانی تاثیرات پر مبنی ہے۔ جنکی حقیقت سے صرف صحیح المذاق لوگ آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی

شخص علمِ معانی کو عین علمِ نحو کہدے تو باطل سمجھا ہے۔ اور اگر اعتباری طور پر ان میں فرق کرے تب بھی صحیح ہے۔ اسی طرح تصوّف بھی یا تو عین شریعت ہے یا پابندی شریعت کا نتیجہ۔ مگر یہ بات ضروری ہے کہ تصوّف کی حقیقت سے بجز ایک متبحر فاضل کے جس نے احکام کی کیفیت وکمیت کو خوب سمجھ رکھا ہو کوئی شخص اچھی طرح سے واقف نہیں ہو سکتا۔ سو جس طرح علمائے شریعت کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ میں صحیح غور و فکر کرنے سے احکام جزئیہ کا استنباط کیا کرتے ہیں اور اصول اجتہاد سے جائز و ناجائز کا حکم حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل تصوّف بھی سالک کے لئے ایسے آداب و شرائط تجویز کرتے ہیں جنکا منبع شریعتِ اسلامی ہوا کرتا ہے۔ اور جس طرح کوئی مجتہد اپنے اجتہاد کو کبھی غیر کے لئے واجب الاتباع نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح کوئی صاحب مقام ولی اللہ اپنے ذوق یا کشف وغیرہ سے کسی امر کو دوسروں کے لئے واجب الاتباع قرار نہیں دے سکتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کو نہایت مفصّل الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مجتہدین شریعت اور مجتہدین طریقت سب کے سب راستباز اور عدول لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خدمت شریعت کے لئے برگزیدہ کرلیتا ہے۔ اس لئے جو شخص نظر دقیق سے کام لیگا اُسے معلوم ہو جائیگا کہ اہل اللہ کے علوم ہرگز شریعت سے باہر نہیں جا سکتے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ کیونکہ شریعت ہی تو ان کے لئے وصول الی اللہ کا ایک ذریعہ ہے۔ اور وہ ایک آن کے لئے بھی طریق شریعت سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ منکر کے انکار کی وجہ کتاب و سنّت میں پوری مہارت نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں علمنا ھذا مشید بالکتاب والسنۃ۔ یعنی ہم اہل تصوّف کا علم کتاب و سنّت کے ساتھ مضبوط کیا گیا ہے۔ اور محققین نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ

اس طریق میں ایک ایسا شخص جو قرآن مجید اور احادیث شارع علیہ السلام کے مفہوم اور اُن کے خاص و عام اور ناسخ و منسوخ اور حقیقت و مجاز و غیرذالک سے بالکل بے خبر ہے کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک صوفی کے لیے عالم کتاب و سنت ہونا ضروری ہے۔ نہ برعکس۔ الغرض انکار کی وجہ بجز غرور و جہل کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ امام قشیری اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ آجتک اسلام پر ایسا کوئی زمانہ نہیں گذرا جس میں اس زمانہ کے بڑے بڑے علمار راسخون فی العلم نے اپنے زمانہ کے شیخ کامل کے سامنے زانو ادب تہ کرکے اس سے استفاضہ نہ کیا ہو اور اگر اس فرقہ مقدسہ کے لوگوں میں کچھ خصوصیت نہ ہوتی تو معاملہ برعکس ہوتا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ہمیں اس فرقہ مبارکہ کی صداقت اور حقانیت پر مفصلہ ذیل بزرگانِ شریعت کی نظیر کافی ہے۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ نے باشارہ امام احمد حنبل علیہ الرحمۃ قطب وقت شیبان راعی قدس سرّہٗ سے سوال کیا۔ کہ آپ اس شخص کی نسبت کیا فتویٰ دیتے ہیں جس کو نماز سے نسیان ہو جائے۔ اور نہ جانتا ہو کہ کونسی نماز تھی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ایسا شخص اللہ تعالےٰ کے ذکر سے غافل ہوگیا ہے اُسے تنبیہ و تہدید کرنا چاہیئے۔ امام رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے طریق حق کی تصدیق کی۔

امام احمد علیہ الرحمۃ کا قاعدہ تھا کہ فقہ کے دقیق سے دقیق مسائل کو بغرض استفسار شیخ وقت ابوحمزہ[1] بغدادی قدس سرّہٗ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے اور شیخ کے جوابات سے پورا پورا اطمینان حاصل کرتے۔

امام ابوالعباس بن شریح جب حضرت جنید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر

---

[1] ابوحمزہ رحمۃ کے متعلق کتب سیر میں لکھا ہے کہ آپ فرمایا کرتے کہ جو شخص طریقت کا علم حاصل کر لیتا ہے اس پر سلوک آسان ہو جاتا ہے اور یہ وہ علم ہے۔ جو عارف کو تعلیم الٰہی سے حاصل ہوا کرتا ہے۔ اور جو شخص استدلال عقلی کے پیچھے پڑتا ہے وہ کبھی تو بھٹک جاتا ہے اور کبھی گمراہ ہو جاتا ہے۔ اور رسول صلعم کے اقوال افعال و احوال طریقت کی مخالفت سے محفوظ نہیں رہ سکتا ۱۲ منہ

ہوئے تو بعد مصاحبت فرمانے لگے کہ اس شخص کا کلام نہایت دقیق ہے جس کا سمجھنا آسان نہیں - ہاں اس میں ایک غیر معمولی حشمت و شوکت بھی مضمر ہے - جو کسی جھوٹے مدعی کو ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی ؛

محدث ابو عمران رحمتہ اللہ علیہ جب حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حیض کے متعلق چند ایک دقیق سوالات میں آپ کا امتحان کیا آپ نے ساٹھ ایسے مسائل کا افادہ کیا جس کی نسبت ابو عمران کا بیان ہے کہ انہیں پہلے انکا ہرگز علم نہ تھا ؛

شیخ قطب الدین ابن امین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے کو محبت مشائخ کبار کی بابت ہمیشہ وصیت کیا کرتے - اور فرماتے کہ ان لوگوں کو اخلاص حقیقی کا وہ رتبہ حاصل ہے جو ہمیں حاصل نہیں - اس قسم کے مختلف نظائر کے لئے رسالہ امام قشیری اور امام یافعی کی روض الریاحین کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے ؛

امام ابو تراب نخشبی علیہ الرحمتہ جو اہل طریقت کے ایک بڑے مقتدا تسلیم کئے ہیں - فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اللہ تعالےٰ سے منہ پھیر لیتا ہے تو اس کا پہلا نشان یہ ہے - کہ وہ اولیاء الرحمان کے حق میں زبان طعن دراز کیا کرتا ہے - اور میں نے اپنے شیخ ابو یحییٰ زکریا انصاری رحمتہ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سنا کہ جب کسی فقیہ کو اہل طریقت کے احوال اور انکی اصطلاحات کی خبر نہیں تو انہیں برہنہ پا سمجھو ؛

شیخ محمد مغربی شاذلی علیہ الرحمتہ فرمایا کرتے کہ کیا اہل طریقت کی پیروی کرو - اگرچہ ان کا وجود بہت قلیل ہے اور جو لوگ اہل طریقت نہیں ان سے بچتے رہو - اگرچہ وہ کثیر التعداد ہوں - اور اہل طریقت کی حقانیت پر موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ میں غور کرنا اس امر کی کافی دلیل ہے - کہ اہل طریقت کی تلاش کرنا طالب مولےٰ

کے لئے واجب ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کا خضر علیہ السلام سے یوں مستدعی ہونا هل اتبعك على ان تعلمنى مما علمت رشدا۔ مرآیا میں تیری پیروی کروں اس شرط پر کہ تو اپنے خداداد علم سے مجھے صلاح و تقویٰ کی تعلیم کرے کسی دنیوی غرض پر مبنی نہ تھا۔ سو جس طرح علم شریعت کا حاصل کرنا فرض ہے۔ اس طرح علم حقیقت کا حاصل کرنا بھی شیخ محی الدین ابن عربی نے ایک رسالہ امام فخرالدین رازی صاحب تفسیر کبیر کو ارسال کیا تھا۔ جس میں انہوں نے امام کے علم وفضل ظاہری کی پائیگاہ کو تسلیم کرکے انہیں بے خبر اور بے علم ثابت کیا۔ اس رسالہ کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

میرے بھائی خدا تمہیں توفیق دے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اہل حقیقت کے نزدیک انسان کامل العلم نہیں ہوتا جب تک کہ وہ منقولات و معقولات کی اصطلاح پرستی سے آگے نہ نکل جائے۔ کیونکہ جو شخص محض تقلیدی طور پر اپنے اساتذہ اور شیوخ کے علم تک محدود رہتا ہے وہ جزئیات کی چھان بین میں اپنی عزیز عمر کو کھو دیتا ہے اور مقصود اصلی سے برطرف پڑا رہتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جزئیات کی کوئی حد محدود نہیں۔ اور ایسا لہا ان کا اخذ کرنا محال ہے۔

عزیز من اگر تو کسی اہل اللہ کی مجلس میں بیٹھ کر حقیقت شریعت سے آگاہ ہو تو وہ تجھے بہت جلد شہود حق کے رتبہ تک پہونچا دیگا۔ جس سے تجھے بلا تکلف خدا تعالیٰ کی طرف سے علوم حقیقت عطا ہونے لگینگے۔ یہ یاد رکھ کہ استدلال سے جو علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کو ان علوم حقیقت کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے۔ کیونکہ نظر و فکر چند ایک عقلی ڈھکوسلوں کا نام ہے جسکا حاصل حقیقت فہمی میں بہت ہی کم تعلق رکھتا ہے۔ اور شیخ کامل ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ علمائے ظاہر کو جو جزئیات میں باہم نوک جھوک جاری رکھتے ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ تم

لوگ مردوں سے علم سیکھتے ہو۔ اور اہلِ حقیقت حی لایموت سے ✦

عزیز من۔ ضروری ہے کہ تو وہ علوم حاصل کرے جس سے تیری ذات کو کمال حقیقی حاصل ہو اور جو مرنے کے بعد بھی تیرے ساتھ ہو۔ اور یاد رکھ کہ علوم وہی ہیں جو بطور موہبت اور مشاہدہ اللہ تبارک و تعالےٰ کی طرف سے دئے جاتے ہیں۔ اِن علوم کے سوا جس قدر علوم ہیں انکی منفعت انسان کی زندگی تک محدود ہے۔ اس کے بعد وہ اِن علوم سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ سو عاقل آدمی کو واجب ہے کہ وہ انہیں علوم کے حصول کی کوشش کرے۔ جو اس عالم فانی کو چھوڑ جانے کے بعد بھی اسکی ذات کے ساتھ منتقل ہو سکیں اور ایسے علوم صرف دو ہیں معرفت ذات باری اور علم بامور آخرت سو تجھے واجب ہے کہ اس دُنیا میں انہیں ہر دو علم کی تحقیق میں سرگرم ہو تاکہ انکا ثمرہ تجھے عالم آخرت میں ملے۔ اور علوم دُنیویہ میں سے صرف انہیں علوم کو حاصل کر جس کے بغیر انسان کو کوئی چارہ نہیں اور جو سلوک طریق میں تجھے معاون ہو سکیں اور تجھے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے۔ کہ یہ علوم بدوں خلوت۔ ریاضت۔ مشاہدہ اور جذب الٰہی کے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے میرا خیال تھا کہ میں تجھے خلوت اور اس کے شروط اور بعض دیگر امور ضروریہ کی بابت تفصیلاً آگاہ کرتا۔ مگر مقتضائے وقت مجھے اس سے مانع ہے۔ اور مقتضائے وقت کے مانع ہونے سے میرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ لفظ پرستی کو شریعت سمجھ بیٹھے ہیں اور اس کے اسرار سے محض نابلد ہیں۔ اور جن کا شعار بجز جنگ و جدل اور حسد و تعصب کے اور کچھ نہیں۔ حتےٰ کہ وہ اہلِ حقیقت پر طعن و تشنیع کرنے کو اپنے لئے موجب فخر سمجھ کر ہر ایک صداقت کا انکار کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ میری باتوں کو نہیں سن سکینگے۔ انتہا۔ ترجمہ[1]۔

پھر فتوحات کے ایک باب میں لکھتے ہیں کہ اہلِ حقیقت کے علوم کا حصول

[1] دیکھو کتاب طبقات الاولیا (شعرانی)

ایمان و تقویٰ پر منحصر ہے۔ کیونکہ خداوند کریم فرماتا ہے ولو ان اھل القریٰ امنوا واتقوا لفتحنا علیہم برکات من السماء والارض یعنی اگر بستیوں والے لوگ ایمان لاتے اور اتقا اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ اس آیت میں خدا تعالےٰ نے زمینی اور آسمانی برکتوں کے نازل ہونے کے لئے ایمان اور تقویٰ کو شرط قرار دیا ہے۔ اور زمینی اور آسمانی برکتوں سے مراد علاوہ ان برکات کے جن کو اہل ظاہر سمجھ سکتے ہیں موجودات ارضی و سماوی کے اسرار و دقائق بھی ہیں۔ جیسے ایسے علوم حقیقیہ کا انکشاف جو علویات سفلیات اور عالم جبروت و ملکوت اور انوار ملک و ملکوت کے متعلق ہو سکتے ہیں۔ اور پھر فرمایا ویرزقہ من حیث لا یحتسب۔ اس آیت میں رزق سے رزق جسمانی اور رزق روحانی ہر دو مراد ہیں۔ پھر فرمایا وفی السماء رزقکم وما توعدون۔ اس میں ان اسرار و معارف کی طرف اشارہ ہے جو عارف کامل کو اس عالم میں حاصل ہوتے ہیں اور نیز ان نعم ابدی کی طرف جو عالم آخرت میں پیش آنیوالی ہیں۔

عزیز من تجھے لازم ہے کہ تو اس طائفہ گرامی کا انکار نہ کرے اور یہ نہ سمجھے کہ یہ لوگ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کے نصوص کو ظاہر سے پھیرتے ہیں۔ کیونکہ ظاہر شریعت کو اس کے مفہوم سے پھیرنا کفر ہے بلکہ بات یوں ہے کہ بموجب فرمان نبوی ان لکل آیۃ ظھراً و بطناً و حداً و مطلعاً الی سبعۃ البطن ظاہر سے مراد وہ احکام شرعیہ ہیں جنکی پابندی سے اعمال صالح بجا لائے جاتے ہیں اور باطن سے مراد وہ اسرار و معارف الٰہیہ ہیں جو کمال ایمان و تقویٰ پر مترتب ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی شور و شغب کرنے والا منکر تجھے جہل کی وجہ سے اہل حقیقت کی تصدیق سے روکنا چاہے تو اسکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ کیونکہ قرآن معارف و اسرار کا گنجینہ ان لفظ پرستوں سے مخفی رکھا گیا ہے۔ ان کے حصہ میں بجز اہل حق کے رد و تکذیب

اور بغض و عناد کے کچھ نہیں آیا۔ کیونکہ نصوص و آیات اور احادیث کو انکے مفہوم ظاہری سے پھیرنا اس وقت لازم آتا ہے جبکہ ظاہر کا انکار کردیا جائے اور یہ کہا جائے کہ ان سے مراد انکے معانی ظاہری نہیں (جیسا کہ بعض نیچریہ اور متصوفہ میں فرقہ باطنیہ خذلھم اللہ تعالیٰ کے لوگ قائل ہیں) بلکہ اہلِ حقیقت ظواہر کو اپنے رتبہ میں اسطرح تسلیم کرتے ہیں جس طرح تمام اہلِ اسلام کو انپر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ لوگ کوئی نئی شریعت نہیں بتلاتے۔ ہاں کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ میں سے خدا کے دئیے ہوئے نورِ فراست اور کشف و شہود حقیقی سے ان معارف و اسرار کو حاصل کرتے ہیں جن کے حاصل کرنے سے اہلِ جدل کوسوں دُور پڑے ہیں۔ یہ لوگ جب ان معارف و حقائق کو کسی اہلِ حقیقت کی زبان سے سن پاتے ہیں تو یہ نہیں کہ وہ اپنے قصورِ فطرت یا کم علمی کا اقرار کریں۔ بلکہ جھٹ یُوں کہنے لگتے ہیں کہ سلف میں سے تو کسی نے یہ بات نہ کہی تھی سوا ایسے اعتقاد کے لوگ مشائخ عظام کے فیضان باطن سے ہرگز مستفید نہیں ہو سکتے۔ انتہیٰ

وجہ انکار منکرین کے مختلف اقسام ہیں۔ بعض لوگ تو بوجہ قصورِ فہم کے انکار کردیا کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن و احادیث سے ان معارف و حقائق کو جنکا اہلِ حقیقت افادہ کیا کرتے ہیں وہ لوگ خود تو اخذ کر نہیں سکتے اور اہلِ حقیقت کے حق میں انہیں پورا پورا سوءِ ظن ہوتا ہے اس لئے بجز تکذیب کے کوئی چارہ نہیں دیکھتے اور بعض کو دنیوی اغراض مدِ نظر ہوتے ہیں۔ اسلئے وہ حسد و تعصب سے کبھی خالی نہیں رہ سکتے اور بعض غرور و تکبّر سے انہیں اپنی خاطر میں نہیں لاتے اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہم جیسے ہی آدمی ہیں۔ اور ضروریات بشریت میں مبتلا ہیں۔ انہیں یہ رُتبہ کیسے مِل گیا۔ علیٰ ہذا اور بھی کئی ایک وجوہ انکار ہیں اور مذکورہ بالا وجوہ کوئی نئے وجوہ نہیں بلکہ اِن لوگوں کو انبیاء علیہم السلام

سے وراثتاً ملے ہیں۔ کیونکہ درحقیقت ورثۃ الانبیاء یہی لوگ ہیں۔ منکرین قسم اوّل کے متعلق قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوا! کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہٖ اور منکرین قسم ثانی کے متعلق یوں فرمایا حسدًا من عند انفسہم اور منکرین قسم ثالث کی نسبت یوں ارشاد ہوا ما لھٰذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق۔

شیخ ابوالحسن شاذلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ حقیقت کو منکرین اہلِ جدال کے ساتھ امتحان کرنا چاہا ہے۔ سو تم بہت کم لوگوں کو دیکھو گے کہ کسی خاص ولی اللہ کی تصدیق کرتے ہوں بلکہ اہل اللہ کے صفات و حالات سُن کر وہ زبانی یوں کہدینگے کہ ہاں اللہ کے مقبول بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ کہاں مل سکتے ہیں۔ مگر جب انکے سامنے کسی ولی اللہ کا ذکر کیا جائے کہ وہ مطاعن کو اسکے برخلاف انکار پر حجت گردان لیتے ہیں اور اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ ایک ولی اللہ اور اُس کے کمال باطنی کا موازنہ کرنے کے لئے چشم بصیرت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ شیخ ابن تیمیہ[1] نے ہمارے زمانہ میں اس امر کی نسبت بہت کچھ تجاوز کیا ہے اور بعض نے ان حقائق کا بھی انکار کر دیا ہے جنکی صلابت بیخ کوہ سے بھی زیادہ مضبوط ہے مگر اس نے بزعم خود انہیں مخالف شریعت قرار دیا ہے سو ایسے اشخاص سے جن کا شعار مطاعن پر مبنی ہو اور انکار کے سوا انکی زبان سے کچھ نہ سُنا جائے ایسے بھاگو جیسے کسی درندے سے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام ابتداء میں عوام کی طرف سے اذیت اور مطاعن برداشت کیا کرتے ہیں۔ تاکہ وصف صبر سے متصف ہوں۔ اولیاء اصفیاء کو بھی یہ مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے اور بالآخر انہیں غلبہ ہوا کرتا ہے کما قال اللہ تعالیٰ کتب اللہ لاغلبنّ انا ورسلی کیونکہ وصف شکر

[1] شیخ ابن تیمیہ کے بعض رسائل سے واضح ہوتا ہے کہ وہ حقیقت تصوف کے قائل ہیں۔ چنانچہ سید الطائفہ جنید اور شیخ شبلی کو جا بجا بطور حجت پیش کرتے ہیں ہاں اسمیں شک نہیں کہ انکے کلام میں اکثر متصوفہ کی نسبت نہایت سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جیسے ابن جوزی کے کلام میں جو شیخ ابن تیمیہ سے انکار میں آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں ۱۲ منہ

سے موصوف ہونا بھی ویسا ہی ضروری ہے جیسا وصف صبر سے ولقد کذبت رسل من قبلک فصبروا علیٰ ما کذبوا واوذوا حتیٰ اتاھم نصرنا۔

خاکسار کا خیال ہے کہ ہمعصریت بھی ایک بھاری وجہ انکار کی ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ لوگ اپنے ہمعصر اہل کمال کی خواہ وہ کسی علم یا فن یا کمال باطنی سے موصوف ہو بہت کم تصدیق کیا کرتے ہیں بلکہ عموماً انہیں معمولی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور ان کو انواع و اقسام کے مطاعن سے مطعون کیا جاتا ہے۔ برخلاف گذشتہ زمانے کے اہل کمال کے جنہیں عام طور پر صاحب کمال تسلیم کر کے انکے کارنامے سنداً پیش ہوا کرتے ہیں۔ اور جس قدر ان کا زمانہ بعید ہوتا جاتا ہے اسیقدر ان کی صداقت کو زیادہ فروغ حاصل ہوتا جاتا ہے ورنہ کئی ایک زمانہ سلف کے اہل کمال جنہیں لوگ اب تسلیم کر چکے ہیں۔ اگر ہمارے زمانہ میں موجود ہوتے تو وہی لوگ جو انکے کارناموں کو حجت سمجھتے ہیں اسی طرح انکی مخالفت کرتے۔ جس طرح ان سلف کے ہمعصر لوگ انکی مخالفت کیا کرتے تھے۔ مگر حقیقت بین لوگ (جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے) بات کی حقیقت کو سمجھ لیا کرتے ہیں اور فی الفور انکار پر نہیں اتر پڑتے۔ یہ سچ ہے کہ بعض اکابر اہل علم نے بخیال خود کسی نہ کسی حجت شرعی پر انکار کیا ہے۔ مگر گفتگو یہ ہے کہ اس حجت پر ہم کہاں تک وثوق کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اختلاف در بارہ ایسے امور کے جو محض مقام ولایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً کشف و شہود و الہام وغیرہ نہ تو محدثین کا کام ہے نہ فقہا کا اور نہ متکلمین کا۔ یہ لوگ بجز معتقدات اور احکام جائز و ناجائز کے اور کیا بتلا سکتے ہیں۔ انہیں مقامات سلوک کی کیا خبر۔ بھلا ذرا شمار کر کے تو بتلاؤ کہ کس قدر محدثین اور کس قدر مجتہدین صاحب مکاشفہ اور الہام گذرے ہیں۔ اور کسقدر ایسے ہیں جنکے ہاتھ پر خوارق عادات صادر ہوئے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ لوگ کتاب و سنت کے مسائل کی تشریح میں عمر گذار دیتے ہیں اور لوگوں کو احکام شریعت کے

متعلق امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہتے ہیں - اور اس خدمت کے عوض وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر عظیم کے مستحق ہیں مگر مقامات عالیہ سلوک کی خبر دینا نتیجہ ہے مجاہدت و ریاضت اور زہد و تقویٰ اور مشاغل ذکر کا اگر فقہاء و محدثین مقامات سلوک کا صرف علم رکھتے ہیں تو اہل اللہ کو ان مقامات پر گذر ہوتا ہے - اور اگر انہیں سماع حاصل ہے تو انہیں رؤیت - اور شنید و دید میں زمین و آسمان کا فرق ہے - سو منکرین کا محض انکار کر دینا اس سلسلہ عالیہ کی تکذیب نہیں کر سکتا - اور اگر یہ ضروری ہوتا تو لازم تھا کہ جناب پیغمبر علیہ السلام کی تکذیب کوئی شخص نہ کرتا مگر یہ حکمت الہٰیہ کا مقتضا ہے کہ اس بزرگ گروہ کے فیضان سے کچھ تو مستفید ہوتے ہیں اور اکثر محروم ؛

برخلاف اس کے ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ تصوّف حقیقی کا متقشی بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے - کیونکہ اکثر نام فروش لوگ کتاب و سنّت کی پیروی کو چھوڑ کر بعض ایسے امور پر زور دینے لگ گئے ہیں جو یا تو سراسر مخالف شریعت حقہ ہیں یا کم از کم مختلف فیہ مگر چونکہ عوام الناس ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے ان کے ذہن میں یہ بات خوب جم گئی ہے کہ کتاب اللہ اور سنّت صحیحہ تو صرف علمائے دین کا کام ہے - سلوک طریقت ایک علیحدہ امر ہے - حالانکہ یہ سراسر ضلالت ہے کیونکہ جو شخص شریعت کے کسی منصوص حکم کی مخالفت کرتا ہے اس کو اہل طریقت کے ساتھ کچھ تعلق نہیں - قرون اولیٰ کے صوفیہ کرام کا دستور تھا کہ وہ کسی شخص کو اپنے حلقہ بیعت میں نہیں لیتے تھے - جب تک کہ اس کو احکام شریعت کے ضروری مدارج کا علم نہ ہوتا اور انکی مجالس میں بجز کتاب اللہ اور سنّت کے کسی امر کا ذکر نہ ہوتا اور اسرار و معارف کے بیان کرنے کے لئے علیحدہ مجالس ہوتیں - وجہ اسکی یہ تھی کہ قاصر الفہم لوگ بد اعتقاد ہو کر انہیں متہم کرنے لگ جاتے - اور یہ طریق بعینہٖ طریق نبوی تھا کیونکہ بمقتضائے کلموا الناس علےٰ قدر عقولہم عام صحابہ

کی مجلس میں سب کو یکساں تعلیم ہوتی - اور جب صدیق اکبر یا حضرت علی یا دیگر اکابرین سے کوئی علیحدہ ہوتا - تو خاص خاص اسرار و معارف کا اعادہ کیا جاتا - کون کہتا ہے کہ تمام صحابہ حضور علیہ السلام کے فیضان سے یکساں مستفیض تھے اور بعض صحابہؓ اور آئمہ[1] اہلبیت رضوان اللہ علیہم سے منقول ہے - کہ سرچشمہ نبوت سے ہم نے بعض ایسے علوم کا بھی استفادہ کیا ہے - کہ اگر ہم تم پر ظاہر کردیں تو تم ہمیں یقیناً کافر کہنے لگو - مگر نہایت حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اکثر مجالس صوفیہ میں بعض ایسے مسائل کا ذکر بھی ہوتا ہے جس کو میرے خیال میں ایسے موقعہ پر بیان کرنا مناسب ہے - یا ایسی باتوں پر زور دیا جاتا ہے - جن کو کسی نہ کسی پہلو میں بدعت کہا جا سکتا ہے - یا اگر بدعت نہ بھی ہوں تو بہرصورت کتاب اللہ اور سنت سے ان کا رتبہ کبھی مقدم نہیں ہو سکتا - اور اگر کسی کو کہا جائے کہ کتاب اللہ اور سنت کی نسبت بڑھ کر ان باتوں کا ثبوت دینا تو مجلس نبوی اور ما بعد کی جماعت بزرگان دین کے برخلاف ہے تو نہایت دبی زبان سے اقرار تو کر لیتے ہیں مگر عملاً اس کے برخلاف کیا جاتا ہے میرے خیال میں یہی چند ایک باتیں ایسی ہیں جن سے اِس سلسلہ تصوف کی اصلی حقیقت کے انکار کی نوبت آگئی ہے - سماع تصور شیخ مسئلہ علم غیب غوث خوانی - طواف قبور وغیرہ ذالک کی نسبت میں اس وقت دربارہ جواز و عدم جواز گفتگو نہیں کرتا - مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ متاخرین میں انکار تصوف کے یہی چند ایک وجوہ ہوئے ہیں اور تعجب یہ ہے کہ یہ مسائل حقیقت تصوف میں بھی داخل نہیں بلکہ زائد ہیں - اور خود بعض اکابر اہل سلسلہ کا انکی مخالفت کرنا کافی حجت ہے - مگر آجکل تصوف کے مفہوم میں بالخصوص انہیں امور کو شامل سمجھا گیا ہے - اور اگر قرآن و حدیث کا ذکر آئے تو علمائے شریعت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل تصوف کو

[1] حضرت ابوہریرہ اور حضرت امام زین العابدین رضی کی طرف اشارہ ہے بخوف طوالت عربی عبارات نقل نہیں کی گئیں مرتب

قرآن و حدیث سے کچھ تعلق نہیں۔ حالانکہ تصوف کی بنا صرف حضور علیہ السلام کی تعلیم پر مبنی ہے۔ منکرین نے اکثر ایسی ایسی مثالوں کو دیکھ کر عام طور پر اس سلسلۂ عالیہ کی حقیقت سے انکار کر دیا۔ بلکہ تکفیر و تفسیق تک نوبت پہنچا دی۔ مگر سچ پوچھو تو جانبین میں افراط و تفریط کی نسبت ہے۔ کل حزب بما لدیہم فرحون ؛

مکتوبات حضرت مجدد قدس سرہٗ میں متعدد مقامات میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ صوفیائے زمان کو مجالس عامہ میں بجز کتاب و سنت کے اور کچھ بیان نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارا زمانہ زمان نبوی سے بہت دور ہو گیا ہے اور خیر و برکات کم ہو گئے ہیں۔ اس لئے محدثات سے خواہ وہ حسنہ ہوں یا سیئہ کلی اجتناب لازم ہے۔ لوگ روز بروز سنت کو ترک کرتے جاتے ہیں اور محدثات کی طرف زیادہ متوجہ پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کی نسبت مجالس صوفیہ سے لوگ بہت کم استفادہ کرنے لگے ہیں ؛

طریق تصوف کی ضرورت

بعض اشخاص کا خیال ہے کہ صرف اوامر و نواہی شریعت کا پابند ہونا تصفیہ و تزکیہ نفس کے لئے کافی ہے اور کسی شیخ کامل کی بیعت میں آنا ضروری نہیں۔ مگر خاکسار کے نزدیک حق یہ ہے کہ بیشک قرآن و سنت کی پابندی سے انسان اعلےٰ سے اعلےٰ ترقی کر سکتا ہے۔ اور جس نے کچھ لیا ہے انہیں کی پابندی سے لیا ہے۔ مگر گفتگو یہ ہے کہ مقامات عالیہ مثلاً اخلاص۔ زہد۔ اتقا۔ ورع۔ توکل۔ صبر۔ رضا۔ تسلیم وغیر ذلک کی حقیقت سے نہ تو تفسیر و حدیث کے پڑھ لینے سے حاصل ہوتی ہے اور نہ رسمی طور پر اوامر و نواہی کی پابندی سے دور کیوں جاتے ہو۔ جن علمائے شریعت نے کسی شیخ کامل کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا اور ذکر و مجاہدت و ریاضت کے منازل طے نہیں کئے انہیں مذکورہ بالا مقامات میں امتحان کر کے دیکھ لو صاف معلوم ہو جائیگا کہ وہ آیات و احادیث

میں تو بال کی کھال اُتار کر دکھا دینگے۔ مگر روحانیت سے انہیں کچھ بھی بہرہ حاصل نہیں ہوتا۔ غرور۔ نخوت۔ ریا۔ عجب۔ حرص۔ شہوت۔ غضب۔ طلب جاہ وغیرہ مہلکہ امراض میں اسی طرح مبتلا ہوتے ہیں جس طرح دیگر اہل دُنیا۔ اس امر واقعہ کا انکار کرنا محض مکابرہ اور ہٹ دھرمی ہے۔ کیونکہ درحقیقت یوں ہی ہے۔ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ہر ایک شخص جو نام نہاد کسی شیخ وقت سے بیعت کرے وہ مذکورہ بالا مقامات کو یونہی طے کر لیتا ہے بلکہ ہزاروں بیعت کنندگاں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بجا رے مقامات تو بجائے خود ظواہر شریعت کی پابندی سے بھی گئے گذرے ہوتے ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ شیخ کامل سے صرف وہی شخص فیض حاصل کرتا ہے جو تمام آواب سلوک کا عملاً پابند ہو اور مجاہدت وریاضت میں اپنی عمر کا ایک حصہ صرف کرے ورنہ صرف ظاہر احکام شریعت کی پابندی جس کا اثر باطن پر کچھ نہ ہو محض رسم وعادت ہے جس کی اہلِ حقیقت کے سامنے کچھ قدر ومنزلت نہیں۔ شیخ عزالدین محدث رحمۃ اللہ علیہ جو مشاہیر علماء دین سے ہیں قبل از مصاحبت مشائخ کرام نہایت اصرار اور تعصب کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ یہ کیا بدعات پھیلانے والا فرقہ ہے۔ بھلا کتاب وسنّت[1] کی پیروی کے علاوہ کوئی اور بھی طریق ہو سکتا ہے۔ مگر جب ایک موقعہ پر ومیاط (مصر) میں بڑے بڑے محدثین اور فقہا مثلاً شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور شیخ مکین الدین محدث وغیرہ کی مجلس میں آپ کو حاضر ہونے کا موقعہ ملا تو امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ تصوف کی بعض عبارات میں گفتگو پیش آگئی۔ اتنے میں شیخ ابوالحسن شاذلی علیہ الرحمۃ تشریف لے آئے۔ چونکہ آپ مشائخ وقت میں سے تھے سب نے استدعا کی کہ آپ اسکے متعلق کچھ فرمائیے۔ آپ نے جواب دیا کہ اس قدر ماہرین کتاب وسنّت کے ہوتے ہوئے

---

[1] ان کی استدلالی غلطی یہ تھی کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ اس فرقہ کے پاس بھی بجز کتاب وسنت کے اور کچھ نہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ احکام کا مقتضا باطن میں پیدا کرتے ہیں اور دیگر لوگ محض رسم وعادت کی عبادت بجا لاتے ہیں اور ہر دو میں بڑا فرق ہے یہ وہ فرقہ ہے جبکا ایک دم بھی اللہ کے ذکر کے بغیر نہیں گذرتا اور دیگر لوگ باوجود پابندی صوم وصلوٰۃ کے غافل پڑے رہتے ہیں ۱۲ منہ

میرے بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر بار بار کے اصرار پر آپ نے ان مقامات کی ایسی تشریح کی کہ شیخ عزالدین بلااختیار پکار اُٹھے کہ سنو سنو یہ وہ کلام ہے جو ابھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نازل ہوا ہے اور یہ وہ کلام ہے جس سے حقائیت کے انوار چمکتے نظر آتے ہیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ نے غنیہ میں اس مسئلہ پر خوب بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ شروع سے اللہ تبارک و تعالےٰ نے روحانی تربیت کا سلسلہ یوں قائم کیا ہے کہ ایک فیض دیتا ہے دوسرا فیض حاصل کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے جانشین حواری یا صحابہ ہوا اور انکے بعد ان کے تربیت یافتہ علےٰ ہذا القیاس یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہیگا اور یہ امر نہایت ہی شاذ و نادر ہے کہ خداوند تعالےٰ کسی کو بلا کسی غیر کی تربیت کے مقامات عالیہ تک ترقی دے۔ مثلاً حضرت ابراہیم خلیل اللہ یا حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ۔ سو ہم ہرگز انکار نہیں کرتے کہ کوئی شخص بلاتربیت شیخ مقامات عالیہ تک ترقی کر سکتا ہے۔ کیونکہ اسپر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم شیخ کامل کی ضرورت جمیع افراد انسان کی حالت کو مدنظر رکھ کر ثابت کرتے ہیں۔ کیونکہ اغلب و اکثر یہی ہے کہ بدوں تربیت شیخ کوئی شخص مدارج سلوک پر ترقی نہیں کر سکتا فلا ینبغی لہ ان ینقطع عن الشیخ حتی یستغنی عنہ بالوصول الی ربہ عزّ و جل یعنی شیخ کی صحبت سے اسوقت تک علیحدہ نہیں ہونا چاہئے کہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ انتہیٰ ؎

اس مضمون کے متعلق صاحب جامع الاصول نے بھی ایک بحث لکھی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قدیم سے رسم چلی آتی ہے۔ اور تجربہ بھی اس امر پر شاہد ہے کہ اندرونی نجاستوں اور غلاظتوں سے پاک و صاف ہونا اور نماز کو حضور قلب اور خشوع سے ادا کرنا جس کو حدیث نبوی میں لفظ احسان[1] سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بجز تربیت

[1] ان تعبدا للہ کانک تراہ کی طرف اشارہ ہے ۱۲ منہ

شیخ کامل کے ممکن نہیں۔ کیونکہ شیخ ہی اندرونی امراض کا واقف اور انکے طریق معالجہ کی مہارت رکھتاہے یہ بات صرف امراض کے علم حاصل کر لینے اور تودہ در تودہ کتابوں کے مطالعہ کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ نفس کی نہایت باریک رہزنیوں اور خفیف وخفی آثار سے بڑے بڑے فقہ وحدیث کے علماء بھی محفوظ نہیں اور انسان کا اپنا تجربہ اس میں کافی دلیل ہے بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ۔ امام شعرانی نے انوار قدسیہ میں شیخ کامل کے وجوب اتباع کو ثابت کیا ہے۔ اور لکھتے ہیں کہ ازالہ نجاسات واجب ہے اس لئے اس طریق کا حاصل کرنا بھی واجب ہوگا جس سے ازالہ ہو سکے اور وہ بجز اتباع شیخ کامل کے کوئی طریق نہیں۔ پھر لکھتے ہیں ولو تکلف لا ینفعہ بغیر شیخ ولو حفظ الف کتاب یعنی اگر خود بخود اپنی اصلاح کرنے لگے تو اسے کچھ مفید نہیں ہوگا۔ اگرچہ ہزاروں کتابیں حفظ کرے۔ سوائے عزیز تجھے لازم ہے کہ تو کسی شیخ کامل کی تلاش کرے اور سرکشی نہ کرے اور امر آخرت میں غور سے کام لے اور اس خیال سے بچتا رہے کہ صوفیا کا طریق کتاب اللہ اور سنت کے برخلاف ہے۔ کیونکہ یہ کفر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طائفہ عالیہ کا طریق عین اخلاق محمدیہ اور سیرت احمدیہ اور سنن الٰہیہ ہے۔ غور کرو کہ امام احمد بن حنبل اور شیخ عزالدین جیسے بڑے بڑے جلیل القدر محدثین کس طرح آخر کار انکار کے بعد صوفیائے کرام کے فیضان باطنی سے مستفیض ہونے پر مجبور ہو گئے۔ امام احمد شروع شروع میں اپنے بیٹے کو بڑے زور سے یوں نصیحت کیا کرتے تھے کہ بیٹا دیکھنا کہیں ان لوگوں کی صحبت میں جنہیں صوفیا کہتے ہیں نہ بیٹھنا کیونکہ یہ لوگ شریعت کے احکام سے بے خبر ہوتے ہیں سو تم علم حدیث کے سوا کسی کام میں نہ لگنا مگر امام صاحب جب حضرت ابو حمزہ بغدادی علیہ الرحمۃ کی مجلس میں بیٹھنے لگے اور آپ کی آنکھیں کھلیں اور دقائق شریعت آپ سے حل کرانے لگے تو بیٹے کو یوں کہا کرتے کہ بیٹا دیکھنا کہیں ان لوگوں پر جنہیں

صوفیا کہتے ہیں سوءِ ظن نہ کرنا اور کبھی انکی مصاحبت سے غافل نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ ان اسرار و معارف کے خزانوں پر دسترس رکھتے ہیں جن سے ہم لوگ بے بہرہ ہیں۔ یہ لوگ حقیقی علوم اور خشیت اور زہد و اخلاص کے مالک ہیں جنہیں علماء فقہ و حدیث اپنے سینکڑوں دفاتر سے بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح شیخ عزالدین کو سخت انکار کے بعد جب شیخ ابوالحسن شاذلی علیہ الرحمۃ کے فیضانِ صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا تو یہ کہا کرتے تھے کہ صوفیائے کرام کی حقانیت پر یہی کافی دلیل ہے کہ یہ لوگ اہلِ حقیقت ہیں اور دوسرے لوگ صرف رسم و عادت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ اُن حقائق و معارف اور خرقِ عادات کے مالک ہوتے ہیں جو دوسروں کو شتر بار کتابوں کے پڑھنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے +

امام شافعی جیسے مجتہد کا یہ قول ہے کہ یحتاج الفقیہ[1] الیٰ معرفۃ اصطلاح الصّوفیۃ لیفیدوہ من العلم مالم یکن عندہ۔ یعنی فقیہ کو صوفیاءِ کرام کی اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے تاکہ وہ اسے ان علوم کا افادہ کر سکیں جنکو وہ نہیں جانتا۔ اس موقع پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر طریقِ صوفیا ضروری ہوتا تو کیا وجہ ہے کہ جماعت صحابہ اور تابعین اور آئمہ مجتہدین نے جس طرح تمام احکام شرعیہ کی تفصیل و توضیح کی ہے طریقہ صوفیہ پر بھی بحث نہ کرتے اور امراض قلبی کے اسباب اور تشخیص اور طریق معالجہ کی کیفیت نہ بتلاتے سو اس کا جواب یہ ہے کہ ان بزرگواروں کا زمانہ خیر القرون تھا اور اس قسم کی بداعتدالیوں کا نہایت ہی خفیف اثر تھا۔ عام مسلمان کتاب و سُنّت کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے اور طریق سُنّت سے ایک قدم بھی ادھر اُدھر نہ ہوتے تھے۔ مگر جب بعد میں فلسفیت کا رنگ طبائع پر چڑھنے لگا اور لوگوں کے دلوں میں انوار سنّت نبوی کی چمک کم ہونے لگی تو علمائے ربانی نے اُس طرف بھی توجّہ کی اور امراض اندرونی کے دُور کرنے اور نفوس کو نجاسات سے پاک و صاف بنانے

[1] فقیہ سے مراد نکاح اور طلاق کے مسائل جاننے والا شخص نہیں بلکہ ایسا شخص مراد ہے جو کتاب و سنت مع اسقدر ثابت قدم ہو کہ اسکا ظاہر و باطن ہے

کے لئے شغل وذکر وغیرہ لوازم تصفیہ وتزکیہ کے متعلق حسب ہدایات کتاب وسنت سے اجتہاد کرنا شروع کیا مع ہذا وہ لوگ جو کتاب وسنت میں قرون اولیٰ جیسے آئمہ کا علم و عمل رکھتے ہوں اُنہیں اگر مشائخ کی ضرورت داعی نہ بھی ہو تو کونسی تعجب کی بات ہے کیونکہ وہ اتباع کامل سے ظاہر وباطن میں بالکل عین شریعت حقہ کا نمونہ ہوتے ہیں اور یہی صوفی کے معنی ہیں۔ ہمارے اس جواب کو امام قشیری نے اپنے رسالہ میں یوں بیان کیا ہے اوّل ما حدث ظہور الامراض الباطنۃ اواخر المائۃ لقولہ علیہ السلام خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم فمن شہد لہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالخیریۃ فقد جاز رتبۃ الکمال کلہ۔ یعنی امراض باطنیہ کے ظہور کا زمانہ تیسری جماعت کا آخری دور ہے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ بہترین اُمت میرے زمانہ کے لوگ ہیں پھر جو انکے بعد ہونگے اور پھر جو انکے بعد آئینگے سو جن لوگوں کے بارے میں جناب پیغمبر علیہ السلام نے بہتری کی شہادت دیدی وہ واقعی جمیع کمالات کے جامع ہونگے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات عقلاً بھی بالکل صحیح اور قابل تسلیم ہے۔ کیونکہ جس طرح آفتاب کے غروب ہو جانے پر تھوڑی دیر کے لئے روشنی کا اثر بدستور قائم رہتا ہے اور آہستہ آہستہ تاریکی چھا جاتی ہے اسی طرح حضور علیہ السلام کے دُنیا سے رخصت ہو جانے پر آپ کے انوار نبوت کا انعکاس صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے قلوب مقدسہ میں برابر جلوہ گر رہا۔ حتیٰ کہ آہستہ آہستہ بدعات اور ترک سنت نبویہ نے زور پکڑا اور ایک عام ظلمت سی چھا گئی ایسے نازک موقع پر الٰہی غیرت اس امر کی مقتضی تھی کہ ایسے مقدس نفوس کو ان خرابیوں کے تدارک کے لئے مختلف ممالک اور مختلف زبانوں میں مبعوث فرماتا تاکہ حضور علیہ السلام کی حقیقی تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رہے پس کوئی شخص جو رسم وعادت کے اسلام کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف آنا چاہتا ہو اور فروعی مسائل میں نامناسب

مکابرہ و مجادلہ سے گذر کر گرد و غبار تعصب سے بالکل پاک و صاف ہوگیا ہو اور سوئے ظن سے جو محض منکرین کے شنیدہ الفاظ سے اس کے دل میں جاگزین ہو چکا ہو بکلی محفوظ ہو ایک آن کے لئے بھی شیخ کامل کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا۔ دیکھو متاخرین میں حافظ ابن حجرؒ[1] کس پایہ کے محدث ہیں اور کس زور کے ساتھ مذکورہ بالا خیال کی تصدیق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طالب خدا کو چاہئے کہ کسی شیخ کامل کو اپنا راہبر مقرر کرے اور منکرین اہل تعصب کی باتوں کو ہرگز نہ سُنے۔ اور یہ خیال رکھے کہ شیخ عارف کامل ہو۔ اور احکام شریعت اور حقیقت میں ماہر۔ اور چاہئے کہ رسم و عادت سے اسلام سے برطرف ہو جائے اور اپنے شیخ کے حکم پر چلے۔ جب کسی شخص کو ایسا راہبر کامل مل جائے تو اسپر حرام ہے کہ اسے چھوڑ جائے اور ہمارے اس دعویٰ پر نہ صرف کتاب اللہ اور سنت نبویہ اور اجماع اُمت اور قیاس صحیح چاروں شہادت دے چکے ہیں۔ بلکہ چاروں آسمانی کتابیں اس دعویٰ کی مثبت ہیں ؛

مضمون چونکہ زیادہ لمبا ہوگیا ہے اسلئے اس کو یہیں چھوڑتے ہیں۔ گو ہم یقین کرتے ہیں کہ متعصبین ہمارے اس مضمون سے بہت کم متاثر ہونگے مگر ممکن ہے کہ کسی صاحب سعادت کو اپنے غلط خیال کی اصلاح کا موقع ملجائے اور مجھے بھی سعادت نصیب ہو ورنہ ؎

بہ مقبولی کسے را دسترس نیست
قبولِ مقبلاں در دستِ کس نیست

اللّٰھم اھدنا الصّراط المستقیم ؛

---

[1] فتح الباری شرح صحیح بخاری کے مؤلف انکی اور بھی کئی ایک کتابیں فن حدیث میں مشہور ہیں ۱۲ منہ

شریعت وطریقت

تصوف درحقیقت نام ہے تعمیر الظاہر والباطن کا جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک صحیح الایمان اپنے آقا حق تعالیٰ کی یاد سے اپنے جسم اور قلب کو آباد رکھے - اور ظاہر ہے کہ کسی تعمیر مکان کی اندرونی و بیرونی زیبائش وہی معتبر ہے جو اس کے مالک کی منشا اور مرضی کے موافق ہو کسی معمار یا مزدور کو اس کا حق ہرگز حاصل نہیں کہ تراش وخراش کرے اور مالک کی رائے میں دخل انداز ہو اور اسی طرح انسان کا جسم اور قلب جو مکان کا بیرونی اور اندرونی حصہ ہے سچے مالک وخالق حق تعالےٰ جلشانہٗ کی طرف سے اسی لئے عطا ہوا ہے - کہ معمار و مزدور بنکر اس کو مالک کی منشا کے موافق سجائیں اور آقا کی مرضی کے مطابق اس کی ایسی زیبائش کریں جسکو دیکھکر مالک خوش ہو جائے - مالک کا خوش ہو جانا ہی لاکھ انعاموں کا ایک انعام ہے چہ جائیکہ اسپر دائمی لذت اور پائدار جنت کے ساتھ شرف دیدار کا وعدہ بھی دیا گیا ہے یہ ہے اصل حقیقت سلوک کی جس کو حق تعالےٰ نے اس آیۂ مقدسہ میں ارشاد فرمایا ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون - (میں نے جن وانس کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ میرے غلام بنے رہیں) یعنی اپنی رائے کا دخل دئے بغیر غلامانہ آداب کے ساتھ جسم کی ظاہری اور قلب کی باطنی آرائش میں مشغول رہیں اور آقا کے حکم کی تعمیل کئے جائیں ؎

عاشقی چیست بجاں بندۂ جاناں بودن

دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن

اور چونکہ ظاہری و باطنی زیبائش کا سجا سجایا ایک مکان مالک نے اصل یا نقشہ دکھاکر

آپ کے سامنے کر دیا ہے اسلئے غلامانہ حیثیت سے معمار بنک یعنے جدید مکان کی اندرونی و بیرونی آرائش کے کسی چھوٹے سے جزو میں بھی آپ کو رائے زنی کا حق حاصل نہیں ہے اور اگر کوئی خود رائے اپنے آقا کی تجویز میں کوئی تغیر یا ترمیم کرے تو مالک کا مجرم اور آقا کا نافرمان بنے گا اور اسپر مکان کی ہیئت بگاڑنے کا الزام قائم ہو گا اور قانون خداوندی کی اس دفعہ کا ملزم قرار پائیگا جو مالک کی ساری لاگت برباد کرنے والے دخل در معقولات دینے والے معمار پر قائم ہؤا کرتی ہے ؛

یہی ہے اصل گُر اور سچا رمز بدعات سے بہ تشدد منع کئے جانے اور اتباع سنت نبویہ کے بتاکید شدید مامور ہونے کا جس کو ادنےٰ عاقل بھی ذرا سی توجہ سے سمجھ سکتا ہے اور جس کو شیخ شیراز رحمۃ اللہ علیہ نے ذیل کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے ؎

محال است سعدی کہ راہِ صفا ۔ تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید ۔ کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

خلاصہ یہ ہؤا کہ اعضاء کے جملہ حرکات و سکنات اور قلب کے تمام جذبات و خیالات غرض سارے قوائے بشریہ ظاہریہ و باطنیہ کو مثل نمونہ خداوندی یعنی ذات سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے حالات و معمولات کا ایسا تابع بنا لینا کہ عبادات و عادات اور معاملات و معاشرت غرض ہر امر میں جہاں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ برتا ہے اُس کو اختیار کرنا انسان کا اقتضائے طبعی بن جائے سلوک اور طریقت کہلاتا ہے اور چونکہ خلاصۂ عالم و عالمیاں سپہ سالار لشکر انس و جاں سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا تمدن اور حالاتِ زندگی کا مجموعہ سنت کہلاتا ہے اِس لئے ایسی اطاعت جس کا اوپر ذکر ہؤا ہے آپ کی سنت کا اتباع کامل اور اقتداء علم تام کہلاتی ہے ۔ اور اسی پر ثمرۂ محبت اس کے بعد محبوبیت و پروانہ مغفرت موعودت جس کی خبر اِس آیہ شریفہ میں دی ہوئی ہے قل ان کنتم تحبون اللہ

فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم ؛

سنّت نبویہ اور شریعت مصطفویہ کے کمال اتباع کی تعلیم جگہ جگہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ اور کھلے الفاظ میں نہایت صاف حکم ہے اس کو نجات و مغفرت اور ولایت و قرب خداوندی کا موقوف علیہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں تاویل کرنے کی بھی کسی بندہ مسلمان کو گنجائش نہیں۔ یہی اتباع کامل جب تک نفس پہ جبر و تکلف کرنے سے ہوتا ہے۔ شریعت کہلاتا ہے۔ اور عمل کرنے والے کو مطیع و زاہد کہتے ہیں اور جس وقت اس اطاعت کا مقتضیٰ عادت بنکر طبیعت ثانیہ ہو جاتا ہے طریقت کہلاتا ہے۔ اور عمل کرنے والے کو صوفی اور صاحب دل کہنے لگتے ہیں ؛

اس میں شک نہیں کہ نجات اخروی کا مدار اتباع سنّت نبویہ پر ہے۔ گو تکلف اور نفس پر جبر کرنے سے حاصل ہو اسی لئے تصوّف کی تحصیل پر فرضیت کا حکم کسی نے نہیں لگایا۔ بلکہ سب مستحب ہی بتاتے رہے۔ مگر پہلی حالت محل خطر ضرور ہے۔ کیونکہ جب تک نفس جیسا دشمن ہلاک نہ ہو اور اتّباع سنّت نبویہ میں جو عین اطاعت حق سبحانہ ہے قلب کو لذت نہ آنے لگے اُس وقت تک نفس و شیطان کی رخنہ اندازی سے امن حاصل نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ کوئی آزاد منش اتباع و اطاعت کے بوجھ سے گھبرا کر اسکو چھوڑ بیٹھے اور حرج عظیم میں واقع ہو کر مورد عذاب خداوندی ہو۔ اس لئے نفس کا مسلمہ بنانا اور اتّباع شریعت میں وہ مرتبہ حاصل کرنا جسکے سبب اطاعت خدا اور رسول اول عادت بنے اور پھر محبوب اور لذیذ شے کی طرح مرغوب اور دل پسند ہو جائے جس کو طریقت کہتے ہیں۔ اگر فرض نہیں تو متمم فرض ضرور ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نفس ایمان اور جملہ ثمرات ایمان خطرناک غار کے کنارے پر پڑے رہتے ہیں۔ چنانچہ کسی صاحب دل نے کہا ہے ؎

اگر خواہی خدا ہی و دل زندگی ؛ بندگی کن بندگی کن بندگی
زندگی مقصود بہر بندگی است ؛ زندگی بے بندگی شرمندگی است

جز خضوع و بندگی و اضطرار ٭ اندریں حضرت ندارد اعتبار
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی ٭ کفر باشد پیشِ او جز بندگی
ذوق باید تا دہد طاعات بر
مغز باید تا دہد دانہ شجر

ایک بیمار شخص جس کو مرض کے سبب مطلق بھوک کا احساس نہ ہو اپنے معالج طبیب کے حکم سے غذا کھاتا ہے تاکہ وہ طاقت بنی رہے جسکی وجہ سے مرض کا تحمل اور عوارض کی مدافعت کر سکے اس بیچارے کو غذا میں کیسی ہی لذیز کیوں نہ ہو کچھ مزا نہیں آتا طبیب کے حکم کی تعمیل میں تھوڑا بہت کھانا ضرور ہے مگر طبیعت پر جبر کرکے نوالے نگلتا ہے ۔ لقمہ اوپر کو ابلا چلا آتا ہے مگر یہ قابل رحم سقیم الحال آئندہ حاصل ہو جانے والی تندرستی کا لحاظ کرکے مصلحت کو نظر کے سامنے لاتے ہوتے بہ تکلف نیچے کو لیجاتا اور تیوڑی چڑھا چڑھا کر حلق سے اتارتا ہے ۔ اس بیچارے کی حالت پر ہر کسی کو ترس آتا ہے ۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جو چلتا پھرتا پورا تندرست اور جوان ہے ، بلا کسی ترغیب کے ہر لذیذ نعمت اور مزیدار غذا کی طرف اس کو طبعاً رغبت ہوتی ہے ۔ اسکا ہمیشہ جی چاہتا ہے کہ لذیذ سے لذیذ غذا کھاؤں ۔ چنانچہ فرمائش کر کرکے پکواتا اور مزے لے لے کر کھاتا ہے ۔ اندر سے جی بحال ہوتا ہے اور ساری غذا جزو بدن بنکر تنومند و توانا ہو جاتا ہے ۔ اس خوش نصیب شخص کی حالت کیسی قابل رشک ہے ۔ جسکو بیمار دیکھکر ضبط کرتا اور اسی جیسا تندرست قوی المعدہ بننے کی ہوس کرتا ہے ۔ پس یہی حال ہے اس عامی عامل شریعت کا جسکے قلب میں حلاوت ایمان پیدا نہیں ہوئی ۔ اور اس بندۂ خاص ولی صاحب دل کا جسکا دل حُبِ خداوندی سے معمور و آباد ہو چکا ہو اور اپنے مولیٰ تعالیٰ شانہٗ کی اطاعت و یاد سے مانوس ہو چکا ہو کیونکہ اول الذکر شخص سنّت نبویہ کا اتباع تو کرے گا مگر جبراً و قہراً جنّت کی نعمتوں اور دوزخ کی مصیبتوں کا نقشہ جما کے اور مؤخر الذکر شخص شر..عت مصطفویہ کا اقتدا کریگا اپنی طبعی رغبت اور دلی انس و محبت کے ساتھ جسکا مطلب یہ ہے کہ

اگر دوزخ جیسا خطرناک مقام نافرمانوں کے لئے اور جنت جیسی پربہار جگہ فرمانبرداروں کے لئے نہ بھی پیدا کی جاتی تب بھی بہ اقتضاءِ طبعی بہ اُنس قلبی ان حضرات سے یہی اطاعت و تابعداری ظاہر ہوتی جو اب ہو رہی ہے۔ اس میں سر مو فرق نہ ہوتا۔ ایسے سرشار ان محبت کی غایت تمنا اپنے محبوب کو راضی کرنا ہے۔ اور بس۔ تغیرات عالم رات دن دیکھتے ہیں اور بزبانِ حال پکارتے ہیں ؎

روزہا گر رفت گو رو باک نیست تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

ان طالبانِ رضا کی یہ شان ہوتی ہے ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

آپ نے دیکھا کیسی قابلِ رحم اور خطرناک حالت ہے۔ اس عامی زاہد خشک کی ایک نامرغوب اور غیر دلکش نمونہ پر تعمیر کرنی چاہتا ضرور ہے مگر بخیال خود ہر زیبائش میں مصلحت ڈھونڈ کر اپنی ہمت بڑھاتا اور طبیعت کو اُبھارتا ہے تاکہ ہاتھ چلے اور تعمیر پوری ہو۔ اس کو تعمیر کے اجزا میں جب تک حکمت کا علم نہیں ہو جاتا۔ اُس وقت تک قدم آگے بڑھانا بارگراں ہے۔ افسوس اگر کبھی کوئی حکمت نامزہ اُسکی سمجھ میں نہ آئے تو کیا نمونہ میں نقص نکالیگا ؟ ہاں بیشک اگر طبیعت کا یہی انداز ہے۔ اور مالک کی عظمت و محبت کی جگہ حکمت و مصلحت کی وقعت دل میں جمی ہوئی ہے تو ایکدن یہی ہونا اور کام کرتے کرتے ہلاکت و تباہی کے دریا میں ڈوبنا ہے۔ برخلاف اس کے کس قدر پیاری حالت ہے۔ اس صاحب دِل بزرگ کی جس کی زمین قلب میں آقا کی محبت کا تخم جم گیا اور مالک کے ساتھ وہ اُنس پیدا کیا جس کی وجہ سے نمونہ حسنہ کے مطابق اپنے جسم و قلب کی تعمیر و آرائش میں مشغول ہے اور اجمالاً سمجھے ہوئے ہے کہ نمونہ خداوندی کا ہر پہلو موزوں اور زیبائش کا پورا حصہ لئے ہوئے ہے۔ اس کو اتباع شریعت پر آمادہ کرنے والی شے اگر ہے تو صرف محبت خدا اور رسول ہے کہ اپنے محبوب کی رضا کا جویا بنکر تعمیل حکم کے لئے مجنونانہ لپکتا اور بہ اقتضائے طبعی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات و معمولات کا

پیدا جنکا اس جانب دوڑتا ہے۔ اس کے نزدیک اگر عزت ہے تو اسی میں ہے کہ متبع شریعت بن جائے اور مال و متاع ہے تو یہی ہے کہ اتباع سنّت نبوی کرے ؎

شریعت کو اگر تمثیل کے طور پر شیریں مانا جائے تو ان کو فرہاد کوہ کن کہنا پڑیگا۔ کیونکہ وہ تعمیل حکم میں ہر ایک مشقت کو راحت سمجھتے ہیں۔ اور اگر شریعت کو لیلیٰ عامریہ کہا جائے تو یہ اسکے مجنون ثابت ہونگے۔ اسکی ہر ادا ان سے پوچھنی چاہیئے کہ کیسی پیاری ہے کسی نے خوب کہا ہے

" اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

ان بزرگواروں کے نزدیک شریعت کے حکم میں بڑی مصلحت یہی ہے کہ وہ انکے آقا کا حکم ہے اور اس کی تعمیل سے مالک راضی ہو جاتا ہے اور سنّت نبویہ کی ہر طرز کو خواہ از قبیل عادات ہو یا از قبیل عبادات معاشرت ہو یا تمدن حالات غم ہوں یا کیفیات شادی و سرور اپنا شعار و وقار بنائے رکھے کیونکہ پیارے کی ہر ادا پیاری ہوتی ہے۔ سخت افسوس ہے کہ کسی ڈاکٹر کا ہر قول و فعل تو بے چون و چرا مان لیا جاتا ہے اور محبوب رب العالمین محمد بن عبد اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام طبیب روحانی کے ارشادات عالیہ پر گفتگو کی جاتی ہے کیا شان محبت سے یہ انداز بعید نہیں ہے ذرا غور فرما کر خود ہی فیصلہ کیجئے۔ کیا جواب دیجیئے گا۔ قیامت کے دن اگر جناب پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم جو ہر ایک ایماندار کے لئے اس کے ماں باپ سے زیادہ مہربان ہیں اور آپ نے فلاح دارین میں کوئی دقیقہ اٹھا کر نہیں رکھا شکایت فرمائیں کہ اے میرے روحانی فرزند و کیا میرے احسانات عظیمہ کا طریق شکر یہی تھا جو تنے برتا ؟ اور کیا میری محبت اور دلسوزی کا یہی صلہ تھا واللہ العظیم اس وقت شرما کر بجز گردن جھکا لینے کے کوئی جواب بن نہ پڑیگا اور ندامت اٹھانا ہوگی مگر بے سود۔ اس مضمون کو جناب رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس حدیث میں ظاہر فرمایا ہے لا یکون احدکم مؤمنا حتی اکون احب الیہ من نفسہ و مالہ وولدہ والناس اجمعین اور اسی حالت کو کسی مسلوب الارادہ

فرمانبردار نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

زدل نشاں چہ خواہی کہ زدل خبر ندارم * تو بگو کہ دل چہ باشد من از و اثر ندارم

حق تعالےٰ شانہٗ کے ساتھ وہ انس و محبت جس کی بدولت مشکلات اطاعت آسان اور آقا کی خدمت میں ہر دم مشغول رہنا مرغوب خاطر ہو جائیں اصطلاح صوفیہ میں نسبت کہلاتی ہے کیونکہ یہ خالق و مخلوق کے درمیان ایک قسم کے رابطہ کا نام ہے اور اس کو مضبوط کرنے والا شخص وہ پیاسا ہے جو سمندر کے پانی سے پیاس بجھانا چاہتا ہے اور جس قدر پیتا ہے۔ اسی قدر العطش العطش پکارتا ہے جس مرض میں مبتلا ہے وہی اس کی دوا ہے اور جو اس کے لئے شفا ہے وہی اسکا عین مرض ہے۔ یہاں تک کہ اسی میں فنا ہو کر حیاتِ ابدی حاصل کرتا اور مر مٹ کر زندگی جاوید پاتا ہے ؎

تداوبت من لیلی بلیلی من الھوی

کما یتداوی شارب الخمر بالخمر

اپنی محبت کا جوہر حق تعالیٰ نے فطری طور پر ہر ذی رُوح کو عطا فرمایا ہے اور بندۂ مومن کے حصہ میں تو یہ دولت اسقدر آئی ہے کہ کوئی محبت اسکا مقابلہ نہیں کر سکتی چنانچہ خود کلام اللہ میں ارشاد ہے والذین امنوا اشد حبا للہ یعنی ایمان والوں کو سب سے زیادہ محبت اللہ کی ہے مگر غفلت و بے خبری اور ماسوے اللہ کے ساتھ تعلقات کی کثرت و قوت نے اس فطری محبت خداوندی کو ایسا دبا رکھا ہے جیسے چولہے کی راکھ چنگاری کو دبائے ہوتی ہے۔ اسی لئے عوارض کا اٹھا دینا اور موانع کا ہٹا دینا اسکے مشتعل ہونے کا موجب ہے۔ اسی چنگاری کو ایک صاحبدل نے دردِ محبت کے ساتھ تعبیر کیا ہے ؎

عجب دردیست اندر دلِ اگر گویم زباں سوزد

وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

اور یہ راکھ کا ڈھیر نہیں ہٹ سکتا جب تک کہ چند روز بہ تکلف نفس پر جبر کر کے قدم قدم پہ

اتباع سنت نبویہ کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ سچ مانئے کہ جس وقت اس چنگاری سے مشتعل کرنے کا آپ محض ارادہ کرینگے توفیق ازلی آپ کے شامل حال ہوگی۔ ہوائے رحمت خداوندی کے جھونکے لگینگے اور حدیث قدسی کا یہ مضمون صادق آیگا من تقرب الی شبراً تقربت الیہ ذراعاً ومن تقرب الی ذراعاً تقربت الیہ باعاً ومن اتانی یمشی اتیتہ ہرولۃ ابھی تک آپ طالب تھے اب آپ مطلوب بن جائینگے اور اس وقت تک آپ محب کہلاتے تھے اب محبوب کہلائینگے شفیق ماں اپنے پیارے بچے کو گود میں لے لینے کے لئے صرف اسی کی منتظر ہے کہ اس کا ناطاقت بچہ گرتا پڑتا مرتعش پاؤں پہ کھڑا ہو کر ایک دو قدم ماں کی طرف بڑھے۔ پھر ماں کو تاب نہیں کہ اسے گرنے دے اور لپک کر گود میں نہ اٹھائے۔ یاد رکھئے کہ یہ وہ چٹک ہے کہ جب حاصل ہوجاتی ہے تو دوسری چیزوں سے مستغنی بنا کر چھوڑتی ہے۔ آپ اسی کے ہو رہینگے اور کہینگے ؎

من ہرچہ خواندہ ام ہمہ از یاد من برفت ✤ الا حدیث دوست کہ تکرار مے کنم

کوئی دوسرا خیال آپ کے لئے وبالِ جان ہوگا اور دوسرا شغل شغلِ اغیار کی طرح بارِ خاطر اس وقت آپ کی طبیعت کا اقتضا یہ ہوگا ؎

نخواہم جز تو یک ساعت تفکر در دگر کردن ✤ کہ در ہر دو جہاں جاناں ندارم جز تو دلدارے

دنیا کے ضروری مشاغل بھی آپ کے دینی مشاغل بن جائینگے۔ اعضا بضرورت تحصیل معاش کسب میں مصروف ہونگے مگر قلب مشغول بحق سبحانہ اور دل اپنے مولیٰ کی طرف متوجہ بقول شخصے ؎

دل پیش تو ام دیدہ بجائے دگر ستم ✤ تا غیر نداند کہ ترا می نگرستم

خلاصہ یہ ہے کہ طریقت عین شریعت ہے مگر اس وقت جبکہ شریعت کا مقتضا قلب میں پیدا ہوجائے اور اتباع سنت واطاعت حق سبحانہ اقتضائے طبیعت بن جائے قلب کو عبادت میں لذت آئے اور دل کو مشغولیت بہ خالق سے انس پیدا ہوکر مزا آنے لگے۔ اور اسکی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ معمولات وعادات اور تمدن ومعاشرت بلکہ ہر حرکت وسکون پر جناب رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع واقتدار کا لحاظ رکھا جائے۔ حق تعالے ہمیں اس نعمت سے مالامال فرمائے اور قال کو حال بنائے ؎

زرساحتِ دلِ اغیار کثرت رُبتن ٭ خوشتر کہ بہ زہ دُرِ وحدت سُفتن
مغرورِ سخن مشو کہ توحیدِ خدا ٭ واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

منعم حقیقی کے انعامات کا دروازہ ہر بندہ کے لئے کھلا ہوا ہے کیا عجب ہے کہ ہمیں بھی بھیک مل جائے ؎

ہر چند نیم لائقِ درگاہِ سلاطین نومید نیم
کآخر بکرم بہ نوازند گدا را۔ گاہے بہ نگاہے

باب دہم

تالیف القرآن

یہ امر مسلم ہے کہ جس قدر صحت اور استحکام کے ساتھ مسلمانوں کی آسمانی کتاب یعنی قرآن کریم آجتک صفحہ دنیا پر محفوظ وموجود ہے دیگر مذاہب کی کتب سماویہ ہرگز اسکا مقابلہ نہیں کرسکتیں اور یہ امر اس کتاب مقدس کے منجانب اللہ ہونے کے لئے ایک دلیل واضح ہے جس کا کوئی راستی پسند انسان ہرگز انکار نہیں کرسکتا یہ مصنفین یورپ جنہوں نے گاہ و بیگاہ مذہب اسلام کے متعلق موافق ومخالف رائیں قائم کی ہیں۔ بالاتفاق اس امر کی صداقت کو تسلیم کرچکے ہیں۔ کہ قرآن مجید بلاکم وکاست انہیں الفاظ میں آجتک اہل اسلام میں موجود ہے جو جناب شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ حقیقت ترجمان پر بتعلیم وحی جاری ہوئے۔ اور اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل ایک واقعہ نفس الامری خیال کیا جاسکتا ہے کہ اگر روئے زمین کو بھی

کتاب بلا تحریف و تبدیل نہایت صحت کے ساتھ موجود ہو سکتی ہے تو وہ صرف قرآن کریم ہے۔ عیسائیوں نے اپنی کتب سماویہ پر سے الزام تحریف دور کرنے کی خاطر قرآن شریف کو محرف ثابت کرنے میں وہ وہ زور لگائے ہیں کہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ مگر انکی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور گو بظاہر ضد اور تعصب سے ہمارے مذکورہ بالا دعویٰ کی صداقت کو تسلیم نہ کریں مگر وہ دل سے خوب یقین رکھتے ہیں کہ انکی ناخن زنیاں اسلام کی آہنی دیوار میں کچھ کارگر نہیں ہو سکتی۔ چودہ صدیاں پوری ہونے لگیں مگر ان کے تمام منصوبے خاک میں ملگئے۔ اور آخر کار وہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون[1] اور یہ جو آئے دن مخالفین اسلام کی طرف سے نکتہ چینیاں گوش زد ہوتی رہتی ہیں یہ فقط ان لوگوں کی حرکات مذبوحی ہیں اور چھپائے ہوئے فتنوں کو چھپا رہے ہیں۔ زمانہ کے انقلابات نے قرآن مجید کی صداقت کے خیال کو مخالفین کی نظروں میں اور بھی مضبوط کر دیا ہے اور روز بروز مضبوط ہو رہا ہے۔ اللھم زد فزد؛

یہ امر عقلاً بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جس کتاب کو دنیا کا آخری اور قطعی دستور العمل قرار پانا ضروری تھا اسکی حفاظت کے اسباب کا مضبوط سلسلہ بالکل غیر مشتبہ ہونا عین منشار ایزدی کے مطابق تھا۔ حضور علیہ السلام نے اپنی مدت رسالت میں قرآن مجید کے آیات شریفہ کو حسب ارشاد جبریل علیہ السلام اس ترتیب سے لکھوایا جس ترتیب سے بارگاہ رب العزت سے نازل ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت زید ابن ثابت انصاری اور اُبی بن کعب اور عبداللہ بن مسعود اور بعض دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کاتبان وحی ہیں جو حسب ہدایت جناب نبوی چمڑوں اور ہڈیوں پر آیات قرآنیہ لکھا کرتے تھے۔ سبحان اللہ شان ایزدی ہے کہ جس شخص پر قرآن مجید نازل ہوتا ہے وہ اسکے قلمبند کرنے سے بھی عاری ہے ؎

کہ اُمی قلم را نگیرد بدست

[1] بیشک ہم ہی نے قرآن شریف کو اتارا ہے اور بیشک ہم اسکے نگہبان ہیں ۱۲ مـ

مگر ضبط و حفظ آیات کا اہتمام اسقدر عالی اور مستحکم واقع ہوا کہ اگر دنیا بھر کی سلطنتیں مل کر بھی کسی کتاب کی حفاظت کرنا چاہیں تو اس قدر طویل مدت کے گذرنے پر وہ کبھی تحریف و تبدیل سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ یہ اس کتاب مقدس کا ایک بڑا زبردست معجزہ ہے جس کا مقابلہ کوئی آسمانی کتاب نہیں کرسکتی اور اس دعویٰ کی صداقت کو بجز تسلیم کرنے کے کوئی چارہ نہیں کیونکہ گفتگو واقعات کی صداقت پر مطلوب ہے نہ جہال حاسدین کی بیہودہ رائی پر بعض اوقات اکثر نیچریہ خیالات کے مسلمان بھی احادیث نبویہ کے متعلق یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ احادیث کی جمع اور ترتیب زمانہ نبوی میں نہیں ہوئی تھی بلکہ مابعد کے زمانہ میں علماء قرن ثانی وثالث نے ان کی جمع اور ترتیب کی طرف توجہ مبذول کی اور اس لئے احادیث میں بہت سا غیر معتبر حصہ داخل ہوگیا۔ اس اعتراض کے مفصل جواب کا کوئی اور موقع ہونا چاہیے۔ مگر اسقدر جان لینا بہایت ضروری ہے کہ خود حضور علیہ السلام شروع ایام رسالت میں احادیث کے لکھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ اور اسلئے صحابہ رضؓ کو سلسلہ روایات زبانی محفوظ رکھنا ہوتا تھا۔ اور وجہ مخالفت یہ تھی کہ مسلمان حضور علیہ السلام کی خدمت میں قرآن شریف سیکھا کرتے تھے۔ اور اس خیال کے پیدا ہوجانیکا قوی موقعہ تھا کہ کہیں احادیث اور آیات قرآنیہ کو لوگ خلط کرکے قرآن مجید میں عمداً یا سہواً تحریف نہ کرڈالیں۔ گویا احادیث کا بتمامہا[1] بزمانہ نبوی قلمبند نہ ہونا بھی منجملہ ان اسباب کے تقاضے کے رو سے قرآن مجید میں کسی قسم کا تصرف عائد نہیں ہوا۔ بہرصورت آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں نہایت احتیاط سے کام لیا جاتا تھا۔ آیات قرآنیہ تو بمجرد نزول قلمبند ہوجاتیں اور صحابہ رضؓ زبانی بھی حفظ کرلیتے۔ اور احادیث کے متعلق سلسلہ روایت نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اگر ایک یا دو یا زیادہ آدمی کسی خاص موقعہ پر کسی ارشاد نبوی یا فعل نبوی کو سنتے یا دیکھتے تو فی الفور جماعت صحابہ رضؓ میں انکی اشاعت ہوجاتی۔ پھر جب ایکدفعہ وہ حدیث قولی یا فعلی صحابہ رضؓ میں منتشر ہوجاتی تو

---

[1] بتمامہا کے لفظ سے اس امر کیطرف اشارہ مقصود ہے کہ بعض صحابہ رضؓ نے اجازت ملجانے پر کچھ کچھ یادداشتیں قلمبند کررکھی تھیں مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر اکثر احادیث کو نقل کرلیا کرتے تھے۔ منہ

اسکی نسبت آئندہ یہ اندیشہ نہ ہوتا۔ کہ اسکی اصل گم ہو جائیگی۔ کیونکہ وہ لوگ جو حضور علیہ السلام کی ادنیٰ ادنیٰ بات کو نہایت غور سے مطالعہ کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اور آپ کی روش پر عامل ہونے کو باعث نجات اخروی باور کرتے تھے۔ انکی نسبت یہ ظن بالکل فاسد ہے کہ کسی شخص نے کسی خاص موقعہ پر کوئی حدیث سنی اور بعد میں اُسکو یاد نہ رہی۔ اور جس طرح اُس نے چاہا روایت کر دیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ معترضین نے حضور کے مستفیضین کو عوام الناس کی مجالس پر قیاس کیا ہے جن میں اِدھر اُدھر کی لغویات بکی جاتی ہیں اور بعد میں انکو کوئی شخص باصلہا روایت نہیں کر سکتا۔ یہ سچ ہے کہ اکثر احادیث بالمعنی روایت کی گئی ہیں۔ مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ احادیث کے الفاظ جو کتب احادیث میں ثبت ہیں حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے نہیں نکلے بلکہ اس سے یہ مقصود ہے کہ جو استحکام آیات قرآنیہ کو حاصل ہے وہ احادیث میں نہیں کیونکہ احادیث میں اختلاف روایت اکثر الفاظ میں کمی بیشی یا تقدیم و تاخیر موجود ہے۔ مگر اس سے نفس احادیث کی ضرورت اور حکم مبین کی اصلیت میں کسی قسم کا نقص عاید نہیں ہوتا۔ کیونکہ احادیث کی روایت تمام دیگر تاریخی روایات سے زیادہ معتبر ہے۔ احادیث میں ارشادات نبویہ دوسروں تک پہونچا دینے کی تصریح آچکی ہے مثلاً نضر اللّٰہ امرأ سمع منا حدیثا فحفظہ حتی یبلغہ غیرہ یعنی خدائے تعالےٰ دین و دنیا میں اس شخص کو سر سبز و شاداب رکھے جو ہم سے کسی حدیث کو سنکر ضبط کرے حتیٰ کہ وہ دوسرے شخص کو (بطور امانت کے) پہونچاوے اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ احادیث کو صرف بغرض عمل ہی ضبط نہیں رکھا کرتے تھے بلکہ وہ جانتے تھے کہ تبلیغ بھی بجائے خود ایک ثواب عظیم ہے پس معترضین کا یہ خیال کہ احادیث کا سلسلہ غیر معتبر ہے ہرگز سُننے کے قابل نہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اگر حدیث نہ ہوتی تو آج قرآن کا سمجھنے والا دُنیا میں ڈھونڈھے نہ ملتا۔ اور لطف یہ کہ خود منکرین احادیث کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ مگر انکا یہ کئے جاتے ہیں[۱] یعرفون نعمۃ اللّٰہ ثم ینکرونہا

[۱] اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جانتے ہیں اور پھر انکار کئے جاتے ہیں ۱۲ منہ

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ احادیث کا سلسلہ بھی منجملہ اسباب ضروریہ کے ایک سبب قوی ہے۔ قرآن مجید کے نزول اور اُسکے جمع و ترتیب اور محفوظیت کے متعلق غور و خوض کرنیکا جس سے ایک فاضل محقق کو اس مقدس اور عظیم الشان کتاب کے متعلق نہایت آسانی کے ساتھ صحیح رائے قائم کرنیکا موقع ملسکتا ہے۔ بخاری وغیرہ معتبر کتب حدیث میں آیات قرآنی کی جمع و ترتیب کی نسبت یوں لکھا ہے۔ کہ خلیفہ اول صدیق اکبر رض نے زید ابن ثابت رض کو اپنے پاس بلوا بھیجا۔ اور آپ نے انہیں فرمایا کہ عمر بن خطاب رض نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ چونکہ مسیلمہ کذاب کے مقابلہ میں بہت سے مجاہدین صحابہ رض جنہیں قرآن مجید ضبط تھا شہادت پا چکے ہیں۔ اس لئے مجھے ڈر ہے کہ قرآن مجید لوگوں سے جاتا رہیگا۔ مناسب یہ ہے کہ آپ جمع و ترتیب کا حکم صادر فرمادیں۔ میںنے عمر رض کو یہ جواب دیا ہے کہ جس کام کے کرنیکا جناب پیغمبر ص نے اپنی زندگی میں حکم نہیں فرمایا اُسے ہم کیسے کر سکتے ہیں مگر عمر رض اصرار تمام یہ فرما رہے ہیں کہ ھذا واللہ خیر (بخدا یہ بھلا کام ہے) یعنی اس میں ہرگز خدا تعالےٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے سو مجھے بھی خداوند کریم کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے کہ عمر رض کی رائے نہایت درست اور قابل عمل ہے سو تم (اے زید) چونکہ صاحب عقل و فراست ہو اور امانت سپار ہونیکے علاوہ جناب پیغمبر ص کی زندگی میں کاتب الوحی رہ چکے ہو پوری پوری کوشش سے قرآن مجید کو ترتیب دو۔ زید ابن ثابت رض فرماتے ہیں کہ صدیق اکبر رض کی یہ بات سنکر مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس امر اہم کی بجائے اگر مجھے پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک اٹھالے جانے کی تکلیف دیجاتی تو میرے لئے قرآن مجید کی ترتیب سے بڑھکر زیادہ گراں نہ تھی۔ میںنے عرض کیا کہ جس کام کو خود جناب حضور علیہ السلام نے نہیں کیا آپ اسے کیسے کر سکتے ہ؟ آپ نے فرمایا کہ بخدا یہ بہتر ہے چنانچہ آپ مجھ سے باربار اصرار کرتے رہے۔ حتّٰی کہ میرے دل میں بھی اس رائے کی عمدگی کا یقین ہوگیا۔ تب میںنے ہڈیاں۔ خرما کی چھالوں۔ سفید پتھروں وغیرہ کو جن پر قرآن مجید لکھا گیا تھا۔ جمع کیا اور

قاریوں سے جنہیں قرآن مجید ضبط تھا مدد لی اور آیات کو ترتیب دی۔ چنانچہ سورہ توبہ کی آیت لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم ابو خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کے پاس نہ پائی گئی۔ یہ مصحف شریف جو اس طرح مرتب ہوا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس بعد ازاں عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس پھر ام المومنین حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس محفوظ رہا۔

خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جبکہ حذیفہ بن یمان خلیفہ کی طرف سے آرمینیہ اور آذربائیجان کے علاقہ میں جہاد کر رہے تھے تو آپ نے اہل عراق کو قرأت میں بہت اختلاف کرتے دیکھا۔ کوئی کسی قرأت کے مطابق پڑھتا اور کہتا کہ یہی صحیح ہے اور کوئی دوسری قرأت کے مطابق پڑھتا اور اسی پر اصرار کرتا۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ حال دیکھ کر عزم کر لیا کہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کرونگا کہ ان سب کو ایک ہی قرأت پر متفق کرنیکا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ جب وہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ جس طرح زمانہ کے گذرنے پر یہود اور نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں اختلاف پیدا کر لئے تھے یہ لوگ بھی قرآن مجید میں اختلاف کرنے لگیں۔ خلیفہ نے انکی اس التماس کو قرین مصلحت سمجھ کر ام المومنین حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ آپ قرآن شریف ارسال فرماویں تاکہ اس کی نقل لیکر آپ کو واپس کر دیا جائے۔ ام المومنین نے فی الفور قرآن مجید ارسال کر دیا اور اس کی چار یا پانچ نقلیں لی گئیں۔ امام سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں کہ حضرت ام المومنین والا قرآن مجید بلحاظ ترتیب آیات مرتب ہوا تھا مگر سورتوں کی ترتیب خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئی اور یہ ترتیب بحضور اکابر صحابہ و قراء قرار پائی۔ چنانچہ خلیفہ نے حضرات زید بن ثابت اور عبداللہ بن زبیر اور سعید ابن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ جہاں کہیں قرأت میں اختلاف پیدا ہو وہاں محاورۂ قریش کو مدنظر رکھو۔ کیونکہ قرآن مجید قریش ہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ یہ نقلیں جب تیار ہو گئیں تو علیحدہ علیحدہ ممالک میں ارسال کر دی گئیں اور حکم دیا گیا کہ کوئی شخص ان مصاحف کے برخلاف قرأت نہ کرے۔ ناظرین اس امر کو بھی خوب یاد رکھیں کہ ان مصاحف

پہ اعراب داو قاف وغیرہ بعد میں قائم کئے گئے تھے کیونکہ وہ لوگ اہل زبان تھے اور انہیں ہرگز اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ اعراب اور واو قاف کو جو بعد میں قائم کئے گئے۔ بذریعہ نشانات مکتوبہ سیکھتے ۔ قرأت زبانی بذریعہ تعلیم و تعلیم کی جاتی تھی اور اسی کی پابندی کیا کرتے تھے ؛

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض متعصب عیسائیوں نے جب دیکھا کہ تفاسیر میں ایک ہی لفظ کے متعلق مختلف قرأتوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو انھوں نے ان علماء اسلام کے مقابلہ میں جو توریت و انجیل کی تحریف کا الزام عیسائیوں پر قائم کیا کرتے ہیں بطور معارضہ یہ بات کھڑی کر دی کہ قرأت کا اختلاف بھی قرآن مجید کی تحریف پر مبنی ہے حالانکہ اس بے اصل اعتراض کو خود جناب پیغمبرؐ نے رفع فرمایا حیث قال اقرأنی جبرائیل علیٰ حرف فراجعتہ فلم ازل استزیدہ و یزیدنی حتی انتھیٰ الیٰ سبعۃ احرف" یعنی مجھے جبرائیلؑ نے قرآن مجید ایک خاص تلفظ کے مطابق پڑھایا۔ میں اسے بار بار دھراتا رہا اور تلفظ کے دوسرے طریق کی بابت ان سے استدعا کرتا رہا۔ اور وہ بتلاتے رہے۔ حتیٰ کہ سات مختلف طریقوں پر انہوں نے مجھے پڑھنا سکھلایا۔ اس حدیث میں اگرچہ شراح حدیث کا اختلاف ہے کہ لفظ سبعۃ احرف سے کیا مراد ہے۔ مگر اقرب الی الصحت یہی معنی ہیں کہ ان سات طریقوں سے وہ سات مختلف وجوہ تلفظ مراد ہیں جو قرأت سبعہ کے نام سے مشہور ہیں۔ بعض محدثین نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرأت سبعہ ایک ہی لفظ میں ہوا کرتی ہیں اس لئے یہ صحیح نہیں کہ سبعۃ احرف سے سات قرأت مراد لی جائیں، بلکہ سات مختلف عربی زبانوں کا استعمال مراد ہے دیکھو حدیث اذا اختلفتم فاکتبوہ بلغۃ قریش یعنی حضرت عثمانؓ نے لکھنے والوں کو حکم دیا کہ اگر

لہ مختلف وجوہ کی بابت استدعا کرنے سے یہ مقصود تھا کہ مختلف لوگوں کی زبانوں پر بہ آسانی جاری ہو سکے اور کسی کو پڑھنے میں دقت نہ ہو ۱۲ منہ

تمہیں اختلاف[1] کا موقع پیش آئے تو لغت قریش کے مطابق لکھو۔ مگر واقعہ ذیل سے جو صحیح بخاری وغیرہ کتب احادیث میں مندرج ہے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ لفظ سبعۃ احرف سے سات مختلف وجوہ قرأت مراد ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم کو بزمانہ حیات نبوی نماز میں سورہ فرقان پڑھتے سنا۔ معلوم ہوا کہ وہ مختلف حروف پر قرآن مجید پڑھ رہے ہیں۔ میں نے چاہا کہ نماز ہی میں ان کی خبر لوں مگر میں منتظر رہا حتیٰ کہ وہ نماز سے فارغ ہو گئے۔ میں نے اُنکے گلے میں کپڑا ڈال دیا اور کہا کہ تمہیں یہ سورت اس طرح کس نے تعلیم کی ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ مجھے جناب پیغمبرؐ نے یُوں ہی تعلیم دی ہے۔ میں نے کہا کہ تو جھوٹ بولتا ہے کیونکہ مجھے جناب پیغمبرؐ نے اسکے برخلاف تعلیم کی ہے۔ آخر میں کشاں کشاں انہیں حضور علیہ السلام کی خدمت میں لیگیا۔ اور عرض کیا کہ یہ شخص سورۂ فرقان کو برخلاف اس طریق کے پڑھتا ہے جس کے مطابق حضورؐ نے مجھے تعلیم فرمائی تھی۔ جناب پیغمبرؐ نے فرمایا کہ اس کے گلے سے کپڑا اُتار ڈالو۔ پھر حضورؐ نے انہیں حکم دیا کہ ہشام پڑھو۔ اُنہوں نے سورت کو اسی طریق پر پڑھنا شروع کیا جس کے مطابق میں نے انہیں پڑھتے سُنا تھا۔ جناب پیغمبرؐ نے سُن کر ارشاد فرمایا کذالک انزلت یعنی یُونہی نازل ہوئی ہے۔ پھر مجھے ارشاد فرمایا کہ تم پڑھو میں نے سورت پڑھنا شروع کی۔ سُنکر آپ نے فرمایا۔ کذالک انزلت ان ھذا القران انزل علی سبعۃ احرف فاقرؤا ما تیسر منہ یعنی یونہی نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ قرآن شریف سات مختلف وجوہ قرأت پر نازل ہُوا ہے۔ سو تم لوگ جس کو بہ آسانی پڑھ سکو پڑھا کرو۔ اس واقعہ سے عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ قرآن مجید میں مختلف طریق تلفظ کا موجود ہونا اس کی تحریف پر دلالت کرتا ہے بالکل باد رہوا ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر لفظ سبعۃ احرف سے ہم یہ مراد لیں کہ ایک لفظ کی بجائے بعض روایات میں اس کا مترادف پڑھا جانا

[1] یہ اس امر کا جواب ہے کہ لکھنا قرأت کے منافی نہیں ہو سکتا یعنی تلفظ وہی سات طریق پر رہا اور لکھنے میں لغظ قریش کی پابندی کی گئی۔ ورجملہ انما انزل بلغتھم کا یہ مطلب ہے کہ اولاً لغت قریش میں نازل ہُوا اور دوسرے وجوہ حضرت کی استدعا پر جبرئیل نے تعلیم کئے ہوا۔

مروی ہے جیسے اقبل کی جگہ تعالیٰ کا پڑھنا جس کا ترجمہ فارسی میں بصیغہ امر رہیا) کیا جاتا ہے۔ تب بھی اس کو تحریف نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ شارع سے ثابت ہے اور جو امر خود شارع سے بتعلیم وحی ثابت ہے۔ یا جو امر خود بہ شارع بتعلیم وحی ارشاد فرمائے اس کو تحریف کون کہہ سکتا ہے؟

ناظرین بخوبی سمجھ گئے ہونگے کہ قرآن مجید کو ترتیب موجودہ کے مطابق مرتب ہونے تک تین مرحلے ایسے پیش آئے جن کی ہیئت پر غور کرنے سے اس میں اس کی محفوظیت پر ایک یقینی شہادت کا پتہ ملتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جناب پیغمبرؐ کا ملک روحانی یعنی جبرئیلؑ سے قرآن مجید کا اخذ کرنا اور اس کو بہ حکم آیہ ان علینا جمعہ و قرآنہ ضبط رکھنا امر لازم تھا۔ چنانچہ ایک حدیث میں جس کو بخاری وغیرہ محدثین نے روایت کیا ہے یوں وارد ہے کہ حضور علیہ السلام ہر سال قرآن مجید کو جبرائیلؑ کے سامنے پڑھتے اور جبرئیلؑ آپ کو سناتے اور حضور کے آخری سال حیات پر جبرئیل علیہ السلام نے دو دفعہ ایسا کیا جس پر حضور علیہ السلام نے اپنی رحلت کی پیش گوئی کردی تھی جو اسی طرح واقعہ ہوئی اور صرف یہی نہیں بلکہ حضور کا فی الفور تعلیم جبرئیلؑ کے مطابق قلمبند کرا لینا اور خواص صحابہ کا فی الفور حفظ کر لینا ضبط آیات کی اعلیٰ اور اقویٰ دلیل ہے۔ چنانچہ عبد اللہ بن مسعود۔ سالم مولیٰ ابی حذیفہ۔ ابی بن کعب۔ معاذ بن جبل وغیرہم رضہ صحابہ کبار بڑے بڑے مشہور قاری تھے جن سے حضورؐ لوگوں کو قرآن مجید سیکھنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ اور جنگ یمامہ میں قریباً ستر بڑے بڑے قاری شہادت پا گئے جنہوں نے خود جناب پیغمبرؐ کی زبان مبارک سے قرآن مجید سیکھا تھا۔ اور شب و روز انکا کام تلاوت کلام اللہ تھا۔ ان حالات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود جناب پیغمبرؐ کے زمانہ حیات میں قرآن مجید بدرجہ اکمل محفوظ ہو چکا تھا صرف اس کی ترتیبؔ باقی

لہ (۱) ترتیب آیات جو زمانہ نبوی ہو چکی تھی۔ (۲) بشکل مصحف ایک جگہ جمع کرنا خلیفہ اوّل نے کیا (۳) اختلاف قرأت کو دور کر کے ایک قرأت متفق علیہ پر قرآن مجید کی نقول مختلف ممالک میں بھیجنا خلیفہ ثالث نے کیا ۱۲ منہ

باقی تھی۔ چنانچہ صاحب تفسیر خازن نے مقدمہ تفسیر میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے اپنی زندگی کے آخری سال میں زید بن ثابت رضؓ کو قرآن شریف سنایا اسلئے ان کا حضورؐ کی زبان مبارک سے سننا قرآن مجید کی محفوظیت اور اس کی ترتیب پر ایک محکم دلیل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ صدیق اکبرؓ نے انہیں آیات کو اسی ترتیب سے لکھنے کا حکم دیا جس ترتیب پر انہوں نے جناب پیغمبرؐ سے ضبط کر رکھی تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں فکتبوہ کما سمعوہ من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وکان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یلقن اصحابہ ویعلمھم ما ینزل علیہ من القراٰن علی الترتیب الذی ھو الاٰن فی مصاحفنا بتوقیف جبریئل علیہ السلام ایاہ علی ذالک واعلامہ عند نزول کل اٰیۃ ان ھذہ الاٰیۃ تکتب عقب اٰیۃ کذا فی سورۃ کذا فثبت ان سعی الصحابۃ کان فی جمعہ فی موضع واحد لا فی ترتیبہ فان القراٰن مکتوب فی اللوح المحفوظ علی النحو الذی ھو فی مصاحفنا الاٰن . . . . الخ یعنی بزمانہ صدیق اکبرؓ صحابہؓ نے قرآن مجید کو ٹھیک اسی صورت میں آئینہ کیا جس میں انہوں نے خود جناب پیغمبرؐ کی زبان مبارک سے سنا تھا اور حضورؐ کا شیوہ تھا کہ جونہی کوئی آیت نازل ہوتی اس کی تلقین صحابہؓ کو فرما دیتے اور اسی ترتیب پر تعلیم فرماتے جس ترتیب پر اب اس وقت ہمارے پاس موجود ہے اور یہ ترتیب جبرئیلؑ کی ہدایت کے مطابق تھی۔ کیونکہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو جبرئیلؑ فرما دیتے کہ اس کو فلاں سورۃ کے فلاں مقام پر رکھو۔ اس تقریر سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ نے قرآن مجید کو صرف ایک جگہ جمع کر دیا اور ترتیب کسی کمی بیشی کے بغیر بعینہ وہی تھی جو جناب پیغمبرؐ نے بذریعہ تعلیم وحی قائم کی کیونکہ قرآن مجید اسی صورت میں لوح محفوظ کے اندر ثبت ہے جس صورت میں ہمارے پاس اب موجود ہے۔ اس صورت میں دو امر قابل غور ہیں اول حضورؐ کا صحابہؓ کو قرآن مجید سکھلا دینا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اسکی شہادت موجود ہے یتلو علیہم اٰیٰتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ دوم۔ قرآن مجید کا لوح محفوظ میں ثبت ہونا۔ اسکی نسبت قرآن مجید فرماتا ہے بل ھو قراٰن مجید فی لوح محفوظ۔ اس لئے قرآن مجید کا محفوظ رہنا خود قرآن مجید سے ثابت ہو رہا ہے اور

وہ کسی دلیل خارجی کا محتاج نہیں۔ مفسر خازن کی عبارت سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ مختلف سورتوں کے نام بھی شارع سے منقول ہیں چنانچہ احادیث صحیحہ بکثرت اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ پس ایک نیچری کا یہ اعتراض بالکل باطل ثابت ہوگیا کہ قرآن مجید کی آیات کی ترتیب اور سورتوں کے نام بعد میں علمائے اسلام نے قائم کئے ہیں۔ اس معترض سے کوئی یہ تو دریافت کرتا کہ تمہارے اس خیال کی کہیں سے تائید بھی ہوتی ہے یا صرف ظن کاذب کی پیروی کر رہے ہو؟ الغرض قرآن مجید کی محفوظیت کے اسباب کے سلسلہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس خداوند کریم نے اپنی حکمت کاملہ سے اپنی اس بے بہا نعمت کو آسمان پر سے نازل کیا تھا۔ اسے بہ حکم انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ اس کو تحریف و تصرف سے بال بال محفوظ و مامون رکھا۔ یہ ہے قرآن مجید کا وہ معجزہ جس کو ہم مسلمان بڑے فخر کے ساتھ تمام مذاہب عالم کے سامنے پیش کیا کرتے ہیں۔ اور جو کسی اور دوسری قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ ناظرین غور کریں کہ آیا عیسائی لوگ اپنی کتب آسمانی کے متعلق اس قسم کے زبردست دعویٰ کو اہل اسلام کے روبرو پیش کرکے سرخرو ہو سکتے ہیں؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

منجملہ اسباب حفظ قرآن کے ایک بڑا زبردست سبب یہ بھی تھا کہ قرآن مجید پورے تئیس سال کے عرصہ میں مختلف واقع اور مختلف حالات کے عائد ہونے پر نازل ہوتا رہا۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ امر کفار کی طرف سے بطور اعتراض پیش کیا گیا ہے کہ کیوں قرآن مجید ایک ہی دفعہ نازل نہیں کیا گیا؟ چونکہ وہ لوگ حکمت ایزدی کے راز سے ناواقف تھے اور انکی نظریں حقائق امور تک نہ پہنچ سکتی تھیں اسلئے وہ قرآن مجید کے بتدریج نازل ہونے کو موجب قدح سمجھنے لگے۔ مگر غور کرو کہ اس تدریجی نزول سے کیسے کیسے اہم فوائد حاصل ہوتے۔ مثلاً:۔

(۱) تکالیف شرعیہ یعنی احکام متعلقہ عبادات بدنیہ و مالیہ اور نیز حلال و حرام وغیرہ کی پابندی کو ایک ہی وقت میں عائد کرنا مقتضائے فطرت انسانی کے بالکل برخلاف تھا۔ یقیناً لوگ کبھی اس کے متحمل نہ ہو سکتے کیونکہ جو طبائع فسق و فجور میں مستغرق اور ہر ایک قسم کی

بد اعتقادی اور بدعملی کے نشہ میں چُور ہو چکی تھیں انہیں آہستہ آہستہ صراط مستقیم شریعت پر چلانا بالکل قانون الٰہی کے مطابق تھا ✦

(ب) جناب پیغمبرؐ کو مخالفین کی اذیتوں پر صبر و تسلی دلانا نہایت اہم امر تھا - ایسے مختلف مواقع پر وحی کا نازل ہونا حضورؐ کی بشریت پر غالب آکر آپ کو تبلیغ رسالت کے لئے ہمیشہ سرگرم و مستعد رکھتا - اس طریق پر حضورؐ کو سابقہ انبیاء علیہم السلام کے نظائر اور آئندہ وعدہ نصرت کی خبر سُنا کر ثابت قدم رکھا جاتا اور یہ نہایت ہی ضروری تھا - پڑھو آیہ کذالک لنثبت بہ فؤادک ۔۔۔ الخ جو کفار کے مذکورہ بالا اعتراض کے جواب میں واقع ہوئی ✦

(ج) عملی طور پر احکام کی پابندی نہایت اطمینان اور یقین کے ساتھ صرف اُسی وقت نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی تھی جبکہ مسلمان اوامر کی خوبی اور نواہی کے ضرر نتائج کا بذات خود کافی امتحان کر لیتے - کیونکہ ایسا علم بمنزلہ ایسے دعوے کے ہوتا ہے جو دلیل کے ساتھ تسلیم کیا جائے - برخلاف اسکے علم بلاتائید تجربہ و مشاہدہ مفید یقین نہیں ہو سکتا ✦

(د) احکام شریعت کے اسرار و حکم کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ احکام کے اسباب اور ان کے نتائج کا علم حاصل ہو جائے تاکہ نفس انسانی انہیں بآسانی قبول کر سکے - اور چونکہ انہیں لوگوں کی صحیح روایات پر آئندہ شریعت اسلامی کا عظیم الشان قصر تیار ہونا تھا اس لئے ضروری تھا کہ انہیں احکام کے علل اور نتائج کے استنباط کا موقع دیا جاتا چنانچہ آیہ لعلمہ الذین یستنبطونہ میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے - علم حدیث کے واقف اس امر کو خوب جانتے ہیں کہ علم فقہ کی اجمالی اجتہادی صورت صحابہؓ کے زمانہ میں قائم ہو چکی تھی جسکی تفصیلی صورت تابعین اور تبع تابعین رضہ کے علمائے عظام نے مکمل کر دی فالحمد للہ علیٰ ذالک ✦

(ہ) ہر ایک حکم کے متعلق خواہ امر ہو یا نہی یہ ضروری تھا کہ مخالف و موافق کو اس میں غور کرنے کا پورا موقع دیا جاتا - تاکہ بعد میں بڑے بڑے احکام شریعت میں کسی قسم کا اشتباہ

باقی نہ رہتا کیونکہ ایسے امور شریعت کا خود شارع ؑ کے سامنے طے ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی بہ نسبت دیگر شریعتوں کے زیادہ وسیع اور مدلل ہے اور اس کے اصول بالکل روز روشن کی طرح واضح ہیں؟

(۵) قرآن مجید کے تدریجی نزول کا بڑا اعلیٰ مقصد یہ تھا کہ آیات کو مسلمان لوگ نہایت استحکام کے ساتھ ضبط کرلیں تاکہ ان کی جمع اور ترتیب میں کوئی دقت پیش نہ آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا کیونکہ گو مختلف صحابہ ؓ کو مختلف حصص ضبط تھے مگر سب کی مجموعی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلیفہ اول ہی کے عہد میں یہ امر اہم نہایت عمدگی کے ساتھ مکمل ہوگیا اور اگر کچھ عرصہ زائد گذر جاتا تو ممکن تھا کہ وہ لوگ زندہ نہ رہتے اور خبط پڑ جاتا جس کی نظیر یہود و نصاریٰ کی کتابوں کے متعلق ہم مشاہدہ کر رہے ہیں اور ایک عظیم الشان اور نہایت خفی و دقیق مصلحت خداوندی قرآن مجید کے تدریجی نزول میں یہ ہے کہ جناب پیغمبر ؐ کی قدوسیت اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام کی نسبت کہیں بہت بالا تھی مگر بایں ہمہ آپ کی بشریت قرآن مجید جیسی ایک گراں وزن امانت کے یکدفعہ متحمل ہونے کیلئے صرف اسی صورت میں ہوسکتی تھی جبکہ آپ کی ذات گرامی کی نوعیت افراد انسانی کی نوعیت سے علیحدہ کوئی اور نوعیت رکھتی مگر تبلیغ قرآن کے فریضہ بجا لانے کے لئے آپ کا بشری لباس میں جلوہ گر ہونا ضروری تھا؟

الغرض قرآن مجید کے تدریجی نزول میں قرآن مجید کے ضبط و استحکام کی ایک زبردست شہادت موجود ہے جس میں غور کرنے سے ایک ذرہ بھر بھی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ قرآن مجید کو واقعی اللہ تعالےٰ نے اپنے دستِ قدرت میں سنبھالے رکھا اور آئندہ بھی جب تک آسمان پر رات کو ستارے چمکتے نظر آتے ہیں اور زمین پر نوع انسان آباد ہے بدیں ہیئت کذائی آفتاب نصف النہار کی طرح پرتو افگن رہیگا۔ اس میں مخالفین کا طعن و تشنیع کچھ اثر نہیں پیدا کر سکتا۔ پڑھو آیہ لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔ سبحان اللہ کیسی بڑی زبردست پیشگوئی ہے اس سے روئے زمین کے کسی مخالف کو بھی انکار کا موقعہ نہیں مل سکتا۔ آج اگر بالفرض تمام قرآن مجید کے نسخے

لہ آیہ - انا سنلقی علیک قولا ثقیلا اور آیہ لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل کے معانی میں غور کرو۔ ۱۲ منہ

صفحۂ دنیا سے گم کر دئے جائیں تو پھر بھی یہ نعمت بیش بہا حفاظ و قرّاء کے پاس بدستور موجود ہے۔ یہ بھی اس کا ایک زبردست معجزہ ہے۔ کیا کوئی دوسری قوم ایسی نظیر دکھلا سکتی ہے؟ مسلمانوں میں قرآن کا پڑھنا پڑھانا بجائے خود ایک بڑی عبادت ہے جس پر احادیث میں بڑے بڑے ثواب عظیم کا ذکر آچکا ہے اور غالباً جاہل سے جاہل مسلمان بھی سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا حافظ ضرور ہوتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اور ایسے خدا کے بندے تو لاکھوں موجود ہیں جو ہر روز اسکی تلاوت کرتے اور اس کے خیر و برکات سے مستفید ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں کسی دوسرے مذہب میں یہ انتظام نہیں کیا گیا اور اسکی وجہ وہی ہے جو اوپر بتلائی جا چکی ہے کہ احادیث میں قرآن مجید پڑھنے پڑھانے کے متعلق ثواب عظیم کا ذکر آچکا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں یوں وارد ہے خیرکم من تعلم القرآن و علمہ یعنی تم میں سے بھلا آدمی وہ ہے جو قرآن مجید کو سیکھتا اور دوسروں کو سکھلاتا ہے۔ پھر فرمایا من قرأ حرفا من کتاب اللہ فلہ بہ حسنۃ والحسنۃ بعشر امثالھا لا اقول الم حرف ولکن الف حرف ولام حرف ومیم حرف۔ یعنی جو شخص قرآن مجید کا ایک حرف پڑھتا ہے اس کے لئے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا عوض دس گنا خدا کے ہاں مقرر ہے اور حرف سے مراد یہ نہیں کہ پورا (الم) ایک حرف ہو بلکہ الف ایک حرف اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف سمجھو۔ پھر فرمایا۔ ان الذی لیس فی جوفہ شئی من القرآن کالبیت الخرب۔ یعنی جس شخص کے دل میں قرآن شریف کا کچھ حصہ بھی داخل نہیں ہوا وہ ایک اجڑے گھر کی طرح ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور بہت سی احادیث ہیں جو اس بارہ میں کتب احادیث میں مذکور ہیں۔ خدائے تعالےٰ نے جنہیں توفیق دے رکھی ہے وہ ہر روز بلاتردد و تساہل اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

اعجاز القرآن

دنیا میں جس قدر انبیاء علیہم السلام خدا کی طرف سے کسی قوم میں مبعوث ہوتے وہ

اپنے منجانب اللہ نبی ہونے کے ثبوت میں اپنی اپنی قوم کے سامنے ہر ایک قسم کے دلائل پیش کرتے رہے۔ کیونکہ یہ عام دستور ہے یا یہ یوں کہو کہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ کوئی دعویٰ بلا دلیل قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ضرورتِ نبوت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس امر کا یقین رکھتے ہیں کہ انبیاء دنیا میں وہ کام کرتے ہیں جس کو کوئی دوسرا شخص ہرگز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شرائع و دیانات کے اصول و احکام کا وضع کرنا اور بندوں اور خدا کے تعلقات کی حقیقت کا کھولنا تعلیم وحی کے بغیر ممکن نہیں۔ انبیاء کی ماہیت اور اسباب و مسببات میں ربط حقیقی کی تعلیم کا مدار اگر حکماء کی تحقیق پر ہوتا تو آئے دن فلسفہ اور سائنس کے اصول میں کسی قسم کا تغیر و تبدل پیدا نہ ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ شروع آفرینش سے آجتک حکماء کی تحقیق نے انسانی دنیا میں کسی قسم کا استقلال پیدا نہیں کیا۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ گو انسانی قوائے فطری کے عمل کا دائرہ بہت وسیع ہے مگر بایں ہمہ انکا عمل محدود ہے۔ اس لئے حکماء کی تحقیقات میں ہر وقت تبدیل و ترمیم کی گنجائش موجود ہے اور ہمیشہ یوں ہی رہیگا۔ برخلاف اسکے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم شروع عالم سے آجتک ایک ہی روش پر چلی آئی ہے۔ کیونکہ اصول اسلام کی تعلیم تمام انبیاء میں ہمیشہ یکساں رہی ہے اور ان کی تعلیم میں تخالف نہیں پایا جاتا وجہ یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی منبع آسمانی وحی ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی شائبہ کذب اور احتمال وساوس کو ہرگز قوت واہمہ کا نتیجہ ہے مطلقاً دخل نہیں ہوتا اور حکماء کی تحقیق کا مدار محض تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے اور تجربہ[1] و مشاہدہ قوائے فطرتیہ انسانی کا نتیجہ ہے جن کا عمل محدود اور بوجہ اختلاط وہم نا قابل اطمینان ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی فلسفی تحقیق غیر متبدل اور قطعی نہیں کہلا سکتی۔ اگر کوئی شخص غلطی سے غیر متبدل ہونے کا دعویٰ کرے تو یوں سمجھا جائیگا کہ وہ اپنے ناقص قویٰ کے نتیجہ تک تمام افرادِ انسانی کو محدود رکھنا چاہتا ہے مگر یہ کیسی فاش غلطی ہے ؎

چو آں کرمے کہ در گندم نہاں است
زمین و آسمان او ہمان است

[1] انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا مدار نہ صرف تجربہ و مشاہدہ پر ہے بلکہ انکے تجربہ و مشاہدہ کی تصدیق بذریعہ وحی و الہام ہوتی ہے اور اسی لئے وہ قطعی ہوتے ہیں ۱۲ منہ

کلام بھی منجملہ صفات باری ایک صفت ہے۔ اس لئے جس طرح ہم دیگر صفات باری کی کنہ حقیقت کو نہیں جان سکتے بلکہ ان کی نسبت ہمارا علم اضافی ہے اسی طرح کلام ذات باری کی حقیقت کی نسبت بھی ہمارا علم محض اضافی ہوتا ہے۔ کیونکہ الفاظ سے ہم صرف بقدر حوصلہ فطرت حقائق و معارف کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔ کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہوسکتا کہ وہ کلام ذات باری کی حقیقت سے کماحقہ واقف ہے۔ یہی وجہ اعجاز ہے جو قرآن شریف کے متعلق علمائے اسلام بیان کیا کرتے ہیں مگر مجھے اس کے متعلق ذرا زیادہ تشریح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مناسب نظر آتا ہے کہ پہلے چند مبادی کا ذکر کیا جائے۔ ناظرین ذرا غور سے کام لیں:

(۱) انسان بمفاد ان اللہ خلق آدم علےٰ صورتہ نمونہ ذات باری ہے۔ چنانچہ جن صفات کی نسبت ہم ذات باری کی طرف حقیقی طور پر کرتے ہیں انہیں صفات کی نسبت انسان کی طرف بھی مجازی طور پر کیجاتی ہے۔ مثلاً ذات باری کے صفات میں سمیع و بصیر داخل ہیں۔ کیونکہ سمیع و بصیر کا اطلاق خداوند کریم نے اپنی ذات پر کیا ہے۔ اسی طرح انسان کے لئے بھی ہم ان صفات کو تجویز کر سکتے ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید میں انسان کی نسبت فجعلناہ سمیعًا بصیرًا آچکا ہے۔ صرف فرق اس قدر ہے کہ ذات باری کے صفات کسی علت کے معلول نہیں یعنی اسکے صفات ذاتی ہیں جو کسی غیر سے مکتسب نہیں مگر انسان کے صفات اس کی ذات کی طرح ذات باری کا معلول ہیں۔ ظاہر ہے کہ معلول و غیر معلول کی حقیقت ایک نہیں ہو سکتی۔ بلکہ دونوں میں صرف ایک اشتراک لفظی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس سمع و بصر کی نسبت انسان کی طرف کی جاتی ہے انکی حقیقت اس سمع و بصر سے مختلف ہے جو ذات باری کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اسی طرح وصف کلام کی حقیقت بھی دونوں صورتوں میں یکساں نہیں ہوگی۔ اس اصل کو خوب یاد رکھنا چاہئے کیونکہ اسی اصل پر اعجاز قرآن کا مسئلہ طے ہوگا ؂

(۲) صفات ذات باری چونکہ کسی علت کے معلول نہیں اسلئے وہ ہر ایک جہت سے کامل ہیں۔ کیونکہ کسی چیز کا معلول ہونا منافی کمال حقیقی ہے اور وہ ازلی اور ابدی ہے اور

اپنی نوعیت مجہول ہیں وہ انسانی صفات کی طرح آلات اعضاء کے محتاج نہیں - اور اس لئے غیر متناہی بھی ہیں - اگر ہم صفات کو من کل الوجوہ کامل اور لامتناہی تسلیم نہ کریں تو ہمیں ان کو ضرورۃً ناقص اور محدود تسلیم کرنا پڑیگا - اس صورت میں ذات باری کو علت موجودات بھی نہیں مانا جائیگا کیونکہ جو چیز فی حد ذاتہ ناقص ہے وہ علت تامہ قرار نہیں پاسکتی پس خدا کا کلام جو اسکی ایک صفت ہے لا متناہی ہے اور من کل الوجوہ کامل ہے ؛

(۳) ذات باری کے تمام صفات کو ہم دو طور پر قیاس کرسکتے ہیں یا یوں کہو کہ ہر ایک صفت کے لئے دو پہلو اعتبار کے قائم کئے جاسکتے ہیں - اوّل یہ تعلق ذات باری - دوم یہ تعلق مظاہر موجودات - اعتبار اوّل کے رُو سے صفات مجہول الکنہ ہیں یعنی انکی حقیقت کو ہم نہیں جان سکتے اور اسلئے وہ قابل بحث بھی نہیں - گو فرقہ معتزلہ نے ان پر بہت طویل بحثیں کیں اور گمراہ ہوئے مگر سوائے خبط کے انکے مباحث سے کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا - وجہ اسکی یہ ہے کہ صفات ذات باری اسکی ذات کی طرح ناقابل فہم ہیں - ہمارا فرض صرف ان صفات پر ایمان لانا ہے اور بس - آپ لیس کمثلہ شئی میں غور کرو - البتہ صفات اعتبار دوم کے رُو سے قابل بحث ہیں[۱] کیونکہ ہم انکے آثار مظاہر قدرت میں دیکھتے ہیں جن سے کسی عاقل کو انکار نہیں ہوسکتا - کلام کے لئے اعتبار دوم کے رُو سے الفاظ قرآنیہ مظاہر ہیں ؛

(۴) مظاہر صفات یعنی افراد موجودات بروجہ کمال موجود ہیں - کیونکہ اگر ہم ان میں کوئی نقص تسلیم کریں تو یہ نقص نقصان علت کا مستلزم ہے بعض اوقات ہم کسی چیز کو غیر مکمل یا ناقص کہہ دیتے ہیں مگر اسکا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ اس نقص کی وجہ علت کے نقصان پر مبنی ہے ؎

نقصاں ز قابل است وگرنہ علی الدوام ؛ فیض سعادتش ہمہ کس را برابر است

---

[۱] یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بار بار مظاہر قدرت میں تفکر و تدبر کرنے کی تاکید کرتا ہے - چونکہ الفاظ قرآنیہ صفت کلام کا مظہر ہیں اسلئے بطور زجر استفہام کرتا ہے - افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا ۱۲ منہ

مذکورہ بالا مبادی کے سمجھ لینے پر اعجاز قرآن کا مسئلہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ جب ہم قرآن مجید کو کلام الٰہی تسلیم کرلیں تو اس کا ضروری نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ کلام بے مثل و بے ہمتا ہے۔ ہاں علمائے اُمت کا فرض ہے کہ وہ منکرین کو ثابت کر دکھلائیں کہ واقعی قرآن مجید میں وہ تمام وجوہِ اعجاز پائے جاتے ہیں جن کا کسی کلام الٰہی میں موجود ہونا ضروری ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نہایت زور کے ساتھ مخالفین کو اپنے مقابلہ کے لئے بلاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی سُنا دیتا ہے کہ تم قطعاً اور یقیناً اس کلام کا مثل و نظیر نہیں لاسکو گے خواہ تم اور تمہارے چھوٹے بڑے مل کر اس بات میں زور لگائیں اور نہ صرف تم یعنی نوع انسان بلکہ نوع جن بھی۔ چنانچہ قرآن مجید کی یہ پیشگوئی پوری ہوگئی اور پوری رہیگی۔ ایسی حالت میں خواہ مخواہ ایک محقق کی توجہ اس امر کی طرف مبذول ہوجاتی ہے کہ اس بڑے زبردست دعوٰی کا موازنہ کرے جو نہ صرف معدودے چند آدمیوں کے برخلاف کیا گیا ہے بلکہ تمام روئے زمین کی آبادی کے برخلاف اور نہ کسی مخصوص زمانہ تک یہ دعوٰی محدود ہے بلکہ تاقیامت بدستور قائم ہے۔ غالباً ایسا محقق آیات قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے وقت اس دعوٰی کی قطعیت کو تسلیم نہیں کرتا ہوگا۔ مگر میں یقین کرتا ہوں کہ حق تفکر و تدبر ادا کرنے کے بعد وہ شخص حیرت زدہ ہوکر رہ جائیگا اور بلا ساختہ وہ کہنے لگیگا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم۔ اس خیال کی تصدیق کرلینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ کیونکہ جس طرح گوہر شاہوار سوا ایک خاص طبعی طریق کے جو معلوم ہے پیدا نہیں ہوسکتا۔ گو بظاہر مصنوعی طور پر اسی قسم کے کئی ایک گوہر آبدار تیار رکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح کلام الٰہی بھی سوا اس طریق معین کے جو انبیاء علیہم السّلام سے مخصوص ہے دُنیا میں لوگوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں انسان کا کلام بھی مصنوعی آبدار موتیوں کی طرح ناواقف آدمی کو ایسا ہی نظر آتا ہے جیسا خدا کا کلام۔ مگر جس طرح گوہر شناس کے بدوں ہر دو قسم کے موتیوں میں کوئی ناواقف آدمی تمیز نہیں کرسکتا اسی طرح سوائے علمائے راسخین فی العلم کے

کلام الٰہی اور کلام انسانی میں ناواقف کو تمیز کرنا دشوار ہے ؛

اعجاز قرآن کے متعلق وجوہ ذیل نہایت قابلِ توجہ ہیں :-

(۱) فصاحت و بلاغت -

جو لوگ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت سے واقف ہیں اُنہیں اِس امر کا تسلیم کر لینا مشکل نہیں ہوگا کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت بجائے خود ایک معجزہ ہے کیونکہ عرصہ تئیس سال تک لگاتار حضور علیہ السلام بڑے بڑے فصحا و بلغا مشرکین عرب کو مقابلہ کے لئے بلاتے رہے مگر کسی کو حوصلہ نہ پڑا کہ چند ایک آیاتِ الٰہی کا معارضہ کرتا۔ حالانکہ وہ لوگ اپنی زبان میں نادر الکلام اور ہر ایک قسم کے مضمون کو نہایت پر زور الفاظ میں ادا کر سکتے تھے۔ چنانچہ انکے خطبات و اشعار سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ وہ فصاحت و بلاغت کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے اور اپنے مقابلہ میں کسی غیر کو فصیح و بلیغ تسلیم نہیں کرتے تھے انکے ہاں ایام حج میں سالانہ مجالس مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں فیصلہ کے لئے ثالث مقرر ہوتے اور سب سے بڑھکر نمبر لینے والوں کا کلام کھال پر لکھ کر دیوار کعبہ پر آویزاں[1] کر دیا جاتا۔ فصاحت و بلاغت کا چرچا حضور علیہ السلام کے زمانہ میں اسقدر ہو گیا تھا کہ اُنہوں نے اسی کو معیار صداقت قرار دے رکھا تھا۔ چنانچہ باہم مشورہ کر کے اُنہوں نے ولید بن مغیرہ کو جو بڑا فصیح و بلیغ تھا حضور علیہ السلام کے پاس بغرض الزام حجت روانہ کیا جسکی استدعا پر حضور علیہ السلام نے قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھیں۔ جب اُس نے یہ آیت سُنی ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی . . . . . الخ تو بے اختیار بول اُٹھا[2] واللہ ان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ وان اسفلہ لمغدق وان اعلاہ لمثمر۔ ابو عبید ایک اعرابی کا ذکر کرتے ہیں کہ اُس نے آیہ فاصدع بما تؤمر سُن کر فی الفور سجدہ کیا اور کہا کہ میں اس کلام کی تاب

---

[1] بعض یورپین جہال نے دیوار کعبہ پر آویزاں کرنے کے واقعہ کو تسلیم نہیں کیا جنکی تقلید میں ہمارے ملک کے بعض جہال بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں مگر یہ کاسہ لیس مقلد یہ نہیں سمجھتے کہ انکی نظر اہل مغرب کی تحقیق سے زیادہ متجاوز نہیں۔ یہی غلط فہمی کی تحقیق کا کوئی دوسرا مقام ہے ۱۲ منہ

[2] بخدا کہ اس کلام میں حلاوت اور رونق معلوم ہوتی ہے اس کا نچلا حصہ سیراب ہے اور بالائی حصہ بار دار ہے ۱۲ منہ

نہ لاسکا۔ اس کی فصاحت و بلاغت انسانی قدرت سے خارج ہے۔ اسی لئے میں نے سجدہ کیا
ایک اور اعرابی نے جب آیہ فلما استیئسوا منہ خلصوا نجیا سنی تو کہا کہ خدا کی قسم میں شہادت دیتا ہوں
کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عمر خطاب ؓ ایک دن مسجد میں لیٹے تھے کہ یکایک ایک شخص
سرپر آکھڑا ہوا۔ آپ کے دریافت کرنے پر اس نے جواب دیا کہ میں روم کا بطریق ہوں اور میں نے
ایک مسلمان سے یہ آیت سنی ہے ومن یطع اللّٰہ و رسولہ و یخش اللّٰہ و یتقہ فاولئک ھم
الفائزون مجھے اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ اس آیت کا منبع وہی ہے جو
مسیح علیہ السلام کے اسی کلام کا منبع تھا۔ الغرض اسی قسم کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں
جن سے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے سامنے بڑے بڑے فصحاء عرب نے اپنے عجز کا
اقرار کر لیا۔ جو لوگ فصاحت و بلاغت عربی سے ناواقف ہیں ان کے لئے اسی بات پر اکتفا کرنا
ضروری ہے کہ جب فصحاء عرب عاجز آگئے تو دوسرا کون مقابلہ کر سکے گا؟

(۲) نظم عجیب و اسلوب غریب۔

یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ قرآن مجید کا طریق بیان دیگر فصحا و بلغا کے طریق بیان سے
بالکل نرالا ہے اس امر کو عربی نہ جاننے والا بھی سمجھ سکتا ہے کیونکہ آیات کے مقاطع اور فواصل
یعنی مقامات وقف بالکل نئی قسم کے ہیں جو نہ تو قرآن مجید سے پہلے کسی کلام میں موجود ہیں
اور نہ بعد کے کسی کلام میں اور طرفہ یہ کہ کوئی شخص اس اسلوب کو نباہ نہیں سکتا۔ خواہ کوئی فصیح
و بلیغ ادیب کیسی محنت و کوشش کیوں نہ کرے۔ چنانچہ اس جدید و عجیب اسلوب کو دیکھ کر فصحاء
عرب دنگ رہ گئے کیونکہ انہیں اس اسلوب کا کوئی کلام نثر یا نظم یا سجع یا رجز یا شعر نہ مل سکا
جس کو وہ مقابلہ میں پیش کر سکتے۔ جب ولید بن مغیرہ حضور علیہ السلام سے قرآن مجید سنکر
واپس آیا تو اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ ابوجہل لعین نے اسے ڈانٹا کہ دیکھو
اپنی اس حالت کا قریش کے سامنے اظہار مت کیجو۔ ایسا نہ ہو کہ اس ساحرانہ کلام سے
وہ متاثر ہو جائیں۔ ولید نے کہا کہ تم جو چاہو کرو مگر میں اسقدر کہنے سے تو باز نہیں رہ سکتا

کہ میں کلام عرب میں تم سے بڑھ کر مہارت رکھتا ہوں مگر اس کلام کا مثل آج تک میرے کان میں نہیں پہنچا۔ انہوں نے کہا کیا وہ کلام کسی کاہن کا سجع ہے؟ کہا نہیں۔ انہوں نے کہا کیا کسی دیوانہ کا کلام ہے؟ کہا ہرگز نہیں۔ پھر انہوں نے کہا کیا شعر کی قسم سے ہے اس نے جواب دیا واللہ میں شعر کے تمام اقسام سے واقف ہوں۔ یہ کلام شعر بھی نہیں انہوں نے کہا کیا وہ سحر ہے؟ کہا سحر بھی نہیں مگر تم یونہی کہوگے کہ سحر ہے۔ اکثر آئمہ محققین کا یہ مذہب ہے کہ فصاحت و بلاغت بجائے خود ایک وجہ اعجاز ہے اور اسلوب غریب بجائے خود یعنی ہر دو علیحدہ علیحدہ وجہ اعجاز قرار پا سکتے ہیں مگر بعض دیگر لوگ مجموعہ فصاحت و بلاغت اور اسلوب عجیب کو وجہ اعجاز قرار دیتے ہیں۔ قاضی عیاض اس پچھلے خیال سے مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو شخص قواعد فصاحت و بلاغت سے واقف ہے وہ کبھی تسلیم نہیں کریگا کہ فصاحت و بلاغت بجائے خود اور اسلوب غریب بجائے خود علیحدہ علیحدہ معجز نہیں۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ جودت الفاظ و رشتت معنی مع قواعد بلاغت ایجاز و اطناب۔ حذف۔ تقدیر وغیرہ کسی کلام میں اس طرح نہیں پائے گئے جس طرح قرآن مجید میں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب اسکے مقابلہ سے عاجز آگئے ؛

(۳) اخبار بالمغیبات۔

باوجودیکہ موجودہ زمانہ میں علوم جدیدہ ترقی کے اعلے معراج تک پہنچ گئے ہیں مگر آئندہ وقعات کے متعلق صحیح اور درست خبر دینا کسی فرد بشر کا کام نہیں منجم لوگ بعض اوقات اٹکل پچو کوئی بات کہہ دیا کرتے ہیں اور وہ پوری ہو جاتی ہے مگر اکثر باتیں غلط جاتی ہیں اس لئے اتفاقاً کسی بات کا پورا ہو جانا ہم بھی تسلیم کرتے ہیں مگر سب کی سب باتوں کا پورا ہو جانا اور ان میں سے کسی ایک کا بھی مفہوم لفظ سے سرمو تفاوت نہ کرنا اس امر کی صاف اور واضح دلیل ہے کہ ان الفاظ کا منبع کوئی ما فوق العقل ہستی ہے جس کا علم حضوری ہے نہ حصولی۔ حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے بذریعہ وحی جس قدر پیشینگوئیاں ظاہر ہوئیں اور جنکا جا بجا قرآن مجید

میں ذکر آیا ہے اپنے اپنے وقت میں ٹھیک طور پر واقع ہوئیں تا آنکہ مخالفین نے بھی ان کی صحت کا اقرار کیا۔ حاملانِ قرآن مجید جانتے ہیں کہ اس پاک کلام میں اس قدر پیشینگوئیاں آگئی ہیں کہ کسی دوسری آسمانی کتاب میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ذیل میں بطور نمونہ چند ایک کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:۔

(۱) لتدخلن المسجد الحرام ان شاء الله امنین۔ (تم عنقریب انشاء اللہ با امن و امان مسجد حرام میں داخل ہو گے) ۱۲ منہ

چنانچہ مسلمان صلح حدیبیہ کے بعد مسجد حرام میں داخل ہوئے اور مناسک حج کو بجا لائے حالانکہ ہجرت کے بعد مشرکین یہ کہتے تھے کہ اب مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ہم بیت اللہ سے خارج کر چکے ہیں ٭

(۲) وھم من بعد غلبہم سیغلبون (رومی مغلوب ہو کر عنقریب ایرانیوں پر غالب آجائینگے) ۱۲ منہ

پہلے روم والے مغلوب ہو گئے پھر اس پیشینگوئی کے مطابق رومی سلطنت ایران پر غالب آگئی ٭

(۳) ورفعنا لك ذكرك (ہم نے تیرے ذکر کو بلند کیا) ۱۲ منہ

غور کرو کہ خداوند کریم نے حضور علیہ السلام کے نام مبارک کی کس قدر عزت کی ہے کہ آٹھ پہر میں اہل دنیا کے مسلمان جس قدر آپ کا نام مبارک زبان پر لاتے ہیں یقیناً کسی فرقہ کے لوگ اپنے پیشوا کا اتنا ذکر نہیں کرتے۔ بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو ہزار ہا بار درود شریف ہر روز پڑھتے ہیں۔ جاہل بھی اذان نماز کو سنکر کلمہ پڑھتے ہیں خود اذان و نماز میں آپ کے نام کا ذکر داخل کیا گیا اور یہ پیشگوئی اس وقت کی ہے جبکہ مسلمان ابھی مکہ میں صرف چند تھے اور ظاہر حالات سے یہ قیاس ہوتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکے گا ٭

(۴) لیظھرہٗ علی الدین کلہ (اللہ نے اسلام دے کر اپنے رسول کو بھیجا ہے تاکہ تمام

ادیان پر اسکو غالب کرے) ۱۲ منہ

چنانچہ تمام ادیان باطلہ پر اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا اور حضور علیہ السلام دُنیا سے اس وقت رخصت ہوئے جبکہ تمام عرب میں اسلام کا زور تھا اور آپ نے فرمایا کہ میں جاتا ہوں اور اب قیامت تک عرب میں بت پرستی نہیں ہوگی ؛

(۵) وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض (خدا نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایماندار ہیں اور اعمال صالحہ بجالاتے ہیں خلافت کا وعدہ کرلیا ہے) ۱۲ منہ ؛

علم تاریخ کے واقف جانتے ہیں کہ مسلمان حضور علیہ السلام کے بعد پچاس سال ہی میں مشرق سے مغرب تک پہنچ گئے - اس پیشگوئی کا ذکر ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ مجھے تمام روئے زمین کو مشرق سے مغرب تک خداوند کریم نے اکٹھا کرکے دکھلا دیا اور میری اُمت عنقریب ان حدود تک ترقی کرکے پہنچیگی ؛

(۶) انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (قرآن مجید ہم نے اُتارا ہے اور ہم ہی اسکے نگہبان ہیں) ۱۲ منہ

غور کرو کہ تمام دُنیا میں کوئی اس قسم کی کتاب نہیں ملتی جسکے الفاظ بلا فرق زیر و زبر محفوظ رہ سکے ہوں - بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ کتاب والے نے وہ کتاب اپنے ہاتھ سے نہ لکھی ہو یہ بات کسی دوسری آسمانی کتاب میں نہیں ملتی - توریت و انجیل کا جو حال ہوا ہے وہ ناظرین پر مخفی نہیں - قرآن مجید اگر کاغذوں میں لکھا ہوا تمام دُنیا میں نہ مل سکے پھر بھی قرآن مجید مسلمانوں سے گم نہیں ہو سکتا - کسی مذہب کے لوگوں کو اپنی ساری کتاب کبھی ازبر ضبط نہیں ہوئی مگر مسلمانوں میں لاکھوں حفاظ دُنیا میں موجود ہیں جو ایک ایک حرکت کو بڑی ہی احتیاط کے ساتھ ضبط کرتے ہیں - اگر قرآن مجید میں اس قسم کے تصرف کو دخل ہوتا تو مخالفین مذہب تو کیا مسلمانوں کے اپنے مختلف فرقے آجتک اس کی اصلی صورت کو بدلکر کسی اور صورت

ہیں نے آئے ہوتے ۔

(۷) انا کفینٰک المستھزءین (اے پیغمبر ہم نے تجھ سے استہزا کرنے والوں کا فیصلہ کر دیا ہے) ۱۲ منہ

حضور علیہ السلام کی اہانت کرنے والے مخالفین کا آپ کی زندگی ہی میں اس طرح خاتمہ ہو گیا کہ زمانے نے ان کا پتہ تک نہ دیا کہ وہ کون تھے اور کہاں تھے ؟

(۸) واللہ یعصمک من الناس (اے پیغمبر خدا تجھے تیرے دشمنوں سے محفوظ رکھیگا) ۱۲ منہ

جب اللہ تبارک و تعالےٰ نے آپ کی حفاظت جان کا وعدہ فرما لیا تو آپ نے اس دن سے اپنی جسمانی حفاظت کرنا چھوڑ دیا اور فرمایا کہ خدا مجھکو کبھی دشمن کے بس میں نہیں ڈالیگا ۔

الغرض اس قسم کی اور بہت سی پیش گوئیاں قرآن مجید میں مذکور ہیں اور یہ بات تو اکثر تھی کہ اگر مخالفین کوئی منصوبہ باندھتے تو قرآن مجید فوراً نازل ہوتا اور انکی قلعی کھولدیتا ۔

(۴) اخبار بالامم الماضیۃ ۔

قرآن مجید ان اقوام کا مفصّل ذکر کرتا ہے جنہوں نے انبیا علیہم السلام کی مخالفت کر کے اپنے تئیں مورد عذاب الہٰی ٹھہرایا ۔ حالانکہ حضور علیہ السلام محض امی تھے کبھی گمان نہیں ہو سکتا کہ آپ نے علم تاریخ الاقوام حاصل کیا بلکہ اس زمانے کے علماء یہود و نصاریٰ بھی اسقدر تشریح و بسط حالات سے واقف نہ تھے جو قرآن مجید میں مذکور ہے ۔ اہل کتاب اکثر حضور علیہ السلام سے امتحاناً بعض قصص کی صحت کی بابت سوال کیا کرتے اور صحیح جواب پاتے چنانچہ قصہ اصحاب کہف قصہ یوسف ۔ قصہ ذوالقرنین ۔ قصہ لقمان ۔ قصہ موسیٰ و خضر قرآن مجید میں اسی قسم کی مثالیں ہیں مع ہذا حضور علیہ السلام کے اکثر مواقع پر اہل کتاب کو احکام توریت دربارہ حلال و حرام تبلائے اور حدود اللہ کا پتہ دیا اور بطور اتمام حجت انہیں کہا گیا ۔ کہ اچھا اگر تم میری بات پر یقین نہیں رکھتے تو لاؤ توریت اور پڑھو ۔ آیا اس میں میری بات کی تصدیق ہے یا تمہاری بات کی ۔

یہ سب امور ایک ایسے شخص کی طرف سے ہیں جس نے ایک جاہل سوسائٹی میں پرورش پائی اور ایک دن بھی کسی اُستاد سے سبق حاصل نہیں کیا اور اگر ایسا ہوتا تو حضورؐ کے مخالفین جھٹ مُنہ پر کہدیتے ۔

[(۵) تعجیز و مباہلہ -

علاقہ نجران کے نصاریٰ مباہلہ سے عاجز آکر واپس ہوگئے ۔ کیونکہ اسقف نے اُنہیں کہدیا کہ مجھے یقین آگیا ہے کہ یہ شخص سچا نبی ہے ۔ اگر تم مباہلہ کے لئے سامنے آئے تو ہلاک کر دئے جاؤ گے ۔ چنانچہ وہ سب کے سب مباہلہ سے ڈر کر باز آئے اور آئندہ حضور علیہ السّلام کی تکذیب سے توبہ کر گئے ۔ اسی طرح یہود کو حکم ہوا کہ اگر تم احبابِ اللہ ہونے کا دعوے کرتے ہو تو تم خدا سے موت کی تمنّا کرو ۔ تاکہ دار آخرت میں تمہیں عزت و اکرام کی زندگی نصیب ہو ۔ مگر کسی نے تمنّا ظاہر نہ کی ۔ کیونکہ اُنکے دلوں میں ہیبت وخوف کلام الہٰی کا پورا پورا سکہ جما ہوا تھا ۔

[(۶) خشیت وحشمت -

کسی کلام میں یہ وصف نہ پاؤ گے مگر کلام الہٰی میں یہ وصف نہایت مستحکم طور پر پایا جاتا ہے ۔ چنانچہ خود قرآن مجید اس امر کا اظہار کرتا ہے لوانزلنا ھذا القراٰن علی جبل لرایتہ خاشعًا متصدعًا من خشیۃ اللہ یعنی حقیقت قرآنیہ پہاڑ پر تجلی ہوتی تو وہ خشیت وہیبت وجلال وسطوت الہٰی سے چکنا چور ہو جاتا ۔ یہی وجہ ہے کہ جب عتبہ بن ربیعہ کفار کی طرف سے حضور علیہ السّلام کے پاس آیا تو حضورؐ نے سورہ حٰم سجدہ پڑھنا شروع کی جب اُسنے آیت صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد وثمود سُنی تو اُس نے حضورؐ کے دہان مبارک پر اپنا ہاتھ رکھدیا اور کہا کہ خدا کے لئے بس کر مجھے اس سے آگے سننے کی تاب نہیں ۔ حضورؐ پڑھتے گئے اور عتبہ دو نو ہاتھ حضور علیہ السّلام کی پیٹھ مبارک پر رکھکر کھڑا سنتا رہا ۔ آیت سجدہ میں پہنچکر حضور علیہ السّلام نے سجدہ کیا اور عتبہ واپس

چلا گیا۔ جب اس کے ساتھی اس کے پاس آئے تو ان سے کہنے لگا کہ بخدا اس نے کچھ ایسا کلام پڑھا ہے کہ آجتک میرے کان میں نہیں پڑا۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس کلام کا کیا نام لوں۔ یحیٰی بن حکم اندلس کا فصیح و بلیغ کہتا ہے کہ میں نے بطور امتحان سورہ خلاص کا جواب لکھنا چاہا کہ یکایک میرے دل میں ایک خوف سا پیدا ہوا اور غیر معمولی ہیبت نے مجھے ایسا منکسر کیا کہ بے اختیار میرے آنسو بہنے لگ گئے اور میں نے توبہ کی کتب سیر اور تواریخ میں اس قسم کے بے شمار واقعات صحیحہ موجود ہیں ہر ایک شخص اپنا اطمینان کر سکتا ہے۔

(۷) بقا و ثبات۔

انبیاء علیہم السلام کو جس قدر معجزات عطا ہوئے وہ سب فانی تھے جنکا ذکر بعد میں صرف بذریعہ سماع روایت باقی رہ گیا۔ مگر حضور علیہ السلام کو اس قسم کے معجزات کے علاوہ قرآن مجید ایک ایسا معجزہ ملا جو بدستور تا قیامت قائم رہیگا لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید[1] ٭

(۸) استلذاذ مع التکرار۔

کوئی کلام خواہ کیسا ہی فصیح و بلیغ کیوں نہ ہو طبیعت انسانی کو ملال سکے دوبارہ سننے یا زیادہ مزاولت کرنے سے ایک گونہ ملال پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر قرآن مجید سے باوجود تکرار کے ہر آن میں ایک نئی فرحت و مسرت دل کو حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ یہ وصف قرآن مجید کا تجربہ میں آچکا ہے کہ دنیا کے غم والم دل سے دور کرتا ہے۔ بالخصوص جبکہ تفکر و تدبر سے پڑھا جاوے ٭

(۹) معارف و حقائق۔

کوئی کلام دنیا میں اس قدر وجوہ کثیر کا جامع نہیں جس قدر قرآن شریف چنانچہ اس میں علوم اولین و آخرین درج ہیں باوجود اختصار اور ایجاز عبارت کے اس میں احکام

[1] قرآن مجید میں نہ تو اب نہ کسی بعد کے زمانہ میں باطل کو دخل ہوگا یہ خدائے حکیم و حمید کا نازل کیا ہوا کلام ہے ۱۲

عبادات و معاملات قصص اقوام جمیع مظاہر قدرت - اخلاق - تمدن - اصول سلطنت اسرار مبدء و معاد سلسلہ دلیل و مدلول وغیرہ کا مفصل بیان ہے - چنانچہ آیت ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شیءٍ[1] میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے - اسی خیال کو جناب امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہٗ نے شعر ذیل میں یوں ظاہر فرمایا ہے ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن
تقاصر عنہ افہام الرجال[2]

اور لطف یہ ہے کہ اہل فلسفہ اہل تصوف اہل فقہ اہل ادب الغرض سب کے سب اپنے اپنے مذاق کے مطابق اسے معجز تسلیم کرتے ہیں ؛

(۱۰) ام سہولت حفظ -

تعجب کی بات ہے کہ ان پڑھ لوگ بھی اس کلام کو نہایت عمدگی سے پڑھ سکتے ہیں اور بآسانی حفظ کر لیتے ہیں - برخلاف اسکے کسی دوسری کتاب کا ایک صفحہ بھی ان پڑھ آدمی سے حفظ نہیں ہو سکتا - مسلمانوں میں آٹھ آٹھ نو نو سال کے بچے حافظ قرآن موجود ہیں ؛

میں نے نہایت اختصار کے ساتھ وجوہ اعجاز کا ذکر کیا ہے - کیونکہ اکثر وجوہ اعجاز علوم عالیہ کے جاننے پر موقوف ہیں - مگر ناظرین کی ایمانی تقویت کے لئے یہ بھی کافی ہیں - اس زمانے کے بعض اہل بدعت یہ خیال کرتے ہیں - کہ قرآن مجید کا کلام معجز نہیں - مگر ان کا یہ خیال ویسا ہی بے معنی ہے جیسا انکا بعض دیگر امور قطعیہ سے انکار کر دینا - وہ یہ کہتے ہیں کہ آج تک اگر کسی نے اس کلام کا معارضہ نہیں کیا - تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت اس کا معارضہ نہیں ہو سکتا - مگر میں کہتا ہوں کہ مشرکین بھی تو لو نشاء لقلنا

[1] اے پیغمبر ہم نے تجھ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام اشیاء کی حقیقت کو واضح کرتی ہے ۱۲ منہ

[2] سب علم قرآن مجید میں مندرج ہیں - مگر لوگوں کے افہام انکے سمجھنے سے کوتاہ ہیں ۱۲ منہ

مثل ھذا کہا کرتے تھے۔ پھر کیوں کسی نے ویسا کلام پیش نہ کیا۔ کیونکہ کسی مخالف و موافق سے اس قسم کی کوئی روایت مروی نہیں۔ سچ ہے ؎

وکم من عائب قولا صحیحاً[۲]
وآفتہ من الفہم السقیم

سبحان اللہ اس قسم کے خفاش فطرت لوگ بھی موجود ہیں۔ جو نور قرآن کی تاب نہیں لا سکتے۔ بھلا ان دشمنان عقل سے کوئی یہ تو پوچھے کہ تمہارے پاس کوئی دلیل قطعی بھی ہے یا یونہی عداوت فی سبیل الشیطان کے طور پر اپنے وہم کی پیروی کر رہے ہو اب مجھے اس خدائے خالق السموٰت والارض کی قسم ہے کہ جسکا یہ کلام ہے کہ یہ خیال کلام مقدس پر سراسر اتہام اور بہتان ہے جس کو ایک ایمان دار شخص سُنکر فوراً کانپ اُٹھتا ہے وما قدروا اللہ حق قدرہ۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک کرسچین نے اعتراض کیا تھا۔ کہ مسلمان لوگ قرآن مجید کو فصیح و بلیغ مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس کی فصاحت و بلاغت معجزہ ہے۔ حالانکہ دُنیا میں ہر ایک زبان کی فصیح و بلیغ کتابیں موجود ہے۔ سو یہ اسی قسم کا قیاس ہے جیسے کوئی خاکروب یوں کہنے لگے کہ میں بھی شہنشاہ ہندوستان کی طرح آدمی ہوں۔ اسلئے میرا اور اس کا رتبہ باہم برابر ہے۔ ایسے منطقی اور فلاسفر پادری صاحب کو یوں کہنا چاہئے کہ ہاں صاحب بیشک قرآن مجید وہی حروف تہجی اور قواعد نحو رکھتا ہے جو دیگر کتب مگر فرق صرف اتنا ہی ہے کہ وہ خدائے برتر کا کلام ہے اور یہ عاجز بندوں کا۔ اور خدا اور بندے کے کلام میں وہی فرق ہے جو خدا اور بندہ میں۔ آپ صرف الفاظ کو الفاظ پر قیاس کرنے لگ گئے یہ کیسی سراسر حماقت ہے ؎

تو ز قرآں لفظِ ظاہر را مبیں
دیو آدم را نہ بیند جز کہ طیں

---

[۱] اگر ہم ایسا کلام کہنا چاہتے تو کہدیتے ۱۲ منہ [۲] اکثر لوگ کسی صحیح یا معنی کلام کو ناقص کہدیتے ہیں مگر ان کم بختوں کی اپنی سمجھ کا قصور ہوتا ہے ۱۲ منہ

تبصرہ صاحبو! اِس امر کو خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ کلام الٰہی کا رُتبہ دُنیا کے تمام انواعِ کلام سے برتر اور اعلےٰ ہے۔ جس طرح اس حکیم مطلق کے دیگر مصنوعات کا مقابلہ کوئی انسانی طاقت نہیں کر سکتی۔ بعینہٖ اِسی طرح کلام الٰہی کا معارضہ کرنا ناممکن ہے۔ یا یوں کہو کہ جس طرح تین و پانچ و سات وغیرہ طاق اعداد کا دو صحیح عددوں میں تقسیم ہونا عقل کبھی تجویز نہیں کر سکتی۔ اسی طرح کلام الٰہی کا معارضہ بھی محال عقلی ہے وہ کیسے کج سرشت لوگ ہیں جو بلا دلیل مُنہ سے ایک بات نکال پھینکتے ہیں اور اپنی ہوائے نفس کو قطعی رائے قرار دیتے ہیں؟

فائدہ ناظرین اس نکتہ کو خوب یاد رکھیں کہ کلام الٰہی جو صفت باری تعالےٰ ہے ان معانی و حقائق کا نام ہے جو ذات باری سے متعلق ہیں اور اِس تعلّق کی نوعیّت دیگر صفات مثلاً سمع اور بصر کی طرح مجہول الکنہ ہے یا ناقابلِ دریافت ہے۔ چونکہ صفات ذات باری قدیم ہیں اسلئے کلام الٰہی بھی قدیم ہے۔ قرآن مجید میں جو بار بار انزلنا۔ نزلنا۔ تنزیل۔ تنزل وغیرہ الفاظ کلام الٰہی کے بارہ میں آچکے ہیں ان سے اس کلام کا نازل کرنا مقصود نہیں جو مذکورہ بالا معنی کی رُو سے ذات باری کی صفت ہے بلکہ نزول ان الفاظ کی صفت ہے جنکو ہم روزمرّہ پڑھتے سنتے ہیں۔ ارادہ ازلی سے معانی کی غیر مادی صورتیں قلم نے لوح محفوظ میں مرتسم کیں اور اِن حقائق کو الفاظ کی صورت میں بحکم اللہ تبارک وتعالےٰ جبریل علیہ السلام جناب حقیقت مآب کے پاس لائے۔ کیونکہ جس طرح عالم کی ہدایت کیلئے نوعِ انسان سے انبیاء مبعوث ہوئے اسی طرح وہ ہدایت بھی انسانی کلام کی صورت میں نازل ہوئی۔ تاکہ لوگ بآسانی اسے پہلے پہل الفاظ کی صورت میں سمجھ سکیں۔ بعدازاں بذریعہ تزکیہ و تصفیہ ان کے نفوس میں لوح محفوظ کے حقائق مجردہ غیر مادیہ کے حاصل کرنیکی قابلیت پیدا ہو جائے اور انبیاء علیہم السلام کے نفوس قدسیہ تو اس مقام سے آگے کہیں دُور نکل گئے ہوتے ہیں اور اِن میں بھی مدارج ہیں تلک الرسل فضلنا بعضہم علی بعض۔ اِس طریق ہدایت میں حکمت یہ ہے کہ روحیں چونکہ علم مادی میں زیادہ مستغرق ہونے کی وجہ سے غیر مادی حقائق کا ادراک نہیں کر سکتیں اسلئے بذریعہ مجاہدت و ریاضت

ان میں غیر مادی عالم کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی صلاحیت آجاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان کبھی روحانی منازل کی سیر نہ کر سکتا۔ درحقیقت انسان کے اشرف المخلوقات ہونیکی وجہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ اس کے سوا انسان کو دیگر موجودات پر کوئی وجہ شرف نظر نہیں آتی۔ اسی صلاحیت کی وجہ سے انسان مادی دنیا میں بھی تمام مخلوقات میں تصرف کرتا ہے۔ اس ترقی میں انسان کی مثال بعینہٖ بعض ان حیوانات کی سی ہے جنکو جنگل سے قابو میں لاکر مختلف قسم کے حیلہ اور تدبیر سے سدھایا جاتا ہے۔ انسان بھی جب الفاظ قرآنیہ سے ہدایت کو حاصل کر لیتا ہے تو حسب ریاضت اسے منازل روحانی کی سیر کا موقع پیش آتا ہے ؛

اعجاز قرآن کا مسئلہ کچھ ایسا دلچسپ اور بسیط ہے کہ اس میں ایک محقق کے لئے بحث کی بڑی گنجائش ہے ۔ ۵

فان وجدت لسانا قائلا فقل

اب میں ذیل میں حضور علیہ السلام کی ایک حدیث اور جناب علی کرم اللہ وجہہ کے ایک خطبہ کے بعض فقرات کا ترجمہ لکھکر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں تاکہ ناظرین کیلئے موجب تقویت ایمان اور باعث مزید ایقان ہو ؛

فرمایا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہ خداوند کریم نے قرآن مجید نازل کیا ہے جو گناہوں سے روکتا ہے اور نیک کاموں کی طرف بلاتا ہے۔ یہ پہلے انبیاء علیہم السلام کی سنت کو بیان کرتا ہے۔ اس میں گذشتہ اور موجودہ اور آنیوالی قوموں کے حالات مندرج ہیں باوجود بار بار تلاوت کے طبیعت میں کسی قسم کا ملال پیدا نہیں ہوتا۔ اسکے عجائبات کی تھاہ کا کچھ پتہ نہیں۔ یہ حق ہے کچھ ہنسی مخول نہیں۔ جو شخص اسکو زبان پر لاتا ہے وہ صدق کا اظہار کرتا ہے۔ اور جو شخص اس کے مطابق حکم کرتا ہے وہ عادل ہے۔ اور جو شخص حجت میں اس کو پیش کرتا ہے وہ غالب رہتا ہے اور جو شخص اس کو معیار تقسیم قرار دیتا ہے۔ وہ انصاف

---

۵ اگر تجھے زبان گویا حاصل ہے تو کہے چل ۱۲ منہ

کا پابند سمجھا جاتا ہے - اور جو شخص اسپر کاربند ہوتا ہے خدا کے ہاں مستحق ثواب عظیم ہوتا ہے - اور جو شخص اس سے تمسک کرتا ہے وہ صراط مستقیم پر چلنے لگتا ہے - اور جو شخص اسکو چھوڑ کر کسی اور طریق کو اختیار کرتا ہے - خدا اسکو گمراہ کردیتا ہے اور جو شخص اس کے سوا کسی غیر کی رائے کو حکم بناتا ہے خدا اسکی پیٹھ توڑ ڈالتا ہے - یہ ایک ایسی موعظت ہے جو اسرار حکمت سے لبریز ہے - یہ خدا کا حبل متین ہے - ہر مرض کیلئے کافی نسخہ ہے - جو شخص اس کو مضبوط پکڑ لیتا ہے اسکے لئے سہارا ہے اور جو شخص اسکی پیروی کرتا ہے وہ دنیا و آخرت میں ہر ایک بلا سے محفوظ رکھا جاتا ہے ۰

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے جناب پیغمبر علیہ السلام پر کتاب نازل کی ہے جس کے چراغ کبھی نہیں بجھیں گے اور جن کی روشنی کبھی کم نہ ہوگی - یہ ایک بحر بے پایاں ہے جسکی تھاہ کا کہیں پتہ نہیں لگتا اور ایسا عام شاہراہ ہے جسپر کوئی شخص چل کر کبھی گمراہ نہیں ہوتا - یہ ایک آسمانی نور ہے جسکی شعاعوں کی چمک کبھی ماند نہیں پڑیگی - یہ حق اور باطل میں فرق کرنیوالا ہے - جس کے دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ کبھی کمزور ثابت نہیں ہونگے - یہ ایک ایسی مضبوط اساس ہے جس کے ارکان ابدالآباد تک بودے نہیں ہونگے - یہ شفا ہے جس سے تمام بیماریاں رفع ہوتی ہیں - یہ عزت ہے جس کے انصار کبھی شکست نہیں پاتے - یہ حق ہے جس کے اعوان کبھی اس مدد چھوڑتے نہیں چاتے - یہ ایک معدن ہے جس سے گوہر ایمان پیدا ہوتا ہے - یہ علوم کا جاری چشمہ ہے جو بحر زخار کی طرح موجزن ہے یہ عدل کا لہلہاتا ہوا بوستان ہے جس میں جابجا فوارے لگے ہوئے ہیں - یہ ایک ہرا بھرا وادی ہے جس میں حق کے پودے پھلتے پھولتے ہیں - یہ ایک ایسا چشمہ ہے جس کا آب زلال کبھی خشک نہیں ہوتا - اس شاہراہ پر ایسے منازل ہیں جو سفر کرنے والوں کو طے کرنے پڑتے ہیں اور اس شاہراہ پر نشان ہیں جو چلنے والوں کو گمراہ نہیں ہونے دیتے - یہ ایک بلند پہاڑ ہے جس سے آگے گذرنا محال ہے یعنی یہیں معرفت ذات باری کی غایت ہوجاتی ہے - خدا نے علمائے راسخین

کی پیاس بجھانے کے لئے اس میں سیرابی بھر دی ہے اور فقہا کی نزہت خاطر کے لئے اسے موسم بہار بنا دیا ہے۔ صلحا کے چلنے کا یہی ایک سیدھا راستہ ہے اور یہ ایسا مجرب نسخہ ہے جس کے استعمال کرنے سے کسی قسم کا مرض باقی نہیں رہتا۔ یہ محض نور ہے جس میں ظلمت کا نام کو بھی نہیں یہ ایک مضبوط رسی ہے اور بلند اور مستحکم جائے پناہ ہے اور طالب عزت کے لئے عزت ہے جو اس کے حرم میں داخل ہو اُسکے لئے امن و امان ہے۔ پھر ایک دوسرے خطبہ میں حسب ذیل فرماتے ہیں :۔

سُنو کہ یہ قرآن شریف ایسا سچّا خیر خواہ ہے جو کبھی دغا فریب نہیں کرتا۔ اور ایسا راہنما ہے جو کبھی گمراہ نہیں ہونے دیتا۔ اور ایسا راست گو ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اسکا ہمنشین یا تو اس سے ہدایت لیکر اُٹھتا ہے یا گمراہی۔ سُنو کہ قرآن مجید کا ساتھی کبھی کسی چیز کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ اور بدوں اسکے انسان کو کبھی اس سے نجات نہیں ملتی۔ تم لوگ اسے اپنی بیماریوں کے لئے شفا اور مصائب کے لئے بار بے ریا سمجھو۔ یہ سب سے بڑی خطرناک بیماریوں کفر و نفاق اور غوائت و ضلالت کا قلع قمع کرتا ہے۔ تم اسکو اپنا وسیلہ بناؤ اور اللہ تعالےٰ سے دین و دُنیا کی حاجت روائی طلب کرو اور اسکی محبت کو موجب نُصرتِ خدا سمجھو۔ ہاں اسکو دُنیا کمانے کا دام نہ بناؤ۔ کیونکہ بندہ اور خدا کے درمیان قرآن پاک سے بڑھکر دُنیا میں کوئی مضبوط وسیلہ نہیں ہوسکتا قرآن مجید قیامت کے دن بارگاہِ احکم الحاکمین میں زبردست شفیع اور مقبول الشفاعت اور سچّا گواہ ہوگا۔ اور جس کے برخلاف کہیگا حق کہے گا۔ کیونکہ عرصۂ محشر میں ایک پکارنے والا یوں پکاریگا کہ آج تمام لوگ اپنے اپنے اس علم و عمل کی جوابدہی سے جو مخالفِ قرآن ہے ہائی نہیں پائینگے مگر وہ لوگ جو عامل بالقرآن تھے۔ میں کہتا ہوں کہ تم لوگ اس کو اُٹھالو اور اس کو اپنا امام مقرر کرو اور اسکے پیچھے لگ کر خدا کا پتہ لگاؤ اور اسکو اپنی جانوں کے لئے ناصح مشفق بنالو اگر تمہاری ہوائے نفس[1] کہیں کسی حکم میں اسکی مخالفت کرے تو تم اسے اپنی کم فہمی اور ہوائے نفس

---

[1] اس فقرہ میں ناظرین خوب غور کریں کیونکہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ قرآن مجید کے ظاہر معانی پر بعض لوگ اپنے تئیں محدود رکھکر حقیقت امر سے جاہل رہ جاتے ہیں ۱۲ منہ

کی خیانت پر محمول کرو الحمل لحمل ختم النہایۃ النہایۃ ولا استقامۃ الاستقامۃ ثم الصبر
الصبر والودع الودع +

گو پہلے انبیاء علیہم السلام پر آسمانی کتب نازل ہوئیں۔ مگر حق یہ ہے کہ ان میں اور قرآن مجید میں وہی فرق ہے جو ان انبیاء علیہم السلام میں اور حضور علیہ السلام میں۔ ہر چند ان میں شرائع اور دیانات کے احکام مندرج ہیں اور وعد اور وعید وغیرہ امور کا بخوبی ذکر آ چکا ہے۔ چنانچہ خود قرآن مجید اس امر کو واضح کرتا ہے۔ اِنَّ ھٰذا لفی الصحف الاولیٰ مگر حق یہ ہے ؎

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

قرآن مجید کی نوعیت تعلیم

جو لوگ حقیقت نبوت سے واقف ہیں وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ بعثت نبوت سے مقصود بالذات خلائق کو صرف عقائد حقہ اور اعمال صالحہ کی تلقین ہوتی ہے اور ہیں تمدن و معاشرت و سیاست کے متعلق ایسے احکام بھی تعلیم نبوت کا جزو ہوتے ہیں۔ جو اصلاح آخرت کا ذریعہ ہو سکیں۔ یہ احکام او امر و نواہی کی صورت میں عائد کئے جاتے ہیں مگر ایسے علوم و فنون جنکی تدوین و ترتیب حکمائے محققین کی تحقیقات پر مبنی ہوتی ہے تعلیم نبوت کا جزو نہیں ہوا کرتے کیونکہ زمانہ اپنی طبعی رفتار سے انکی ضرورت کی طرف لوگوں کو خود متوجہ کر لیتا ہے تعلیم نبوت صرف انہیں امور کی متکفل ہوتی ہے جو کسی نہ کسی پہلو میں انسان کی آخرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے مختلف مواقع پر زمین و آسمان کی پیدائش اور مخلوقات عالم کے اختلافات اور مظاہر قدرت الہیہ کا ذکر وارد ہوا ہے۔ مگر یہ سب امور ایسے ہیں جو اثبات صانع عالم کے مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے صفات ذات باری علم و ارادہ۔ قدرت و حکمت کا واضح

کرنا مقصود ہے۔ ان امور کے بیان کرنے میں اِس قسم کی تفصیلات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ جو انسانی تحقیقات سے خود بخود منکشف ہونیوالی تھیں۔ کیونکہ وہ مقاصد شریعت میں داخل نہیں۔ مثلاً آیہ اِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش سے پہلے مادۂ عالم مجموعی صورت میں موجود تھا۔ اس مادہ کو اجزاء لا یتجزیٰ مانو یا الیکٹرونز کی کسی حالت کا نتیجہ مگر یہ باتیں ظنیات فاسدہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اور نہ ان کو مقاصد شریعت میں کچھ دخل ہے اور نہ شریعت نے ایسی باتوں میں ایمان کا انحصار کیا ہے۔ زمین و آسمان اور کواکب کی پیدائش کی کیفیت خواہ تو اسطرح واقع ہوئی ہو جس طرح اہل سائنس کا خیال ہے یا کسی دوسرے طریق پر اہل شریعت انکے وجود سے صانع عالم اور اسکی صفات کاملہ پر استدلال کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کہ سکتے۔ نصوص شریعت سے بظاہر آسمان کا ایک مادی جسم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور عام اہل اسلام اس کے معتقد بھی ہیں۔ مگر بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ وہ کرہ ہوا کے سوا کچھ نہیں چونکہ ان کا یہ خیال کسی قطعی دلیل پر مبنی نہیں۔ اسلئے بمقابلہ نص شرعی جو قطعی دلیل ہے قابل اعتبار نہیں۔ کیونکہ علماء اسلام نے ایک قاعدہ کلیہ باندھ دیا ہے کہ نص شرعی کے الفاظ میں کسی قسم کی تاویل جائز نہیں جب تک کہ قطعی عقلی دلیل معارض نہ ہو۔ مگر سائنس دانوں کا مذکورہ بالا خیال قطعی تو بجائے خود رہا ظن فاسد سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ظن کی بنا پر یقینی بات کا ترک کر دینا کسی عقلمند کا کام نہیں۔ اہل اسلام کا یہ دعوٰی بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسی بات بیان نہیں کیگئی جس کی سائنس تکذیب کر سکے گو قرآن مجید کے اس دعوٰی کی تصدیق سائنس نے تاحال نہیں کی مگر اسکے لئے منتظر رہنا چاہئے بالآخر حق اپنے مرکز پر آ کھڑا ہوگا۔ سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ﴿

ممکن ہے کہ آیہ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ سے کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ قرآن مجید ہر ایک شے کی تفصیل کا مدعی بنتا ہے تو جمیع علوم و فنون کا ذخیرہ اس میں موجود ہونا چاہئے۔ چنانچہ اہل اسلام کا بھی یہی خیال ہے

قرآن مجید میں ہر ایک سوال کا جواب موجود ہے خواہ وہ کسی امر کے متعلق ہو سو اسکا جواب یہ ہے کہ بیشک حضرت علما کا دعویٰ بالکل صحیح ہے مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ ہر ایک علم و فن کے متعلقہ مسائل کی تشریحات اس میں اس طرح دیگئی ہیں جس طرح جامعین علوم و فنون اپنی تصنیفات میں دیا کرتے ہیں۔ کیونکہ اسقدر شرح و بسط الہامی کتب کا دستور نہیں۔ علوم و فنون کی تعلیم جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں مقاصد شریعت میں داخل نہیں۔ بیشک بطریق اشارات اجمالاً آیات قرآنیہ میں سب علوم و فنون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً اظہار انعام کے موقعہ پر گھوڑے۔ گدھے۔ خچر کو انسان کی سواری کی خاطر پیدا کرنیکا ذکر فرماکر جملہ یخلق مالا تعلمون۔ ارشاد فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ زمانہ میں ہم تمہارے لئے ایسی سواریاں بھی پیدا کرینگے۔ جنکا تمہیں اسوقت علم نہیں اہل عرب کو کیا معلوم تھا کہ یہ سواریاں کس قسم کی ہونگی۔ مگر اس جملہ کی تصدیق ان لوگوں نے کردی۔ جو ریل گاڑی۔ موٹر کار۔ بائیسکل۔ ہوائی جہاز پر سوار ہوتے ہیں۔ کیا معلوم کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ سواریوں کی تعداد بڑھ جائے۔ اسی خیال پر یہ مشہور شعر کہا گیا ہے۔ جو امیر المومنین علی ابن ابی طالب کی طرف منسوب ہے ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن
تقاصر عنہ افہام الرجال

یعنی تمام علوم قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ مگر لوگوں کے اذہان انکے سمجھنے سے قاصر ہیں امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر اتقان میں ان علوم و فنون کا شمار کیا ہے جنکی نسبت قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔ واللہ ولی التوفیق ؏

تفسیر بالرائے

وما کان الناس الا امۃ واحدۃ فاختلفوا۔

تفسیر بالرائے کا موضوع ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اور پیچیدگی کی وجہ ظاہر ہے۔ کیونکہ کلام الٰہی کے الفاظ معانی مختلفہ کا احتمال رکھتے ہیں۔ اور طبائع کا انداز استعداد یکساں نہیں۔ مگر باوجود مشکل ہونے کے اس مضمون کی ضرورت بھی بجائے خود واضح ہے۔ کیونکہ قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو ہر ایک سوال کے جواب کا ماخذ صراحتاً یا اشارتاً اپنے اندر رکھتی ہے ؛

واضح ہو کہ ائمۂ دین نے اس کٹھن منزل کا راستہ علم اصول کو واضح کر کے بہت کچھ صاف کر دیا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کو مدنظر رکھکر علماء دین فرمایا کرتے ہیں من ضیع الاصول لم یتیسر له الوصول (جو شخص اصول کا پابند نہیں وہ کسی ٹھکانے نہیں لگتا) اصول کی ضرورت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی علم بھی دنیا میں ایسا نہیں جو بلا اصول رواج پذیر ہوا ہو قانون ملکی۔ دیوانی اور فوجداری کے لئے علوم اصول کی ضرورت ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ مقنن وہی شخص ہو سکتا ہے جو اصول قانون کا خوب واقف ہو۔ جس طرح کج نہاد کبھی سنورتے نہیں، اسی طرح اہل حق کبھی بگڑتے نہیں۔ ہوائے نفس کا خدا ستیاناس کرے جس نے ایک صاف اور سادہ پاک مذہب میں سینکڑوں کیا بلکہ لا تعداد اختلاف پیدا کر دئے ۔

آج اختلافات مذہبی کی یہ نوبت آ پہونچی ہے کہ ایک فرقہ کے دو آدمیوں کے معتقدات بھی کلی طور پر منطبق نہیں ہوتے۔ بھلا ان اختلافات کو سوائے خدا کے کوئی مٹا بھی سکتا ہے۔ ہرگز نہیں آیہ ولا یزالون مختلفین اس اختلاف کی ضرورت پر دال ہے قبل اس کے کہ میں تفسیر بالرائے کی حقیقت متعین کروں مجھے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ناظرین پر چند امور کو واضح کر دیا جاوے۔ اختلاف کی ہمیشہ دو صورتیں ہوا کرتی ہیں (۱) اختلاف بغرض تحقیق حق (۲) اختلاف بغرض اثبات ہوائے نفس۔ پہلا اختلاف محمود ہے بلکہ موجب ازدیاد علم اور دوسرا مذموم بلکہ باعث ازدیاد ضلالت۔ اور یہ تقسیم بعینہٖ تقسیم حیرت کی طرح دو صورتیں رکھتی ہے کیونکہ حیرت بھی (۱) محمود (۲) مذموم ہو سکتی ہے ۔

(۱) اگر کسی عارف حق کو روحانی منازل کے طے کرنے میں معارف حق کا انکشاف خدا کی طرف سے ہونے لگتا ہے تو اسکی حیرت برابر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی حیرت کی بابت حضور علیہ السلام نے اشارۃً فرمایا ہے ربِّ زِدنی فیك تحیرا گویا یہ جملہ ربِّ زدنی علما کا مترادف ہے۔

(۲) کبھی شخص کو کسی مسئلہ کے حل کرنے میں دو متضاد قسم کے دلائل ملیں جن میں سے ایک دلیل تو اس مسئلہ کے اثبات کی مستلزم ہو اور دوسری اسکی نفی کی اور وہ ان دونوں میں تعارض دور نہ کرسکتا ہو تو وہ حیرت زدہ ہوکر رہ جاتا ہے اور کسی پہلو کو بھی یقینی طور پر تسلیم نہیں کرسکتا۔ یہ حالت اکثر کم استعداد لوگوں میں مشاہدہ کی جاتی ہے۔ جو علم قرآن وسنت میں پختہ نہیں ہوتے۔ یہ حیرت ترقی کے لئے واقعی سنگ راہ ہے۔ اسکی طرف قرآن شریف میں بالفاظ ذیل اشارہ کیا گیا ہے کالذی استھوتہ الشیٰطین فی الارض حیران لہ اصحاب یدعونہ الی الھدی ائتنا۔ الغرض اگر اختلاف کی غرض تحقیق مذہب حق ہو تو اس قسم کا اختلاف امت کے لئے موجب رحمت سمجھو۔ چنانچہ اختلاف امتی رحمۃ کا یہی مطلب ہے۔ برخلاف اسکے اگر اختلاف ہوائے نفس پر مبنی ہے تو اس اختلاف کو امت کے لئے باعث زحمت خیال کرو۔ چنانچہ حکم ولا تنازعوا میں اسی قسم کے اختلاف سے روکا گیا ہے۔ دنیا میں کئی ایک صداقتیں اس وجہ سے بھی غیر مقبول رہی ہیں کہ ہم اپنی جگہ پہلے اپنی غلط فہمی سے یا کسی دوسرے شخص پر حسن ظن رکھنے کی وجہ سے چند ایک امور کی صحت کا یقین کرلیتے ہیں اور انہیں دیگر صداقتوں کیلئے محک یا معیار قرار دے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کھینچ تان کر ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ کتاب اللہ سے وہی ثابت کریں۔ جو بر بنائے مسلمات سابقہ ہم پہلے ہی تسلیم

سلہ اے خدا میری حیرت زیادہ کر ۱۲ منہ سلہ اے پیغمبر انہیں کہدو کہ کیا ہم بتوں کو جو بجائے خود نہ تو کچھ مفید ہیں نہ مضر معبود قرار دیکر انکی عبادت کرنے لگیں اور ہدایت حاصل کرچکنے کے بعد پھر ضلالت کی طرف واپس آجاویں اور اس شخص کی طرح ہوجائیں جسکو جنگل میں غول لیکے بیابانی نے سراسیمہ بناکر راستے سے گمراہ کردیا ہو اور وہ حیرت زدہ ہوکر کسی طرف راستہ نہ پاتا ہو اور اسکے ساتھی یوں پکارتے ہوں کہ میاں ادھر آؤ اور وہ سنتا نہ ہو ۱۲ منہ

کرچکے ہیں۔ ایسی صورت میں فیصلہ کا طریق نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہوجاتا ہے۔ لآمعتبار الیہ (۳) ہم بہت کم اس امر کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ ہماری عقل کا مدار کس قدر وسیع ہے۔ بسا اوقات ہم ایسے امور میں بھی بحث کرنے لگ جاتے ہیں۔ جن میں صرف تعلیم وحی حجت ناطق سمجھی جاتی ہے۔ اور عقل انسانی کو انکے تسلیم کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ایسی صورت میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ بعض اوقات کسی حقیقت کا سرے سے ہی انکار کردیتے ہیں۔ حقائق غیر مادیہ یا صور مجرّدہ مثلاً ملائکہ ابلیس جبر و قدر صفات باری حقیقت روح وغیرہ امور اسی قسم کی مثالیں ہیں۔ غلطی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے تجربہ و مشاہدہ کی وسعت کو لامتناہی سمجھنے لگتا ہے۔ اِس لئے اس خیال کی پیروی میں یا تو تاویل پر مجبور ہوجاتا ہے یا انکار پر چنانچہ نیچریت کی بنا اسی خیال پر قائم ہوئی ہے (۴) حقیقت وحی کے سمجھنے میں اکثر لوگ غلطی کرجاتے ہیں چونکہ اِس حقیقت کا سمجھنا بغایت دشوار ہے اسلئے بعض اصحاب اِسکو اپنی تسلّی کے لئے ایک ملکہ فطری قرار دیکر بہت سے حقائق کی اصلیّت کے سمجھنے سے محروم رہ جاتے ہیں اور وہ کبھی انوار معرفت کو جو آفتاب نبوّت سے قلب مومن پر تاباں ہوتے ہیں حاصل نہیں کرسکتے۔ حالانکہ نورِ فطرت اور چیز ہے اور نور وحی اور چیز آیہ نورٌ علیٰ نورٍ کی حقیقت پر غور کرو کہ کس طرح خداوند کریم نے نور وحی اور نور فطرت کو علیٰحدہ علیٰحدہ بیان کیا ہے (۵) جمیع احکام شرعیہ جو عملیات سے متعلق ہیں ایسی تکالیف ہیں جن سے نفس کو طبعاً نفرت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ نفس ہرگز نہیں چاہتا کہ کسی قسم کا مالی یا بدنی نقصان گوارا کرے۔ اس لئے وہ ہمیشہ کسی حکم کی ایسی عملی صورت کا خواستگار رہتا ہے جس میں اسے کافی سہولت مل سکے یا بالکل مرفوع القلم قرار پائے۔ چونکہ ظاہر احکام شریعت اسکی خواہش کو پورا کرنے سے روکتے ہیں اسلئے وہ بظاہر الفاظ آیت سے تمسک کرتا ہے۔ مگر درحقیقت اسکی غرض یہ ہوتی ہے۔ کہ اس میں کسی نہ کسی قسم کی گنجائش پیدا ہوجائے (۶) بعض اوقات بعض لوگ اپنے سابقہ استدلال کی بنا پر ایک رائے کو قطعاً تسلیم کرچکے ہوتے ہیں۔ بعد میں جب اسکے برخلاف صحیح استدلال پر

مطلع ہو جاتے ہیں تو انہیں اپنی رائے کا واپس لے لینا اسوجہ سے دشوار ہو جاتا ہے کہ لوگ انسے بدظن ہو جائینگے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ صاحب رائے کوئی قابل وقعت شخص ہو۔ جسکی رائے عام حالات میں لوگوں کے نزدیک حسن ظن کی وجہ سے حجت سمجھی گئی ہو۔ مگر یہ خیال عموماً حق کی اشاعت کا مانع ہو کر صداقت کو ظاہر نہیں ہونے دیتا البتہ ائمہ مجتہدین میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بعض اجتہادات کو صحت استدلال کے ظاہر ہو جانے پر واپس لیا ہے مگر وہ لوگ مستثنیٰ ہیں کیونکہ انکا اختلاف لئے محض نیک نیتی پر مبنی ہوتا تھا ؛

مذکورہ بالا اُمور اس قسم کے ہیں جو ایک وسیع غور و خوض کا نتیجہ ہے۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ محقق انکی صحت سے کبھی انکار نہیں کریگا ؛

جسقدر کسی کا علم وسیع ہوتا ہے اُسیقدر اسے اپنی رائے پر وثوق کم ہوتا چلا جاتا ہے ایسا شخص کبھی بلا سوچے سمجھے قرآن مجید کے آیات کے مفہوم کی تعیین کا مدعی نہیں ہو سکتا برخلاف اس کے بعض لوگ مروجہ علوم کی تعلیم حاصل کرکے بڑی جرأت سے معانی قرآنمجید کو اپنے خیال کے مطابق تجویز کرنے لگ جاتے ہیں۔ انکے خیال میں قرآن مجید کے سب معانی صرف لفظی ترجمہ سے بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک صاحب نے میرے مذکورہ بالا خیال کی مخالفت میں یہ آیت پڑھ سنائی تھی ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر[1] اور یہ کہا کہ اگر قرآن مجید خاص خاص لوگوں کے سمجھنے تک محدود ہے تو پھر کون اسکی تعلیم سے منتفع ہو سکیگا۔ مینے اس کے جواب میں کہا صاحب بیشک یہ حق ہے مگر آپ اس کا مطلب غلط سمجھے ہیں۔ اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمام وہ اشخاص بھی جو ان علوم سے بالکل بے بہرہ ہوں جن پر قرآن مجید کا سمجھنا منحصر ہے۔ قرآن مجید کے مفسر بن جائیں اور اس کے معانی کو متداول ترجموں سے باتوں ہی باتوں میں حاصل کر سکیں۔ یوں تو علم طب کی کتابیں اور ان کتابوں کے تراجم اور شروح موجود ہیں پھر کیوں سب کے سب طبیب نہیں بن جاتے ...

[1] قرآن مجید کو ہم نے لوگوں پر وعظ قبول کرنے کیلئے آسان کر دیا ہے کیا کوئی ہے جو وعظ قبول کرے ۱۲ منہ

بالکل نہیں اور اطبا کی خدمت کے بوجھ سے سبکدوش ہو جائیں۔ قرآن مجید تو کیا کوئی عام بھی بغیر استاد حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ قرآن مجید کا علم تو سب سے مشکل ہے جو سالہا سال کی محنت اور جانفشانی توجہ اور شوق خلوص اور ذوق سے حاصل ہوتا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی جغرافیہ ہے کہ تفصیلیں اور نقشے بنائیں حفظ کر کے سنا دو گے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید سمجھنا چاہے تو ایک طریق معین پر بآسانی سمجھ سکتا ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے ایف اے کا امتحان پاس کر لینا کسی ایسے شخص پر مشکل نہیں جو پاس کرنا چاہے۔ مگر اس سے کوئی سمجھدار یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ بلا محنت کوشش یا دیگر ابتدائی مدارج کے بدون ہی وہ پاس کر لے۔ سب سے پہلے تمام علوم آلیہ مثلاً صرف نحو۔ ادب۔ معانی۔ بدیع تاریخ جغرافیہ۔ اصول۔ فقہ۔ حدیث اور بعض دیگر علوم متعلقہ وغیرہ کو حاصل کرتے اور پھر قرآن مجید کو ان علوم کی مدد سے حاصل کرتے اور اس میں بھی وہ اپنی رائے کو دخل نہ دیتے بلکہ ظاہر معانی کو احادیث سے ثابت کرتے۔ کیونکہ انہیں یہ خیال برابر مدنظر رہتا کہ اگر اپنی رائے سے وہ کسی معنی کو معین کر دینگے تو بصورت غلطی خدا پر ایک قسم کا اتہام و افترا لازم آئیگا۔ اسی احتیاط کو مدنظر رکھ کر فرقہ حنبلیہ کے لوگ تاویل کرنے کو مستوجب لعنت قرار دیتے ہیں چنانچہ تمام اکابر سلف کا مسلک آیات متشابہات کے بارہ میں تفویض رہا ہے یعنی اس پر ایمان لانا کہ وہ حق ہے۔ مگر اس کی کیفیت سے خاموش رہنا۔

ممکن ہے کہ اس موقعہ پر کوئی شخص مجھ پر مفصلہ ذیل اعتراضات کرے: -

(۱) کیا صحابہ رضوان مذکورہ بالا علوم آلیہ پڑھے ہوئے تھے (۲) کیا قرآن مجید کے معانی جو اکابر مفسرین سلف نے قرار دئے ہیں انکے علاوہ قرآن مجید کے معارف و حقائق دوسرے شخص پر منکشف نہیں ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ علماء دین ہی مدعی ہیں۔ کہ قرآن مجید کے معانی قیامت تک لوگ پیدا کرتے چلے جائینگے۔ مگر وہ کبھی ختم نہیں ہونگے (۳) کیا صحابہ یا بعد کی دو جماعتوں میں بھی کوئی اختلاف درباره معانی قرآن پیدا نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ خود تفاسیر میں اس

قسم کے اختلافات مذکور ہیں۔ سو سوال اوّل کا جواب تو یہ ہے کہ صحابہ واقعی علوم مذکورہ بالا کو اس طرح نہیں جانتے تھے جس طرح بعد کے زمانہ میں یونیورسٹیوں میں لوگ یہ علوم حاصل کرنے لگے مگر انہیں قرآن کے لئے ان علوم کو اس طور پر حاصل کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ خود حضور علیہ السلام کا موجود ہونا انکی قرآن دانی کے لئے کافی حجت ہے وہ بزرگواران اپنے اپنے حوصلہ استعداد کے مطابق قرآن مجید کو بمفحوائے ویعلمہم الکتاب والحکمۃ[ل] خود حضور علیہ السلام سے سیکھا کرتے تھے اور مفہوم آیات کو الفاظ سے صحیح صحیح طور پر اخذ کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں انکے جناب پیغمبر علیہ السلام کے فیضان صحبت سے مستفید ہوتے اور شب و روز فہم قرآن میں علماً و عملاً مشتغل رہنے نے انکو قرآن کی خاطر علوم آلیہ کے حاصل کرنے سے بالکل مستغنی کر رکھا تھا۔ مع ہذا ان کا اہل زبان ہونا اور بھی موجب تقویت حجت ہے*

سوال ثانی واقعی قابل غور ہے۔ کیونکہ یہ قول درحقیقت صحیح ہے کہ قرآن مجید ایسا بحر ناپیدا کنار ہے جس سے تا انقطاع عالم گوہر شاہوار برآمد ہوتے رہیں گے مگر بات صرف اتنی ہے کہ جس طرح سمندر کی تہ سے خاص وہی لوگ موتی نکال سکتے ہیں جو اس کام کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کے معانی بھی سوائے علماء راسخین فی العلم کے صحیح صحیح طور پر دوسرا شخص کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ چونکہ فیضان الٰہی کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے اور خدا نے بموجب مصرعہ ہر کسے را بہر کارے ساختند* اپنی مشیت ازلی اور حکمت کاملہ سے ہر کام کے لئے ایسے افراد منتخب کر رکھے ہیں جو کسی خاص زمانہ اور خاص ملک میں خاص خاص ضرورتوں کو سر انجام دیتے رہیں گے۔ اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کے معارف و حقائق کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے جاری ہے مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہئے کہ اوامر و نواہی میں کوئی شخص کسی قسم کی کمی بیشی کرنے لگ جائے یا انکی نوعیت بدل ڈالے۔ کیونکہ اوامر و نواہی کے آیات ایسے نصوص بینہ ہیں کہ وہ حضور علیہ السلام کے زمانہ سے آجتک بدستور چلے آئے ہیں۔ ہاں جزئیات احکام میں

[ل] جناب پیغمبر انہیں کتاب و سنت سکھلاتے ہیں ۱۲ منہ

حسب ضرورت زمانہ تغیر و تبدل ہونا ممکن ہے۔ اگر ان نصوص بیّنہ میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی گنجائش ہوتی تو آج شریعت اسلامی کے حلال و حرام اور عبادات منصوصہ میں نمایاں فرق آ گیا ہوتا۔ مگر وہ بدستور ہیں اور رہینگے۔ اور دلیل عقلی سے بھی یہ ثابت ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے یہ سوال ہو سکتا ہے کہ پھر ان حقائق و معارف کی نوعیت کیا ہے جبکہ سلسلہ تا قیامت جاری ہے سو اس ضمنی سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ معارف و حقائق شریعت کے حصہ عملی سے متعلق نہیں۔ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کیونکہ عبادات بدنیہ یا مالیہ کی صورت تو جو شروع سے آ رہی ہے وہی ہے جو زمانہ نبوت میں تھی۔ ہاں ان عبادات کے علل اور وجوہ تصفیہ نفس اور نتائج حسنہ ہر ایک شخص کو یکساں حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ جس خوبی اور حسن نیت کے ساتھ کوئی شخص انہیں ادا کریگا۔ اسی کے مطابق اسکا آئینہ قلب منجلی ہوگا۔ اس جہت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حصہ عملی میں بھی معارف و حقائق داخل ہیں مگر ہمیں اس وقت صرف ظاہر احکام شریعت میں گفتگو کرنا مقصود ہے سو انکی نوعیت میں کسی قسم کا فرق نہیں آ سکتا۔ ان حصہ علمی میں جس پر معتقدات کی اساس قائم کی جاتی ہے معارف و حقائق لاتناہی داخل ہیں مثلاً حقیقتاً ایمان میں وجود ملائکہ کا اقرار بھی داخل ہے مگر ایک کثیف فطرت کا آدمی سوائے اقرار اور تصدیق کے کیا سمجھ سکتا ہے۔ لیکن ایک شخص جو منازل روحانی طے کرکے درجہ ولایت کو حاصل کر چکا ہو اور سلطان محبت الٰہی نے بمضمون اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً[1] اسکے مملکت دل کو شیطان و نفس وغیرہ ظالموں کے ہاتھ سے چھڑا لیا ہو اور نور معرفت سے اس مملکت کے در و بام چمک اٹھے ہوں۔ اس قسم کے امور کی حقیقت واقعیہ کا علم حاصل کرکے دوسروں کے سامنے ایسے مناسب پیرایہ میں بیان کرے گا جس سے وہ لوگ قاصر ہیں۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص خود کسی چیز کی حقیقت سے ناواقف ہے کسی دوسرے کو اس کا افادہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مسئلہ توحید میں جو شریعت اسلامیہ کا نہایت عمیق راز ہے ایک کثیف الفطرت آدمی صرف اسی پر قانع ہو سکتا ہے کہ خدا ایک ہے اور وہ

---

[1] بادشاہ لوگ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں کے بڑے بڑے اکابر و رؤسا کو ذلیل کرتے ہیں ۱۲ منہ

ایسے ایسے صفات کا مالک ہے جو کسی غیر کو حاصل نہیں۔ مگر کیا ایک عارف کامل بھی اسی پر قناعت کریگا ہرگز نہیں ؎

شربت الحب کاسا بعد کاس

فما نفد الشراب ولا رویت

چونکہ یہ سب معارف و حقائق آیات قرآنیہ کے پردہ الفاظ سے جلوہ گر ہوتے ہیں کسی اور جگہ سے اسلئے یہ جملہ و تھی صحیح اور درست ہے کہ قرآن مجید کے معارف و حقائق لاتناہی ہیں چنانچہ آیہ قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مگر میں اس پہلو کو چھوڑ کر الفاظ کے ظاہری پہلو کی نسبت بھی یہی ایمان رکھتا ہوں۔ کہ کوئی شخص آیات قرآن کے تراکیب مثلاً حذف۔ تقدیر۔ تقدیم۔ تاخیر۔ حصر۔ قصر۔ ایجاز۔ اطناب۔ استیناف۔ توضیح ابہام۔ اجمال۔ تفصیل۔ متشابہ۔ محکم۔ مجاز۔ حقیقت۔ مطلق۔ مقید۔ عام۔ خاص وغیرہ امور کی حقیقت سے پورے طور پر کبھی واقف نہیں ہو سکتا۔ علمائے سلف جن کے مبلغ علمی کا عشر عشیر بھی آج شاید ہی کسی کو نصیب ہو باوجود امور مذکورہ بالا میں پوری پوری تنقیح کرنے کے آخر یہی کہتے رہے سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ زمانہ کی ترقیات کے لحاظ سے قرآن مجید کے احکام میں تغیر و تبدل ہوتا رہیگا۔ افسوس کہ بعض دہریت مزاج لوگوں نے قرآن مجید کے نامتناہی حقائق و معارف کو اسی تاویل پر محمول کیا ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ ممکن ہے کہ کسی مسئلہ کی توجیہ بہ نسبت مفسرین سلف کوئی شخص بہت عمدہ پیدا کرے مگر یہ کبھی نہیں ہوگا کہ وہ کسی حکم

لہ ہر شراب کے جام پر جام پیتا گیا۔ مگر نہ تو شراب ہی ختم ہوئی اور نہ میں ہی سیراب ہوا ۱۲ منہ ۵۲ سے کہدے پیغمبر کہ اگر میرے خدا کے کلمات بند کرنے کے لئے سمندر کا پانی بجائے سیاہی کے استعمال کیا جاتا تو انکے ختم ہونے سے پہلے سمندر کا پانی ختم ہو جاتا۔ بلکہ اسکے برابر اور بھی استعمال ہوتا تو بھی ناکافی تھا ۱۲ منہ سے تو پاک ہے ہم کچھ نہیں جانتے مگر وہی جو کچھ تو نے ہم کو سکھایا بیشک تو بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے ۱۲ منہ

کی نوعیت کو بدل ڈالے مثلاً سود حرام ہے اسلئے یہ حکم شریعت اسلامی میں تاقیامت قائم رہیگا گو کوئی اہل بدعت جواز کا فتویٰ شائع کر ہی دے اور وہ طبیعتیں جن پر یوروپین لائٹ یعنی مغربی ظلمت کا اثر پڑ چکا ہے ایسے فتوے سے خوش ہو جائیں یا مثلاً حج بشرائط معینہ فرض ہے۔ پس یہ فرض ہی رہیگا۔ گو کوئی بدعتی شخص لندن کی سیر کو زیارت بیت اللہ پر ترجیح دے کر اہل ہوا کو خوش کرے اور حج کو کسی نامہذب زمانہ کی وحشیانہ رسم پر محمول کر کے انہیں اس بوجھ سے سبکدوش قرار دے۔ الغرض قرآن مجید کے مسلمہ احکام متعلقہ عبادات اور حلال وحرام وغیرہ میں تاقیامت کسی قسم کا فرق نہیں آئیگا۔ کیونکہ یہ آخری اور قطعی شریعت ہے جو اہل بنا پر بطور حجت قرار دیگئی ہے۔ اگر کوئی شخص ایسے احکام کلیہ میں کسی قسم کی دست اندازی کریگا تو وہ دشمنان خدا ورسول کی جماعت میں داخل سمجھا جائیگا۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ بیشک صحابہ رضہ میں جزئی اختلاف پیدا ہوتے تھے۔ مگر خلیفہ وقت کے فتویٰ پر عمل کیا جاتا اور کسی کو مجال انحراف نہ ہوتی۔ اس قسم کے سینکڑوں واقعات کتب تواریخ میں قلمبند کئے گئے ہیں اور سچ پوچھو تو اسلام پاک کی صلبیت بھی زمانہ خلافت تک قائم رہی کیونکہ ان بزرگواروں میں باآنکہ ہر ایک علم وعمل میں یگانہ تھا مگر پھر بھی ایک کو دوسرے کی نسبت ہوا علم منی کا گمان نہ تھا۔ برخلاف ہمارے موجودہ مسلمانوں کے جن میں ہر ایک انا اسلم منہ پکارتا پھرتا ہے۔ بعد میں جوں جوں زمانہ نبوت سے بعد ہوتا چلا گیا اختلاف کی نوعیت اور مقدار بڑھ گئی تھی مگر تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے زمانہ تک تو کچھ خیر تھی جونہی کہ معتزلہ نے لِمَ اور لانسلم کا دروازہ کھولا اختلافات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ یہ اختلافات زیادہ تر معتقدات کے حصہ میں واقع ہوئے۔ تب سے یوں سمجھو کہ اسلام پاک کے نورانی چہرہ پر مختلف قسم کی بدعات کا غبار چھا گیا۔ گویا یہ فساد اختلاف ایک سیلاب عظیم تھا جس نے ایمان کی مضبوط جڑھ کو دلوں سے اکھاڑ پھینکا۔ فلسفہ وطبعیات اور دیگر علوم حکمیہ کے اصول معانی قرآن کی صحت کے لئے معیار قرار پائے۔ ہر ایک شخص کو اپنے اپنے ثبوت

علما کے لئے اس امر کی ضرورت پڑی کہ الفاظ و تراکیب سے وہی بات نکالے جو اس کے مفید مطلب ہو - علامہ رازی کی مشہور تفسیر کبیر اس دعوٰی کی تائید کرتی ہے +

چونکہ اہل حق[1] کا فرقہ ہمیشہ غالب رہا ہے اس لئے ایسے خطرناک زمانہ میں اس فرقہ کے علما نے قرآن مجید کو کافی حجت سمجھ کر ان لوگوں کا مقابلہ کیا اور اپنے دعاوی کی تائید میں سنت و اجماع امت کو پیش کر کے انکے معتقدات باطلہ کی پوری پوری تکذیب کی - یہی وجہ ہے کہ ان علما کی کتب تفاسیر میں آیات قرآن مجید کی تفسیر میں صحابہ اور بعد کی دو جماعتوں کے اقوال کو نقل کیا جاتا ہے - کیونکہ بموجب فرمان نبوی اور نیز بہ شہادت عقلی انہیں کے اقوال قابل اعتبار قرار پا سکتے ہیں +

ہاں اس موقعپر ایک اور بات قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض مقامات میں ان ہر سہ طبقہ کے لوگوں کے اقوال میں بھی اختلاف موجود ہے - مثلاً اگر کسی آیت کے شان نزول یا تعیین مفہوم میں دو مختلف اقوال موجود ہیں جن میں بظاہر کوئی وجہ تطبیق نظر نہیں آتی تو کسی معترض کا حق ہے کہ وہ اس بنا پر کسی قول کو مسلم نہ سمجھے - سو اسکا جواب یہ ہے کہ واقعی بظاہر یہی بات ثابت ہوتی ہے مگر علمائے اسلام نے یہ راستہ بالکل صاف کر دیا ہے کسی مفسر کا مفسر ہونے کی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ طبقات ثلاثہ کے اقوال نقل کرے مگر صرف اسی پر اکتفا نہیں ہوگا بلکہ ان مختلف اقوال کی قوت و ضعف کا موازنہ کرنے کے لئے انہیں کتاب اللہ اور سنت اور دیگر اقوال پر پیش کر کے ان میں سے کسی ایک کی صحت و عدم صحت کا اندازہ لگایا جائیگا یا ان میں وجہ مطابقت بیان کر دی جائیگی - چنانچہ راجح و مرجوح اقوال کو اسی اصل پر علمائے اسلام نے کتب تفاسیر و احادیث میں واضح کر دیا ہے - اس لئے یہ خیال بالکل بے معنی ہے کہ تفاسیر میں چونکہ بہت سے اختلافات لکھے ہیں اسلئے وہ قابل اعتبار نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان اختلافات ہی سے ہمیں یہ بات ہاتھ لگی ہے کہ فلاں قول صحیح ہے اور فلاں

[1] اہل حق سے مراد وہ فرقہ ہے جو قرآن و سنت و اجماع کو حجت تسلیم کرتا ہے کیونکہ باقی تمام فرقے صراط مستقیم سے منحرف ہیں ۱۲ منہ

غیر صحیح۔ ہاں جن طبائع پر ہوائے نفس غالب آگئی ہو انہیں بے شک او نگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ کوئی نہ کوئی حیلہ مل ہی جاتا ہے جس سے وہ اثبات دعویٰ میں کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں مار لیتے ہیں مگر الحمدللہ کہ علمائے اسلام نے رضا انہیں جزائے خیر دے کوئی بات مبہم و مغلق نہیں رہنے دی جسکی توضیح و انکشاف کے لئے ہمارے اس زمانہ کے نیم محقق کمر باندھیں۔ سنو! میں یہ دعویٰ کرتا ہوں اور بآواز بلند کہتا ہوں کہ اسلام پاک کی تعلیم کو ہمارے علمائے سلف نے ایسے طور پر صاف کر دیا ہے کہ میں کبھی یہ تسلیم نہیں کرونگا کہ کوئی شخص کوئی ایسا نیا مسئلہ پیدا کرتا ہے جس کو سلف نے طے نہیں کیا۔ جس قدر اعتراضات عائد ہو سکتے ہیں سب کے سب حضور علیہ السلام کے زمانہ میں عائد کیے گئے اور سب کا جواب قرآن مجید اور احادیث میں موجود ہے۔ انہیں کو ہمارے علمائے اسلام نے کتب مدونہ میں قلمبند کیا ہے۔ اگر کسی شخص کو کوئی نیا اعتراض سوجھے تو وہ علمائے راسخین کے پیش کرے۔ انشاء اللہ تعالےٰ وہ علمائے سلف کی کتب سے جواب دینگے۔ اور اگر بالفرض کتب سلف میں نہ ہو تو قرآن مجید میں تو یقیناً اس کا جواب مذکور ہوگا۔ یہ لوگوں کی اپنی کم استعدادی اور کم ہمتی ہے کہ انہیں کتاب اللہ یا کتب سلف پر نظر نہیں یا ہمارے علماء موجودہ کا قصور ہے کہ وہ معترضین کو مطمئن نہیں کر سکتے یا نہیں کرتے۔ الغرض شریعت کا کوئی عقیدہ یا مسئلہ غیر منفصل نہیں رکھا گیا جس میں آجکل کے ترجمہ خوانوں کے اجتہاد کی ضرورت ہو۔ جو نہ تو اصول سے واقف ہوتے ہیں اور نہ فروع سے اور جو نہ معقول جانتے ہیں نہ منقول ہاں ریاضی اور سائنس اور فلاسفی ان کے ان تمام مشکلات کے حل کرنے کا آلہ ہیں مگر افسوس کہ ان آلات سے وہی کام نکل سکتا ہے جو ان سے مخصوص ہے۔ قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے کچھ اور آلہ علمیہ کی ضرورت ہے۔

مذکورہ بالا تمہید کے بعد میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ تفسیر ہلالیہ کا مفہوم کیا ہے؟

---

۵ ملک میں کئی ایک اصحاب ایسے ہیں جو علوم عربیہ سے نابلد ہیں مگر وہ کامل مجتہد بھی ہیں۔ حرمۃ

جسکی شارع علیہ السّلام نے زور کے ساتھ ممانعت کی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضورؐ نے یوں ارشاد فرمایا ہے "من فسر القرآن برایه فلیتبوء مقعدہ من النار"[1]

یہ ظاہر ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ رائے کو فہم معانی میں مطلقاً دخل نہیں کیونکہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ قرآن مجید کے سب معانی جنکو میں پہلے لامتناہی کہہ چکا ہوں یا کم از کم وہ معانی جو مفسرین نے قائم کئے ہیں اور جنکو ہم تسلیم کرتے ہیں حضور علیہ السّلام سے دہناً مسموع ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضور ابن عباس رضؓ کے حق میں بالفاظ اللّٰھم علمہ التاویل[2] نہ فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معانیٔ قرآن میں رائے کو دخل ہے۔ پھر ایک دوسری حدیث میں حضورؐ فرماتے ہیں ان للقرآن ظھراً وبطناً وحدًا ومطلعًا[3] اور امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں لو شئت لاوقرت سبعین بعیرًا من تفسیر فاتحۃ الکتاب[4] ابو الدرداؓ فرماتے ہیں لایفقہ الرجل حتی یجعل للقرآن وجوھًا[5] پھر ایک بزرگ یوں لکھتے ہیں لکل آیۃ ستون الف فہم دما بقی من فھمھا اکثر[6]۔ ان روایات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ میں اجتہاد اور رائے کو دخل ہے۔ یہ خیال نہ صرف احادیث و اقوال سے ثابت ہوتا ہے بلکہ آیت لعلمہ الذین یستنبطونہ سے استنباط جو ایک گونہ اجتہاد کا مترادف ہے اور جس کی بنا رائے پر مبنی ہے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ گو مجملاً گذشتہ سطور میں ایسی رائے کی تعیین ہو گئی ہے جو فہم قرآن میں قابل اعتبار ہو سکتی ہے تاہم یہاں مجھے واضح طور پر ایسی رائے کو معین کرنا چاہئے۔ مجھے اُمید ہے کہ ناظرین پورا پورا غور فرمائینگے کیونکہ دین کا معاملہ ایسا سرسری نہیں کہ ایک محقق اسکو اخباری مطالعہ کے طور پر پڑھ جائے اور کسی یقینی رائے تک نہ پہنچے۔ عوام الناس کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی

---

[1] جو شخص اپنی رائے سے قرآن شریف کی تفسیر کرتا ہے اسے جہنم میں اپنا ٹھکانا بنانا چاہئے ۱۲ منہ [2] اے خدا اسے معانیٔ قرآن کا فہم عطا کر ۱۲ منہ [3] قرآن کی ایک پشت ہے اور ایک شکم اسکی حد ہے اور ایک جائے طلوع ۱۲ [4] اگر میں سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھتا تو ستر اونٹ کا بوجھ کتابیں لکھ ڈالتا۔ بعض روایات میں اربعین بھی آیا ہے ۱۲ منہ [5] علم دین میں آدمی پورا فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک قرآن مجید کے مختلف وجوہ آیات کو نہ سمجھے ۱۲ منہ [6] ہر ایک آیت کے لئے ساٹھ ہزار وجہ تجویز ہو سکتے ہیں مگر پھر بھی جو باقی رہ جاتے ہیں انکی مقدار وجوہ مجوزہ سے بہت زیادہ ہے ۱۲ منہ

شخص کی پُر زور تقریر اور دلائل عقلیہ کو سنتے ہیں تو چونکہ ان کا اپنا مبلغ علم بہت محدود ہوتا ہے اسلئے وہ ایسے شخص کی تحقیق کو جھٹ تسلیم کر لیتے ہیں۔ دنیا میں کئی ایک مثالیں ایسی ملینگی جن سے ثابت ہوگا کہ بہت لکھنے والے یا بولنے والے آدمیوں نے مختلف مواقع پر اپنا سکہ و خطبہ جما کر گروہ گروہ خلقت کو اپنا تابع بنایا ہے۔ جو لوگ کسی رائے کو تسلیم کرانا چاہتے ہیں انکے لئے اس وصف کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ مگر ایک ایسا شخص جس کو خدا نے نور فطرت سے محروم نہیں رکھا اور وہ کتاب اللہ کو علمائے راسخین کے طریق پر سمجھتا ہے۔ اس قسم کے قلاب دغابازوں۔ اخوان الشیاطین کے دام میں کیوں آنے لگا؟ اس تقریر سے میرا مطلب یہ ہے کہ مذہب کا معاملہ ایسا آسان نہیں کہ کوئی حق یا باطل کو بآسانی طے کر سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو اسقدر اختلافات دنیا میں موجود نہ ہوتے۔ اس لئے کسی رائے کے تسلیم کر لینے سے پہلے پہلے ہمیں ان علمائے دین کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو ہوائے نفس میں گرفتار نہ ہوں اور ان کی اعتقادی اور عملی حالت عین بزرگان سلف کے مطابق ہو۔ اس اصل کی پابندی نہ کرنے سے دنیا میں ہزاروں لوگ گمراہ ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ قرآن مجید کی تفسیر بالرائے کے متعلق بعض مفسرین نے حسب ذیل بحث کی ہے:-

امام حجۃ الاسلام غزالی احیاء جلد اول میں لکھتے ہیں فالنھی اما عن التاویل علی وفق مالہ من الرای الذی لولاہ لم یلح لہ کون یلبس علے خصمہ بالتمسک عایۃ بانہ یعلم انہ لیس المراد منھا کمن یدعوالی مجاھدۃ النفس فیتمسک بقولہ عزوجل اذھب الی فرعون انہ طغی ویشیر الی نفسہ وقد تکون الایۃ محتملۃ فیمیل فھمہ الی ما

له تفسیر بالرائے سے مخالفت کے یا تو یہ معنی ہیں کہ ایسی تفسیر الفاظ قرآن کی نہ کرے جو اس کی اس رائے کے موافق ہو جسکو پہلے سے وہ اپنے سر اصول پر تسلیم کر چکا ہے اور جسکا اگر پہلے سے تسلیم نہ کر چکا تو یہ معنی اسکو نہ سوجھتے مثلاً ایسا شخص جو اپنے مخالف کو کسی آیت کے پیش کرنے سے وہم کا دینا چاہتا ہے یا اگر ہمکو معلوم ہے کہ الفاظ قرآن کا یہ مفہوم نہیں جیسے کوئی شخص نفس کی ریاضت و مجاہدت پر آیۂ اذھب الی فرعون انہ طغی (اے موسیٰ فرعون کی طرف جا وہ سرکش ہو گیا ہے) سے استدلال کرنے لگے کہ فرعون سے نفس امارہ مراد ہے اور موسیٰ سے قوت عاقلہ۔ اور کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ الفاظ آیت دو معنی کا احتمال رکھتے ہوں اور وہ انہیں معنی کو متعین کر لے جو پہلے تسلیم کر چکا ہے اور یا تفسیر بالرائے سے مخالفت کے یہ معنی ہیں کہ ظاہر حکم ترک کر کے باطن کو اختیار کرے مثلاً نماز سے مراد دل کی نماز ہے سو ایسا شخص دروازے سے گذرے بغیر ہی اندر جانا چاہتا ہے ۱۲ منہ

بوافق غرضہٗ واما من لتبادر الی الباطن قبل احکام الظاھر بانہ کالبالوغ الی صدر البیت قبل مجاوزۃ الباب اور شارح التاویلات یوں لکھتے ہیں اجمعوا علے استخراج معانیہ بالرای واختلفوا فی التوفیق بینہ وبین الاحادیث فقیل التفسیر بیان سبب النزول و التاویل بیان ما یحتمل اللفظ وقد جعل اللہ القرآن اصلا لجمیع ما یحتاج الیہ ولیس کلہ منصوصا فلا بد من الاستخراج بالرای یا لعرض علے الاصول اور بعض ائمہ یوں لکھتے ہیں التفسیر بیان حقیقۃ اللفظ اذا علمت والتاویل صرف اللفظ المحتمل الی بعض وجوھہ لموافقتہ للاصول فلو قطع منہ کان تفسیرا بالرای اور شیخ ابو منصور لکھتے ہیں التفسیر ھو القطع فان کان ثمۃ دلیل قطعی صح والا حرام لما فیہ من الشہادۃ علے اللہ بما لا یؤمن فیہ الکذب والتاویل بیان عاقبۃ الاحتمال بغالب الرای بلا قطع ۔

بعض یوں لکھتے ہیں کہ تفسیر بالرائے ایسے معنی کو بولتے ہیں جو محض معیار عقل پر قائم کئے جائیں اور اصول یعنی کسی دوسری آیت محکم یا حدیث متواتر یا اجماع امت کے مطابق ان کو نہ مقرر کیا گیا ہو ۔علاوہ ازیں علماء کے اور بھی اقوال اس باب میں مذکور ہیں مگر ان سب میں بطور قدر مشترک اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ تفسیر بالرائے وہ ہے جو قواعد علم اصول کے مطابق نہ ہو۔ اسی خیال پر علماء نے من صنیع الاصول لم یتیسر لہ الوصول کہا ہے جس کو میں شروع میں لکھ چکا ہوں۔ گو اس اتفاق کے رُو سے تفسیر بالرائے کی تعیین ہو جاتی ہے مگر مرا تب

---

[1] علماء نے رائے سے معانی قرآن مجید کے استنباط پر اتفاق کیا ہے اور حدیث میں جو ممانعت آئی ہے اسکے ساتھ اس جواب کو تطبیق مطابقت دی ہے کہ تفسیر ان معانی کو کہتے ہیں جو آیات کے سبب نزول کو بیان کریں اور تاویل ان معانی کو بولتے ہیں جنکا الفاظ آیت سے احتمال پیدا ہو سکتا ہے اور خداوند کریم نے قرآن مجید کو تمام ضروریات کے لیے اصل قرار دیا ہے اور سب کا سب واضح نہیں رہا کہ آثار ثانی منشاء بعید واشارہ بالطریق رمز حاصل ہوتے ہیں تو اسلئے رائے کو اصول کے مطابق قائم کرنا ضروری ہے اور جسکا تفسیر لفظ کے حقیقی معنی کے بیان کا نام ہے جبکہ اسکا علم ہو اور تاویل لفظ کو اصول کے مطابق ایسے وجوہ کی طرف لیجانا جسکا وہ لفظ احتمال ہو سکتا ہے اگر اصول کے مطابق نہ ہو تو تفسیر بالرائے ہوگی ۱۲ ۔ شیخ ابو منصور کہتے ہیں کہ تفسیر قطعی معنی کو کہتے ہیں اسلئے اگر وہاں کوئی قطعی دلیل موجود ہوگی تو وہ معنی صحیح ہونگے ورنہ ممنوع ہے کیونکہ بلا دلیل معنی کو قائم کرنا ایک گونہ اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایک ایسی شہادت کا قائم کرنا ہے جس میں جھوٹ کا احتمال ہو سکتا ہے اور تاویل بلا یقین غالب رائے پر لفظ کے احتمالی معنی بیان کرنے کو بولتے ہیں ۱۲ منہ

ذیل بھی ایک گونہ اس باب میں اس کی توضیح کرتے ہیں :-

(۱) جو شخص محض انسانی تجربہ و مشاہدہ کو معیار کلی تسلیم کرتا ہو اور اپنی رائے کو بر بنائے اُصول فلسفہ ناطق سمجھتا ہو۔ معانی قرآن میں اس کا قول مسموع نہیں اگرچہ وہ صحیح معنی بیان کرتا ہو۔ ایسے شخص کے قول کو باطل سمجھو۔ اس خیال کی مؤید حدیث ذیل ہے :-

من[1] قال فی القرآن برأیہ فاصاب فقد اخطاء - مع ھذا سلف صالحین کا یہی طریق رہا ہے کہ وہ بلا صحیح علم کے معانی قرآن کے بیان کرنے سے محترز رہتے تھے - قال الترمذی واما[2] الذی روی عن مجاھد و قتادۃ وغیرھما من اھل العلم انھم فسروا القرآن فلیس الظن بھم انھم قالوا فی القرآن او فسروہ بغیر علم او من قبل انفسھم وقد روی عنھم ما یدل علی ما قلنا انھم لم یقولوا من قبل انفسھم بغیر علم اس لئے اگر کوئی شخص بغیر استاد علوم ضروریہ یعنی کتاب اللہ یا سنت یا اجماع امت کوئی معنی بیان کرے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم مطلقاً اس کی پروا نہ کریں جب تک ان معنی کا ماخذ وہ شخص بیان نہ کرے۔

(۲) جو شخص سنن و فرائض کا اس طریق پر پابند نہیں جو سلف صالحین کا تھا یا یوں کہو کہ اس کو اللہ کے ذکر کا درجہ نصیب نہیں ہوا تو اس کا قول ہرگز مسموع نہیں ہوگا - کیونکہ ایسا شخص ہوائے نفس کا تابع ہے جو مانع حق ہے - ایسے بہت سے لوگ ہیں جو یوں تو علم رکھتے ہیں مگر ان کا تدین درست نہیں ہوتا - قرآن مجید کا حکم ہے ولا[3] تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھواہ وکان امرہ فرطا۔

(۳) جو شخص بدعت پھیلاتا ہو یا دنیوی ہوا و ہوس میں مبتلا ہو یا اپنی کوئی مخفی جماعت

---

[1] جو شخص اپنی رائے سے قرآن کے معانی بیان کرتا ہے اور صحیح کہتا ہے تو وہ خطاکار ہے ۱۲ منہ [2] اور جو مجاہد و قتادہ وغیرہ اہل علم سے مروی ہے کہ انہوں نے قرآن کی تفسیر کی سو ان کے حق میں یہ گمان صحیح نہیں کہ انہوں نے اپنی رائے سے یا بلا علم اپنی طرف سے تو کوئی معنی بیان کئے ہوں اور ہمارے اس خیال پر یہ روایت دال ہے کہ انہوں نے بلا علم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا ۱۲ منہ [3] جس کا دل ہمارے ذکر سے غافل ہو اور وہ ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہو اور صراط مستقیم سے منحرف ہو اس کی بات مت مانو ۱۲ منہ۔

قائم کرنا چاہتا ہو اُس کا قول ناقابلِ اعتبار ہے۔ وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ۔ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون ؞

(۵) ایسے شخص کے قول پر اعتماد نہیں ہونا چاہیئے جو سنت یا اجماع صحابہؓ کو حجت نہیں تسلیم کرتا۔ کیونکہ ایسا شخص خذوا ما اتکم الرسول اور ومن یتبع غیر سبیل المؤمنین کے مقتضا پر عامل نہیں کیونکہ ان آیات سے سنت اور اجماع کا وجوب ثابت ہوتا ہے ؞

مذکورہ بالا امرات گو بظاہر مختلف صورتیں رکھتے ہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سب کے سب ہوائے نفس کا نتیجہ ہیں ؞

خلاصہ اور حاصل مذکورہ بالا تقریر کا یہ ہے کہ جو شخص اس طرح قرآن شریف کے معانی بیان کرتا ہے کہ ان معانی کا ماخذ کتاب اللہ یا سنت یا اجماع اُمت نہ ہو اور وہ اصول آئمہ دین کی جو تفسیر قرآن کے لئے موضوع ہیں پیروی نہیں کرتا اور اپنی طرف سے ایک ایسی بات پیدا کرنا چاہتا ہے جسکی تائید مذکورہ بالا طریقوں پر نہیں ہوسکتی تو ایسے شخص کے مجوزہ معانی تفسیر بالرائے کہلائینگے مثلاً اگر کوئی شخص مسیح علیہ السلام کے بلا باپ پیدا ہونے کا انکار کردے باآنکہ قرآن مجید اسکو بطور آیات بینات ثابت کررہا ہے اور اجماع اُمت اس پر قائم ہوچکا ہے تو ایسا شخص تفسیر بالرائے کرتا ہے اور ہوائے نفس کا تابع ہے۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں ای ارض تقلنی وای سماء تظلنی اذا قلت فی القرآن برایی یعنی میں کس زمین پر رہونگا اور کس آسمان کے نیچے رہونگا جبکہ میں قرآن میں اپنی رائے کو دخل دونگا۔ مگر ایک ہمارا زمانہ ہے کہ جہاں علوم مروجہ سے فارغ ہوئے اور مفسر قرآن بنگئے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ؞

علم حدیث کی ضرورت

بعض اہل بدعت و ہوا اس امر کے مدعی ہیں کہ قرآن مجید شریعت کے تمام جزئیات مسائل

۵ اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم انکی پیروی کروگے تو وہ تمہیں خدا کے راستے سے گمراہ کردینگے۔ وہ محض ظن کی پیروی کرتے ہیں اور انکا بیچو ہالتے ہیں ... [illegible]

کیلئے کافی ہے۔ احادیث کے ماننے کی انہیں کچھ ضرورت نہیں اور اس دعوے کے ثبوت میں وہ دو طرح استدلال کرتے ہیں۔ اوّل یہ کہ قرآن مجید خود اپنی نسبت تبیانا لکل شیئ اور تفصیل کل شیئ کہہ رہا ہے۔ جنکا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید ہر قسم کے مسائل کا جامع ہے اور تمام جزئیات مسائل اس میں موجود ہیں۔ دوم یہ کہ وہ لوگ احادیث میں تناقض اور تضاد ثابت کرتے ہیں یعنی وہ ایسی احادیث پیش کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک میں تو ایک حکم ہے اور دوسری میں بالکل اسکے برخلاف۔ اس لئے احادیث بالکل قابل اعتبار نہیں کیونکہ ایک ہی شخص کا کلام دو متضاد حکموں پر کیونکر مشتمل ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے کہ اس قسم کے اقوال پر بعض بھولے بھالے مسلمان فریفتہ ہو جائیں اور ایسے ملحدانہ خیالات کو قابل وقعت سمجھ لیں مگر میں کہتا ہوں کہ ہر دو طریق استدلال یا تو ان ملحدین کی دیدہ و دانستہ بد نیتی کا نتیجہ ہیں یا بوجہ جہالت وہ اپنے اوھن من بیت العنکبوت استدلال پر آگاہ نہیں ہو سکتے۔ ورنہ ایک شخص جس نے قرآن و سنت میں محققانہ طور پر نظر کی ہو ممکن نہیں کہ ایک آن کیلئے بھی وہ احادیث صحیحہ کی ضرورت سے انکار کر سکے۔ کیونکہ ان ہر دو میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر آیات قرآن مجمل ہیں تو احادیث صحیحہ اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ میں مذکورہ بالا ہر دو طریق استدلال کی لغویت پر معزز ناظرین کو حسب ذیل متوجہ کرتا ہوں:۔

(۱) واضح ہو کہ اہل بدعت کا قاعدہ ہے کہ جب انہیں اپنے ہوائے نفس کے مطابق کسی بات کا تسلیم کرانا ناممکن نظر آتا ہے تو ان کی سب کوشش اس امر پر محدود ہو جاتی ہے کہ کسی طرح ان اشیاء کی اصلیت میں جرح و قدح کریں جو انکے حصول مقصود میں مانع ہیں۔ یہی حال ان منکرین حدیث کا ہے کیونکہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ احادیث میں بعض ایسے احکام کی توضیح کی گئی ہے جنکی پابندی سے انہیں ہوائے نفس مانع ہے یا بعض ایسے معتقدات حقہ کی تفصیل دی گئی ہے جن کو قرآن مجید نے بالاجمال بیان کیا ہے تو بجز اسکے اور کوئی حیلہ نہیں

- - - - - - - - - - - - -

پاتے کہ سرے سے احادیث کو بے اصل ثابت کرنے کی کوشش کریں کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم[لہ] بھلا کوئی عقلمند جس کو خدا نے نورِ فطرت سے بے بہرہ نہیں رکھا ایک آن کے لئے بھی اس باطل خیال کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے کیونکہ جس امر کی صداقت کو اکابر کافۂ اسلام تسلیم کرتے چلے آئے ہوں اور صحابہ و تابعین و تبع تابعین نے اس سے ایک قدم بھی باہر نہ رکھا ہو بلکہ باتفاق سلف و خلف شریعت کا اصل اصول اور تعلیم قرآن کا موقوف علیہ مانا گیا ہو کیونکر کسی ناتراشیدہ کے الحاد و زندقہ پر اپنے ذروۂ عزت و وقعت سے گر سکتا ہے؟ حاشا ثم حاشا کہ خدائے جل و علا کو یہ منظور ہو کہ وہ اپنے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم کی پاک شریعت کو اس قسم کے خنظل خربوزہ نما مسلمانوں کے بس میں ڈالدے یریدون[لہ] لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ✤

معزز ناظرین! اگر علم حدیث یونہی ہر کس و ناکس کی ناقابل اعتبار رائے پر مبنی ہوتا تو شروع زمانہ نبوت سے ابتک بڑے بڑے اجلّہ و ائمہ اسلام کی توجہ کیوں اس کی طرف مبذول ہوتی آخر سوچنے کا مقام ہے کہ اس قسم کے بہتانات عظیمہ بخیال مبتدعین کس نے کس زمانہ میں کیونکر اپنی طرف سے اکٹھے کر لئے۔ اور پھر کیونکر وہ لوگ اس قسم کے موضوعات کو دنیا بھر کے مسلمانوں کے منوانے میں کامیاب ہو گئے ؟ یہ ایسی باتیں ہیں جو اصول تاریخ کے رُو سے ہر ایک محقق کو سوجھتی ہیں اور کبھی کوئی محقق انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بھلا اہل اسلام جن کی تاریخ نویسی نے انسانی دُنیا میں سب سے بڑھکر آگے قدم رکھا ایسے بڑے اہم امر کو جو ان کے مذہب کا دستور العمل قرار پایا کیونکر بلا تحقیق مان لینے پر اتر آئے ✤

کتب تاریخ سے یہ مسلم ہو چکا ہے کہ احادیث کا ضبط و حفظ زمانہ نبوت ہی سے شروع ہو گیا تھا اور صحابہ اور بعد کی دو جماعتوں نے انکی پوری پوری نگہداشت کی۔ ہاں یہ بات تھی کہ یہ احادیث مختلف علمائے اسلام کے پاس تھیں جو مختلف دیار و امصار میں

[لہ] وہ ایک بڑی بات اپنے منہ سے نکالتے ہیں ۱۲ منہ [لہ] خدا کے نور کو دہن کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ اپنے نور یعنی اسلام پاک کی تکمیل کرکے رہیگا۔ خواہ کافر بُرا ہی منائیں ✤

پھیل گئے تھے۔ تبع تابعین کی جماعت نے انہیں باضابطہ قید کتابت میں لانا شروع کر دیا۔ چونکہ تبع تابعین اور جناب پیغمبر اسلام میں اس وقت تک بہت کم واسطے پڑے تھے اس لئے غلطی کا احتمال محض گمان و وہم کے درجہ تک باقی رہ جاتا ہے اور وہ بھی رفع ہو جاتا ہے اگر یہ امر مدنظر رہے کہ احادیث کو افسانہ کے طور پر لوگ حاصل نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اسے ذریعہ حصول ثواب سمجھ کر بغرض عمل اخذ کرتے اس لئے جس شخص کو ان بزرگوں کی دیانت و تقویٰ اور زہد و ورع کا پورا پورا علم ہوگا کبھی ان کی طرف اس لغویات کو منسوب کرنے کی جرأت نہیں کریگا کہ انہوں نے عمداً جھوٹ بولا یعنی احادیث کو اپنی طرف سے وضع کیا۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کے صحابہ (معاذ اللہ) بخیال معترضین پرلے درجے کے فاسق و فاجر تھے کیونکہ اللہ کے رسول پر بہتان باندھنے سے بڑھکر اور کیا جرم ہو سکتا ہے؟ باآنکہ انہیں راویان کی جماعت میں مہاجرین و انصار کے اکابر صحابہ بھی داخل ہیں جنکی صداقت پر قرآن شاہد ہے[1]۔ اس خیال پر ایک سمجھ دار آدمی کبھی اس نتیجہ کے اخذ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ حاملان قرآن مجید بھی تو یہی لوگ تھے پھر ہمیں کیونکر اعتماد ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید بعینہٖ ہم تک پہنچا ہے؟ کیونکہ اگر کچھ فرق ہو سکتا ہے تو یہی کہ قرآن ایک جامع صورت میں تھا اور احادیث متفرق مگر کیا اسکا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ احادیث کچھ شے ہی نہیں۔ ہاں اگر کسی دستی الفاظ یا جزئی تغیر و تبدل کا کوئی شخص دعوے کرے تو البتہ ایک بات ہے مگر ایسے شخص کو ہم یہ کہینگے کہ تم اصول حدیث اور کتب حدیث کو غور سے دیکھو کیونکہ نہایت خوبی کے ساتھ ان باتوں کو صاف کر دیا گیا ہے اور کوئی بات قابل گرفت مہمل نہیں چھوڑی گئی

اب آؤ ایک اور پہلو سے اسی مسئلہ پر غور کریں۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب آیات قرآنیہ حضورؐ پر نازل ہوتی تھیں تو کیا آپ صرف ان آیات کو جماعت صحابہؓ کے سامنے پڑھ دیتے تھے یا ان آیات کی اپنے لفظوں میں تفسیر بھی کیا کرتے تھے اگر تم یوں کہو کہ نہیں صرف

---

[1] علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں وکانت احوال نقلۃ الحدیث فی عصور السلف من الصحابۃ والتابعین معروفۃ عند اھل بلدھم یعنی زمانہ سلف میں ناقلین حدیث یعنی صحابہ اور تابعین کے حالات انکے اپنے اپنے علاقہ میں مشہور و معروف تھے علامہ

آیات ہی پڑھ سنایا کرتے تھے اور انکے متعلق خود حسب ضرورت یا بروقت استفسار کبھی کوئی کلمہ یا جملہ آپ نے ارشاد نہیں فرمایا تو غالباً اس خیال کی تصدیق کے لئے دُنیا میں ایک آدمی بھی تیار نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اکثر آیات کی تشریح صحابہ حضور سے پوچھتے اور جواب پاتے۔ پس وہی جوابات احادیث قولیہ کا ایک حصہ ہیں۔ اسی طرح دوسرے سوال کی صورت ہے کہ آیا حضور کے طریق عبادات و دیگر عادات کو صحابہ ایک دوسرے کے پاس ذکر کرتے تھے یا نہیں؟ اگر تم کہو کہ نہیں تو یہ صریح غلط ہے کیونکہ ایک معمولی رہبر قوم یا کسی عالم و پیشوائے مذہب کے حالات عام طور پر لوگ سُنتے سناتے ہیں تو کیونکر متصور ہو سکتا ہے کہ حضور کے صحابہ آپ کے حالات کو نہ سُنتے سناتے ہوں بلکہ ایسے بڑے جلیل القدر پیغمبر کی ادنیٰ ادنیٰ بات کو موافق و مخالف لوگ مختلف مقاصد کے رُو سے شہرۂ آفاق کر دیتے ہیں۔ پس یہی منقولات وہ احادیث ہیں جن میں سُنن فعلیہ شامل ہیں۔ ہاں گفتگو صرف اس امر میں ہوگی کہ نقل کرنے والے کون لوگ ہیں سو ہم نے گزشتہ سطور میں لکھدیا ہے کہ فلاں فلاں حدیث یا تو وہ لوگ تھے جنکی صداقت پر قرآن مجید شہادت دے رہا ہے یا وہ جنہوں نے ان احادیث کو حاصل کیا۔ تعجب ہے کہ کس طرح ایک شخص کو یہ گمان پیدا ہو سکتا ہے کہ صحابہ رض اور بعد کی دو جماعتوں میں جن کو مشہود لہا بالخیر کہا گیا ہے ایسے لوگ بھی تھے جو جھوٹ موٹ ایک قول کو پیغمبر خدا کی طرف منسوب کیا کرتے۔ علامۂ ابن خلدون لکھتے ہیں فلا تاخذک[1] ریبۃ فی ذلک فالقوم احق الناس بالظن الجمیل بہم والتماس المحامل الصحیحۃ۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ زمانہ خلافت کے منقضی ہو جانے پر سلاطین بنی اُمیہ کے زمانہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو حکام کو خوش کرنے کے لئے جھوٹی حدیثیں بناتے۔ مگر اوّل تو ایسی احادیث خاص خاص موضوع سے متعلق تھیں۔ دوم انکا خاتمہ انہیں کے ساتھ ہو گیا۔ محدثین نے تصحیح سند میں اسقدر جانکاہی کی کہ جو احادیث متفرق طور پر مختلف بلاد و امصار میں موجود تھیں انکی تخریج کے لئے قواعد جرح و تعدیل اور اقسام حدیث اور علم اسماء الرجال کی

[1] احادیث کے بارہ میں کسی قسم کا شک نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے جمع کرنے والے تمام دنیا کے لوگوں سے بڑھکر حسن ظن کے مستحق ہیں اور احادیث کے صحیح مخارج تلاش کرنے میں سب سے زیادہ افضل تھے ۱۲ منہ

بنا ڈالی اور یہ سب کچھ اسلئے تھا کہ انکے مجامیع و مسانید میں کوئی موضوع حدیث نہ داخل ہونے پائے ۔
صرف تنقید احادیث کی خاطر حضرات محدثین کو ایک شخص کے سوانحعمری اور اس کے تقویٰ و تعبد صداقت و عدالت کے معلوم کرنے کے لئے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور آج ان کے علمی کارنامے جو اس پارہ میں روئے زمین پر موجود ہیں انکی محنت و محبت دینی پر مُہر لگا رہے ہیں ۔
افسوس! صد افسوس!! کہ حضور کی پیاری سنت کی اس طرح تحقیر کی جاتی ہے کہ اس کو بالکل افسانۂ باطل قرار دیا جاتا ہے ؎

آہ آہ از دست صرافانِ گوہر ناشناس
ہر زماں خر مہرہ را با دُر برابر می کنند

سچ ہے جب انسان شرم و حیا سے برطرف ہو جائے تو جو چاہے بک دے اور جو دل میں آئے کر بیٹھے، ایسے کو کون روک سکتا ہے قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اذا لم تستحی فاصنع ما شئت[1]۔ مگر کل فردائے قیامت کو بوقت حساب میں بحضور احکم الحاکمین سب کچھ کھل جائیگا ؎

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ باکہ باختۂ عشق در شبِ دیجور

صاحبو! سنتِ حضور علیہ السلام وہ سرچشمۂ ہدایت ہے جس سے تمام اکابر علمائے اُمت سیراب کام ہوتے اور آجتک کسی کو بھی مجال انکار نہیں ہوئی۔ حالانکہ قرونِ اولیٰ کے لوگ اگر انکار کر دیتے تو ایک بات تھی۔ آج ڈیڑھ ہزار سال گذرنے کو آیا اور کسی نے انکار نہیں کیا پھر ایسا کون دشمن خدا اور رسول ہے جو آج انکار کرنے لگے۔ مدعی قرآن ہونا اور سنت کی ہتک کرنا درحقیقت جمع بین المتضادین ہے جس کو کوئی صاحب ہوش جائز نہیں رکھ سکتا ؛
(٦) سنت کا پیارا اور جانفزا لفظ خود جناب پیغمبر کے زمانۂ مبارک میں حرزجان سمجھا گیا تھا۔ اور اس کو دین متین کا جزو اعظم خیال کیا جاتا تھا۔ دیکھو ذیل کے شعر میں حسان ابن ثابت

[1] آپ نے فرمایا جب تو شرم اٹھا دے تو جو جی چاہے کر بیٹھ ۱۲ منہ

صدیق اکبرؓ کی مدح میں کیونکر سنت کو قرآن کے ساتھ ملا کر بیان کرتے ہیں ؎

الیس اوّل من صلّے لقبلتکم
واعرف الناس بالقراٰن والسنن

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب ابن عباسؓ کو فرقۂ خوارج کے پاس بغرض الزام حجت روانہ کیا تو آپ نے حسب ذیل وصیّت کی لا تخاصمہم بالقراٰن فان القراٰن اجمال ذو وجوہ کثیرۃ تقول ویقولون ولکن حاجہم بالسنۃ فانہم لن یجدوا عنہا محیصا حضرت عمر بن خطابؓ نے قاضی شریح کو ایک فرمان میں حسب ذیل لکھا تھا ان جاءک شیٔ فی کتاب اللہ فاقض بہ ولا یلفتک عنہ الرجالُ فان جاءک مالیس فی کتاب اللہ فانظر سنۃ رسول اللہ صلعم فاقض بہا فان جاءک مالیس فی کتاب اللہ ولم یکن فی سنۃ رسول اللہ صلعم فانظر ما اجتمع علیہ الناس فخذ بہ ۰۰۰۰ الخ

ان مذکورہ بالا استشہادات کو دیکھکر صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ سنت حضورؐ کو اپنا قدوہ سمجھتے تھے۔ تعجّب ہے کہ ہمارے زمانہ کے بعض دریدہ دہن کیونکر سنت سے انکار کرتے ہیں اور وہ کس طرح صحابۂ کبارؓ سے اپنے تئیں زیادہ صحیح الایمان سمجھتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک مستور الحال مؤرخ جسکی عدالت ودیانت کی نسبت ہمیں کچھ علم نہیں اپنی مورخانہ تحقیق میں کچھ رطب ویابس لکھدے تو وہ قابل حجت سمجھا جائے اور احادیث جنکی تنقیح وتہذیب میں ہزار ہا ایسے لوگوں نے محنت وجانفشانی کی جنکا مثل دنیا میں ناپدید ہے غیر معتبر سمجھ کر چھوڑ دیجائیں اور نہایت بےحیائی اور گستاخی سے یوں کہا جائے کہ ہم زید وبکر وعمرو کی باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ بھلا ان دشمنانِ دین سے کوئی یہ تو پوچھے کہ بجز اس بکواس کے تمہارے پاس کوئی دلیل بھی ہے جس سے تم حضورؐ کی پیاری سنت کی ان الفاظ میں ہتک کرکے ناقابل اعتبار قرار دیتے ہو۔ کیا اس آہنی دیوار میں تم اپنے ناخن حیلہ سے کوئی رخنہ اندازی کرسکوگے ؎

۱؎ کیا صدیق اکبرؓ تم میں پہلے وہ بزرگوار نہیں جنہوں نے حضرتؐ کے ساتھ قبلہ کیطرف نماز ادا کی۔ اور کیا وہ سب لوگوں سے قرآن وسنت کو بڑھکر نہیں جانتے تھے۔
۲؎ انکے ساتھ قرآن سے نہ جھگڑنا۔ کیونکہ قرآن کے الفاظ ایسے ہیں جو بہت سے معانی کا احتمال رکھتے ہیں تو ایک آیت پڑھیگا اسکے مقابل وہ بھی ایک آیت پڑھدینگے۔ یعنی وہ تسلیم نہیں مانینگے۔ ہاں جناب پیغمبرؐ کی سنت کو پیش کرنا کیونکہ وہ اس سے گریز نہیں کرسکینگے ہو

ہمہ شیرانِ جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند
روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

حقیقت تو یہ ہے کہ ع خوئے بدرا بہانہ بسیار - آپ لوگ تمام تکالیف شرعیہ سے سبکدوش ہونا اور ہوائے نفس کی پیروی میں سیدھی جہنم کو لیجانے والی آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں فرائض دستی کی زنجیروں کو یوں توڑنا محال ہے - صرف یہی ایک حیلہ بن پڑتا ہے کہ علمِ دین کے ناواقفوں کو اس دام میں پھانس لو کہ علمار سلف نے احادیث اپنی طرف سے وضع کر لی ہیں - اسلئے ہمیں صرف قرآن شریف ہی کی پیروی کرنا ضروری ہے - میں تمہیں لوگوں سے دو تین سوال کرتا ہوں اپنے خدائے عزوجل کو حاضر جان کر جواب دو (۱) آیا تمہارے دل پورا یقین رکھتے ہیں کہ سلسلۂ احادیث محض ایک مصنوعی بات ہے (۲) آیا تم نے اپنے اس خیال کی تصدیق بر ثبوت دلائل قاطعہ کر لی ہے (۳) آیا تم یقین رکھتے ہو کہ تمہارے اس مذہب کو اسلامی دنیا ماننے پر تیار ہو جائیگی ؟ اور کسقدر علمار نے تمہارے اس خیال کی تصدیق کی ؟ اگر تم لوگوں کی ضمیر بالکل مُردہ نہیں ہوگئی اور کچھ بھی خدا کا خوف باقی ہے تو یقیناً اندر ہی سے یہ شہادت ملیگی کہ یہ سراسر شیطانی وساوس ہیں جن میں مطلقاً ایمان کی بُو تک نہیں پائی جاتی - ہیکڑی سے ایک بات کا نہ ماننا یا اپنی بات کی پچ کرنا اور بات ہے اور انصاف و دیانت اور اعدلوا[2] ھو اقرب للتقویٰ ؏

○ (۲) ان لوگوں کا پہلا طریق استدلال محض انجانوں کو فریب دہی پر مبنی ہے - کیونکہ اس بات میں تو کسی کو بھی انکار نہیں کہ قرآن مجید من کل الوجوہ کامل مکمل آسمانی کتاب ہے اور اس میں تمام اولین و آخرین کے علوم مندرج ہیں - بلکہ یہی امر اس عظیم الشان کتاب کے لئے وجہ امتیاز ہے جو بمنزلۂ معجزہ تسلیم کیا گیا ہے - چنانچہ تمام اہلِ اسلام بالاتفاق اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن مجید بنی نوع انسان

حاشیہ از صفحہ گذشتہ

[1] اگر تجھے کوئی مسئلہ پیش آئے تو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کیا کر اور لوگوں کے کہنے پر مت جا اور اگر کوئی ایسا امر پیش آئے جو کتاب اللہ میں نہ مل سکے تو پیغمبر کی سنت کے مطابق فیصلہ کر اور اگر سنت میں بھی اسکا جواب نہ ملے تو اجماع امت پر فیصلہ صادر کر ۱۲ منہ

[2] عدل کرو عدل تقویٰ سے بہت قریب ہے ۱۲ منہ

کے لئے ہدایت کی آخری کتاب ہے جو بطور حجت قاطعہ نازل کیگئی۔ اسلئے اگر اس میں کسی قسم کا نقصان پایا جائے تو اس کا حجت ہونا ٹوٹ جائیگا۔ پس اگر تبیانا لکل شیئ اور تفصیل کل شیئ سے یہ مطلب ہے کہ وہ مذکورہ بالا معنی کے رو سے ہر ایک قسم کی تعلیم کا جامع ہے تو اس میں کون اختلاف کر سکتا ہے اور اگر الفاظ مسطورہ سے یہ مراد ہے کہ اسکی تفسیر و توضیح کی ضرورت نہیں یعنی اسکے معنی کے سمجھنے کے لئے حضور علیہ السلام کی احادیث قولیہ وفعلیہ سے استعانت کرنا لازمی نہیں تو اسکے ماننے کے لئے غالباً کوئی ایماندار مسلمان ہرگز تیار نہیں اور امیقدر نہیں بلکہ تفسیر بالرائے کی وعید کے رو سے اس خیال کو بدعت و الحاد تصور کریگا۔ کیونکہ قرآن مجید کے ہر چیز کے لئے تبیان و تفصیل کہلانے کے ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ اس میں تمام روزمرہ فقہی مسائل کی وہ صورتیں بھی مندرج ہیں جو آئمہ مجتہدین نے علم اصول کے رو سے مستنبط کی ہیں کیونکہ اس صورت میں تو قرآن مجید سینکڑوں مجلدات میں نازل ہوتا یہ تیس سیپارہ کیونکر کافی ہو سکتے تھے جو صرف پانچسو یا کچھ کم وبیش آیات متعلقہ احکام پر مشتمل ہیں بلکہ تبیان اور تفصیل کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کے تمام مدارج ترقی ظاہری و باطنی کے قطعی اصول کا جامع ہے جنکی بنا پر علمائے راسخین فی العلم لاکھوں بلکہ کروڑوں مسائل کا استنباط کر چکے ہیں اور تا قیامت کرتے رہینگے اور مختلف قسم کے اسرار و معارف کا گنجینہ ہے۔ اگر ان مسائل کے استنباط میں حضورؐ کی احادیث قولیہ وفعلیہ سے استعانت نہ کی جائے تو شریعت اسلامی میں کسقدر مشکلیں پیش آئیں اور لطف یہ ہے کہ یہ منکرین انہیں کتب احادیث و تفاسیر سے اپنے معترضین کے جوابات حاصل کرتے ہیں اور بدوں انکے مطالعہ کے چارہ نہیں مگر بظاہر ان سے انکار ہے۔ سچ ہے نمک خوردن و نمکدان شکستن ؛

واضح ہو کہ یہ لوگ انجانوں کو قرآن مجید کے متعلق تبیان و تفصیل کے الفاظ سنا کر سخت دھوکا میں ڈالدیتے ہیں۔ کیونکہ جب کسی ناواقف کے آگے یوں بیان کیا جائے کہ فلاں شخص کتاب اللہ کے مقابلہ میں زید و عمر و بکر وغیرہ لوگوں کی باتوں پر عمل کرتا ہے تو وہ بمجرد سننے کے چونک اٹھیگا کہ واقعی جب کتاب اللہ کے سامنے کسی شخص کا قول مسموع نہیں ہو سکتا تو پھر

اور کس چیز کی ضرورت ہے؟ مگر ایک عالم دین اس مغالطہ اور فریب دہی کی قلعی کھولدیگا کہ یہ طریق استدلال محض عوام کو بہکانے کی غرض سے مبتدعین نے اپنی طرف سے گانٹھ لیا ہے ورنہ اس کی تہ میں کچھ بھی نہیں رکھا کیونکہ سردست وہ سوال پیش کریگا کہ احادیث تو رسول اللہ صلعم کا کلام ہے زید و عمرو وغیرہ تو صرف اس کلام کے ناقل یا راوی ہیں۔ جب تک تم یہ نہ ثابت کرو کہ زید و عمرو نے یہ کلام جھوٹ موٹ خود اپنی طرف سے وضع کیا ہے کبھی انکی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ مگر ناقلین حدیث کے حق میں حضرات محدثین سے بڑھکر آج کوئی جرح و تعدیل نہیں کرسکتا پھر یونہی منہ بنا کر بلا تحقیق یہ کہہ دینا کہ احادیث زید و عمرو کا کلام ہے۔ اگر محض فریب دہی نہیں تو اور کیا ہے اور اگر اسی کہنے پر احادیث کا غیر مسلم ہونا تسلیم کیا جاتا ہے تو کیوں نصاریٰ کے اس قول کو مسلم نہیں سمجھا جاتا کہ قرآن مجید پیغمبر عرب علیہ السلام کا کلام ہے خدا کی طرف سے ہرگز نہیں؟

(۳) یہ لوگ دوسرا اعتراض یہ پیش کرتے ہیں کہ احادیث میں بہت سا اختلاف موجود ہے۔ ایک موقعپر ایک حکم موجود ہے اور دوسرے موقعپر اس کے برخلاف۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ؎

وکم من عائب قولا صحیحا
وآفته من الفهم السقيم[1]

قرآن مجید کی آیات بینات میں سینکڑوں مقام ایسے ہیں کہ بظاہر ان میں اختلاف نظر آتا ہے مگر درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ بلکہ قرآن مجید نے عدم اختلاف ہی کو اپنے منجانب اللہ ہونے کے لئے بطور دلیل کے پیش کیا ہے۔ اعتبارات مختلفہ سے احکام کی نوعیت بدل جایا کرتی ہے۔ ایک مقام پر ایک حکم مطلق ہوتا ہے دوسری جگہ مقید یا ایک جگہ حکم میں خصوصیت ملحوظ ہوتی ہے اور دوسری جگہ عمومیت یا ایک جگہ حکم بطور وجوب عائد کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ

[1] اکثر لوگ ایسے ہیں کہ صحیح کلام کو معیوب سمجھتے ہیں حالانکہ انکی اپنی سمجھ کا قصور ہوتا ہے ۱۲ منہ

بطور اباحت و ندب۔ علیٰ ہذا القیاس۔ بظاہر ایک شخص جو اصول سے ناواقف ہے وہ ضرور کہیگا کہ یہ ہر دو حکم آپس میں متضاد ہیں مگر ایک عالم علم دین ہر دو اعتبارات کو بخوبی جانتا ہوگا جنکے رو سے ان حکموں میں تغایر موجود ہے مثلاً بطور مثال کے آیات ذیل میں غور کرو۔ وان[1] تصبہم حسنۃ یقولوا ھذہ من عند اللہ وان تصبہم سیئۃ یقولوا ھذہ من عندک قل کل من عند اللہ۔ فما لھؤلاء القوم لا یکادون یفقہون حدیثا اور ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کلام میں بظاہر اختلاف موجود نہیں کیونکہ پہلے تو کہا کہ سب نعمت اور مصیبت خدا کی طرف سے ہے۔ پھر کہا کہ نعمت تو خدا کی طرف سے ہے اور مصیبت انسان کی شامت اعمال کا نتیجہ ہے۔ مگر ایک سمجھ دار جس کو خدا نے نور فطرت اور علوم ضروریہ سے محروم نہیں رکھا بخوبی جانتا ہے کہ نعمت و مصیبت کے اللہ کی طرف سے ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کا ارادہ ہر ایک چیز کی علت اصلی ہے اس وجہ سے سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے اور دوسرے مقام پر نعمت کے اللہ کی طرف سے اور مصیبت کے بندہ کی طرف سے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ نعمت محض اسکا احسان اور لطف ہے۔ کیونکہ ہماری طرف سے باوجود ہر ایک قسم کی ناسپاسی کے پھر بھی اس کے نعم غیر متناہیہ کا سلسلہ بند نہیں ہوتا اور مصیبت ہمارے معاصی کا نتیجہ ہے یعنی سبب قریب جو موجب مصیبت ہوتا ہے وہ ہمارے معاصی ہیں اور علت اولیٰ وہی ارادۂ ذات باری ہے۔ چونکہ ایک ہی حکم کے دو مختلف اعتبار کئے گئے ہیں اسلئے ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ دونوں حکموں میں کسی قسم کا تضاد یا تخالف پایا جاتا ہے بلکہ ہر دو میں تطبیق پر ظاہر ہے کیونکہ حکم اولیٰ میں علت بعیدہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور حکم ثانی میں علت قریبہ کو *

احادیث میں بعض مواقع پر اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابتدائے اسلام میں بعض

---

[1] اگر انہیں کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو اللہ کی طرف سے تھی اور اگر انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اے پیغمبر! تجھ کو کہنے لگتے ہیں کہ (معاذ اللہ) یہ تیری نحوست کی وجہ سے ہے۔ تم انہیں کہدو کہ نعمت و مصیبت سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں کہ قرآن مجید کی تعلیم کو نہیں سمجھتے (اور یہ اے انسان!) تجھے جو نعمت حاصل ہوتی ہے وہ تو اللہ کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تیرے اپنے شامت اعمال کی وجہ سے ہے ۱۲ منہ (تنبیہ) مسلمان جب ہجرت کرکے مدینہ میں پناہ گزین ہوئے تو یہود کہا کرتے کہ جب سے یہ لوگ یہاں آئے ہیں پیداوار کم ہوگئی ہے۔ یہ آیت اسی غلط فہمی کو رفع کرتی ہے ۱۲ منہ

احکام کو نہایت سہولت اور نرمی کی صورت میں پیش کیا گیا تاکہ عوام الناس کی طبائع جو کفر و شرک میں ڈوب رہی ہیں متنفر نہ ہو جائیں۔ اِس لئے بعض احکام پر مصلحتاً کسی آسان وضع سے عمل کرایا جاتا۔ اور جوں جوں لوگ عادی ہو گئے اور حکم کی خوبی کو سمجھ گئے ذرا شدت کے ساتھ عمل میں لانیکا حکم دیا گیا اور یہ ایک ایسا امر واقع ہے جس میں کبھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مثلاً نماز کی تعیین رکعات و اوقاتِ خمسہ وغیرہ شروع میں بالکل نہ تھی بعد میں بتدریج موجودہ صورت میں نمودار ہوئی مگر ایک بیوقوف جاہل جو حکمت تبلیغ انبیاء علیہم السلام سے ناواقف ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ پہلے تو کچھ اور بتلایا گیا تھا اور بعد میں کچھ اور۔ حالانکہ درحقیقت اسی پہلے حکم کو درجہ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔ یہ اختلاف ہرگز نہیں کہلا سکتا بلکہ تمام احکام شرعی میں اس اصل کا امتحان ہو سکتا ہے اس لئے ابتدائی صورت کے احکام بعد کے احکام سے ہرگز متضاد نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ تقدیم و تاخیر کے رو سے صرف ان میں بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے جس کو محدثین رفع کیا کرتے ہیں۔ منجملہ وجوہ اختلاف کے ایک وجہ اختلاف یہ بھی ہے کہ بعض صحابہؓ نے حضورؐ کے قول و فعل سے وجوب کا حکم اخذ کیا اور بعض دیگر نے اباحت وغیرہ کا۔ اِس لئے سلسلہ روایت میں اختلاف پیدا ہوا۔ مثلاً مقام محصب میں نازل ہونے کو بعض نے اتفاقیہ سمجھا اور دیگر بعض نے اسے منجملہ سنن حج قرار دیا۔ کما مرّ۔ اِسلئے یہ اختلاف درحقیقت سنت حضورؐ میں عائد نہیں ہوا بلکہ اخذ کرنے والوں کے اعتبار میں عائد ہوا ہے ؛

الغرض اختلاف احادیث کے وجوہ مختلف ہیں۔ علماء کا قاعدہ ہے کہ اِن اختلافات میں تطبیق تاویل۔ نسخ وغیرہ کا اختیار کر کے احکام کی اصلیت کو قائم کرتے ہیں اور اِس لئے حقیقی تعارض و تضاد کہیں نہیں پایا جاتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں دھی صورۃ مفروضۃ لا تکاد توجد[1] اس لئے محدثین جہاں بظاہر عوام الناس کو دھوکا دہی کی غرض سے دو حدیثوں کے درمیان تناقض ثابت کرتے ہیں وہاں درحقیقت تناقض نہیں ہوتا کیونکہ

[1] یعنی دراصل حقیقی تعارض ایک فرضی صورت ہے جسکی مثال احادیث میں نہیں مل سکتی ۱۲ منہ

حقیقی تعارض و تناقض کے لئے ضروری شرط یہ ہے کہ ہر دو حدیث ہر ایک جہت سے متحد حیثیت ہوں۔ مگر ایسا ہونا محال ہے لہٰذا مفروض بھی محال ہوا۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ الاصل ان یعمل بکل حدیث الا ان یمتنع العمل بالجمیع للتناقض وانہ لیس فی الحقیقۃ اختلاف ولکن فی نظرنا فقط۔ اس کے بعد آپ نے متعدد امثلہ ایسے اختلاف کی بیان کی ہیں مثلاً رکعات وتر۔ نماز تہجد میں قرأت۔ جہر و خفا۔ رفع یدین کانوں تک یا کندھوں تک۔ تشہد عبداللہ بن مسعود اور تشہد ابن عباس وغیرہ وغیرہ مگر علمائے علم حدیث نے اُصول کی پابندی سے راجح و مرجوح مذہب کو ظاہر کر دیا ہے اور عملدرآمد میں مذہب محقق کو اختیار کیا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص اُصول علم حدیث سے واقف نہ ہوئے اسے ہرگز ایسا اعتراض عائد نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہی اختلاف روایات تحقیق حق کا موجب ثابت ہوا۔ الغرض کتب احادیث اور شروح احادیث کی طرف رجوع کرنے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف وغیرہ کا عذر پیش کر کے ان مخالفین کا احادیث سے اعراض کرنا محض ایک قسم کی ڈھٹ بندی ہے جس کو کوئی عاقل ہرگز قابل وقعت نہیں سمجھتا۔ علمائے احادیث نے جزاھم اللہ خیر الجزاء کوئی بات ان جھگڑوں کے فیصلہ اور بحث پر ملتوی نہیں رہنے دی۔ انہیں سب اعتراضات اور انکے مخالف و موافق پہلوؤں پر نظر تھی جس شخص نے شروح احادیث پر کچھ مدت صرف کی ہوگی غالباً وہ اس قسم کے لغو اعتراضات کو سن بھی نہیں سکتا۔ ہاں جس کو خبر ہی کچھ نہیں اور محض ہوائے نفس کو اپنا قدوہ سمجھتا ہے اور اُصول کی پابندی نہیں کرتا وہ جو چاہے بک دے۔ گو زنشتر نہ بزرمیں نہ بر آسماں۔

انہیں لوگوں کے گروہ میں بھی وہ لوگ شامل ہیں جو بعض احادیث کو مانتے ہیں اور بعض

ﻟﮧ مثلاً کوئی شخص یوں کہے کہ احادیث سے زیارت قبور کی ممانعت بھی ثابت ہوتی ہے اور جواز بھی تو گو بظاہر یہ اختلاف ہے لیکن درحقیقت اختلاف نہیں کیونکہ جب تک بت پرستی کے آثار کا غلبہ تھا تب تک ممانعت تھی۔ جب حقیقت حال کو لوگوں نے خوب سمجھ لیا تو حضور نے بغرض عبرت اور رقت قلب اجازت دیدی ۱۲ منہ ﻟﮧ قاعدہ یہ ہے کہ ہر ایک حدیث پر عمل کیا جائے ہاں اگر اختلاف کی وجہ سے سب پر عمل نہ ہو سکے تو پھر اس قاعدہ کی پابندی نہیں کی جاتی اور یہ امر بھی بطور قاعدہ کلیہ کے تسلیم کیا گیا ہے کہ احادیث میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ البتہ بعض احادیث میں ہمیں بظاہر معلوم ہوتا ہے۔

سے انکار کرتے ہیں۔ اصول حدیث کے مطابق خواہ کوئی حدیث صحیح ہی ہو مگر انکے مسلمات کے برخلاف ہونے کی صورت میں انکے نزدیک قابل تسلیم نہیں۔ ان کا مسلک صرف یہ ہے کہ اگر کوئی مفید مطلب قول بھی مل جائے تو جھٹ لے لیتے ہیں۔ اور مخالف کو اگرچہ صحیح حدیث ہی ہو ہرگز قبول نہیں کرتے۔ اس شعبہ کے لوگ وہ ہیں جو فلسفہ کی آڑ میں اہل یورپ کی دہریت پر مرمٹے ہیں۔ یہ لوگ بھی سراسر ہوائے نفس کے تابع ہیں کیونکہ ان کا اصول یہ ہے کہ جس امر کو انکی عقل تسلیم نہ کرے اس کو قابل حجت نہیں سمجھتے۔ قرآن مجید میں بھی ان کا مسلک یہی ہے۔ مگر چونکہ آیات اللہ سے صریح انکار نہیں کر سکتے اسلئے اسکی تحریف معنوی اور غلط تاویل کرکے بزعم خود اپنے دعویٰ کو ثابت کر لیتے ہیں مگر نؤمن ببعض ونکفر ببعض کے مصداق ہونے سے خارج نہیں ہو سکتے۔ بھلا ان ناکامل الایمان مسلمانوں سے کوئی یہ تو سوال کرے اور کاش کہ وہ مجھے جواب دیں کہ اگر دین کا معاملہ سچ مچ تمہارے ناقص عقول کے معیار ہی کے مطابق ہے تو پھر بعثت انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیا جن باتوں کو تم لوگ بطور اعتراض کے پیش کرتے ہو مخالفین کو اپنے اپنے زمانہ میں انبیاء کے مقابلہ میں نہ سوجھی تھیں۔ نہیں بلکہ ہر ایک قسم کے اعتراضات زمانہ نبوت میں پیش ہوتے اور قرآن مجید نے ان سب کا جواب دیا۔ حشر جسمانی کا انکار۔ جنت وجہنم کا انکار۔ ملائکہ کا انکار۔ معجزہ کا انکار۔ قضاء و قدر کا انکار وغیرہ وغیرہ سب کچھ مخالفین نے پیش کیا اور ان کا جواب پایا۔ آج تم کونسی نئی بات پیش کرتے ہو جس کا جواب علمائے اسلام دینے لگیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ایمان صحیح بجز اتباع سنت حضور امر محال ہے۔ یہ جملہ ہر ایک مسلمان کو لکھکر اپنے اپنے گھر کے دروازہ پر چسپاں کر دینا چاہئے یہی تمام سلف صالحین اور بعد کے اکابر اہل اللہ کا طریق رہا ہے اور انشاء اللہ تا قیامت رہیگا مبتدعین کو سوائے حسرت و وبال کے کچھ بھی حاصل نہیں مرتے وقت سب باتوں کا فیصلہ ہو جائیگا اور ہر ایک قسم کی حجت بازی کا نتیجہ نظر آجائیگا یہیں سے بات کی حقیقت کو کیوں نہیں سمجھ لیا جاتا کہ آجتک کسی بدعتی کو روحانیت کے وسیع اور پرفضا میدان میں چلنا نصیب نہیں ہوا ۔

قساوت و غفلت کے دبیز تو حجاب انکے دلوں پر چڑھے ہیں مگر وہ مطلقاً اس کا احساس نہیں کرتے وجہ اسکی یہ ہے کہ درد و محبت پیدا ہوتے ہیں اتباعِ سنت اور معتقدات صحیحہ سے جو بمنزلہ اساس ہیں مگر جب اساس ہی نہیں تو بجز حبطت اعمالہم[1] کے اور کیا نتیجہ ہو سکتا ہے ؟ ع

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ

صاحبو! اگر یہ بدعات اور معتقدات فاسدہ جو یوروپ کے دہریوں سے ہمارے مسلمان بھائی آجکل حاصل کر رہے ہیں اللہ اور اللہ کے رسول کی پاک شریعت میں داخل ہوتے تو صحابہ اور تابعین سلف صالحین کو یہ سب کے سب بدرجۂ اولیٰ حاصل ہوتے کیونکہ عقلاً و نقلاً یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ان بزرگوں کی علمی اور عملی حالت مذہبی ہم لوگوں سے بڑھکر ہزارہا درجہ زیادہ صحیح اور درست تھی۔ اور میں اپنے ایمان سے کہتا ہوں کہ گر یہ لوگ بھی غلط راستہ پر چل رہے تھے تو اسلام میں صراطِ مستقیم کا ملنا یقیناً محال ہے اور اگر ہم انہیں صحیح الایمان مسلمان مانتے ہیں تو یقیناً یہ تمام بدعات اور معتقدات فاسدہ جہنم کی راہ دکھائینگے یہ کیسا غضب ہے کہ جن لوگوں نے بجز معرفت ذات باری کے اپنا کوئی مقصد زندگی قرار نہیں دے رکھا تھا اور انہوں نے اعتقاداً اور عملاً خداوند کریم کی فرمانبرداری میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا حتیٰ کہ انہوں نے بوساطت وحی خدا سے وعدہ ہائے مغفرت حاصل کئے انکی پیروی سے تو پہلوتہی کی جائے اور ایک ہوس باز دنیا پرست۔ بداعتقاد جو بجز استحقاق لعنت کے دنیا میں کچھ حاصل نہیں کر سکا محض ہوائے نفس کی وجہ سے قابل تقلید سمجھا جائے خواہ اس وصف کا آدمی کوئی نام نہاد مسلمان ہو یا کوئی نصاریٰ فرقہ عیسائی۔ قرآن و سنت نے کوئی بات مہمل نہیں چھوڑی جسکو کوئی آجکل کے یورپین مذاق کا دہریہ اپنی ہوسناکی سے واضح کرنے لگے۔ یہ کس دشمن دین کا قول ہے کہ کتاب و سنت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ ذرا غور کر کے دیکھو کہ اس کو عقل کبھی تسلیم ہی نہیں کر سکتی۔ جناب عائشہ صدیقہ رضہ

[1] انکے اعمال اکارت گئے ۱۲ منہ

سے جب حضورؐ کے اخلاق حمیدہ کی بابت سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کان خلقہ القرآن یعنی آپ کے اخلاق عین قرآن مجید تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اور آپ کی ظاہری و باطنی عملی حالت میں سرِ مو تفاوت نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں آپ کے اخلاق فاضلہ کی خود خدائے خالق السموٰت والارض نے بھی تعریف کی ہے۔ اور فرمایا انک لعلیٰ خلق عظیمؐ۔ اسی مضمون کو ابن رواحہ عربی شاعر نے اپنے فصیح و بلیغ الفاظ میں یوں ادا کیا ہے ؎

لو لم تکن فیہ اٰیات مبینہ

لکان منظرہ ینبئک بالخبر

ہر ایک مسلمان ایماندار کا فرض ہے کہ اپنے تئیں متبع سنّت بنانے کی کوشش کرے کیونکہ اسی امر پر خاتمہ بالخیر اور نجات اُخروی کا مدار ہے۔ چنانچہ خود خداوند جل وعلا اپنے پاک کلام میں ارشاد فرماتا ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ پھر دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم فانتھوا۔ پاک فطرت اور صحیح الایمان علمائے اسلام نے بڑے دلائل کتاب و سنّت اس امر کا فیصلہ دیدیا ہے کہ جو شخص حضورؐ کے قول و فعل کو حجت نہیں سمجھتا اور ہوائے نفس سے مخالفت کرنا چاہتا ہے ہرگز اس کا ایمان صحیح نہیں ہوسکتا۔ دیکھو آیات مذکورہ بالا کا مطلب یہی ہے۔ دلائل عقل و نقل کو چھوڑ دو صرف اسی ایک بات میں غور کرو کہ جس شخص پر قرآن کریم جیسی مقدس کتاب نازل ہوئی ہے اور جبرئیلؑ جیسے مقرب فرشتہ حضور رب العالمین سے جناب والا کی خدمت مبارک میں حاضر ہوتے کس رتبہ کا مالک ہوگا۔ مگر یہ سب کچھ صحت اعتقاد پر مبنی ہے جو محض توجہ ازلی سے خدا ہر مسلمان کو توفیق دے ؎ (سماوی)

الا یا من تمسک باللجاج تمسک بالذی اتی النبیؐ

لہ اے پیغمبر آپ ایک خلق عظیم کے مالک ہیں ۱۲ منہ ؎ حضورؐ وہ ستودہ اخلاق ہیں کہ اگر بالفرض آیات قرآنیہ آپ کی شان عالی میں نہ بھی نازل ہوتیں تو آپ کی صورت مبارک کا دیکھ لینا ہی حقیقت امر پر کافی شاہد تھا ۱۲ منہ ؎ اے پیغمبرؐ انہیں کہدو کہ اگر تم خدا سے محبت پیدا کرنا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تمہیں دوست رکھیگا ؎ پیغمبرؐ خدا جو تمہیں دیتے ہیں لے لو اور جس چیز سے روکتے ہیں رک جاؤ ۱۲ منہ

نبی کان یجلوا الریب عنا ❊ فیتضح الصراط لنا السوی
یوحی اللہ لیلاً او نہاراً ❊ فلیس یکاد ینکرہ الذکی
لہ سنن ابیت اللعن حقاً ❊ یحوز فخارھا الرجل الصفی
مشیٰ سلفٌ علی الآثار قدماً ❊ فانت بما مشوا فخر احری
ایمدحھم الہ العرش شکراً ❊ و یھجوما آنونکس دنی
الا یالیت شعری کیف تنجو ❊ ولا یخفیٰ علی اللہ الخفی
فدع عنک اللجاج ولا تجاوز ❊ حدوداً لا یجاوزھا التقی
واعجب منک یا ذا الجھل انی ❊ تسودوانت کذاب غوی

اے وہ شخص جو مرف لڑنے جھگڑنے کو حجت سمجھے بیٹھا ہے جناب پیغمبرؐ کی سُنّت کو حجت پکڑ ❊ وہ جناب پیغمبرؐ جو مسلمانوں کو شک وشبہ کی ظلمت سے اسطرح محفوظ رکھتے کہ صراط مستقیم واضح ہوجایا کرتی ❊

آپ شک وشبہ کو بذریعہ وحی خدا رفع کیا کرتے جس سے کسی عاقل کو انکار نہیں ہوسکتا ❊

تجھے خدا کی سنوار حضورؐ کی وہ پاک سنتیں ہیں جنہیں خدا کے برگزیدہ بندے حاصل کیا کرتے ہیں ❊ قدیم سے بزرگانِ سلف حضورؐ کے قدم بقدم چلے آئے ہیں سو تجھے بھی زیبا ہے کہ جو عزت اُنہوں نے حاصل کی ہے تو بھی حاصل کرے ❊

کیا خدا وندِ جل وعلا تو ان بزرگوارانِ دین کی سعی مشکور پر انکی مدح کرتا ہے اور ایک ہیٹا فرومایہ انکے قابلِ قدر کا ناموں کی ہجو ؟

کاش کہ مجھے معلوم ہوتا کہ تو موقف حساب میں خدا کے عذاب سے کیسے نجات پائیگا حالانکہ خدائے عالم الغیب پر کوئی بات پوشیدہ نہیں ❊

لڑائی جھگڑا چھوڑ دے اور خدا کی ان مقرر کردہ حدود سے آگے نہ بڑھ جن سے کوئی پرہیزگار آگے نہیں بڑھ سکتا ❊

اے جاہل میں تجھ سے تعجب کرتا ہوں کہ تو کیونکر بڑا بننا چاہتا ہے۔ حالانکہ تو خالص جھوٹا اور گمراہ ہے ۔

چونکہ اکثر ناواقف اور کم علم لوگ احادیث کی وقعت کو نظرانداز کرکے صرف قرآن مجید کے استدلال تک محدود رہتے ہیں اور احادیث واجتہادات ائمہ کو آیات قرآنیہ کا غیر سمجھتے ہیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ انہیں آگاہ کیا جائے کہ احادیث صحیحہ آیات قرآنیہ کا غیر نہیں بلکہ محال عقلی ہے۔ کہ کوئی فطرت سلیمہ اس امر کی صداقت پہ ایک آن کے لئے بھی شہادت دے سکے کہ معاذ اللہ جناب نبوی نے کبھی کوئی فعل یا قول ایسا کیا ہو جس کی تعلیم افراد امت کو کرنا مقصود تھی اور وہ قول یا فعل قرآن مجید سے مخالف۔ یا منافی ہو۔ اہل بدعت وہوا کا قاعدہ ہے کہ جب اپنے مسلمات کے برخلاف احادیث میں کسی امر کو دیکھتے ہیں تو فی الفور احادیث کی بے وقعتی یا ضعف یا عدم ضرورت ظاہر کرکے زبان درازی کرنے لگ جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جو امر عقل سلیم کے نزدیک اسلامی شریعت کی فوقیت اور اسکے اقتدار کو ثابت کرتا ہے۔ اس کو یہ لوگ محض اپنی کجروی کی وجہ سے عیب سمجھتے ہیں۔ غور کرو کہ اگر آج احادیث روئے زمین پر پایہ ضبط وجامعیت محفوظ نہ ہوتیں تو دین میں کس قدر رخنہ اندازیاں نظر آتیں اور احکام کی حقیقی صورت مٹ مٹا کر زندقہ والحاد ایسا عام ہوجاتا کہ کوئی شخص مدعی حق ہونیکا دعویٰ نہ کرسکتا۔ مگر احادیث کے منضبط ہوجانے سے تمام ملحدین ومنافقین کے ہاتھ پاؤں بیکار رہ گئے جس سے وہ ہمیشہ کے لئے معطل ہوکر بیٹھ گئے اور اگر کوئی شخص کسی قسم کی راہزنی کرنے کا ارادہ کرتا بھی ہے تو کوئی بات چل نہیں سکتی۔ اس موقع پر ممکن ہے کہ بعض کم استعداد یوں کہنے لگیں کہ اگر احادیث کے سوا کام نہیں چل سکتا تو پھر قرآن مجید کو جامع اور مکمل کن معنوں میں کہا جاتا ہے جبکہ تمام علمائے اُمت بالاتفاق اس امر کو مانتے ہیں کہ قرآن مجید نے تمام انسانی ضروریات کے متعلقہ احکام کو بطور آسمانی شریعت کے مکمل کردیا ہے۔ سواسکا جواب یہ ہے کہ بیشک قرآن مجید فی ذاتہٖ جامع اور مکمل ہے۔ مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ اسکی تفسیر وتشریح کے لئے شارع علیہ السلام

کی، ان تعلیمات کو نظر انداز کر دیا جائے جو آیات قرآنیہ کو عملی طور پر افراد امت میں رواج دینے سے متعلق ہیں۔ چونکہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے جس کا طرزِ بیان باوجود سادہ ہونے کے نہایت دقیق و عمیق واقع ہوا ہے اسلئے مشیت خداوندی اس امر کی مقتضی تھی کہ خود شارع علیہ السلام ان تمام مشکلوں کو آسان کر دکھاتے جو بعد میں آنیوالی امتوں میں متنازع فیہ ہو سکتے تھے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر ایک زبان میں عموماً اور عربی زبان میں خصوصاً ایک ہی لفظ مختلف مواقع میں مختلف معانی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اگر شارع علیہ السلام یا ان بزرگواران کے زمانہ حیات میں جنہوں نے بچشم خود موارد وحی کا مشاہدہ کیا اور احکام کی اصلی عملی صورت کو نہایت تحقیق کے ساتھ ضبط کیا عقائد و احکام کی تشریح نہ ہو چکتی تو بعد میں زید و عمرو وغیرہ کی رائے کی کون سماعت کرتا؟ اور قرآن مجید کے عبارات کا مختلف معانی کا محتمل ہونا ایک ایسا واضح امر ہے جو خود زمانۂ صحابہ میں مسلم ہو چکا تھا چنانچہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضہ نے جب ابن عباس کو ملاحدۂ خوارج کے پاس اتمام حجت کے لئے روانہ کیا تو آپ نے انہیں وصیت کی کہ دیکھنا خوارج سے آیات قرآنیہ کے ساتھ مقابلہ نہ کرنا۔ کیونکہ عبارات قرآنیہ اس قسم کے وجوہ مختلفہ کا احتمال رکھتے ہیں کہ تم بمقابلہ ان کے عہدہ برا نہیں ہو سکو گے۔ تم ایک آیت پڑھو گے وہ لوگ بالمقابل اسکی منافی آیت تمہیں سنا دینگے (ایسی منافات درحقیقت آیاتِ قرآنیہ میں موجود نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید خود اس کی نفی کرتا ہے مگر افہام قاصرہ کو ضرور منافات کا خیال پیدا ہو جاتا ہے مثلاً آیات جبر و قدر میں بظاہر کس قدر منافات نظر آتی ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے) تم ان سے سنت صحیحہ کا سلاح لیکر مقابلہ کرو اس میدان میں وہ ایسے عاجز آجائینگے کہ انہیں بجز تسلیم کوئی چارہ نہیں ہوگا ٭

"تاریخ صحیح ثابت کرتی ہے کہ خود صحابہؓ کے زمانہ میں مفہوم آیات پر جب لوگوں کو کسی قسم کا اشتباہ ہوتا تو بذریعہ سنت قولی نعدت: کا فیصلہ کر لیا جاتا۔ اس فیصلہ کی اہمیت

کا انکار کرنا محض مکابرہ اور حماقت ہے۔ آج بھی کوئی شخص جو بڑے سے بڑے علم و فضل کا مدعی ہو۔ اگر بلا امداد سنّت صحیحہ حل آیات قرآنیہ کا دعویٰ کرے تو غور کرو کہ وہ کہاں تک عہدہ برا ہوگا؟ یقیناً ایسا شخص ایسی باتیں کہنے لگے گا جو نہ تو بزمانۂ نبوی مسموع ہوئیں نہ بعد کے کسی زمانہ میں علمائے اُمت نے انہیں پیش کیا۔ یہ شروع سے ہوتا چلا آیا ہے کہ جسقدر اہل بدعت و ہوا ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے عموماً آیات سے استدلال کرکے احکام شریعت میں اسقدر ردّ و بدل کیا کہ اُنکی اعتقادی یا عملی صورت جو بزمانۂ نبوی مروّج تھی بالکل بدل ڈالی۔ افسوس! اگر یہ لوگ سلف صالحین کی روش کو نہ چھوڑتے بلکہ اس کی تائید و تقویت کرتے تو ہندوستان کے مسلمانوں میں آج اسقدر ابتری نظر نہ آتی۔ اور ان کے اتفاق کا حبل متین کبھی نہ ٹوٹتا۔ اور سچ پوچھو تو ذلت و ادبار نتیجہ ہے جناب ختمیت مآب کی سنّت صحیحہ سے اعراض کرنے اور ائمۃ الکفر والضلال کے پیچھے لگ جانے کا۔ اور یہ کافی سزا ہے ❖

اور تعجب ہے کہ آیہ ما اٰتکم الرسول فخذ وہ سے بڑھکر ضرورت احادیث پر کیا دلیل ہوگی؟ مگر کور باطنوں کو دیکھو کہ الفاظ ما اٰتاکم سے صرف آیات قرآنیہ مراد لیتے ہیں۔ کیا کوئی شخص جو قرآن مجید کے اسلوب بیان کو خوب سمجھتا ہے وہ یہ کہے گا کہ ما اٰتکم سے جو عموم مفہوم ہوتا ہے اسکی تخصیص آیات قرآنیہ سے بلا وجہ تخصیص صحیح ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اگر صرف آیات قرآنیہ مراد ہوں تو حقِ عبارت یوں تھا "خذوا ما اٰتینا الرسول" نہ "ما اٰتاکم الرسول فخذ وہ" مع ہذا آیہ "ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم اٰیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ" میں الفاظ یتلو۔ یزکی۔ یعلم" تینوں علیحدہ علیحدہ معانی پر دال ہیں اور کوئی عقلمند آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہر سہ الفاظ مترادف ہیں۔ منکرین حدیث کے حق میں یہ آیت تلوار سے کم نہیں کیونکہ اگر جناب پیغمبرؐ نے آیت نازلہ کو صرف لوگوں میں پڑھ کر سنا دیا اور اسکی تشریح یا تعمیل نہ کرائی تو صرف لفظ یتلوا اس مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا۔ پھر یزکی اور یعلم کا علیحدہ علیحدہ کیا فائدہ تھا۔ بجز اسکے

ہم یہ تسلیم کرلیں کہ حضور علیہ السلام آیات کو لوگوں تک پہنچاتے اور علماً ان کا مقتضاء ان میں پیدا کرتے اور انکے معانی پر انہیں آگاہ فرماتے - اور کوئی صحیح معنی اس آیت کے نہیں ہوسکتے پس وہی قول اور فعل جو حضور علیہ السلام خود بجالاتے یا صحابہ اس پر عامل ہوتے یا زبان مبارک سے ارشاد فرماتے وہی حدیث نبوی ہے نہ کچھ اور بلکہ غور کرکے دیکھو تو یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ خود شارع علیہ السلام آیات قرآنیہ کے معانی بیان کرنے سے ساکت رہے ہوں جبکہ ہمارا مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ اگر کسی استاد کے پاس کوئی شاگرد پڑھتا ہے تو وہ اپنے تمام سوالات کا جواب لیتا ہے - اور ہر ایک طرح اس کی تسلی کردینا استاد کا فرض ہوتا ہے - کیا کوئی عقلمند آدمی یہ کہیگا کہ استاد نے جو تقریر کسی عبارت یا جملہ یا کلام کی کی ہے اس کو اس عبارت یا جملہ یا کلام سے کچھ تعلق نہیں - وہ تقریر گو بلحاظ الفاظ کے مذکورہ بالا عبارت یا جملہ یا کلام سے علیحدہ ہے مگر چونکہ بدون اسکے وہ عبارت یا جملہ یا کلام آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا اسلئے وہ اسکا غیر نہیں بلکہ اعتباری فرق ہے ؛

احادیث کی وقعت صرف اسی امر سے ظاہر ہے کہ سلف وخلف کے اکابر علماء نے ہر ایک زمانہ میں اسکو اپنا شعار بنالیا ہے اور بدون انکے شریعت اسلامی کا کماحقہ واضح ہونا محال سمجھا ہے - تعجب یہ ہے کہ انسانی کلام کے سمجھنے کے لئے لوگ شروح وحواشی کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں مگر قرآن مجید جیسے دقیق وعمیق صحیفۂ آسمانی کے لئے پیغمبرؐ کی سنت کو ضروری نہیں سمجھا جاتا جو بمنزلہ تشریح وتفصیل کے ہے اور جس کو اہل بدعت قرآن کے لئے یہ کہہ کر موجب نقص قرار دیتے ہیں کہ احادیث کے ماننے سے قرآن مجید کو غیر مکمل ماننا لازم آتا ہے ؎

بریں عقل ودانش بباید گریست

علم حدیث کے موضوع کے رو سے علم حدیث کی ضرورت

(۱) علمائے عربیت ہر ایک علم کی نسبت موضوع کی بحث کیا کرتے ہیں - چنانچہ موضوع کی تعریف یہ ہے کہ موضوع کسی علم کا وہ چیز ہے جس کے عوارض

ذاتیہ کی بحث اس علم میں کی جائے مثلاً علم طب کا موضوع بدن انسانی ہے بلحاظ صحت و مرض کے۔ سو علمِ طب میں جسم انسانی کے ان حالات پر بحث ہو گی جو اس پر صحت و مرض کے رُو سے طاری ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا علم حساب کا موضوع عدد ہے کیونکہ اس میں اعداد کے مختلف عوارض سے بحث ہوتی ہے۔ اسی طرح علمِ حدیث کا موضوع محدثین ذات والا صفات جناب رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام بیان کیا کرتے ہیں نہ بہ حیثیت مطلق انسان ہونے کے بلکہ بلحاظ رسول ہونے کے یعنی علم حدیث میں رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ان اقوال و افعال وحالات ظاہری وباطنی پر بحث ہوتی ہے جو حضور علیہ السلام کی ذات والا صفات سے بحیثیت رسولِ خدا ہونے کے مخصوص ہیں۔

(ب) علمائے عربیت اس امر کا اظہار بھی کیا کرتے ہیں کہ کسی علم کی شرافت و فضیلت اس کے موضوع کی شرافت و فضیلت پر موقوف ہے یعنی جس قدر موضوع کسی علم کا شریف ہوگا اسیقدر وہ علم بہ نسبت دیگر علوم کے زیادہ شریف اور ضروری سمجھا جائیگا۔ چونکہ علم حدیث کا موضوع ذات جناب پیغمبر ہے جو باتفاق سلف و خلف اشرف المخلوقات ہیں اسلئے کچھ شک نہیں کہ علمِ حدیث بہ نسبت دیگر علوم کے زیادہ شریف اور اہم سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں جناب نبوی کے ان تمام حالات زندگی کی تشریح و تفصیل مندرج ہے جنکا علم ایک ایک مسلمان کو کامل الایمان ہونے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

(ج) یہ مسلم ہے کہ اگر ہم کتب احادیث کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ سمجھیں تو ہمیں مخالفین اسلام کے سامنے شارع علیہ السلام اور اسلامی شریعت اور اسکے تاریخی کارناموں اور انکی عظمت کے اظہار کے لئے کوئی موقع نہیں مل سکتا۔ بلکہ موجودہ محققین کے سامنے ہم ایک لفظ بھی اسلام کے فضائل بہ زبان تک نہیں لاسکتے کیونکہ قرآن مجید شارع علیہ السلام کے حالات اور احکام شریعت کو اس اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ کوئی محقق بلا استمداد حدیث ہرگز مؤرخانہ پہلو میں ان سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بالکل امر واقع ہے

کہ جب تک مخالفین شارع علیہ السلام کے تفصیلی حالات سے بخوبی ماہر ہو کر صحیح رائے قائم نہ کرینگے تب تک ناممکن ہے کہ انہیں حضور علیہ السلام کی غیر معمولی صداقت کا یقین حاصل ہو سکے جس نے شریعت حقہ کی عظمت کا سکہ مشرق سے مغرب تک قائم کر دیا۔ مثال کے طور پر حضور ؐ کے غزوات (جہادات) کی کیفیت پر غور کرو کہ قرآن مجید میں انکی کیفیت کس قدر مذکور ہے اور ایک محقق مورخ کو ایسے اہم واقعات اور انقلابات پر بحث کرتے وقت جن چھوٹے چھوٹے جزئیات کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے اور جن پر مورخانہ پہلو میں کئی ایک قسم کے مخالف و موافق نتائج پیدا کئے جاتے ہیں۔ قرآن مجید ان کو کہاں تک پیش کرتا ہے؟ ہر ایک لڑائی کے متعلق خواہ اسے دینی لڑائی کہو یا ملکی مورخ کو ان امور کا جاننا ضروری ہوتا ہے جن پر بالآخر وہ ایک صحیح رائے قائم کرنے کا موقع پا سکتا ہے۔ مثلاً . . . . .

(الف) اس لڑائی کے اسباب کیا تھے ؛

(ب) کن دو فریقوں میں وہ لڑائی ہوئی ؛

(ج) کس مقام پر ہوئی ؛

(د) کب ہوئی اور کب تک رہی ؛

(ہ) طرفین کی تعداد اور ہتیاری اسلحہ جنگ

(و) طرفین کے بہادروں کی تعداد ؛

(ز) کس قدر کشت و خون ہوا ؛

(ح) طرفین کے سپہ سالار اور نامی بہادر ؛

(ط) کیا کیا تدابیر طرفین سے عمل میں آئیں ؛

(ی) اگر کوئی مصالحت ہوئی تو اس کے شرائط ؛

(ک) فتح و شکست ؛

(ل) اس لڑائی کے نتائج اخلاقی، تمدنی سیاسی پہلو میں کیا کیا ظہور میں آئے وغیرہ

وغیرہ۔ اگر کسی جنگ یا اہم انقلاب ملکی یا مذہبی کو مذکورہ بالا تفصیلی صورت میں ظاہر نہیں کیا جائیگا۔ تو ایک محقق تو بجائے خود نیم محقق بھی تشفی نہیں پاسکیگا مگر موجودہ زمانہ ایسا جہالت خیز زمانہ نہیں ہے کہ صرف اتنی بات پر قانع ہو کر رہ جائے۔ کہ احزاب کا غزوہ پیغمبر کو پیش آیا تھا اور بس۔ جو شخص حدیث کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتا۔ اُسے چاہئے کہ قرآن مجید سے مذکورہ بالا امور کا پتہ لگائے۔ تعجب ہے کہ وہ کونسا جاہل اور اکھڑ آدمی ہے جس کی تسلی صرف اتنی بات پر ہو جائیگی کہ اس غزوہ احزاب واقع ہوا جسکے متعلق سورۂ احزاب میں آیات قرآنیہ نازل ہوئے سورۂ نور میں حدیث افک کے متعلق چند آیات قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ مگر کیا کوئی عقلمند آدمی ان آیات سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ منافقین نے افک (اتہام) کس عورت کی نسبت قائم کیا تھا اور کس شخص کو اس امر میں انگشت نما کیا گیا تھا۔ اور والذین جاؤا بالافک میں کون کون لوگ شامل تھے۔ اور آیات برئیت ام المومنین کے نازل ہونے تک کیا کیا امور جزئیہ پیش آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان سب سوالات کا جواب نفی میں دیا جاسکتا ہے مگر کیا کوئی محقق صرف اتنی ہی بات پر قانع ہو جائیگا کہ قرآن مجید میں کسی شخص پر کوئی کسی قسم کی تہمت لگائی گئی تھی جسکی اللہ تعالےٰ نے تکذیب کر دی اور بس؟ ہرگز نہیں۔ اور علیٰ ہذا القیاس تمام واقعات کو تاریخی حیثیت سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید انپر نہایت اجمال سے بحث کرتا ہے اور یہ امر اعجاز قرآنی میں داخل ہے۔ کیونکہ انسانی طرز تصنیف سے اسکا طرز بیان بالکل نرالا واقع ہوا ہے ؛

اب رہا احکام کا معاملہ جسکے مجموعہ کو شریعت اسلامی کہتے ہیں۔ سو اس کی نسبت صرف اتنا ہی کافی ہے کہ نماز کی نسبت جو تمام احکام سے اہم اور اولیٰ حکم رکھتی ہے صرف اتنا ہی مذکور ہے کہ نماز پڑھا کرو۔ کہیں کوئی تفصیل جس کو ایک غیر مذہب کا آدمی پڑھ کر نماز کی تفصیلی کیفیت سے آگاہ ہو جائے۔ مذکور نہیں۔ ارکان و آداب کے اشارات تو بیشک قرآن مجید میں مذکور ہیں مگر اوقات خمسہ کی حد بندی اور ارکان نماز کی تفصیل و ترتیب کا کچھ ذکر نہیں پھر کیا

بصورت عدم ضرورت حدیث یہ اعتراض مخالفین اسلام کا صحیح نہ ہوگا کہ نماز جیسے اہم حکم کو قرآنمجید نے واضح کرکے ذکر نہیں کیا۔ اور اگر کوئی مدعی ہمارے اس بیان کی صحت کا منکر ہو تو اسے چاہیئے کہ کسی مخالف اسلام سے اسکی تصدیق کرائے کہ نماز کی کیفیت تفصیلی قرآن مجید میں مذکور ہے اور جب یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ امر غیر کی تفہیم پر موقوف ہے تو پھر سوال عائد ہوگا کہ وہ غیر ایسا کون ہے جسکی تفصیل کو جناب پیغمبرؐ کی تفصیل پر ترجیح حاصل ہے اور کہاں تک قابل سماعت ہے ؟÷

ہمارے خیال میں تو حدیث سے کیفیت نماز نہ سمجھنے کی صورت میں یہ بات لازم آئیگی کہ ہر ایک شخص اپنی اپنی مرضی کے مطابق نماز کا ایک طریق ایجاد کرے جو یقیناً باہم ایسے مختلف ہونگے جن سے ایک سمجھدار کبھی یہ نہیں سمجھیگا کہ یہ مختلف طریق نماز کے کسی ایک ہی مذہب کے طریق ہیں۔ اس صورت میں جو جو خرابیاں لازم آئینگی انکے جوابدہ وہی جاہلان مغرور ہوسکتے ہیں جو حدیث کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتے ؛

چونکہ یہ مسئلہ موجودہ زمانہ میں کسی حد تک اہمیت حاصل کرچکا ہے اسلئے ہم اس کو مزید تفصیل کے ساتھ قلمبند کرکے منکرین کے اعتراضات کا قلع قمع کرتے ہیں ؎

الا گر از رہِ انکارِ سنت پیش می آئی
سرِ خود را نگاہ دار از دمِ شمشیرِ بطحائی (روحی)

جب انسان سوئے ظن میں ترقی کرتا ہے تو اس کا آخری مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ بہ اتباع ہوائے نفس اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کے حق میں بھی طرح طرح کی بدظنی کرنے لگتا ہے ۔

قرآن مجید کا مدعی ہونا اور سنت رسول علیہ الصلوٰۃ سے انکار کرنا دو عجیب متناقض خیال ہیں جنکا اکٹھا ہونا دشوار تو بجائے خود نا ممکن محض سے بھی چار قدم آگے ہے منکرین سنت نے چند ایک جاہلوں کو عجیب چکر دے رکھا ہے۔ کہ اگر قرآن مجید حدیث کا محتاج ہے تو پھر اسکو کتاب مکمل نہ سمجھا جائیگا۔ حالانکہ قرآن مجید خود اپنے کامل اور مفصل ہونے پر جا بجا شہادت دیتا ہے

پہلے تو یہ فرقہ نیچریہ کی نسبت سُنا کرتے تھے کہ وہ ان احادیث کو جو انکے غلط مسلمہ اصول کے برخلاف ہوتی ہیں تسلیم نہیں کرتے ۔ اور جہاں کوئی مفید مطلب حدیث ملجاتی ہے تو جھٹ اخذ کر لیتے ہیں چنانچہ نیچریوں کی تصانیف کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے مگر اب نیچریہ سے بڑھکر ایک اور فرقہ نمودار ہؤا ہے جس نے مطلق سنت رسول پر ہاتھ صاف کرنا چاہا ہے ان لوگوں کا استدلال بالکل فرقہ خارجیہ کے استدلال سے مشابہ ہے ۔ جنھوں نے جناب امیرالمؤمنین علیؑ کی امامت سے صرف آیہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کی غلط توجیہ پر انکار کرکے خونریزیاں کیں اور واصل جہنم ہوئے ۔ اسی طرح منکرین حدیث نبوی عام جہلا میں یہ کہا کرتے ہیں ۔ کہ قرآن مجید خود ہر ایک چیز کے لئے تبیان اور تفصیل ہے ۔ پھر حدیث کی کیا ضرورت ہے غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ بزعم خود جس قباحت سے گریز کرتے ہیں ۔ انکار حدیث کی صورت میں بدرجہ اولیٰ انہیں اسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ کیونکہ محدثین پر انکا الزام ہے کہ یہ لوگ قرآن کو ناقص خیال کرکے احادیث کی طرف رجوع کرتے ہیں مگر خود جب تفصیل و ترتیب احکام اور شان نزول کے متعلق واقعات کا پتہ انہیں قرآن مجید میں نہیں ملتا تو نہایت ذلیل ہوکر رہ جاتے ہیں ۔ مثلاً زکوٰۃ کے متعلق نہ تو نصاب کا ذکر قرآن مجید میں کہیں آیا ہے اور نہ مقدار زکوٰۃ کا ۔ اسلئے یہ کہنا کہ حدیث کی کچھ ضرورت نہیں اس جملہ کا قائم مقام ہے کہ اسلام میں احکام کی کیفیت و کمیت کا کچھ پتہ نہیں تو کیا یہ امر اسلام کے لئے موجب نقص نہیں ۔ الغرض ان لوگوں نے عوام الناس کو یہ دھوکا دے رکھا ہے ۔ کہ احادیث قرآن مجید کے برخلاف ہیں ۔ بعد میں لوگوں نے اپنی طرف سے بنالی ہیں اور حدیث کے جامعین کو جو بڑے بڑے اکابر ائمہ دین اور حامیان ملت تھے یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ اور مختلف قسم کی احادیث کو جنکا مضمون بظاہر

سلہ امیر معاویہ اور حضرت علی کے درمیان تنازع دور کرنے کے لئے عمرو بن عاص اور ابو موسیٰ اشعری طرفین سے ثالث مقرر ہوئے تھے ۔ خوارج نے کہا کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کا حکم مسموع نہیں ثالث مقرر کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جواب دیا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے میاں بیوی میں ناچاقی ہو جانے پر طرفین سے دو ثالثوں کے مقرر کرنیکا حکم دیا ہے ۔ حالانکہ وہ صرف شخصی معاملہ ہوتا ہے اور یہ معاملہ تو جمہور اہل اسلام کے لئے ہے ۱۲ منہ

ایک دوسرے کے مخالف ہو پیش کر کے تکذیب سنت پر زور دیتے ہیں۔ عوام الناس بیچارے جو اُصول سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں اور ناسخ و منسوخ۔ عام و خاص۔ مجمل و مفسر وغیرہ کا علم نہیں رکھتے اُن کی باتوں پر آ جاتے ہیں۔ اور سنت رسول علیہ السلام سے بدظن ہو کر انکار کر دیتے ہیں +

واضح ہو کہ جس شخص نے کتب احادیث کا مطالعہ کیا ہو گا اور اُصول سے واقف ہو گا۔ وہ بخوبی جانتا ہو گا کہ حضرات محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ نے ایک ایک حدیث کی یہاں تک تحقیق کی ہے اور اُصول کے مطابق تطبیق یا توجیہ یا راجح و مرجوح سے حکم اصلی کا پتہ لگایا ہے۔ کہ کسی منکر کی کوئی بات بھی چلتی نظر نہیں آتی اگر یہ لوگ انصاف اور حق پرستی سے کام لیتے تو اس امر میں غور کرتے کہ دنیا میں علوم و فنون کے جامعین ہمیشہ کسی علم کے متعلقہ مسائل کو بر وجہ اجمال مرتب کر دیا کرتے ہیں جن کی تفصیل و تشریح بعد کے آنے والے لوگ نہایت بسط کے ساتھ کیا کرتے ہیں اور الفاظ کے مفہوم کی تعیین میں عبارات نہایت کو ایراد کر کے دیگر لوگوں تک ان کا افادہ کیا کرتے ہیں گو یہ عبارات اصل کتاب کے الفاظ نہ ہوں مگر اصل الفاظ کے مفہوم کے پیش کرنے کے رُو سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم ان الفاظ سے استفادہ کرنے سے مستغنی ہیں۔ گو کسی خاص شخص کے الفاظ کو ہم غیر معتبر ہی سمجھیں مگر جب اصل کتاب کے الفاظ پیش کرنے والا ان الفاظ کی خود ہی تشریح کر دے تو اس کے مان لینے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اور اختلاف معانی حدیث کے متعلق ہم نے اوپر ذکر کر دیا ہے کہ ان میں حقیقتاً اختلاف نہیں ہوتا۔ دیکھو آیہ لا اکراہ فی الدین اور آیہ فاقتلوا المشرکین میں بظاہر تخالف نظر آتا ہے۔ مگر درحقیقت کوئی تخالف نہیں۔ آیات کے شان نزول اور خطاب عام اور خطاب خاص اور ناسخ و منسوخ اور مجمل و مفسر وغیرہ مسائل اصولیہ کو نظر انداز کر دینے سے کوئی شخص لاانتہا ہی درجہ تک گمراہ ہو سکتا ہے اور جو چاہے قرآن مجید سے ثابت کر دکھائے۔ تعجب ہے کہ ان لوگوں کو تغایر اور تناقض میں تفاوت معلوم نہیں ہوتا۔ تغایر کتاب اللہ اور احادیث نبویہ میں تو موجود ہے مگر یہ امر موجب عیب نہیں اور تناقض کہیں نہیں پایا جاتا۔ اور یہ واقعی موجب تکذیب ہے۔ سو ان لوگوں نے اختلاف تغایر اور اختلاف تناقض کو مخلوط کر کے حق کا انکار کر دیا +

یہ خیال کہ احادیث جو کتب صحاح میں منضبط ہو چکی ہیں بلاتحقیق لکھدی گئی ہیں اور یہ رسول علیہ السلام کے قول و فعل پر مشتمل نہیں ایک ایسی گستاخی ہے جسکے لئے معافی کی گنجائش نہیں۔ علمائے اُمت تو بخوبی واقف ہیں مگر عوام الناس پر اس امر کا ظاہر کردینا ضروری معلوم دیتا ہے کہ جسقدر تنقیح اور تحقیق احادیث کے بارے میں پہلی تین صدیوں میں ہو چکی ہے یقیناً کسی مذہب میں اس کی مثال موجود نہیں بلکہ ہمارا دعوےٰ ہے کہ اس سے زیادہ تنقیح و تحقیق ناممکن ہے اور یہ جناب حضور علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ جناب کی سنت مطہرہ کو ملحدوں۔ زندیقوں اور باقی تمام مخالفین کی دغل بازیوں سے بالکل مامون و مصون رکھا گیا۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالےٰ نے قرون اولےٰ کے عرصہ میں ایسے نفوس قدسیہ پیدا کر دئے جنکو اتقا۔ زہد۔ اخلاص۔ عالی ہمتی۔ فطرت سلیمہ۔ سلامت طبع۔ جودت ذہن۔ صفاءِ باطن۔ صبر و استقلال۔ محبت رسول علیہ السلام اس درجہ کمال تک حاصل تھے کہ آج انکی نظیر صفحہ عالم پر ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔ سچ ہے اذا اراد اللہ امرا ھیّأ اسبابہ یعنی جب اللہ تعالےٰ کسی کام کو پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کے اسباب بہم پہنچا دیتا ہے۔ اگر زمانۂ نبوت کے قریب ہی اس قسم کے پاک طینت اہل ایمان حفاظت دین کے لئے سینہ سپر نہ ہوتے تو آجتک یہود و نصاریٰ کی طرح اسلام کی حقیقی صورت کا دیکھنا محال ہو جاتا۔ گو مختلف فرقے پیدا ہوئے اور سینکڑوں مدعیانِ کاذب اُٹھے مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حقیقی اسلام کا علمی ذخیرہ معدوم ہو گیا ہے بدیہ سخت نادانی ہے کہ مختلف فرقوں کے اختلافات سے کوئی مدباطن یہ نتیجہ نکال لے کہ اس اسلام مقدس کا پتہ نہیں لگتا جس کو جناب امیٔ عرب (فداہ روحی) نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بذریعہ وحی لیا اور اُمت مرحومہ تک اس کی تبلیغ کر دی۔ قرآن مجید بلاتحریف بدستور موجود ہے۔ جناب کے وہ اقوال و افعال جنکو بڑے بڑے اکابر صحابہ رضہ نے بگوش ہوش سُنا اور بچشم عبرت ملاحظہ فرمایا۔ جماعت تابعین رح تک بطور امانت کے پہنچے

اور اِن بزرگواروں نے بلا کم وکاست ان عالی ہمت مردانِ خدا کے سپرد کئے۔ جنہوں نے بڑے بڑے دفاتر میں نہایت عرقریزی اور جانفشانی کے ساتھ عمریں صرف کرکے ایسی متانت سے قلمبند کئے کہ آج ہم لوگ بلا دقت اپنے ہر ایک قسم کے شک وشبہ کو دُور کر سکتے ہیں۔ اور اپنے نفوس سقیمہ کا معالجہ تجویز کرکے تقرب الے اللہ کا درجہ پا سکتے ہیں۔ انہیں نے اسماء الرجال کی بناڈالی تاکہ راویان حدیث کے حالات علمی اور حفظ وضبط اور اتقاء و اخلاق وغیرہ امور کا ہمیں پتہ لگ سکے کیونکہ بدوں ایسے اشخاص کے جو ہر ایک طرح سے قابل اطمینان ثابت ہوں کسی دوسرے کی روایت کو پایہ اعتبار حاصل نہیں ہو سکتا انہیں نے اُصول حدیث کو باندھا اور اقسام حدیث متواتر مشہور۔ عزیز۔ غریب۔ مرفوع و موقوف۔ منقطع ومرسل وغیرہ کو قائم کرکے ہر ایک کی حجیّت کا موازنہ کیا۔ اور تطبیق وترجیح کے قواعد مقرر کئے اور موضوع اور ضعیف وقوی کی پوری پوری تنقید کی جس سے ملحدین کی تمام موضوعہ اور غلط احادیث ایسے طور پر علیحدہ کر دکھائیں جیسے دودھ سے مکھی نکال کر باہر پھینک دی جاتی ہے ؛

اِن حضرات کے بعد آنیوالے علماء ملت نے نخات حدیث پر کتابیں لکھیں اور بڑی بڑی بسیط وسبیع شرحیں قلمبند کیں جن سے سنت جناب رسول علیہ السلام کا قلعہ اس طرح مضبوط ہوگیا کہ اگر آج تمام روئے زمین کی سلطنتیں ملکر اس کو منہدم کرنا چاہیں تو مُنہ کی کھا کر رہ جائیں۔ کیا ایک انصاف پسند آدمی کے لئے جو اپنے امعان نظر سے کام لے اس امر میں شک کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ یہ سب کچھ حضور علیہ السلام کے اس نور پاک کا پرتو تھا جو بذریعہ وحی جناب باری سے سینہ مبارک نبوی میں القا ہوا اور مسلسل ان نفوس قدسیہ تک پہنچا جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ علمی معجزات کا ذکر کرتے ہوئے حضورؐ کے اس معجزہ کا مقابل کوئی دوسرا معجزہ ہو سکتا ہے کہنے کو تو کتب صحاح تمام لوگ کہا کرتے ہیں مگر کوئی حقیقت بین اور سلامت کیش فطرت چاہئے جو حقیقت ترانیہ کو چشم بصیرت سے

ان میں جلوہ گر دیکھے۔ اور اُسے یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ ودیعت جو آدم علیہ السلام سے مسیح علیہ السلام تک یکے بعد دیگرے تمام انبیاء علیہم السّلام کے پاس منتقل ہوتی رہی اور اہل عالم اس سے مستفید ہونے سے محروم تھے۔ بالآخر بوساطت جناب ختم المرسلین اس اُمت مرحومہ کے نصیب ہوئی۔ ع

تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

سنّت مطہرہ رسول علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی حقانیت پر اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہوگی کہ جن بزرگوارانِ دین نے اس کو سفر و حضر میں ظاہر و باطن میں لیل و نہار میں اپنی روش زندگی کا دستور العمل قرار دے لیا۔ انہیں تقرب الی اللہ کے مدارج عالیہ پر پہونچنا نصیب ہوگیا۔ وہ صاحب کشف و کرامات ہوگئے۔ اُنکی دعائیں مستجاب ہوئیں وہ لاکھوں کیلئے راہنما بنے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا مستغنی بنا دیا کہ دُنیا و مافیہا کی اُنکی نگاہ میں کچھ حقیقت نہ رہی اور انکے مبارک نام قیامت تک کیلئے صفحۂ عالم پر کندہ کر دئے گئے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوگیا یہ وہی بزرگوار ہیں جن کا اشارہ آیہ واخرین منھم لما یلحقوا بھم میں آچکا ہے۔ برخلاف اس کے جن لوگوں نے اس صراط مستقیم سے مُنہ پھیر لیا اور این و آں کے پیچھے دوڑتے پھرے اور اپنے معلومات اور تحقیقات پر اتراتے رہے اور بزعم خود سالکانِ طریق کو غلط راستے پر سمجھتے رہے اور سوءِ ظن سے اُنہیں مشکوٰۃ نبوت سے اقتباس انوار کا موقع نہ ملا اور غلط طریق کو حق باور کرتے رہے۔ نہ تو انہیں کسی منزلِ تحقیق تک پہنچنا نصیب ہوا۔ اور نہ اپنے دعاوی باطلہ کو اپنے بعد قائم رکھ سکے۔ چند روز کے لئے کرمک شب تاب کی طرح اپنی چمک دکھلا گئے۔ مگر ضیا کے نور کو ماند نہ کرسکے۔

اب ہم اس سوءِ ظن کو دور کرتے ہیں کہ کتب احادیث میں بناوٹی اور فرضی باتیں لکھی ہیں ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ خیال ایک بڑی سخت گستاخی ہے اور نشان شقاوت ہے کیونکہ اگر ہم ان بزرگوارانِ دین کے حق میں سوءِ ظن پیدا کرلیں۔ جنہوں نے نزول وحی کے مواقع اور

اسباب کا بزمانہ نبوی بچشم خود مشاہدہ کیا اور حضور علیہ السلام کی صحبت بابرکت میں رہ کر علمی اور عملی کمالات کے رنگ میں رنگے گئے۔ علاوہ جن کی تصدیق میں قرآن مجید کی آیات نہایت زور کے ساتھ ناطق ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حق اور صداقت کی تلاش ہم کس جگہ کر سکتے ہیں اور وہ کونسے ایسے ماخذ ہیں جہاں سے ہم اپنا اطمینان کر سکیں۔ کیونکہ قرآن مجید بھی تو ہمیں انہیں حضرات کی معرفت ملا ہے اور انہیں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے جس خدا نے اس مقدس کتاب کو تحریف سے آج تک محفوظ رکھا ہے اسی نے ہمیں یہ بھی تلقین کی ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اور اسی نے ہمیں یہ ہدایت فرمائی قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ یہی دو آیتیں سمجھدار صداقت پسند کے لئے سنت مطہرہ نبویہ کے ثبوت میں کافی و وافی ہیں بشرطیکہ کج بحثی سے کام نہ لیا جائے۔

جس نبی اللہ کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹ ایسا گناہ کبیرہ ہے اور قرآن مجید جھوٹوں کی نسبت لعنت اللہ علی الکاذبین کا حکم کرتا ہے۔ کیا اس کے حاشیہ نشین اور تربیت یافتہ لوگ اللہ اور اللہ کے رسول پر بہتان باندھنے کی جرأت کرینگے؟ معاذاللہ ایسا خیال صرف ایسی شخص کا ہو سکتا ہے جس کے دل میں مطلق خدا کا خوف باقی نہ رہا ہو اور وہ شیطان کے دام میں ایسا گرفتار ہو چکا ہو کہ اسکا رہائی پانا ناممکن ہو جائے۔ ورنہ عقل و ہوش کا آدمی خود سمجھ سکتا ہے کہ وہ لوگ تو جناب رسول کی خدمت سراپا برکت میں صلاح و تقویٰ اور نجات آخرت کی امید پہ گھر بار چھوڑ کر آ بیٹھے تھے۔ اگر انہوں نے جھوٹ بولنا ہی سیکھا تھا تو معاذاللہ یہ کس قدر بھاری تہمت ہے نہ صرف انہیں حضرات پر بلکہ رسول خدا اور خدا پر وہی لوگ تو اس حدیث کے راوی ہوں مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ۔ اور خود ہی اللہ کے سچے رسول کی طرف جھوٹی باتیں نسبت

لہ یہ خیال کہ رسول یعنی قرآن ماخوذ ہے۔ ایک ایسی فاش غلطی ہے جو سیاق و سباق آیت کے منافی ہے بھلا آیہ یاایہا الرسول بلغ ما انزل الیک کے یہ معنی ہونگے کہ اے قرآن تو قرآن مجید کو لوگوں کے سامنے پیش کردے۔ ۱۲ منہ

کرنے بیٹھ جائیں اور اگر بفرض محال اسکو سچ مان لیا جائے تو لازم آئیگا کہ شروع اسلام سے آجتک تمام لوگ ضلالت و غوایت کے گڑھے میں پڑے رہے اور ان میں سے کوئی بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ صرف قرآن مجید ہی تمام احکام کی وضاحت کے لئے کافی ہے احادیث کی کیا ضرورت ہے؟ اور یہ بات سمجھ میں آئی تو ان لوگوں کو جنہیں نہ تو علم ہے نہ عمل نہ صلاح نہ تقویٰ ؂

کس نیاید بزیر سایہ بوم
ور ہما از جہاں شود معدوم

اسلام میں مطلق کذب کی سخت مذمت وارد ہوئی ہے۔ اور گو اس کی ممانعت میں تمام مذاہب متفق ہیں۔ مگر ہم چند احادیث کو ذیل میں بطور شہادت کے پیش کرتے ہیں۔ اہل ایمان خود اندازہ لگا لیںگے کہ جو لوگ ان احادیث کے راوی ہیں آیا وہ جھوٹ بولنے والے لوگ تھے؟

(۱) ابوداؤد اور ترمذی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں ایاکم والکذب فان الکذب یھدی الی الفجور وان الفجور یھدی الی النار۔ یعنی جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ آدمی کو بدکاری کی ہدایت کرتا ہے۔ اور بدکاری جہنم میں پہنچا دیتی ہے۔

(ب) مسند امام احمد میں بروایت ابن لھیعہ مروی ہے۔ اِذَا کَذَبَ الْعَبْدُ فَجَرَ واذا فجر کفر واذا کفر دخل النار۔ یعنی آدمی جب جھوٹ اپنی عادت بنا لیتا ہے تو بدکاری تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جب بدکاری کا مرتکب ہوتا ہے تو کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور جب کفر کرتا ہے تو مستوجب جہنم ہو جاتا ہے ؛

(ج) صحیحین میں مروی ہے کہ منافق آدمی کے تین نشان ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ۔ یعنی جب بات کہے تو جھوٹ کہے ؛

(د) مسند امام احمد و طبرانی میں مروی ہے لا یؤمن العبد الایمان کلہ حتی

یترک الکذب فی المزاح والمراء وان کان صادقا۔ یعنی آدمی کامل الایمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک مخول اور جھگڑے میں بھی جھوٹ بولنا ترک نہ کر دے گو وہ سچا ہی ہو ؛

(ط) طبرانی۔ بیہقی۔ ابویعلی بسند صحیح راوی ہیں یطبع المومن علی کل خلۃ غیر الخیانۃ والکذب۔ یعنی ایمانداری میں تمام خصائل طبعی ہو سکتے ہیں۔ مگر خیانت اور جھوٹ اسکی فطرت سے دور ہوتے ہیں ؛

(ی) مالک رضہ بطریق ارسال راوی ہیں قیل یا رسول اللہ ایکون المومن جبانا قال نعم۔ قیل لہ ایکون المومن بخیلا قال نعم قیل لہ ایکون المومن کذابا قال لا یعنی حضور سے سوال کیا گیا کہ ایماندار آدمی بزدل ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر سوال کیا گیا کہ ایماندار آدمی بخیل ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر سائل نے سوال کیا کہ آیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں !

(ک) مسند امام احمدؒ میں بروایت ابوہریرہ رضہ مروی ہے من قال لصبی تعال ھاک اعطک ثم لم یعطہ فھی کذبۃ۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی بچے کو یوں کہے کہ آؤ میں تمہیں کچھ دوں پھر وہ اسے کچھ نہ دے تو یہ بھی ایک جھوٹ ہے۔ ان مسطورہ بالا احادیث میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جھوٹ کی شارع علیہ السلام نے کس قدر مذمت فرمائی ہے اور قرآن مجید کا جھوٹے کو مستوجب لعنت قرار دینا کس قدر سخت وعید ہے۔ یہ تو عام طور پر جھوٹ کی نسبت حکم ہے مگر اللہ تعالے اور اس کے رسول مقبول کی طرف کوئی جھوٹی بات نسبت کرنا اس سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید صاف صاف اس حکم کو ان الفاظ واضح کرتا ہے وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ تَرَی الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلَی اللّٰہِ وُجُوْھُھُمْ مُّسْوَدَّۃٌ۔ یعنی قیامت کو تم ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ تعالے پر جھوٹ باندھا سیاہ رو دیکھو گے۔ اور حدیث مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار جو اوپر مذکور ہوئی۔ محققین اہل حدیث کے نزدیک متواتر تسلیم کیگئی ہے۔ چنانچہ قریباً اسی[1] صحابہ سے

[1] محدث طبرانی اور ابن مندہ نے ۶۰ طرق سے اس حدیث کی تخریج کی ہے اور محدث ابن حجر عسقلانی مؤلف فتح الباری شرح صحیح بخاری نے اس حدیث پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے ۱۲ منہ

مختلف طریقوں پر مروی ہے۔ پھر ایک دوسری حدیث میں جو بروایت مسلم مروی ہے اس امر کی تصریح ہوئی ہے من حدث عني بحديث يرى انه كذب فهو احد الكاذبين یعنی جو شخص میری طرف کسی ایسی حدیث کی نسبت کرے جس کو وہ جھوٹ باور کرتا ہو تو وہ شخص بھی جھوٹوں میں ایک جھوٹا ہے ۔

ناظرین با انصاف غور کریں کہ جو لوگ اس حدیث کا بنیاد دستور العمل بنالینگے کیا وہ خدا کے رسول مقبول کی طرف کوئی جھوٹ بات منسوب کر سکیں گے؟ انہوں نے سچ اور جھوٹ میں کامل تمیز کرنے کے لئے علم اسماء الرجال وضع کیا اور جھوٹوں اور موضوع اور ضعیف حدیثوں کے راویوں کی فہرستیں لکھیں تاکہ لوگ شریعت میں کسی جھوٹی بات پر دھوکا کھا کر اس کو حکم شرعی نہ سمجھنے لگیں۔ درحقیقت وہ زمانہ سخت ابتلاء کا زمانہ تھا جبکہ مختلف قسم کے اہل بدعت نے اپنے اپنے دعاوی کے اثبات میں جھوٹی حدیثیں بنانی شروع کردیں اور حق و باطل میں ایسا اختلاط پیدا کر دیا کہ جس کو دور کرنا انہیں مردانِ خدا کا کام تھا جن کو اللہ تعالےٰ نے اہل ایمان کے لئے پیشوا اور قدوہ قرار دیا۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ اُن کا ذکر خیر دلوں میں ایمانی طاقت کو مضبوط کر دیتا ہے اور ان کی روش مستقیم کو سُن کر محبت شریعت دل میں پیدا ہوتی ہے کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ عبداللہ ابن عباس رض اور عبداللہ ابن مسعود اور عبداللہ بن عمر اور ابوہریرہ رض جھوٹ بولا کرتے تھے یا ابوحنیفہ۔ شافعی۔ مالک۔ احمد رحمہم اللہ جھوٹے لوگ تھے؟ معاذاللہ ثم معاذاللہ۔ جھوٹا تو خدا کی لعنت کا مستحق ہو کر یہ عزت نہیں پا سکتا۔ جو انہیں چار دانگ عالم میں حاصل ہے۔ کیا اگر ان حضرات میں سے کوئی شخص آج زندہ ہو کر یہ کہے کہ فلاں حدیث ہم کو نہایت صحیح طریق پر جناب رسول مقبول علیہ السلام سے یوں پہنچی ہے تو کیا کوئی کہہ سکیگا کہ نہیں حضرت آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ حاشا و کلا۔ بلکہ ان لوگوں کی صداقت کا اسلامی دنیا میں اسقدر سکہ وخطبہ مسلم ہو چکا ہے کہ ایک آن کے لئے بھی کوئی شخص ایسا سوءِ ظن ان کی نسبت پیدا نہیں کر سکتا۔ اور اگر سوءِ ظن کو اتنا ہی وسیع کرنا چاہتے ہو تو ان لوگوں

کا پتہ دو۔ جن کی نسبت ہمیں سوءِ ظن پیدا نہ ہو۔ ان حضرات نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا کوئی نہ کوئی ماخذ شرعی انہوں نے اپنی جگہ قرار دے لیا ہے۔ گو یہ خیال ہر ایک حالت میں صحیح ہے کہ ہر ایک مجتہد یا ہر ایک محدث یا ہر ایک فقیہ اپنے اجتہاد میں غلطی کر سکتا ہے مگر وہ عمداً جھوٹ نہیں کہہ سکتا +

ہم اپنے ناظرین پر یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ جن احادیث کو محدثین نے قابل حجت سمجھا ہے وہ صرف وہی احادیث ہیں جو صحیح کہلاتی ہیں۔ ہاں صحیح کے کئی ایک اقسام ہیں جو بلحاظ قوت وضعف کے متفاوت ہیں۔ مگر اس امر کو ہرگز جائز نہیں رکھا گیا کہ حدیث ضعیف کو اور بالخصوص ایسی حدیث کو جس کے موضوع ہونے کا یقین ہو چکا ہو کوئی شخص معرض استدلال میں پیش کرے۔ حافظ سیوطی اپنی کتاب تدریب الراوی جو علم اصول حدیث کی ایک معتبر کتاب ہے لکھتے ہیں :۔

النوع الحادی والعشرون الموضوع هو الکذب المختلق المصنوع وهو شر الضعیف واقبحه وتحرم روایته مع العلم به ای بوضعه فی ای معنی کان سواء الاحکام والقصص والترغیب وغیرها الا مبینا ای مقرونا ببیان وضعه لحدیث مسلم من حدث عنی بحدیث یری انه کذب فهو احد الکاذبین۔ یعنی اکیسویں قسم حدیث موضوع ہے اور وہ کذب کا نام ہے جو خود ساختہ اور من گھڑت ہوتا ہے اور ضعیف احادیث میں اس کو نہایت قبیح سمجھا گیا ہے اور اس کا روایت کرنا حرام ہے جبکہ راوی کو اس کے مصنوع ہونے کا علم ہو اور کسی امر کے استدلال میں اس کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ وہ کوئی امر شرعی ہو یا کوئی واقعہ ہو یا کوئی ترغیب و ترہیب کا موقع ہو۔ ہاں اس وقت اس کو بیان کیا جا سکتا ہے جبکہ لوگوں پر اس کا موضوع ہونا بیان کرنا مد نظر ہو اور ایسی حدیث کی حرمت روایت حدیث مسلم سے ثابت ہے جو اوپر مذکور ہو چکی۔ اسی طرح حافظ عراقی الفیۃ الحدیث میں لکھتے ہیں ؎

شر الضعیف الخبر الموضوع — الکذب المختلق المصنوع
وکیف کان لم یجیبن واذکرہ — من علمہ مالم تبین امرہ

اس کا حاصل بھی بعینہ وہی ہے جو مذکورہ بالا عبارت حافظ سیوطی کا ہے۔ حافظ سخاوی رح اس کی شرح میں لکھتے ہیں وکفیٰ بھذہ الجملۃ وعیداً شدیداً فی حق من روی الحدیث وھو یظن انہ کذب فضلاً عن ان یتحقق ذلک ولایبینہ لانہ صلے اللہ علیہ وسلم جعل المحدث بذلک شریکاً لکاذب بہ فی وضعہ۔ یعنی یہ جملہ (حدیث مسلم) اس شخص کے لئے وعید اس جھوٹی حدیث کو روایت کرے کافی وعید ہے چہ جائیکہ اس کو ثابت کرے اور اس کے موضوع ہونے کا بیان نہ کرے کیونکہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے ایسے راوی کو حدیث کے واضع کے ساتھ شریک کذب فرمایا ہے +

اور سفیان ثوری حبیب بن ابی ثابت سے راوی ہیں من روی الکذب فھو الکذاب۔ یعنی جو شخص کسی جھوٹ بات کو روایت کرتا ہے وہ بڑے درجہ کا جھوٹا ہے +

خطیب بغدادی لکھتے ہیں یجب علے المحدث ان لا یروی شیئاً من الاخبار المصنوعۃ والاحادیث الباطلۃ الموضوعۃ فمن فعل ذلک باء بالاثم المبین ودخل فی جملۃ الکاذبین۔ یعنی محدث پر واجب ہے کہ خود ساختہ اور جھوٹی حدیثوں کو روایت نہ کرے جو شخص ایسا کرے وہ اپنے گنہگار ہونے کا خود اقرار کرتا ہے اور جھوٹوں میں داخل سمجھا جائیگا +

اور امام بخاری حدیث موضوع کے ذیل میں لکھتے ہیں من حدث بھذا استوجب الضرب الشدید والحبس الطویل یعنی جو شخص موضوع حدیث کی روایت کرتا ہے وہ ضرب شدید اور زندان کا مستوجب ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں لکن محل ھذا مالم یبین ذاکرہ امرہ کان یقول ھذا کذب او باطل او نحوھما من التصریح فی ذلک یعنی مذکورہ بالا سزا کا وجوب وہاں عائد ہوگا جہاں راوی حدیث اس حدیث کی اصلیت کو بیان نہ کرے

مثلاً بالصراحت یہ نہ کہے کہ یہ حدیث جھوٹ ہے یا باطل ۔

محدث ابن حجرؒ کتاب زواجر میں امام شافعیؒ سے ناقل ہیں ومن الکذب الکذب الخفی وھو ان یروی الانسان خبرا عمن لا یعرف صدقہ من کذبہ یعنی جھوٹ کے اقسام میں سے ایک جھوٹ خفی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کسی ایسے شخص سے روایت کرے جسکے صدق و کذب کا اسے علم نہیں۔ صیرفی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اسکی مثال بعینہ ریا کی سی ہے جو شرک خفی کا حکم رکھتا ہے ۔

الغرض ہم کہاں تک عبارات کو نقل کئے جائیں۔ جا بجا آئمہ اہل حدیث نے احادیث موضوعہ کی روایت کی سخت ممانعت کی ہے اور وہ سب کے سب جناب پیغمبرؐ کے فرمان واجب الاذعان سے اس ممانعت کو بنص صریح پیش کرتے ہیں۔ پھر کس شخص کی مجال ہے کہ باوجود کتاب اللہ اور سنت رسول علیہ السلام کے پورا علم رکھنے کے کوئی ایسی بات اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف نسبت کرے جو انہوں نے نہیں کہی۔ میرے خیال میں ایسا شخص واجب التعذیر ہے جو جھوٹ موٹ شریعت حقہ میں ایسی بات کو داخل کرتا ہے یہ ایک ایسا فتنہ عظیم ہے جس پر کسی معمولی ایماندار کو بھی جرأت نہیں ہوسکتی چہ جائیکہ حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ اور دیگر آئمہ مجتہدین جن کی نسبت عمداً جھوٹ بولنے کا گمان تک بھی نہیں ہوسکتا۔ مگر حق یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے شقاوت سر پر سوار ہو جائے تو کسی بھلے مانس کو ایسی ہی باتیں سوجھا کرتی ہیں کہ وہ بزرگان دین کو طرح طرح کی تہمتوں سے بدنام کرنا شروع کرتا ہے اور عوام الناس کو ان کے اتباع سے روکتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ خود ہی خائب و خاسر ہو کر خدا کے عذاب کا مستوجب قرار پاتا ہے ومما قلت واعظاً فی ھذا المقام :۔

الا[1] یا من تصدیٰ للخصام ۔ الیک فلا تبالغ فی الکلام

[1] اے فلاں جس کا کام جھگڑا ہے چل ہٹ۔ زیادہ گفتگو مت کرو۔

۲ فکم من عابث بالحق زوراً ÷ وباطله علی ادهی مرام

۳ تکذب عصبة الاخیار ظلماً ÷ وهم خیر الوری اعلی المقام

۴ فکیف تطیق امراً لم یرمه ÷ اولوا الالباب قبلک فی المنام

۵ تکذب بالحدیث تقول فیه ÷ بما یزری بقاطبة الکرام

۶ اتنکر قول من یهدی الحق ÷ بنور الوحی ضدّ ذوی الظلام

۷ فهذا لیس من عادات قوم ÷ مضوا اسلافاً براءً من ملام

۸ وسوء الظن لا یجدیک شیئاً ÷ فتب قبل الممات الی السلام

۹ فربّ العرش ذو بطش شدید ÷ ستبلی کلّ نفس بالاثام

۱۰ صلوة الله قرناً بعد قرن ÷ علی جرثومة المجد الهمام

(ق)

۱۱ نبی الله من عاداه جهلاً ÷ فقد عادی ملیکاً ذا انتقام

صاحبو! ہمارا زمانہ درحقیقت نہایت ابتلاء اور امتحان کا زمانہ ہے۔ جابجا شورہ پشتی اور مذہبی آزادی کے آثار نمودار ہو رہے ہیں اور مدعیان کاذب لوگوں کو دین کے لباس میں آکر عجیب عجیب طریق پر صراط مستقیم شریعت سے ہٹا رہے ہیں۔ ہر ایک جاہل

۲؎ اکثر لوگ حق کو بگاڑنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کا باطل طریق ایک خوف کے مقصد پر مبنی ہوتا ہے ۳؎ تو تمام سلف صالحین کی جماعت کی تکذیب کرتا ہے حالانکہ وہ بہترین خلق اور عالی پایہ کے لوگ تھے ۴؎ تو ایسے امر پر کیسے قدرت پائے گا جس کا خیال کسی عقلمند کو خواب میں بھی نہیں آیا (۵) تو حدیث رسول اللہ صلعم کی تکذیب کرتا ہے اور ایک ایسی بات کہتا ہے جو تمام اکابر کے لئے موجب عیب ہے (۶) کیا ایسے شخص کے اقوال سے جو نور وحی کے ساتھ ظلمت کفر و شرک سے نکال کر لوگوں کو حقیقی منزل کی طرف ہدایت کرتا تھا تو انکار کرتا ہے ۷؎ یہ تو ان شریف لوگوں کی عادات سے بعید ہے جو اس دنیا سے نہایت عزت کے ساتھ نیکنام ہو کر رخصت ہوئے ۸؎ بدظنی کچھ مفید نہیں ہوگی سو تو مرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر (۹) کیونکہ وہ زبردست خدا سخت غضب والا ہے اور عنقریب ہر شخص اپنی برائیوں کی پاداش میں مبتلا ہوگا ۱۰؎ سالہا سال تک اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہو اس شریف الاصل بلند بخت (۱۱) یعنی رسول اللہ صلعم پر کہ جہالت سے جو شخص آپ کا دشمن ہوا وہ درحقیقت خدائے تعالیٰ کا دشمن ہو گیا جو صاحب انتقام ہے ۱۲ منہ

بازاری جس کو نہ علم ہے نہ عمل اور جس کا مقصد بجز دنیا کمانے کے اور کچھ نہیں۔ رہنا اور محقق اور امام بن رہا ہے۔ دہریت۔ نیچریت۔ میرزائیت۔ چکڑالویت وغیرہ مذاہب باطلہ کو آپ نہایت غور سے دیکھیں گے تو ان سب میں اس امر کو قدر مشترک پائیں گے کہ بزرگانِ سلف کی ہتک عزت اور توہین کی جائے اور ان کے طریق کو پرانا اور مردہ اسلام کہہ کر لوگوں کو بدظن کیا جائے اور زندقہ اور الحاد کی طرف توجہ دلائی جائے۔ چنانچہ بعض لوگ دعاوی باطلہ میں اس قدر دُور نکل گئے ہیں کہ اب کوئی مرحلہ کسی دعویٰ کا باقی نہیں رہا۔ خدا ہے کہ غریب اور بے کس مسلمانوں کو اس طوفان بے تمیزی سے نجات دے۔ ورنہ بظاہر نہایت مشکلات کا سامنا نظر آ رہا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ امور دنیا میں اس حد تک کہ منافی شریعت نہ ہوں جس طرح چاہیں زمانہ کا ساتھ دیں اور اسباب ترقی میں ہمہ تن ساعی رہیں مگر خدا کے لئے دین کے معاملہ میں بھیڑ چال نہ اختیار کریں۔ کیونکہ دین کا معاملہ نہایت نازک ہے اور وہی حق ہے جس پر قرون اولیٰ کے لوگ قائم تھے اور جو جمہور علمائے اسلام میں اب تک موجود ہے ؎

دور است سرِ آب دریں بادیہ ہشدار تا غولِ بیاباں نفریبد بسرابت

باب یازدہم

الحقوق

بنی نوع انسان کے علاوہ دیگر جاندار مخلوقات پر بھی رحمدلی سے سلوک کرنا عین منشاء اسلام ہے	جس شخص نے قرآن مجید کی تعلیم میں غور و خوض کیا ہوگا۔ وہ یقیناً جانتا ہوگا کہ شریعت سب کی سب آداب اور حقوق کی تعلیم پر مشتمل ہے۔ پس جو شخص آداب

حقوق اسلامی سے واقفیت نہیں رکھتا وہ کمال ایمان کے معنی سمجھنے سے بھی عاری ہے - ایمان کی تکمیل آداب اور حقوق کی بجاآوری سے ہوتی ہے - حفظ مراتب اسلام کی پہلی تعلیم ہے ؂

ایک حدیث میں وارد ہوا لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا یعنی جو شخص چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے اور ایک دوسری حدیث میں دین کی حقیقت کو یوں ارشاد فرمایا التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علے خلق اللہ یعنی دین اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم اور خلق خدا پر شفقت کرنے کا نام ہے - اس حدیث میں لفظ خلق اللہ کے مفہوم میں ہر ایک قسم کی مخلوقات شامل ہے کسی مذہب کی کوئی تخصیص نہیں - اس کی تائید میں ایک اور حدیث میں یوں وارد ہوا ہے ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء یعنی تم زمین والوں پر رحم کرو - خدائے برتر تم پر رحم کریگا - اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ہر ایک قسم کی مخلوق خدا کے ساتھ شفقت و رحمت سے پیش آنیکی تعلیم دیتا ہے ذیل میں چند ایک حقوق ضروریہ کا ذکر کیا جاتا ہے - جن کا جاننا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے ؂

حقوق عامۂ مسلمین

قرآن مجید کے الفاظ انما المؤمنون اخوۃ سے جو تعلیم مدنظر ہے وہ اسقدر وسیع اور جامع ہے جس کو کسی دوسرے الفاظ میں بدیں اختصار پیش کرنا ناممکن ہے - تمام اہل ایمان کو اخوت کے ایسے مضبوط سلسلہ میں جکڑا گیا ہے - جس میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیگئی - یہ رابطۂ اخوت ہر ایک اہل ایمان پر کئی ایک قسم کے حقوق عائد کرتا ہے - جن کی نگہداشت فرض شرعی ہے - چنانچہ واجب ہے کہ ہر ایک ایماندار جب اپنے کسی بھائی مسلمان سے ملاقات کرے تو خواہ سابقہ تعارف یا تعلق ان ہر دو میں قائم ہو یا نہ ہو السلام علیکم کہے - اور دوسروں کو چاہئے کہ اس کا جواب دیں اور جس طلب منفعت یا دفع مضرت کو اپنے لئے چاہتے وہی اپنے دوسرے مسلمان

بھائی کے لئے بھی چاہئے اور اپنی طرف سے کسی کو زبان یا ہاتھ سے اذیت نہ پہنچائے کیونکہ کامل مسلم کا نشان ایک حدیث میں یہی بتایا گیا ہے اور نہ کسی کی بُری بات کو دوسروں تک پہونچائے - کیونکہ یہ چغلی ہے - اور چغلی کھانے والے کی نسبت وارد ہُوا ہے کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا - اور اگر کسی مسلمان بھائی سے ناراض ہو تو تین دن سے زیادہ فی مابین رنجش نہ رہنے دے - اور احسان و مروّت کرتے وقت اپنے اور بیگانے میں امتیاز نہ کرے اور یہ ایک بڑا بھاری وصف ہے اور اگر کسی دوست کے مکان پہ اُس کی ملاقات کو جائے تو اجازت لیکر اندر داخل ہو - اگر اجازت حاصل ہو تو اس کے گھر میں داخل ہو ورنہ واپس چلا آئے - اور ہر ایک شخص کے ساتھ حسن اخلاق کے ساتھ پیش آئے اور اپنے کلام میں لطف و مدارات کو ملحوظ رکھے - آیۂ قولوا للناس حسنا کے یہی معنی ہیں اور کشادہ روئی اور خندہ پیشانی سے ملاقات کرنا حسن اخلاق کا پہلا مرحلہ ہے اور اپنے وعدے کا ایفا کرے - اس کے علاوہ کسی مسلمان کے جنازہ میں شامل ہونا یا اس کا کسی امر جائز میں کسی دوسرے مسلمان کی امداد کرنا اور دو مسلمان بھائیوں میں مصالحت کرا دینا اور بیمار پرسی کرنا اور کسی امر جائز میں اسکو صحیح رہنمائی کرنا اور کسی کے عیوب پہ پردہ پوشی کرنا اور یتیم رانڈ مسکین اور دیگر اہل حاجت کی خبر گیری اور اعانت کا حتی الوسع متکفل ہونا اور کسی مصیبت زدہ یا مظلوم کی اعانت کرنا اور زیارت قبورِ مسلمین اور ان کے حق میں دعائے مغفرت اور عبرت حاصل کرنا وغیر ذالک سب کے سب حقوق عامہ مسلمین میں داخل ہیں *

افسوس کہ مسلمانوں میں اکثر ایسے نفوس بھی نظر آتے ہیں جو اپنی وجاہت دنیوی کو مدنظر رکھ کر مذکورہ بالا حقوق کی نگہداشت اپنے لئے موجب عار و ننگ خیال کرتے ہیں - مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ وہ غرور و نخوت ہے جس سے دوسروں کے دلوں میں مبغوض سمجھا جاتا ہے - ایک حدیث میں وارد ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خاطر فروتنی کرتا ہے خدا اُسے اور بھی بلند

کرتا ہے مگر حکومت کی کرسی پر بیٹھنے والوں کو یہ بات کیوں نصیب ہونے لگی؟ ؎

حقوق الجوار

قبل از اسلام حق جوار اہل عرب میں بدرجہ غایت ملحوظ تھا۔ اخبار عرب اور ان کے دواوین اشعار اس امر پر ناطق ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

وما ضرنا انا قلیل وجارنا ؎ عزیز وجار الاکثرین ذلیل

یعنی ہمارا اشمار زمین کم ہونا ہمیں کچھ مضر نہیں۔ جبکہ ہمارا ہمسایہ ہماری حمایت میں باعزت زندگی بسر کرتا ہے۔ حالانکہ بعض دوسرے لوگوں کے ہمسایہ ذلیل سمجھے جاتے ہیں ؎

شریعت اسلام نے اس حق جوار کی عزت کو ملحوظ رکھنے کی بہت تاکید کی ہے اخوت اسلام کے علاوہ شریعت اسلام نے اس حق کی نگہداشت کا تاکیدی حکم صادر فرمایا۔ ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے۔ الجیران ثلاثۃ۔ جار له حق واحد وجار له حقان وجار له ثلاثۃ حقوق فالجار الذی له ثلاثۃ حقوق الجار المسلم ذو الرحم فله حق الجوار وحق الاسلام وحق الرحم واما الذی له حقان فالجار المسلم له حق الجوار وحق الاسلام واما الذی له حق واحد فالجار المشرك له حق الجوار۔ یعنی ہمسایہ تین قسم کے ہیں۔ اول جسکا صرف ایک حق ہے۔ دوم جس کو دو حق حاصل ہیں۔ سوم جس کو تین حق حاصل ہیں۔ تین حق والا ہمسایہ مسلمان رشتہ دار ہمسایہ ہے اور دو حق والا مسلمان ہمسایہ ہے اور ایک حق والا ہمسایہ ہمسایۂ مشرک ہے غور کرو کہ ہمسایہ مشرک کو بھی حق جوار سے محروم نہیں چھوڑا گیا سو مسلمان ہمسایہ بالخصوص رشتہ دار مسلمان ہمسایہ کا کس قدر حق ہونا چاہئے۔ اور ایک دوسری حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حق ہمسائیگی کو اچھی طرح بجالاؤ۔ صحیح مسلمان بن سکو گے۔ پھر ایک دوسری جگہ فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام مجھے ہمیشہ حق جوار کی وصیت فرمایا کئے۔ حتیٰ کہ مجھے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ ہمسایہ کو وراثت میں بھی شریک کرنے کی وصیت فرمائیں گے

اور پھر فرمایا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان ماننے والے کو چاہئے کہ اپنے ہمسایہ کی عزت کرے اور پھر فرمایا کہ آدمی صحیح الایمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کا ہمسایہ اس کے شر سے نہ بچ سکے۔ سلف صالحین میں اس حق جوار کے متعلق ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ ایک صاحب کے گھر میں بہت سے چوہے پیدا ہو گئے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ گھر میں ایک بلی رکھ لو چوہے بھاگ جائینگے۔ اس نے جواب دیا کہ اگر میں ایسا کروں تو چوہے بلی کی آواز سنکر میرے کسی ہمسایہ کے گھر میں پناہ لینگے اور اس صورت میں مومن کی اس وصف سے محروم رہ جاؤنگا جس کو حضور علیہ السلام نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی شخص خالص ایمان نہیں پا سکتا۔ جب تک اپنے بھائی کیلئے وہ بات نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے آیہ الجار الجنب والصاحب بالجنب کی تفصیل میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ حق جوار کی حفاظت اس طرح پر کرے کہ انکو اپنی خوشی میں شریک کرے اور مصیبت میں انکا ہمدرد ہو اور انکے اندرونی حالات کی نسبت ٹوہ نہ لگائے اور ان کے عیوب نہ تو افشا کرے اور نہ اسکے مستورات کی طرف نظر کرے اور قول و فعل میں اسے کسی قسم کی تکلیف نہ دے۔ الغرض کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو ہمسایہ کے لئے موجب اذیت ہو یا اس کے لئے بار خاطر ثابت ہو اور ایک حدیث میں جو عمرو بن شعیب کی روایت سے مروی ہے حق جار کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔ کیا تم ہمسایہ کا حق جانتے ہو؟ اس کا حق یہ ہے کہ اگر تجھ سے کسی قسم کی مدد مانگے تو اسے مدد دے اور اگر قرض طلب کرے تو اسے قرضہ دے۔ اور اگر وہ محتاج ہو جائے تو تو اس کی خبر گیری کرے۔ اور بیمار ہو تو عیادت کرے اور اگر مر جائے تو جنازہ میں شامل ہو اور اگر اس کے ہاں کوئی خوشی کا موقع ہو تو تو اسے تہنیت کہے اور اگر کوئی اسے مصیبت پہنچے تو تعزیت کرے اور اپنے مکان کو اس کے مکان سے اونچا نہ بنائے جس سے اس کے گھر میں ہوا نہ پہنچ سکے اور اسے اذیت نہ دے۔ اور اگر تو اپنے گھر میں میوہ یا پھل لائے تو اسے بھی شریک کر

اور اگر تو ایسا نہ کر سکے تو پھل اپنے گھر میں پوشیدہ طور پر لائے اور اپنے بچے کو پھل دیکر اُسکے بچے کو حسرت زدہ نہ کرے اور کسی کھانے کی بو اُس کے گھر تک نہ پہنچنے دے - ورنہ اُس کھانے میں اسے بھی شریک کر۔ کیا تم ہمسایہ کا حق جانتے ہو؟ بخدا کہ حق ہمسایہ کو وہی شخص ادا کرتا ہے - جو خدا کی رحمت کا مستحق ہو ؛

مجاہد فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمرؓ کے ہاں موجود تھا - اور ان کا ایک غلام بکری کی کھال اُتار رہا تھا - غلام کو حکم دیا کہ جب کھال اُتار چکو تو پہلے ہمسایہ کو جو ایک یہودی شخص تھا ہدیہ گوشت بھیجو۔ اور یہ بات وہ بار بار فرماتے رہے - تو اُس نے کہا کہ آپ کب تک بار بار فرماتے رہینگے تو اُنہوں نے فرمایا کہ حضور ہمیں بار بار حق ہمسایہ کی وصیت فرمایا کرتے - تا آنکہ ہمیں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ہمسایہ کو مال اور وراثت میں بھی شریک فرما دینگے - اور حسنؓ یہودی یا نصرانی ہمسایہ کو قربانی کا گوشت دینے میں کوئی حرج نہیں خیال کرتے تھے - ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا مجھے ارشاد تھا کہ ہنڈیا پکاتے وقت شوربا زیادہ کر دیا کرو اور اپنے ہمسایہ کے گھر میں بھیج دیا کرو ؛

افسوس کہ آجکل مسلمانوں میں حق جوار کی نگہداشت نہیں کی جاتی بلکہ بسا اوقات سخت عداوت ہوتی ہے ؛

حقوق ذوی القربیٰ

ذوی القربیٰ یعنی رشتہ داروں کے حقوق کا ذکر آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں بتاکید تمام وارد ہوا ہے - شریعت اسلامیہ نے کوئی حکم ایسا عائد نہیں کیا کہ جس میں تمدنی معاشرتی حقوق کو ملحوظ نہ رکھا ہو - تمدن و معاشرت کی بنا دفع مضرت اور جلب منفعت پر قائم کی گئی ہے - اس لئے جس قدر ان ہر دو امر میں امداد اور استمداد کا زیادہ سلسلہ مستحکم ہوگا - اسیقدر تمدن و معاشرت کے لوازم نہایت مضبوط ہونگے - عامۃ المسلمین کے حقوق کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ذوالقربیٰ کے ساتھ ان کے حقوق کے علاوہ دیگر زاید حقوق کی نگہداشت کا حکم بھی صادر ہوا ہے

ان حقوق کی نگہداشت کا نام صلہ رحمی ہے۔ یعنی تعلقات رشتہ داری کو قائم رکھنا ۔
ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ میرے اسم رحمان اور رحیم کا ایک ہی مادہ ہے سو جو شخص صلہ رحم کو ملحوظ رکھیگا وہ میرے ساتھ اپنے تعلقات کو قائم رکھیگا اور جو شخص ان تعلقات کو قطع کردیگا وہ مجھ سے بھی منقطع ہو جائیگا پھر فرمایا کہ جو شخص اس بات سے خوش ہونا چاہتا ہے کہ اسکی یادگار دیر تک قائم رہے اور اس کو فراخ روزی ملے تو اسے چاہئیے کہ وہ تعلقات صلہ رحمی کو قائم رکھے۔ اور دوسری جگہ جبکہ آپ سے پوچھا گیا کہ افضل الناس کون شخص ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جو زیادہ پرہیزگار ہو اور صلہ رحم کو زیادہ ملحوظ رکھے اور لوگوں کو امر معروف اور نہی عن المنکر زیادہ کیا کرے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا کہ رحم عرش کے ساتھ لٹکایا گیا ہے۔ اور تعلقات رحم کا قائم رکھنے والا پورے طور پر تلافی مافات نہیں کرتا۔ ہاں وہ شخص ایسا کر سکتا ہے۔ کہ اگر تعلقات رحم منقطع ہوگئے ہوں تو انہیں پھر قائم کردے۔ اور نیز فرمایا کہ جس عبادت کا سب سے جلدی ثواب ملتا ہے وہ صلہ رحم ہے۔ چنانچہ کسی خاندان کا صلہ رحم سے مال و دولت بڑھتا ہے اور انکے شمار میں ترقی ہوتی ہے۔ اسمار بنت ابوبکر فرماتی ہیں کہ میری مشرکہ ماں میرے پاس آئی۔ میں نے حضور سے دریافت کیا کہ میں اسکے ساتھ صلہ رحم کروں فرمایا ہاں۔ اور ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ مساکین کو صدقہ دینا ایک صدقہ ہے اور اپنے رشتہ دار کو صدقہ دینا دو صدقہ کا حکم رکھتا ہے۔ جب ابوطلحہ رضہ نے اپنے ایک باغ کو صدقہ کرنا چاہا جو انہیں بہت ہی مرغوب خاطر تھا تو آپ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ میں فقرا اور مساکین پر اسے صدقہ کردوں حضور نے ارشاد فرمایا کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنے قریبی رشتہ دار پر جو دشمنی رکھتا ہو صرف کیا جائے۔ اور یہ درحقیقت ایک دوسری حدیث کا مضمون ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ بہترین فضیلت انسان کے لئے یہ ہے کہ وہ اس شخص سے ملے جو اس سے قطع تعلق کر چکا ہو اور اس شخص کو

دے جس نے اسے محروم رکھا ہو اور جس نے ظلم کیا ہو اس سے درگذر کر جائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو تاکیداً لکھا کہ رشتہ داروں کو باہم ملنے کا حکم دو اور یہ کہو کہ ایک دوسرے کے پڑوسی ہو کر نہ رہیں کیونکہ پڑوسی ہو کر رہنے سے حقوق کی پوری نگہداشت نہیں ہو سکتی اور قطع رحم کا موجب ہوتا ہے۔

حقوق والدین

حقوق والدین کی نسبت اِس سے زیادہ اور کیا لکھا جاسکتا ہے کہ تمام کتب سماویہ میں ان حقوق کی نگہداشت کی سخت تاکید آئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کا ذکر کیا ہے۔ اسکے ساتھ ہی بلافاصلہ والدین کے حقوق کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا۔

گذشتہ تمام حقوق سے بڑھکر جس حق کا ادا کرنا ہر ایک انسان کا فرض ہے وہ حق والدین ہے۔ والدین سے بڑھکر دنیا میں کوئی شخص محسن نہیں ہو سکتا جو تربیت اولاد کے لئے اپنے مال وجان سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور اگر ان کے بس میں ہو تو اپنی عمر بھی اولاد کو دیدیں۔ پس ایسے محسن کا شکریہ تمام بنی نوع انسان کے حقوق سے کہیں بہت زیادہ سمجھا گیا ہے۔ خالق حقیقی تو حقیقی محسن ہے اور مخلوق میں سے والدین کے احسانات کا مقابلہ کوئی اور محسن نہیں کر سکتا۔ پس بحکم ھل جزاء الاحسان الا الاحسان اولاد کا فطری اور شرعی فرض ہے کہ والدین کے حق میں جسقدر بھی اولاد کو استطاعت ہو کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ یعنی دل میں انکی عزت اور محبت اور زبان سے ادب وتعظیم کے کلمات اور اعضاء سے انکی جسمانی خدمات اور زر ومال سے انکی امداد میں مطلقاً دریغ جائز نہ رکھیں۔ البتہ اگر والدین حکم خداوندی کی مخالفت پر آمادہ کریں تو انکار کر دیں۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہوا ہے لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق یعنی حکم خداوندی کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق

کی اطاعت نہیں کرنی چاہیئے - ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ والدین سے حسن سلوک اور نکوئی برتنا - نماز - صدقہ - روزہ اور حج اور عمرہ اور جہاد سے کہیں زیادہ فضیلت رکھتا ہے - اور ایک دوسری حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ جو شخص ایسی حالت میں صبح کرے کہ وہ اپنے والدین کو مسرور کئے ہو تو اُس کے لئے جنت کے دروازے کھولدئے جاتے ہیں - اسی طرح اگر وہ ایسی ہی حالت میں شام کرے تو یہی حکم ہے - اور اگر والدین میں سے کوئی ایک ہو تو ایک ہی دروازہ اُس پر کھولا جاتا ہے - اگرچہ اس کے والدین اس پر ظلم کریں ظلم کریں ظلم کریں - اور جو شخص ایسی حالت میں صبح کرے کہ وہ اپنے والدین کو ناراض کئے ہو تو اُس پر دوزخ کے دو دروازے کھولے جاتے ہیں - اسی طرح اگر وہ ایسی حالت میں شام کرے اور اگر والدین میں کوئی ایک ناراض ہو - اگرچہ وہ ظلم کریں ظلم کریں ظلم کریں اور ایک دوسری حدیث میں یوں ارشاد ہوا ہے کہ جنت کی بو کے خوش پانچسو سال کے راستے سے آنے لگیگی مگر والدین کے نافرمانبردار اور تعلقات صلہ رحمی کو قطع کرنیوالے اس بو کو نہیں پا سکینگے - اور دوسرے موقع پر یوں ارشاد ہوا کہ اپنی ماں اور باپ اور بہن اور بھائی سے احسان اور نکوئی کرو - پھر انکے بعد جو درجہ بدرجہ اہل قرابت ہوں - اور ایک روایت میں یوں وارد ہوا ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کو یوں وحی کیگئی کہ اے موسیٰ والدین سے جو شخص نکوئی کرتا ہے اور میری نافرمانبرداری تو میں اُسے نیکوکار ہی لکھونگا - اور جو شخص مجھ سے نکوئی کرتا ہے اور والدین کا نافرمانبردار ہے تو میں اُسے نافرمانبردار ہی لکھونگا - بعض آثار میں وارد ہے کہ جب یعقوب علیہ السّلام نے اپنے فرزند یوسف علیہ السّلام سے ملاقات کی تو حکم ہوا کہ اپنے باپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور ایک حدیث میں وارد ہے کہ والدین کی وفات کے بعد انکے حق میں نکوئی برتنے کی صورت یہ ہے کہ انکی نماز جنازہ ادا کرے اور اُنکے حق میں دعائے مغفرت کو لازم

سمجھے۔ اور انکی وصیت کو نافذ کرے۔ اور انکے احباب اور دوستوں کی عزت ملحوظ رکھے اور حق صلہ رحمی کا حکم بغیر والدین کے ساتھ نکوئی برتنے کے بجالایا نہیں جاسکتا۔ اور ایک روایت میں یوں وارد ہوا ہے کہ ماں کے ساتھ نکوئی برتنا باپ کے ساتھ نکوئی برتنے سے دو چند ہے اور ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا کہ ماں کی دعا اولاد کے حق میں دیگر سب دعاؤں کی نسبت بہت جلد مقبول ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں اپنے فرزند پر سب سے زیادہ مہربان ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ علمائے محققین نے لکھا ہے کہ طبعی محبت صرف وہ محبت ہے جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جو تکلیف ماں اپنی اولاد کی تربیت میں اٹھاتی ہے وہ باپ کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کا اشارہ آیا ہے۔ حیث قال اللہ تعالیٰ حملتہ کرھاً ووضعتہ کرھا ✦

افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ ہمارے اسلامی بچے مذکورہ بالا حقوق کی نگہداشت سے کوسوں دور پڑے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انہیں احکام شریعت سے بالکل بے بہرہ رکھا جاتا ہے۔ اور موجودہ نصاب تعلیم میں مغربی تمدن اور معاشرت کی جو تعلیم دیجاتی ہے اس سے بچوں کی طبیعت میں ایک قسم کی خود پسندی اور خود غرضی او خودرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ جوان ہوکر سوء ادب اور سرکشی کے سوا اور کچھ نہیں سیکھتے بلکہ بسا اوقات اسلامی احکام شریعت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اکثر جہال احکام شریعت کو استہزا اور مخول میں اڑا دیتے ہیں ✦

تربیت اولاد والدین کا ایک اہم فرض ہے۔ جو لوگ شروع ہی سے احکام شریعت کی پابندی سے اپنی اولاد کو ناواقف رکھتے ہیں انکی اولاد میں دنیا اور آخرت میں ان کے لئے کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکتی مگر سچ یہ ہے کہ جو لوگ خود احکام شریعت کے پابند نہیں رہتے وہ اولاد کو کیسے پابند کرسکتے ہیں ۝

میپرور درختے کہ خار آورد
بہ پرور درختے کہ بار آورد

حقوق معلم

منجملہ ان ضروری حقوق کے جنکا اوپر ذکر آچکا ہے حق معلم بھی ہے جنکی ضرورت پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہر ایک شخص جانتا ہے کہ اگر والدین بچہ کی تربیت جسمانی کے متکفل ہیں تو معلم اس کی تربیت روحانی کا متکفل ہوتا ہے - اسی خیال پر بعض علمار نے لکھا ہے کہ جو فضیلت روح کو جسم پر حاصل ہے وہی اُستاد کو والدین پر ہوتی ہے - یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے ابوك ثلثة من وَّلدك ومن زوجك ومن علمك وخیرالاباء من علمك یعنی انسان کے تین باپ ہوتے ہیں - اوّل جس کے نطفے سے تو پیدا ہوا دوسرا جس نے اپنی بیٹی تجھے اپنی نکاح میں دی - تیسرا جس نے تجھے تعلیم دی - اور سب سے بہتر وہی ہے جس نے تجھے تعلیم دی - اور اس کی وجہ وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں - حقوق معلم کے نگہداشت کی صورت یوں ہوسکتی ہے کہ دل میں اسکی عزت و تعظیم اور زبان سے حسنِ ادب اور دست و پا سے انکی خدمت کے لوازم کو بخوشی خاطر بجالا یا جائے - اور ہدیہ وغیرہ سے دریغ جائز نہ رکھا جائے - قرآن مجید کا ارشاد ہے - هل جزاء الاحسان الّا الاحسان یعنی احسان کا مقابلہ احسان ہی ہوا کرتا ہے شاگرد کو لازم ہے کہ کبھی اپنے اساتذہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرے بشرطیکہ خلاف شریعت نہ ہو - حضرت امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں کہ من علّمنی حرفاً فقد صیّرنی عبداً - یعنی جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھلایا اُس نے مجھے اپنا غلام بنالیا - دیکھو قرآن شریف میں جہاں موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے تعلیم کی استدعا فرماتے ہیں - وہاں ساتھ ہی یہ بات بھی پیش کرتے ہیں لااعصی لك امرا یعنی مجھے خدا تعالےٰ کے علم لدنی سے کچھ بہرہ عطا فرمایئے اور میرا فرض ہوگا کہ میں آپ کے کسی رکن کی خلاف ورزی

نہ کروں ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسا معلم جو اپنے شاگرد کی تعلیم و تربیت اخلاق کا متعہد ہوتا ہے۔ اُس سے بڑھکر کوئی شخص قابلِ تعظیم نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر ہر ایک مسلمان جناب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور دیگر آئمہ دین کی تعظیم و تکریم اور انکی محبت کو اپنا جزو ایمان باور کرتے ہیں ورنہ دنیوی مفاد کے لحاظ سے کوئی جہت اس محبت و تعظیم کی علت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ علم ہی ایک ایسی نعمتِ عظمےٰ ہے جو انسان کے لئے دین و دنیا میں موجب صلاح و فلاح ہو سکتی ہے۔ اور یہ وہ نعمت ہے جسکا مقابلہ کوئی دوسری نعمت نہیں کر سکتی۔ اور جس کے نتائج حسنہ سے انسان بعد از مرگ بھی منتفع ہونے کی اُمید رکھتا ہے۔ علم سے ہماری مراد وہی ہے جو گزشتہ صفحات میں ہم لکھ آئے ہیں یعنی علم شریعت اور تربیت اخلاق حسنہ جس کے ضمن میں دیگر مبادی علوم بھی شامل ہیں۔ سلف صالحین کا قاعدہ تھا کہ وہ حضرات اساتذہ کی محبت و تعظیم قولاً و فعلاً بیش از بیش ملحوظ رکھا کرتے تھے۔ برخلاف ہمارے موجودہ زمانے کے جس میں عام طور پر شاگرد اپنے اُستاد کی کوئی عزت و وقعت نہیں سمجھتے اور جہاں شاگردی سے فراغت ہوئی ساتھ ہی علم سے بھی بکلی قطع تعلق ہو گیا۔ بلکہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتگاں کو اکثر اپنے اساتذہ کی ہجو و مذمت کرتے سنا گیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ سکولوں اور کالجوں کے اساتذہ بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ اُن کے ساتھ ان کے حسن ادب کو ملحوظ رکھا جائے۔ کیونکہ وہ بھی شاگرد کے ساتھ شفقت اور حسن مراعات کا مطلقہ پاس نہیں رکھتے۔ شاگرد یہ سمجھتا ہے کہ یہ مزدور ہیں جو اُجرت پہ کام کر رہے ہیں اور اساتذہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مُردہ دوزخ جائے یا بہشت مُلاں کو حلوے مانڈے سے کام اللہ اللہ اور خیر صلا۔ لیکن یہ سب کچھ اس مغربی تہذیب کا نتیجہ ہے۔ جس پر ہمارے تعلیم یافتہ لوگ دلدادہ اور مفتون ہو رہے ہیں۔ سلف صالحین کے

طریق تعلیم کا یہ دستور تھا کہ شاگرد کہیں وطن سے دُور کسی قابل اُستاد کی شاگردی کا موقع پا لیتا تو ہمیشہ کے لئے اس کی شاگردی کو اپنا، یہ فخر و ناز خیال کرتا اور حضرات اساتذہ بھی محض خالصاً لوجہ اللہ اسے تعلیم دیتے کوئی کسی قسم کا معاوضہ یا اُجرت نہ لیا کرتے بلکہ وہ اس کو ایک دینی خدمت سمجھا کرتے اور شاگرد کی ہر ایک طرح نگرانی اپنا فرض سمجھتے بلکہ غیر منتطیع شاگردوں کے ضروریات کی اپنی گرہ سے کفالت کرتے یہی وجہ ہے کہ معلم اور شاگرد کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم ہو جاتا جو عمر بھر کبھی منقطع نہ ہوتا۔ والتوفیق من اللہ تعالےٰ ؛

حقوق زوجیّت

صرف مذہب اسلام ہی میں یہ حکمت لمحوظ رکھی گئی ہے کہ جب مرد اور عورت کا تعلق انسان کی تمدنی اور معاشرتی اصلاح کے لئے ایک امر فطری خیال کیا گیا ہے۔ تو عقل انسانی ایک آن کے لئے بھی اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ کہ مرد اور عورت کے حقوق متبادل نہیں۔ یعنی جس طرح مرد عورت کی ذات پر تعلق نکاح کی صورت میں اپنے حقوق کی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ اسی طرح عورت تعلق نکاح کی بنا پر مرد کے ذمہ اپنے حقوق عائد کرتی ہے۔ جس شخص نے مختلف اقوام کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ قبل از اسلام کسی قوم میں عورت کی کبھی وہ عزت قائم نہیں ہوئی جو مذہب اسلام نے عملاً دنیائے اسلامی میں قائم کر دکھائی ؛

رومن امپائر کو قانون سے سخت مناسبت تھی۔ اور اس کا بنایا ہوا قانون آج تک یورپ کا سنگ بنیاد ہے۔ اسی قانون میں عورتوں کے یہ حقوق تھے ؛

عورت شادی کے بعد خاوند کی زر خرید جائداد ہو جاتی ہے ؛

اس کا تمام مال و متاع خواہ اُس کا ہو خواہ کسی عطیہ یا اس کا کمایا ہوا ہو۔ وہ تمام شوہر کا ملک سمجھا جاتا ہے ؛

وہ کسی سے کوئی عہد نہیں کرسکتی تھی - اور نہ کسی کی ضامن ہوسکتی تھی ؛
وہ کسی وقت ادا ر شہادت کے قابل نہ تھی ؛

اس کو وصیّت کرنے کا بھی اختیار نہ تھا - ایک عرصہ تک تمام یورپ کا یہی قانون تھا مگر جب رومن امپائر کا عیسائی مذہب ہُوا تو قدرے اس کے اُصول بدلے - مگر چند روز کے بعد پھر وہی پُرانے اُصول قائم کردئے گئے - ایک عرصہ تک ان مہذب عقل کے پتلوں کا یہ خیال تھا کہ عورت میں روح نہیں ہوتی - ۵۸۶ء کے بعد یورپ میں ایک جلسہ ایسی بات کی تحقیق کے لئے قائم ہُوا کہ آیا عورتوں میں روح ہوتی ہے یا نہیں - جس کی تحقیق سے یہ نتیجہ نکلا کہ عورت نیک نوع آدم میں داخل ہے اور اس کا پیدا کرنا مرد کی خدمت کے لئے ہے - ایک عرصہ تک ان میں یہی قانون رہا - اب جب سے رومن ایکٹ بنا ہے پہلے قوانین میں کچھ ترمیم ہوگئی ہے - مگر اب تک بہت ہی غیر معمولی باتیں اصلاح طلب باقی ہیں - رہے یہودی - انکے یہاں عورتوں کی مٹی ایسی ذلیل تھی کہ ادنیٰ سی بات پر عورتوں کا طلاق دیدینا کوئی بڑی بات نہ سمجھی جاتی تھی - مذہباً اگر کوئی پہلی عورت سے خوبصورت عورت ملجائے تو اپنی عورت کو طلاق دے کر اس سے شادی کرلینا جائز ہے - کہانے میں اگر خلاف معمول نمک بھی زیادہ ہوجائے تو خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے - نہ اس کا کوئی حصہ تھا اور نہ ترکہ سے کوئی تعلّق - عیسائیوں کی طرح ان کے ہاں بھی عورت خاوند کی زرخرید لونڈی ہُوا کرتی تھی - باپ بیٹی کی قیمت میں کچھ روپیہ لیکر داماد کے حوالہ کردیا کرتا تھا ؛

ہندوؤں میں بھی اسی طرح بیوی - ماں - بیٹی کو ترکہ سے کچھ نہیں ملتا تھا - اور علاوہ اس کے ان کی کوئی عورت مالک جائداد اور حصہ دار ترکہ کسی صورت میں کسی رشتہ دار کی طرف سے نہیں ہوسکتی - اگر ایک شخص فوت ہوجائے اور باوجود اس کے کہ اس کی لڑکیاں اور بیوی زندہ موجود ہوں اور کوئی لڑکا نہ ہو تو بھتیجے میت کے

وارث جائداد ہونگے۔ اور ترکہ ماں۔ بیٹی۔ بیوی کو نہ پہنچے گا۔ صرف میت کی بیوی کا نان ونفقہ اس کے بھتیجوں کے ذمہ ہوگا جو میت کے وارث جائداد ہونگے (دیکھو اصول دھرم شاستر مصنفہ میگناٹن صاحب) رہے عرب جاہلیت۔ انکے یہاں تو ایسا اندھیر تھا کہ عورت ایک ذلیل مملوکہ لونڈی سے بھی بدتر تھی۔ اوّل یہ کہ باپ کی بیوی یعنی سوتیلی ماں اُسکے لڑکے اور رشتہ داروں کا ایک ترکہ سمجھی جاتی تھی۔ سب سے پہلے اس کا بڑا لڑکا اس سے نکاح کرتا تھا۔ اگر وہ منظور نہ کرتا تو کوئی دوسرا لڑکا اُس سے نکاح کر لیتا۔ یہانتک کہ وہ بصورتا اُس کے انکار کے کسی رشتہ دار سے فوراً نکاح کر دیتے تھے۔ اور کسی حالت میں نکاح اور عدم نکاح میں اس کی رائے کا اعتبار نہ ہوتا تھا بلکہ بیچاری محض مجبور ہوتی تھی۔ تاریخ کی کتابیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کی بی بی سے اُس کے چار چار پانچ پانچ بیٹوں نے بتدریج نکاح کیا ہے۔

دختر کشی کو فخر سمجھتے تھے۔

ہندوؤں کی طرح ترکہ میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔

ایک شخص جتنے چاہے نکاح کر سکتا تھا۔

حیض کے عرصہ میں یہ وحشی عورتوں سے لواطت کیا کرتے تھے۔ اور عورت محض مجبور ہوتی تھی:

باندی کے بطن سے جو اولاد ہوتی تھی وہ غلام سمجھی جاتی تھی۔ اور اُن کو میراث کا حصہ نہ ملتا تھا:

عورتوں کو جانوروں کا دودھ دینا بالکل ممنوع تھا۔

عورتیں لڑائی میں مردوں کے ساتھ ہوتی تھیں اور ان کو لڑائی میں لڑنے پر اُبھارتی تھیں۔

عورتوں کو طلاق دینے کے انکے یہاں تین طریقے تھے۔ اوّل ایک طلاق اور

اس کے دینے کا یہ طریق تھا کہ عدت کے وقت کے ختم ہوتے ہوتے پھر رجوع کر لیتے تھے اور پھر طلاق دیدیتے تھے۔ جس سے عورت کو ستانا اور تنگ کرنا مقصود ہوتا تھا۔ عورتوں سے ننا کرا کر خرچی لیتے تھے۔

دوسرا طریقہ طلاق کا یہ تھا کہ ایک سال اور دو سال عورت کے پاس جانے کی قسم کھا لیا کرتے تھے اور جب مدت پوری ہوجاتی تو وہ عورت مطلقہ سمجھی جاتی تھی۔ مگر اس عرصہ میں بھی عورت کو تکلیف پہونچاتے تھے۔

تیسرا طریقہ ان کے ہاں یہ مروّج تھا کہ کچھ روپیہ عورت سے لیکر خاوند چھوڑ دیتا تھا باری باری سے لوگ عورتوں کے پاس جاتے تھے اور عورت جب حاملہ ہوجاتی اور اس کی اولاد پیدا ہوتی تو جس کا وہ بچہ بتلاتی وہ لے لیا کرتا تھا۔

عورت کی عدت توڑنے کا طریقہ یہ تھا کہ کسی جانور کو پکڑ کر اپنے شرمگاہ پر ملتی تھی۔ اور جب وہ مر جاتا تو اس کی عدت ٹوٹ جاتی تھی اور عورت گھر سے باہر نکل آتی تھی۔ یا اونٹوں کی چند مینگنیاں ہاتھ میں لیکر نکل آتی تھی اور اپنی پیٹھ پر مارتی تھی۔ اور اس سے اس کی عدت ٹوٹ جاتی تھی۔

جاہلیت کے زمانہ میں عورتوں کا شراب پینا ممنوع تھا۔ عورتوں کے لئے خوبصورتی کے واسطے اپنا بدن گودنا ضروری تھا اور اسی طرح بھوؤں کا باریک کرنا اور بال نوچنا اور دانتوں کا چھیدنا وغیرہ جس کے لئے اسلام نے منع کیا ہے۔

لڑائیوں میں عورتوں کو گرفتار کر لیتے تھے اور بڑی بے عزتی سے پیش آتے تھے اور قیمت لیکر واپس کر دیتے تھے۔

جب عورتیں لڑائی کی صفوں میں جا کر پیشاب کر دیتی تھیں تو فریقین لڑائی کو ختم کر دیتے تھے۔

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جب گھوڑے کو سوار کے نیچے پسینہ آجائے تو گویا اس کی

عورت کا غیر سے ناجائز تعلق ہو گیا۔
بہادروں کے پاس عورتوں کو بھیجتے تھے تاکہ دلاور اولاد پیدا ہو غرض ان اوہام باطلہ اور جہالت سے آئے دن ایسے گروہ بنی آدم کی انکے ہاتھوں سخت پلید ہوا کرتی تھی۔ اسلام نے آکر ان سب باتوں کو چھڑا دیا حقیقی اور اصلی تلقین فرمائی۔ اسلام نے اول تو یہ تعلیم دی کہ عورت اور مرد انسانیت میں برابر ہیں ہاں مردوں کو اُن پر ترجیح ہے للرجال علیهن درجة دوسرے یہ فرمایا کہ رشتہ داروں کو میت کے ترکہ کا حسب رشتہ حق حاصل ہے عورت اور مرد کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اور فرمایا ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف اور قتل اولاد سے اس حکم واجب الاذعان سے روکا واذا الموءدة سئلت بای ذنب قتلت۔ اور کہا کہ حسب فطرت مرد اور عورت برابر ہیں۔ لڑکوں کا پالنا اور لڑکیوں کا مارنا درست نہیں اور بیویوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ اور مشفق سمجھنے کی اس طرح تعلیم دی قال اللہ تعالی ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودة ورحمة پھر واضح طور پر بتا دیا کہ ان کا ہر طرح سے تم پر حق ہے۔ ہر حیثیت سے تمہاری رفیق ہیں قال اللہ تعالی هن لباس لکم وانتم لباس لهن وقال اللہ تعالے لهن مثل الذی علیهن بالمعروف - قرابت کے تعلقات کی تصریح فرما کر والدین کے حقوق کو یوں بیان کیا۔ قال اللہ تعالی وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندک الکبر احدهما او کلاهما فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما وقل لهما قولا کریما واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما کما ربیانی صغیرا پھر ماں کے حق پر زور دیا خداوند تعالے فرماتا ہے حملته امه کرها ووضعته کرها۔ پھر اسلام نے یہ تعلیم دی کہ عورت کا مال عورت کا ہے اور مرد کا مرد کا اور مرد کو جبراً عورت کا مال لینا درست نہیں قال اللہ تعالی للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن - قاعدہ تھا ....

کہ مہر جو جاہلیت میں لڑکی کا ہوتا وہ لڑکی کے باپ کو ملتا۔ اسلام نے آکر حکم دیا کہ مہر لڑکی کا حق ہے۔ لڑکی کو ہی ملنا چاہیئے قال اللہ تعالےٰ واتوا النسا صدقاتھن نحلۃ۔ اور فرمایا کہ جو لوگ عورتوں سے برا سلوک کرتے ہیں خدا ان سے ناراض ہوتا ہے۔ اور وہ اصول حکمت اور قاعدہ ہمدردی کے خلاف کرتے ہیں اور حکم دیا کہ اپنی عورتوں سے عمدہ سلوک کیا کرو کما قال اللہ تعالیٰ وعاشروھن بالمعروف اور پھر اسلام نے یہ تعلیم دی کہ عورتیں شہوت نفس کے لئے نہیں ہیں بلکہ اسلئے ہیں کہ وہ گھر کا انتظام کریں اور خاوند کی معاش اور معاد کے حاصل کرنے میں معاون ہوں۔ اور خاوند پر فرض ہے کہ وہ بھی عورت کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے اور ایسا برتاؤ کرے کہ باہم رابطۂ اتحاد ٹوٹنے نہ پائے ۔ اور فرمایا کہ اگر عورت ناراض ہو جائے تو اس سے بالکل انحراف نہ کرو بلکہ مصالحت بر[illegible]ا کرو کیونکہ عورت کی اذیت پر صبر کرنا بھی موجب ثواب ہے وقال اللہ تعالےٰ فان کرھتموھن [illegible] عن تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً اور عورت کو بھی نصیحت کی کہ اگر [illegible] ناراض ہو جائے تو اس سے صلح کرلے اور صلح ان کے لئے بہت بہتر ہے کما قال اللہ تعالیٰ وان امرأۃ خافت من بعلھا نشوزاً او اعراضاً فلا جناح علیھما ان یصلحا بینھما صلحا والصلح خیر۔ عرب میں یہ قاعدہ تھا کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کی بیوہ کو کسی دوسرے سے نکاح کرنے کی اجازت دیتے وقت کچھ روپیہ لے لیتا تھا اور عموماً جاہلیت کے عربوں کا یہ دستور تھا کہ عورت سے طلاق دینے کے بعد مجبور کر کے کچھ لیا کرتے تھے۔ ان باتوں کے متعلق اسلام نے یہ تعلیم دی لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما اتیتموھن [2] پھر عورت کی بدخوئی منع کرنے کی یہ تجویز بتائی والتی تخافون نشوزھن

[1] اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے لڑنے سے یا پھر جانے سے ڈرے تو ان پر گناہ نہیں کہ آپس میں صلح کر لیں اور صلح ہی اچھی چیز ہے [2] اور تمہارے واسطے حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ۔ اور انہیں منع نہ کرو تاکہ تم اس چیز کا کچھ حصہ لے لو جو تم نے انکو دیا ہے ۱۲ منہ

فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا[۱] - اور پھر فرمایا اگر بدخوئی سے ناچاقی بڑھ جائیگی نوبت پہنچے تو انصاف کے لئے ایک پنچایت دونو طرف کے لوگوں کی مقرر کرو کما قال اللہ تعالیٰ وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا[۲] - پھر یہ تعلیم دی کہ اگر اس پر بھی نہ بنے تو طلاق دیدو - اور ہدایت کی کہ تین ماہ میں بتدریج طلاق دو کہ شاید تم میں پھر صلح ہو جائے اور اپنے کئے پر نادم ہو اور طلاق کے بعد ان کو تکلیف نہ دو - بلکہ عمدہ سلوک سے پیش آؤ - قال اللہ تعالیٰ وبعولتھن احق بردھن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا[۳] - اور یہی مصلحت تھی کہ اگر یکبارگی طلاق دینے کا حکم ہوتا تو طلاق دینا سہل ہو جاتا - لیکن پھر باہم دونو کو نادم ہونا پڑتا - اور طلاق پوری ہو جانے کے بعد بھی اس صورت میں کہ وہ غیر سے نکاح کرے اور وہ غیر اپنی خوشی سے اُسے طلاق دیدے تو پہلا خاوند اس سے نکاح کر سکتا ہے اور اس سے بھی یہی مطلب ہے کہ ایسی عار انسان ذرا مشکل سے گوارا کر سکتا ہے - اس لئے اس ڈر کے مارے ابتداء سے کبھی انسان کو جرأت نہ ہوگی کما قال اللہ تعالیٰ فان طلقھا فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ[۴] - اس کے بعد یہ تعلیم دی کہ یہ طلاق کوئی خانگی معاملہ نہیں بلکہ اسپر قوم کی شہادت لو اور عدت کے زمانے تک یعنی تین ماہ دس یوم تک اس کے نان و نفقہ کے کفیل ہو - اگر عورت حاملہ ہو اور بچہ جنے اور تمہاری اولاد کی تربیت اپنے ذمے لے تو دو سال تک اس کی اجرت اس کو دو اور ہر طرح اس کے گھر میں رہنے اور رخصت کے وقت اس کے ساتھ عمدہ سلوک کرو - اور ہمدردی سے پیش آؤ اور بار بار یہی

---

[۱] اور وہ عورتیں جنکی بدخوئی سے تم ڈرتے ہو انہیں نصیحت کرو اور انہیں خوابگاہ میں چھوڑ دو اور ان کو مارو پس اگر تمہارا کہا مانیں تو انکے اوپر (الزام کی) راہ نہ ڈھونڈو [۲] اور اسکے خاوند ان کو پھیر لینے کے حقدار ہیں گر وہ اپنے درمیان صلح کرنا چاہیں [۳] پس اگر اسکو طلاق دی تو اسکے لئے جائز نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اس خاوند کے سوا کسی اور سے نکاح نہ کرے [۴] پس جب وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو ان کو روک رکھو اچھی طرح یا الگ کو چھوڑ دو اور دو صاحب عدل گواہ کو مقرر کرو اور گواہی کو درست کرو واسطے خدا کے ۔

ہدایت کی کہ طلاق دینے سے پہلے صلح کرانے کی کوشش کرو اور ہر حالت میں اس رسم کو مٹانا چاہیئے۔ چونکہ حسب مصلحت یہ ایک امر ممنوع تھا اس لئے اس کے واقع کرنے یہی حکم ہے اور ان کا حق واجب دینے کی تاکید فرمائی قال اللہ تعالٰے واذا بلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف واشھدوا ذوی عدل منکم واقیموا الشھادۃ للّٰہ قال اللہ تعالٰے وللمطلقت متاعًا بالمعروف حقا علی المتقین وقال اللہ تعالٰے ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذٰلک فقد ظلم نفسہ وقال اللہ تعالی والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعۃ وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف

اکثر لوگوں کا قاعدہ تھا کہ نکاح کے وقت تو بہت سا مہر مقرر کر لیتے تھے مگر طلاق کے وقت اُس کے گھٹانے کے لئے سخت کوششیں کرتے اور عورت کو تکلیف دیتے تھے اسلئے اِس سے باز رکھنے کے لئے اِسلام نے یہ تعلیم دی قال اللہ تعالی وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئا اتاخذونہ بھتانا واثما مبینا وکیف تاخذونہ وقد افضی بعضکم الی بعض

ان اُصولوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو کسی طرح کے حقوق نہیں دئے۔ ہر کام کی ہدایت جس طرح اسلام نے عورتوں کو کی ہے مردوں کو بھی کی ہے اور جس طرح مردوں کو کی ہے عورتوں کو بھی کی ہے۔ مگر حسب فطرت ہر ایک کے وقت احتیاج کا لحاظ رکھا ہے۔ عبادات میں دونو برابر خانہ داری کے انتظام میں حسب قانون اسلام دونو بادشاہ و وزیر نظر آتے ہیں۔ تمام حقوق عورتوں کے جس طرح اِسلام میں قائم تھے آج تک اسی طرح قائم ہیں +

خاوند کے حقوق	مرد کا عورت کے ذمہ پہلا حق یہ ہے کہ وہ ہر ایک امر میں بشرطیکہ خلاف شریعت نہ ہو اُس کی اطاعت کرے آیہ الرجال

قوامون علی النساء کے مفہوم میں اس طاعت کو بالوضاحت بیان کیا گیا ہے چنانچہ بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ ایک شخص نے سفر کو جاتے وقت اپنی بیوی کو وصیت کی کہ اُوپر کی منزل سے نچلی منزل میں نہ آنا۔ عورت کا باپ نچلی منزل میں رہتا تھا۔ اتفاقاً وہ بیمار ہو گیا۔ عورت نے جناب پیغمبرؐ سے کہلا بھیجا کہ میں باپ کی عیادت کے لئے نچلی منزل میں آؤں یا نہ۔ فرمایا کہ اپنے خاوند کی وصیت پر قائم رہ۔ پھر جب اُس کا باپ مرگیا تو عورت نے دریافت کر بھیجا کہ میں اب بھی نیچے اتروں یا نہیں۔ فرمایا کہ اپنے خاوند کی وصیت پر قائم رہ۔ جب اُس کے باپ کو دفن کر چکے تو حضور علیہ السلام نے عورت کو کہلا بھیجا کہ تیرے اپنے خاوند کی اطاعت کرنے پر خداوند تعالیٰ نے تیرے باپ کی مغفرت کر دی ہے۔ اور ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جب عورت پانچ نمازیں ادا کرے اور روزہ رمضان کو پورا کرے اور اپنے عفت کی نگہداشت کرے اور اپنے خاوند کے فرمان کو بجا لائے تو وہ داخل جنت ہوتی ہے۔ غور کرو کہ خاوند کی اطاعت کو دیگر ارکان اسلام کے پہلو بہ پہلو بیان کیا گیا ہے جس سے اس اطاعت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ عورت کو جائز نہیں کہ وہ اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے کوئی چیز کسی کو دے ورنہ وہ گنہگار ٹھہرائی جاتی ہے اور اس کا ثواب مرد کو پہنچیگا عورت کو مرد کی اجازت کے بغیر عبادات نافلہ کو بجا لانیکا حکم نہیں۔ ورنہ وہ عبادات مقبول نہیں ہوتیں۔ عورت کو بلا اذن شوہر گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ورنہ اس کے واپس آنے تک ملائکہ اسپر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ عورتوں کو آزادی دینے والے اصحاب اس وعید میں غور کریں اور ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اگر میں کسی مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کیا کرے۔ اور ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ عورت کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ سے اس وقت زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ وہ اپنے گھر میں مستور رہے اور گھر کے صحن میں اسکا

نماز ادا کرنا مسجد میں نماز ادا کرنے سے اور گھر میں کوٹھڑی کے اندر نماز ادا کرنا گھر میں نماز ادا کرنے سے کہیں زیادہ فضیلت رکھتا ہے اور پھر فرمایا کہ عورت کا تمام بدن شرمگاہ اور واجب الستر ہے۔ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اُس کی طرف جھانکتا ہے۔ الغرض مرد کے حقوق عورت کی ذات پر بہت ہیں مگر نہایت ضروری دو ہیں۔ اوّل عفت و عصمت جو صرف پردہ سے متصور ہو سکتی ہے۔ پردہ اُٹھا دینے کی صورت میں اسکی عفت و عصمت بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ دوم یہ کہ وہ اپنے خاوند سے کسی غیر ضروری امر کا مطالبہ نہ کرے اور مرد کے مال حرام سے منتفع نہ ہو۔ یہ ہر دو وصف سلف صالحین کے زمانے کی عورتوں میں پائے جاتے تھے۔ ہمارے ناہنجار زمانہ میں یہ ہر دو مفقود ہیں۔ عورت کو نہیں چاہیئے کہ وہ اپنے حسن اور مال کی وجہ سے اپنے خاوند کے ساتھ کبر و غرور کے ساتھ پیش آئے اور خاوند کے بدشکل ہونے کی وجہ سے اسے حقیر جانے۔ الغرض عورت کا فرض ہے کہ خاوند کی غیبت و حضور کی حالت میں وفادارانہ سلوک کرے اور کسی امر کا جو موجب اذیت ہو ارتکاب نہ کرے اور دل اور زبان سے اُسکی عزت اور تعظیم کو ملحوظ رکھے ؛

عورت کے حقوق

آیہ عاشروهن بالمعروف جو اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ ایسے جامع اور وسیع مفہوم پر مشتمل ہے جس میں تمام اخلاق حسنہ جو مرد کو عورت کے ساتھ ملحوظ رکھنے چاہئیں داخل ہیں مرد چونکہ عورت کی ہر ایک حالت کا شرعاً نگران اور متکفل ہوتا ہے۔ اِس لئے اس کا فرض ہے کہ عورت کو اس کے جائز حقوق سے ہرگز محروم نہ رہنے دے۔ اسے لازم ہے کہ اپنی حیثیت کے موافق نان و نفقہ اور دیگر ضروریات خانہ داری میں اسے شکایت کا موقعہ نہ دے۔ اور چھوٹی چھوٹی بات پر اس سے سختی نہ برتے اور احکام شرعی کے بجا لانے کی اسے ہدایت کرے اور گھر کے مصارف میں اسے اسراف اور بخل کا عادی نہ ہونے دے اور دل آزارانہ

الفاظ سے اسے خطاب نہ کرے اور سب و شتم اور زد و کوب فرومایہ لوگوں کا کام ہے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اور عفت و عصمت کی نگہداشت کیطرف اسے خاص طور پر متوجہ کرے اور یوں سمجھے کہ امور خانہ داری میں عورت مرد کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہے جو بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ سے نسبت رکھتا ہے۔ اور اگر اسے کسی غلطی پر آگاہ کرنا ہو تو ملاطفت اور مدارات سے کام لے اور اگر اس کی تندخوئی اور بدخلقی کو برداشت کرے تو اس کے لئے موجب ثواب ہے اور بضرورت کے وقت اسے اپنے رشتہ داروں سے ملنے کی اجازت دے مگر بجز اپنے محارم کے کسی غیر کے ساتھ عورت سفر نہیں کر سکتی۔ الغرض عورت کی عزت اور محبت مرد کے دل میں ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہیئے ؞

باب دوازدہم ۱۲

حرمتِ سود

یہ مسئلہ اگرچہ اُصول شریعت کی بنا پر بالکل صاف ہے اور حرمتِ سُود کے بارہ میں کسی قسم کے شک و شُبہ کی گنجائش نہیں مگر باایں ہمہ ایک عرصہ سے یہ مسئلہ معرکۃ الآرا ہو رہا ہے اور گاہ و بیگاہ ملک کے مختلف افراد پر بحث کی ہے جن میں اکثر اصحاب وہ لوگ ہیں جو اُصول شریعت سے بالکل بے خبر اور فقیہات سے مطلق بے بہرہ ہوتے ہیں اور محض حالاتِ حاضرہ کی ضرورت کو مدنظر رکھکر مسلمانوں میں جواز سود کا رواج دینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کے دلائل کا

لہ ایک فاضل مولوی صاحب نے اس مسئلہ کو صفحہ ۳۰ تک اُصول فقہ پر کھولا ہے جو خاص اُن لوگوں کے لئے زیادہ دلچسپ نہ ہو جو علم فقہ سے ناواقفیت نہیں رکھتے مگر اس طور پر اس کا کھولنا ضروری تقاضہ سے حالات حاضرہ کے رُو سے اس پر بحث کی گئی ہے ۱۲ منہ

بدا برحرف موجودہ اقتصادیات مغربی کے اُصول پہ ہے مگر سود بہن کل الوجوہ حرام مطلق ہے اور اس میں کسی قسم کے جواز کی گنجائش نہیں جیسا کہ آئندہ عبارات سے واضح ہوگا۔ حق یہ ہے کہ کتاب وسنّت سے دست بردار ہونے والے صحابہ اس قسم کی خرافات باتیں بذریعہ اخبارات ورسالہ جات شائع کرکے اہل اسلام کو ایک فعل حرام کا مرتکب قرار دینا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید میں صاف طور پر وارد ہے ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ..... الخ[1] مگر مجوزین سود کی بے باکی کا کیا ٹھکانا ہے کہ ایک صریح حکم کو محض اپنی ہوائے نفس کی بنا پر توڑنا چاہتے ہیں۔ میں نے جس قدر مجوزین سود کے دلائل کا تتبع کیا ہے معلوم ہوا ہے کہ ان میں کسی صاحب نے بھی صحیح استدلال سے کام نہیں لیا۔ آئندہ عبارات میں اس مسئلہ کو زیر بحث لایا جاتا ہے اور مجوزین کے دلائل کا تار و پود کھول کر دکھلایا جاتا ہے ؎

فان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ[2]
وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

مجھے اس وقت یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ سود حرام ہے یا حلال؟ کیونکہ اس ارشاد باری تعالیٰ کے بعد کہ احل اللہ البیع وحرم الربٰو اس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اور ہم میں سے کسی شخص کے دل میں یہ خیال جاگزین نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ نص آیت کی مخالفت کرے بلکہ ہماری بحث صرف ان دو سوالوں کے متعلق ہے جو مدت سے زیر بحث چلے آتے ہیں اور برابر سلف مجتہدین کے درمیان محل بحث رہے ہیں۔

(۱) اس ربوٰ کی تعریف کیا ہے۔ جس کی تحریم آیات قرآنی سے ثابت ہوتی ہے؟

(۲) کن چیزوں کے تبادل میں ربوٰ ہوتا ہے؟

---

[1] یعنی اپنی زبانوں سے جھوٹ بیان کرکے یہ مت کہو کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام کیونکہ اس طرح خدا کی ذات پر افترا لازم آتا ہے ۱۲ منہ

[2] اگر تو حقیقت امر کو نہیں جانتا تو یہ مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے تو یہ دوہری مصیبت ہے۔ ۱۲ منہ

ان دونوں سوالوں کا جواب پا لینے پر ہم اپنے بعض مروجہ جزئی معاملات کو بھی قیاس کر سکینگے۔ یہ بات محتاج دلیل نہیں کہ اصل اور قیاس کی بنا منصوصہ احکام شرعی پر قائم ہوتی ہے۔ پس کیا ہمارے سامنے کتاب و سنت ہی ہے اور اگر اس میں سے ہمارا مطلب نکل آئے تو کسی دوسری جگہ دست دراز کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ اجماع مسلمین کی طرف ہم کو جھکنا پڑیگا۔ پس اگر مجتہدین اور جماعت صحابہ نے کسی مسئلہ کی تنقیح نہیں کی تو ہم سلف صالحین کے طریقہ پر قرآن کریم میں غور کریں گے۔

قرآن مجید میں ربوٰ کا ذکر ان چار مواضع پر آیا ہے:۔

(۱) سورۃ روم میں۔ اس کو پہلے نمبر پر ہم نے اس لئے رکھا ہے کہ یہ اس موضوع میں سب سے پہلی آیت ہے کیونکہ یہ مکیہ ہے باقی مدنیات ہیں۔ فرمایا:۔

وما اٰتیتم من ربًا لیربوا فی اموال الناس فلا یربو عند اللہ وما اٰتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ اللہ فاولٰئک ھم المضعفون (ترجمہ) اور جو تم بہت دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مالوں میں بڑھے بس وہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک نہیں بڑھتا اور جو صدقہ دیتے ہو جس سے تمہاری مراد خاص اللہ کی رضا ہوتی ہے۔ سو یہ صدقہ دینے والے لوگ اس کو کئی گنا بڑھاتے ہیں۔

(۲) سورہ نساء کی آیت میں جو یہودیوں کے معائب اور ان کے ارتکاب منہیات کے اثنائے ذکر میں آئی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

واخذھم الربٰو وقد نھوا عنہ واکلھم اموال الناس بالباطل (ترجمہ) اور بوجہ ان کی رباخواری کے جس سے ان کو ممانعت کیگئی تھی اور بہ سبب انکے لوگوں کا مال کھا جانے کے ناجائز طور پر۔

(۳) سورۃ آل عمران کی آیت میں فرمایا:۔

یاایھا الذین امنوا لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ واتقوا اللہ لعلکم
تفلحون۔ (ترجمہ) اے مومنو! تم ربا نہ کھاؤ کئی گنا جو پھر کئی گنا ہو جاتا ہے
اور اللہ سے ڈرو شاید کہ تم فلاح پاؤ۔

(۴) سورہ بقر کی آیت ہیں۔ اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس موضوع میں
سب سے آخری آیات یہی ہیں۔ فرمایا:۔

الذین یاکلون الربوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطن من
المس ذلک بانھم قالوا انما البیع مثل الربوا واحل اللہ البیع وحرم الربوا فمن جاءہ
موعظۃ من ربہ فانتھی فلہ ما سلف وامرہ الی اللہ ومن عاد فاولئک اصحب
النار ھم فیھا خالدون۔ یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات واللہ لا یحب کل
کفار اثیم۔ یا یھا الذین امنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم
مومنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ وان تبتم فلکم
رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون۔ (ترجمہ) جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت
کے دن نہیں کھڑے ہونگے۔ مگر اس شخص کا سا کھڑا ہونا جس کو شیطان نے مخبوط
الحواس کر دیا ہے چپٹ سے۔ یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے کہا کہ معاملہ بیع کا مثل
سود کے ہے حالانکہ بیع کو تو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ پس جس کے پاس
اس کے پروردگار سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو پہلے لے چکا ہے سو اس کا
معاملہ خدا کے حوالے ہے اور جو پھر بھی ربو کی طرف لوٹے تو یہی لوگ دوزخی ہیں وہ دوزخ
میں ہمیشہ رہینگے۔ اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے اور جتنے منکر باتیں نہیں
مانتے خدا ان سے راضی نہیں۔ اے مسلمانو! خدا سے ڈرو اور جو سود باقی ہے اس کو
چھوڑ دو۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول سے
لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور اگر تم توبہ کرتے ہو تو تمہاری اصل رقم تم کو پہنچ جاتی ہے

سے تم کسی کا نقصان کرو اور نہ کوئی تمہارا نقصان کرے *

معتبر اور مقبول مفسرین نے پہلی آیت (سورہ روم) کی تاویل ایسے معانی سے کی ہے جن کے رو سے وہ ہماری بحث میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اُنھوں نے اس کی تاویل اس عطیہ سے کی ہے جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کو دیتے ہیں اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ معاوضہ ملے۔ اور وہ ہدیہ کہلاتا ہے۔ آیت کی یہ تفسیر ابن عباس۔ سعید بن جبیر۔ مجاہد۔ طاؤس۔ قتادہ اور ضحاک نے کی ہے اور شیخ المفسرین طبری نے ان سے نقل کی ہے۔ اس کے ہم معنی وہ آیت ہے جس میں خداوند تعالےٰ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے ولا تمنن تستکثر یعنی کسی کو اس لالچ سے کوئی شے ہبہ نہ کر کہ تجھکو اس سے زیادہ عوض دیا جائے *

اس بات کی دو دلیلیں ہیں کہ مذکورہ آیت کے معنی مرادی ہماری بحث سے خارج ہیں (۱) یہ کہ اس آیت میں اتیتم کا لفظ آیا ہے۔ بخلاف اس کے اس سُود کے ذکر میں جو ہمارا موضوع بحث ہے لا تاکلوا الربوٰا اور والذین یاکلون الربوٰ کا لفظ فرمایا ہے اور پھر اس کا مقابلہ وما اتیتم من زکوٰۃ تریدون بہ وجہ اللہ سے کیا ہے۔ پس پہلی چیز تو وہ عطیہ ہے جس سے زیادہ طلبی کی غرض سے بندوں کو خوش رکھنا مدعا ہو اور دوسری چیز وہ عطیہ ہے جس سے رضائے الٰہی مطلوب ہو پہلی چیز مذموم و مکروہ اور دوسری محمود و مبارک ہے (۲) یہ آیت مکیہ ہے اور قرآن کا جو حصہ مکہ شریفہ میں نازل ہوا ہے اس میں جزئی احکام نازل نہیں ہوئے بلکہ اس میں صرف توحید و آخرت کا ذکر اور بڑے بڑے مکارم اخلاق عدل و احسان وغیرہ کا بیان آیا ہے تشریع جزئیات مدنیہ آیات میں ہے جیسا کہ امام شاطبی نے موافقات میں ظاہر کیا ہے۔ اور جیسا کہ ایک لائق و ماہر قرآن بخوبی جانتا ہے *

سورہ نساء والی آیت تاریخی آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا ذکر کیا ہے

جس پر سود حرام کیا گیا تھا۔ مگر وہ سود لینے سے باز نہ آئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو عذاب میں مبتلا کر دیا اور اُس پر کئی حلال چیزیں حرام کر دیں؟

اب سورۂ آل عمران اور سورۂ بقر کی دو آیتوں کے متعلق بیان کرنا باقی ہے۔ اِن دونوں آیتوں میں رِبٰو کے لفظ پر الف لام داخل ہے۔ اور الف لام تین معنوں میں آتا ہے (۱) استغراق (۲) جنس (۳) عہد۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ الربٰو کے لفظ پر جو الف لام داخل ہے لاؔم کے ہر سہ مذکورہ بالا اقسام میں سے کس قسم میں داخل ہے۔ ذیل میں اس لاؔم کی حقیقت کا معین کرنا ضروری ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اُصول عربیت کے ماہرین کے لئے تو اس کے سمجھنے کے لئے کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔ لیکن اس کتاب کے ناظرین میں سے اکثر اصحاب ایسے بھی ہونگے جو اُصول عربیت سے بالکلیت ناآشنا ہیں اس لئے ہم ہرسہ اقسام کی حقیقت کو واضح کرکے لفظ الربٰو کے حرف لاؔم کی تعیین کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ لاؔم استغراق کا مفہوم یہ ہے کہ جس لفظ پر وہ داخل ہوتا ہے اس میں کسی چیز کے تمام افراد داخل ہوا کرتے ہیں۔ جیسے آیہ تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض میں لفظ الرسل پر جو لاؔم داخل ہے وہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ الرسل کے لفظ میں رسول کے تمام افراد داخل ہیں۔

بدیں طور کہ کوئی رسول خارج نہیں رہ سکتا۔ سو اس تعریف کے مطابق لفظ الربوٰ میں لام استغراق نہیں لیا جاسکتا کیونکہ ربٰوا کے معنی زیادتی کے ہیں۔ اگر ہم اس لام کو لام استغراق سمجھیں تو ہر ایک قسم کی زیادتی کا لینا جائز نہیں ہوگا۔ حالانکہ بیع کی صورت میں بعض اوقات بائع مشتری سے حسب دستور اصل قیمت پر زیادہ بھی کچھ لیا کرتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کوئی چیز بیس روپیہ پر خرید کرے اور پچیس روپیہ پر فروخت کردے تو اس قسم کی زیادتی ممنوع نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ الربوٰ پر لام استغراق کے معنی چسپاں نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح لفظ الربوٰ پر لام جنس بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ لام جنس کے معنی یہ ہوا کرتے ہیں کہ جس لفظ پر وہ داخل ہو اس سے کسی چیز کی ماہیت مراد لیا کرتے ہیں اور ماہیت ایک امر ذہنی ہوا کرتا ہے جس کا خارج میں افراد سے علیحدہ کوئی وجود نہیں ہوتا اور اوامر و نواہی کا حکم ماہیت ذہنیہ پر عائد نہیں کیا جاتا۔ جیسے لفظ الحمد پر جو لام داخل ہے بموجب تحقیق علامہ زمخشری لام جنس ہے۔ اگر ہم لفظ الربوٰ میں لام جنس مراد لیں تو معنی یہ ہونگے کہ ماہیت ربوٰ جو ایک امر ذہنی ہے حرام ہے مگر ہر ایک عاقل سمجھ سکتا ہے کہ ایک مفہوم ذہنی کو حرام کہنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ جب الربوا کا لام نہ تو لام استغراق ہو سکتا ہے نہ لام جنس تو لامحالہ ہم اسے لام عہد قرار دینگے جو سب محققین کے نزدیک مسلم ہے اس لئے

لفظ الربوٰا سے وہ ربوا مراد لیا جائے گا جو مخاطبین کے نزدیک معہود ہے۔ یعنی جس کو مخاطبین جانتے ہیں کہ وہ ربوا جو عام طور پر لوگوں میں متداول ہے حرام ہے کیونکہ اگر مخاطبین کو پہلے سے یہ معلوم نہ ہو کہ ربوا سے کونسا ربوا متکلم نے مراد لیا ہے۔ تو متکلم کا انہیں اس ربوا سے منع کرنے کا کیا مطلب ہو گا۔ پس اس تحقیق سے معلوم ہُوا کہ لفظ الربوا سے وہ ربوا مراد ہے جو اہل عرب کے ہاں متداول تھا اور جس کو ہر ایک شخص اپنے روزمرہ معاملات میں بخوبی جانتا تھا۔ مگر ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ بیع اور ربوا میں کچھ فرق نہیں کرتے تھے اور اسی وجہ پر وہ دونوں کی ایک ہی نوعیت خیال کیا کرتے تھے جس پر اللہ تعالٰے نے فرمایا کہ بیع تو حلال ہے اور ربوا حرام ہ

واضح ہو کہ اہل عرب کے ہاں جس ربوا کا لین دین متداول تھا اس کی صورت یہ تھی کہ ایک شخص دوسرے شخص کو کسی مدت معینہ پر کچھ قرض دیتا اور جب وہ مدت ختم ہو چکتی تو قرض دہندہ قرضدار کو یوں کہتا کہ یا تو قرض ادا کر دو یا اس کی مقدار میں کچھ زیادتی کرو جس کی صورت یوں تھی کہ یا تو ایک ناقہ کے عوض وہ دو ناقہ کا لینا قرار دیتا یا چار سالہ اونٹ کے بچے کے مقابل وہ جوان اونٹ لینا قرار دیتا۔ سو یہ ہر دو قسم کی زیادتی ربوا خیال کی گئی ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں نہی وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ حدیث انما الربوا فی النسیئة نے اس ربوا کی وضاحت کردی۔ کیونکہ نسیہ یعنی ادھار کے ساتھ جو زیادتی لی جاتی ہے وہ ربوا کہلاتی ہے۔

اس سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ قرضہ میں وہ زیادتی جو مہلت قرضہ کے مقابلہ میں لی جاتی ہے حرام ہے۔ یا یوں کہو کہ ربوا قرضہ کے ساتھ وہ زیادتی ہے جو بلا کسی قسم کے معاوضہ کے قرضدار سے وصول کی جاتی ہے۔ شریعت نے مہلت قرضہ کے مقابلہ میں کسی قسم کی زیادتی کو جائز نہیں رکھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلام نے ربوا کی دو صورتیں قرار دی ہیں۔ اوّل ربوا النسیہ یعنی اُدھار دے کر کسی مدت کے بعد اصل کے ساتھ کچھ زیادتی وصول کی جائے۔ دُوم ربوا الفضل یعنی دست بدست ادل بدل کرنے میں اصل مقدار کے ساتھ کچھ زیادتی وصول کی جائے۔ ربوا نسیہ مثلاً سو روپیہ کے ساتھ کچھ مدت کے بعد سو سے زیادہ کسی شرح مقررہ پر وصول کیا جائے۔ اور ربوا الفضل مثلاً سونا یا چاندی یا کوئی اور دو ہم جنس چیزوں کا دست بدست ادل بدل جس میں ایک طرف کچھ اور زیادتی کا لینا ٹھہرایا جائے۔ شریعت نے ہر دو صورت کو حرام قرار دیا ہے۔ اس لئے آجکل جو معاملات بنکوں میں مروّج ہیں مثلاً ایک سَو روپیہ ایک خاص مدت کے لئے بعوض ایک سو دَس روپیہ کے بطور قرض دیا جاتا ہے وہ ربا نسیہ ہے جو کتاب و سُنت اور اجماع کے رُو سے حرام ہے۔ کیونکہ اصل پر ایک ایسی زیادتی ہے جو مدت کے مقابلہ میں ہے۔ اضعافاً مضاعفۃ کا جو

لفظ صراحتاً سورۂ آل عمران کی آیت میں آیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قرض بسا اوقات مرور ایام سے کئی گنا ہو جاتا ہے ملک شام کے مشہور پروفیسر شیخ عبد العزیز جاویش اپنی ایک طویل تقریر میں جس کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے بیان کرتے ہیں :-

اہل عرب میں رواج تھا کہ وہ لوگ مدت بڑھا دیتے تھے اور جانور کی عمر میں زیادتی کر دیتے تھے۔ پس ایک سال کے بچہ شتر کی بجائے دو سال کا بچہ لیتے تھے۔ اب جبکہ ان دونوں میں ایک ہی سال کا فرق ہے تو بے شک اضعاف کی صورت نہیں پائی جاتی۔ مگر جب مدت قرض بتدریج بڑھتی جاتی تو ایک سال کے بچے سے ایک ایک سال کے دو یا تین بچے بن جائینگے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہر مدعی کی بات کا فیصلہ کر دیتا ہے کہ ان تبتم فلکم رؤس اموالکم۔ پس اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کے لئے بشرطیکہ وہ توبہ کریں رؤس اموال پر قناعت کرنے کی ہدایت کی ہے اور ان پر کسی قسم کی قلیل وکثیر زیادتی عائد نہیں کی اکثر لوگوں کو یاد ہوگا کہ کچھ مدت ہوئی کہ ملک شام کے بعض عیسائی و یہودی سود خواروں نے دیہاتی کاشتکاروں کو قرض دینا شروع کیا تھا جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ گذرنے پر سود اصل سے کئی گنا بڑھ جاتا حتیٰ کہ مقروض کے پاس کچھ نہ رہتا۔ اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ جو سود اصل قرضہ سے کئی گنا بڑھ جائے حرام سود کی افراد میں سے ایک وہ بھی ہے۔ یہ نہیں کہ صرف وہی حرام ہے :

اب یہ بیان کر دینا باقی رہا کہ شریعت نے اس زیادتی بمقابلہ مدت کو کیوں حرام قرار دیا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ آجکل اس مسئلہ میں معمول سے زیادہ ہاتھ پائوں مار رہے ہیں۔ اگر اس موضوع پر کچھ بیان کیا جاتا ہے تو خوب کان لگا کر سنتے ہیں۔ اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس مسئلہ مشکل سے نجات پائے۔ مگر ساتھ ہی ہماری شریعت کی مخالفت بھی لازم نہ آئے :

ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ سُود کسی صورت میں بھی مفید و نافع نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم بہت سی ایسی صورتیں دیکھ رہے ہیں جن میں سود کی طفیل انسان کی بہت سی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور بہت سی مشکلات حل ہوتی ہیں۔ لیکن شارع علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم کو اس سے ضرر پہنچیگا اور وہ اسکے نفع سے بڑھکر ہوگا اور وہ متمول و دولتمندی کو اغنیائے اُمت کا ورثہ بنا دے گا اور شارع کا مقصود یہ ہوتا ہے ۔ کہ دولت تمام طبقات اُمت کے درمیان قطع نظر اس سے کہ وہ غریب ہوں یا فقیر متبادل ہوتی رہے اِس لئے سُود کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ اور اس کو قطعًا خواہ قلیل ہو خواہ کثیر حرام کر دیا۔ کچھ زیادہ مدت نہیں گذری کہ بنکوں کی کثرت ہونے سے پیشتر ہمارے ملک کا یہ حال تھا کہ جو زراعت پیشہ اور زمیندار لوگ تھے وہ اپنی کھیتی باڑی سے کافی غلہ پیدا کر کے گذران کرتے تھے اور جو ملازمت پیشہ تھے وہ اپنے فرائض منصبی کے پابند رہ کر بقدر ضرورت روزی سے متمتع ہو کر مزے سے گذارا کرتے تھے۔ پس ملک کی تھوڑی سی ثروت اہل ملک کے گذارہ کے لئے کافی ووافی تھی۔ انپر کوئی قرضہ کا بار نہ پڑتا تھا اور نہ کوئی قرضخواہ اپنے حق اور اقتدار کے دعویٰ پر انکے ساتھ ایسا برتاؤ کرسکتا تھا جو آقا نوکر کے ساتھ اور مالک غلام کے ساتھ کرسکتا ہے ؛

یورپ کے ماہرین تجارت نے ہمارے لئے عطائے قرض کے دروازے کھول دیتے ہیں اور اس غریب ملک میں اپنے یورپین اصول کی ایسی نہریں چلانی شروع کی ہیں جو اس کی رہی سہی ثروت کو بھی بہائے جا رہی ہیں۔ کیونکہ اس تند و تیز سیلاب کے بہا لیجانے کے لئے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ سفید پوش لوگ جو اپنی شان و شکوت قائم رکھنے کے لئے اپنی موجودہ جائداد کو ناکافی سمجھ کر قرض لینا ضروری خیال کرتے ہیں۔ دوسرے وہ تاجر لوگ جو اپنے سرمایۂ تجارت کو تھوڑا جانکر زیادہ سرمایہ سے نفع کی حرص کرتے ہیں اور یہ غرض قرض پر روپیہ لیکر پوری کرنا چاہتے ہیں۔ ان

دو قسم کے لوگوں سے کم تعداد میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تنگدستی سے تنگ آ کر اپنی حاجات پوری کرنے کے لئے قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اب اس کے ساتھ ساتھ یہ حالت ہے کہ اہل ملک کے ہاں اس وقت بہت سی دولت موجود ہے۔ جس کا بڑا حصہ انہیں بذریعہ قرض حاصل ہوا ہے اور طبعاً اس کا نتیجہ یہ ہے اور ہونا چاہئے کہ اراضی کی قیمت بہت چڑھ گئی ہے۔ مختلف سامان کی قیمت اور اشیائے خوردنی کا نرخ گراں ہو گیا ہے اور سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تمام مشکلات اسی جعلی دولت کی بدولت پیدا ہو رہی ہیں جو چشمہ کی طرح بنکوں سے پھوٹ رہی ہے حساب دان معلوم کر سکتا ہے کہ ہمارے ملک شام کے سر پر غیر ممالک کے قرضہ کا بہت بڑا بوجھ پڑا ہوا ہے۔ جس کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے اور جس کے ذمہ وار قوم اور حکومت ہیں۔ تمدن کے نکتہ شناس بخوبی جانتے ہیں کہ ثروت اس چیز کا نام ہے کہ آمدنی اور خرچ کے بعد کچھ بچ رہے۔ جس شخص کی آمدنی دس اور خرچ آٹھ ہے وہ صاحب ثروت ہے اور جسکی آمدنی ہزار اور خرچ گیارہ سو ہے وہ بے ثروت ہے۔ جب ہم اپنے ملک پر نظر کرتے ہیں تو ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ بنکوں کے قائم ہونے کے بعد آجکل وہ دوسری صنف میں داخل ہو گیا ہے۔ لوگوں کی آمدنیاں بڑھ گئی ہیں اور عوام الناس کے ہاتھ میں بہت مال آ گیا ہے لیکن بنکوں کے جو قرض انکے ذمہ ہیں وہ انکی آمدنی سے بڑھ گئے ہیں۔ کیونکہ سالانہ سود کے رقوم کا ادا کرنا واجبات سے ہے اور ان رقوم کا مجموعہ کروڑوں تک ہے جو ہر سال ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور اس سے کچھ فائدہ ہمارے پلے نہیں پڑتا۔ اس برباد کن حالت کا منظر دیکھنا ہو تو خاص افراد پر نظر کرنا چاہئے۔ چنانچہ مجھے ایک ایسے ثقہ آدمی سے جسکی رائے ان معاملات میں خاص وقعت رکھتی ہے معلوم ہوا ہے کہ مالکان اراضی میں شاید ہی کوئی ایسا نظر پڑے جس کی کمر اس قسم کے قرضہ کے بوجھ سے جھکی ہوئی نہ ہو۔ لوگ کوئی

اشیاء ضرورت کے لئے قرض نہیں لیتے بلکہ صرف ترقی و ثروت کی اُمید پر قرض لیتے ہیں مگر اپنی مراد سے محروم رہتے ہیں۔ کئی شاندار محلات اس تباہی نے کھنڈر بنا کر چھوڑے ہیں جنکی عبرتناک داستان محبانِ وطن کو آنٹھ آنٹھ آنسو رُلاتی ہے ؛

ایک نامی متمول اور رئیس کا ذکر ہے کہ اُس نے پچھلے سال ایک ہزار پونڈ تیس فیصدی سود پر صرف اس غرض سے لیا تھا کہ ایام گرما شہر پیرس میں گزارنے کے لئے رہائش کے لائق کوئی مکان مہیا کرے ؛

ہمارے بے ثروت ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ جب سے بنکوں نے ادھار مال دینے سے انکار کر دیا ہے اُس وقت سے لوگ دل شکستہ نظر آرہے ہیں۔ اور کاروبار ٹھنڈے پڑ گئے ہیں کیونکہ کارخانہ دار لوگ اب تک ترقی ثروت کی موہوم اُمید پر غیروں کے روپیہ سے کام چلا رہے تھے۔ آہ۔ وہم تیرا برا ہو۔ تو ان لوگوں کو دولتمندی کے خیال خام میں مست رکھتا ہے۔ جو درحقیقت تباہی کی غار کی طرف جا رہے ہیں۔ مال جو لوگوں کے درمیان گردش کرتا رہتا ہے اگر وہ قوم و ملک کا مال ہوتا تو بھی بہت کم مصیبت سمجھی جاتی۔ کیونکہ ہم اس وقت کہہ سکتے تھے کہ قوم کا مال قوم ہی کے افراد میں دورہ کر رہا ہے۔ ایک کی جیب سے کچھ مال نکل جاتا ہے۔ تو دوسرے کی جیب میں داخل ہو جاتا ہے۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ جو مال ہمارے پاس ہے وہ غیروں کا ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ٹھہر نہیں سکتا۔ بلکہ ہماری قومی ثروت کو بھی کھینچتا اور سلب کرتا جا رہا ہے۔ یہانتک کہ وہ دن دور نہیں جبکہ ہماری جائدادیں مستعار اور غیروں کا حق ہونگی۔ یا ہم اپنے آپ کو انیٹوں کے بھٹے پر کام میں مشغول پائینگے ؛

افسوس کہ فی الواقع ہم لحہ بلحہ اس تباہ کن حالت کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا بڑا موجب ایک تو وہ کوتاہ نظری ہے جو انسان کو اکثر غیر محسوس حالت

تک پہنچادیا کرتی ہے ۔ دوسرے بڑی آرزوئیں ہیں جنکی آڑ میں زمانہ کسی اور ہی بھیانک حالت کو قریب لا رہا ہوتا ہے اور انسان کو اس کچھ علم نہیں ہوتا اس میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ لوگوں نے اپنے آپ کو سخت مشکلات کے بھنور میں ڈال لیا ہے ۔ یہاں تک کہ ان کی حالت اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ وہ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتے ۔ مگر دیکھ لینا کہ ایک نہ ایک دن زمانہ انکی آنکھیں کھول دیگا ۔ فضلائے قوم اور مدبران ملک کا فرض ہے کہ اس اندیشناک معاملہ میں ہر طرح عقل دوڑائیں اور لوگوں کی ٹیڑھی رفتار کو سیدھی بنا کر اسراف اور فضول خرچی سے باز رکھیں تاکہ وہ چادر سے باہر پاؤں نہ پھیلائیں ؛

میرے خیال میں اگر مال ہمارا ہوتا تو تھوڑی مصیبت تھی ۔ کیونکہ ہماری موجودہ حالت دو مصیبتوں پر مشتمل ہے ۔ اگر ہمارا تصرف اپنے ہی مال میں ہوتا تو ایک مصیبت ہی تھی ۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ مال کا بڑا حصہ اغنیاء کے ہاتھوں میں چلا جاتا جو نادار لوگوں سے مال کھینچنا حلال جانتے ۔ اور خود آرام کے مسند پر جلوہ افروز ہوتے ؛

اس امر کو ملحوظ رکھ کر شارع علیہ السلام نے سود کو حرام قرار دیا ۔ اور یہ حالت بعینہٖ ان اقوام میں پائی جاتی ہے جنکی اقتداء اور تقلید پر ہم مرتے جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انکے برابر ہو جائیں تاکہ ہم بھی کسی امر کی تیاری کریں کیونکہ ان اقوام کے اغنیاء بڑی تیاری اور مستعدی رکھتے ہیں ۔ ثروت عامہ کی کنجیاں انکے قبضہ میں ہیں ۔ اجناس کی ارزانی و گرانی انکے اختیار میں ہے ۔ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ۔ ایک سواد اعظم انکی طفیل فقر و ناداری کے گڑھے میں گرا ہوا ہے ؛

نتیجہ یہ نکلا کہ ربا نسیہ تھوڑا ہو یا زیادہ باجماع مسلمین حرام ہے اور تمدنی و معاشرتی زندگی میں اسکا نقصان بہت شدید ہے اور وہ خدا اور رسول سے نبرد آزمائی کرنے کا داعی ہے چنانچہ فرمایا فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ اور جو لوگ حقائق کی بنیاد اوہام

پر رکھ لیتے ہیں ان کو اپنے ادبار کا جلد ہی احساس ہو جائیگا۔ شارع ہمیشہ جہت غالب کا لحاظ کیا کرتا ہے۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ اس میں عموماً شر غالب ہے تو حرام قرار دیتا ہے۔ اور اگر دیکھتا ہے کہ خیر غالب ہے تو حلال بنا دیتا ہے۔ لیکن خاص ان جزئیات کو بھی غیر ملحوظ نہیں چھوڑتا۔ جن میں سخت ضرورتیں پیش آجاتی ہیں۔ ایسی صورتوں میں اگر ممنوع چیز کی ضرورت پیش آجاوے تو شارع ایک منفرد و مخصوص حالت میں حد ضرورت تک اس کو مباح بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ شریعت نے شراب اور قمار کو حرام قرار دیا ہے اور فرمایا ہے یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیہما اثم کبیر و منافع للناس واثمہما اکبر من نفعہما پس گناہ کی جانب کو ترجیح دیگئی ہے اور قلیل مقدار تک کو بھی حرام کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ کثیر کا ذریعہ ہے۔ اور اس عام حکم میں ان بعض افراد کا کوئی لحاظ نہیں کیا جو شراب نوشی میں بالکل حد اعتدال پر چلتے ہیں حتی کہ اثر مستی کبھی غالب نہیں ہوتی۔ کیونکہ شریعت میں جہت غالب کا لحاظ کیا جاتا ہے مگر ساتھ ہی فقہاء نے اس خاص مدت میں کہ کوئی بڑی سخت مرض میں مبتلا ہو اور کوئی عادل و حاذق طبیب کہدے کہ اس کو صرف شراب سے شفا ہوگی اجازت دیدی ہے کہ صرف ضرورت کے موافق شراب استعمال کر لینا چاہئے جس سے بیماری دور ہو جانے کی امید ہو۔ بقول "الضرورات تبیح المحظورات" ؎

چوں ضرورت بود روا باشد (انتہیٰ)۔

ذیل میں چند ان وجوہات یا دلائل کو جو مجوزین کی طرف سے اکثر پیش کیجاتی ہیں رد کیا جاتا ہے۔ منجملہ انکے (۱) بعض اصحاب یہ کہا کرتے ہیں کہ ہندوستان دار الحرب ہے اور دار الحرب میں سود کا لین دین ممنوع نہیں جیسا کہ صاحب ہدایہ نے حدیث لا ربوٰ بین المسلم والحربی فی دار الحرب پیش کی ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نہیں تسلیم کرتے کہ ہندوستان دار الحرب ہے۔ کیونکہ دار الحرب ہونے کے لئے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ کے نزدیک تین شرطوں کا ایک ملک میں مجموعاً پایا جانا ضروری ہے اول یہ

کہ کوئی ملک جو دارالاسلام ہو اس وقت دارالحرب ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس میں تمام احکام اسلامی کا اجرا موقوف ہو کر احکام کفر کا اجرا حکماً قرار پائے۔ دوم یہ کہ وہ ملک چاروں طرف سے دارالحرب سے متصل ہو۔ سوم یہ کہ اس ملک میں جان و مال کے متعلق وہ امان اول قائم نہ رہے جو دارالاسلام کے وقت لوگوں کو حاصل تھی۔ امام ممدوح کے نزدیک تو ان تینوں شرطوں کا ایک وقت میں پایا جانا دارالحرب ہونے کے لئے ضروری ہے مگر صاحبین کے نزدیک صرف پہلی شرط کا پایا جانا ہی دارالحرب کے وجود کے لئے کافی ہے چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ اور نیز دیگر کتب فقہ میں اس امر کی پوری تفصیل مذکور ہے۔ مگر چونکہ فتویٰ امام ممدوح کے قول پر صادر کیا جاتا ہے اسلئے صاف ظاہر ہے کہ پہلی شرط ہندوستان میں قطعاً مفقود ہے کیونکہ حدود و قصاص کے سوا باقی تمام احکام شرعیہ بدستور نافذ ہیں۔ کسی کو کسی قسم کی روک ٹوک نہیں۔ طحاوی میں مذکور ہے کہ جس ملک میں احکام شریعت اور احکام شرک دونوں نافذ ہوں وہ ملک دارالاسلام ہی سمجھا جائیگا۔ اور نیز فصول عمادی میں مذکور ہے کہ اگر کسی ملک میں کچھ احکام شرعی جاری ہیں تو وہ ملک دارالحرب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اہل اسلام کا غلبہ باقی نہ رہا ہو۔ ہندوستان موجودہ حالات میں ہرگز دارالحرب قرار نہیں پا سکتا۔ کیونکہ احکام شرعیہ از قسم عبادات و تقسیم ترکات بدستور دارالاسلام بلا ممانعت حکومت نافذ ہیں علیٰ ہذا القیاس دوسری شرط بھی مفقود ہے۔ کیونکہ ہندوستان بعض اسلامی ریاستوں پر مشتمل ہے اور اس کے بعض اطراف اسلامی ممالک کے حدود سے متصل ہیں جہاں سے اعانت لشکر اسلام ہو سکتی ہے یہی حال تیسری شرط کا ہے۔ کیونکہ امان اول سے مراد یہ ہے کہ اہل اسلام بہ حیثیت اسلام اور کفار اہل ذمہ بہ حیثیت عقد ذمہ اپنے جان و مال کو اس طرح محفوظ نہ رکھ سکیں۔ جس طرح دارالاسلام میں وہ محفوظ رکھ سکتے تھے۔ مگر ہندوستان میں ہر شخص جانتا ہے کہ عیسائی حکومت اہل اسلام اور کفار کے جان و مال کو بہ حیثیت اسلام و عقد ذمہ تلف

نہیں کرد ہی اور غیر ممالک کے لوگ بلا روک ٹوک ہندوستان میں آمد و رفت کرسکتے ہیں -
لہٰذا ہندوستان تصریحات مذکورہ بالا کے رو سے کسی طرح بھی دار الحرب قرار نہیں پا سکتا ؛
(۲) بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ سود در اصل تو نا جائز ہے مگر ہم لوگ انگریزی عملداری کے رہنے والے حکم ممانعت سُود کے مخاطب ہی نہیں ہیں - کیونکہ اپنی خاص حالت کی وجہ سے مضطر ہیں . اور مضطر کو جس طرح میتہ و خنزیر جائز ہے اسی طرح ہمارے لئے سُود کا معاملہ بھی جائز ہے - بہت سے احکام شرعی کی ہم انگریزی عملداری میں تعمیل نہیں کر سکتے جیسا کہ رجم زانی - قطع ید سارق - مسلمانوں کے مقابلہ میں نا مسلم کی شہادت و میعاد سماعت وحدود - اسی طرح ہم حکم ممانعت سُود کی تعمیل نہیں کر سکتے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے معاملہ کا سود میں حد اضطرار کو پہنچنا غیر مسلّم ہے - کیونکہ دولت کمانے کے پہلے سے بہت زیادہ دروازے کھلے ہوئے ہیں - مثلاً نوکری - تجارت - زراعت وغیرہ - ایک سُود کا لین دین مشد نشد - غرض سُود کا معاملہ نہ کرنے سے کوئی وجہ خوف ہلاکت کی پائی نہیں جاتی - اور اگر بفرض محال اضطرار تسلیم کر لیا جائے تو سُود کے دینے میں ہو سکتا ہے - کیونکہ سود کے لینے میں کوئی وجہ اضطرار کی متحقق نہیں ہے - اس لئے دعویٰ عام ہے اور دلیل خاص - لہٰذا دلیل مستلزم ثبوت دعویٰ نہیں - اور پھر اضطرار کی حالت میں بھی اُن ہی اشیاء کا استعمال جائز ہے - جنکا ثبوت دلیل شرعی سے ہے اور سُود کا جواز حالت اضطرار میں کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے - اور قیاس کرنا سُود کا رجم زانی و قطع ید سارق و نا مسلم کی شہادت بمقابلہ مسلمانوں کے و میعاد سماعت وحدود پر ایک قیاس مع الفارق ہے کیونکہ یہ سب امور حکومت سے متعلق ہیں اور حکومت اہل اسلام کی ہندوستان میں نہیں ہے - اس لئے ہم انپر قدرت نہیں رکھتے بخلاف معاملہ سُود کے کہ اسکو حکومت سے کوئی علاقہ نہیں ہے - ہمیں اختیار ہے چاہے سُود کا معاملہ کریں یا نہ کریں - حکام کی جانب سے اس میں کوئی تعرض نہیں ہے - مع ہذا اس دلیل سے تو تصویر سازی اور اس کی بیع وشرا

اور آلات موسیقی کا بنانا اور اس کی بیع و شرا اور قمار بازی اور دیگر بیوع اور اجارات فاسدہ اور نیلام فاسد اور پیشہ مغنیہ اور بیع و شرا خنزیر سب جائز ہو جاتے ہیں۔

(۳) بعض کا یہ خیال ہے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ تو اضعافاً مضاعفۃ یعنی سُود در سُود کی مناہی ہے اور دوسری جگہ مطلق سود کی تفسیر امام رازی سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لوگوں میں صرف سود در سُود کا رواج تھا۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں سُود کی مناہی ہے وہاں یہی سود در سُود مراد ہے اور چونکہ مطلق سُود الربوٰ معرّف فرمایا ہے۔ اس سے نحو کے قاعدہ سے وہی ربٰو سمجھا جائیگا معہود فی الذھن جو عرب میں مروّج تھا۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قول کہ عرب کے لوگوں میں صرف سود در سود کا رواج تھا غلط ہے بلکہ عرب میں علاوہ سُود در سُود کے سود مروجہ حال بھی مروّج تھا۔ کیونکہ اگر آیہ احل اللہ البیع وحرم الربٰو کے الف لام سے اگر بخیال مستدل صرف سود در سود مُراد لیا جائے اور سود مفرد اس میں داخل نہ سمجھا جائے تو الفاظ اضعافاً مضاعفۃ عائد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور الفاظ فلکم رؤس اموالکم سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اہل عرب کے ہاں ہر دو قسم کے سُود یعنی مفرد و مرکب کا رواج تھا اور ہر دو کی علیحدہ علیحدہ ممانعت قرآن مجید میں وارد ہوئی۔ کیونکہ نصوص جو حرمت ربٰو کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں وہ مطلق ہیں جس میں مفرد و مرکب سود ہر دو شامل ہو سکتے ہیں اضعافاً مضاعفۃ سے اکثر اہل ہوا کو یہ دھوکا لگا ہے کہ شریعت میں صرف سُود مرکب کی ممانعت ہے نہ سود مفرد کی۔ مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ ان الفاظ سے محض ایک حکم کا شدت کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو یوں کہے کہ مسجد میں چوری کرنا گناہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسجد کے باہر چوری کرنا جائز ہے سخت جہالت ہے یا یوں سمجھو کہ کوئی شخص یوں کہے کہ زید میرے پاس گھوڑے پر

سوار ہو کر نہیں آیا۔ اس سے زید کا ضروری طور پر آنا کہاں ثابت ہوتا ہے ؟
اس لئے اضعافاً مضاعفۃ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر آیہ حرم الربٰو سے بحکم لا تظلمون ولا تظلمون مفرد سود کا ظلم ہونا مفہوم ہوتا ہے تو اضعافاً مضاعفۃ سے ظلم در ظلم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جیسے چوری کرنا اگر حرام ہے تو مسجد میں چوری کرنا حرام در حرام ہے۔ کیونکہ اس میں دو گناہ کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ اوّل۔ غیر کے مال میں بلا اجازت تصرّف کرنا دوّم حرمت مسجد کا پاس نہ کرنا ؛

(۴) بعض لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ سب سے آسان تدبیر جو سوجھ پڑتی ہے۔ وہ یہی ہے کہ ہم اپنی خاص حالت کی وجہ سے اپنے آپ کو حکم ممانعت سود کا مامور بہ اور مخاطب قرار نہ دیں یہ اس سے بدرجہا بہتر ہوگا کہ مامور بہ اور مخاطب بن کر بے باکی اور شوخ چشمی کے ساتھ خلاف حکم کریں ؛

سو اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو حکم ممانعت سود کا مخاطب نہ قرار دیگا وہ حرام چیز کے حلال ہونے کا معتقد ہوگا۔ جو اعتقاد حد کفر تک پہنچتا ہے اور جو شخص حکم ممانعت سود کا معتقد اور مخاطب بن کر بے باکی سے خلاف حکم کریگا وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اب اگر بہ نسبت کبیرہ گناہ کے کفر کا اختیار کرنا مستدل کے نزدیک بہتر ہے تو اور بات ہے ورنہ قواعد اسلام کے موافق تدبیر مذکورہ بدترین تدبیر ہے ؛

(۵) بعض یہ کہتے ہیں کہ مسئلہ سود میں آئمہ ایک دوسرے کے مخالف اور حدیثیں ایک دوسرے کی متعارض ہیں ؛

مگر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قول بالکل غلط ہے کیونکہ سود کے حرام ہونے میں آئمہ ایک دوسرے کے ہرگز مخالف نہیں ہیں۔ چنانچہ میزان شعرانی میں ہے اجمعوا علیٰ ان الاعیان المنصوصۃ علیٰ تحریم الربٰو فیہا الذھب والفضۃ والبرّ والشعیر والتمر والملح۔ ان چیزوں میں سود کے حرام ہونے کا سبب آئمہ نے اپنے اپنے

اجتہاد کے مطابق بیان کیا ہے۔ سود کے حلال ہونے کا کوئی سبب کسی نے بیان نہیں کیا۔ غرض حرمت میں اتفاق اور سبب حرمت میں اختلاف یہ اور بات ہے اور نفس حرمت میں اختلاف اور بات ہے۔ ان دونوں کا ایک سمجھنا کسی صاحب فہم کا کام نہیں کوئی ہم مرتبہ دو حدیثیں بھی اس باب میں متعارض نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو مدعی کا ذمہ ہے کہ وہ پیش کرے۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کا جو یہ قول ہے کہ وہ چیزوں کے دست بدست معاملہ میں ربوٰ کو جائز کہتے تھے۔ مازنی نے کتاب الاعتبار میں لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سُنیں تو اپنے اس قول کو اُنھوں نے چھوڑ دیا۔ اور اس سے توبہ کی۔ اسی طرح عبداللہ بن عمرو نے اپنے قول سے رجوع کیا ہے۔ جس کا ذکر صحیح مسلم میں ہے۔ ابن ماجہ وغیرہ میں معاویہ اور عبادۃ بن الصامت کا جو قصہ ہے اس میں معاویہ کی جانب سے کوئی حدیث پیش نہیں ہوئی۔ صحیح مسلم میں اُسامہ رضؓ کی جو حدیث ہے کہ سُود قرض کی صورت میں ہے نقد کی صورت میں نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ امام بخاری نے صحیح بخاری میں کر دیا ہے کہ یہ حدیث بیع صرف کی صورت میں ہے۔ چاندی کے عوض سونا لیا جائے یا سونے کے عوض چاندی لی جائے تو اس کو بیع صرف کہتے ہیں یہ دست بدست ہو تو اس میں کمی بیشی جائز ہے۔ لیکن یہ بیع قرض کے طور پر جائز نہیں۔

(۶) بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وصف جودت کا اعتبار بیع میں ضروری ہے کیونکہ جو حدیث شریف عدم اعتبار پر دلالت کرتی ہے اس میں ہنوز کلام ہے کہ آیا صحیح ہے یا نہیں جیسا کہ ہدایہ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس کا جواب یوں ہے کہ جس حدیث کا مطلب صاحب ہدایہ نے بیان کر کے ایک شرطیہ بات کہی ہے کہ فان صح ھذا الحدیث فھو حجۃ۔ یہ ایک حدیث صحیح بخاری

ومسلم میں ابی سعید خدری رضؓ کی روایت سے اور فقط صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضؓ کی روایت سے ہے۔ ایسی صحیح حدیث کی نسبت مدعی تے جو یہ کہا ہے کہ جو حدیث عدم اعتبار پر دلالت کرتی ہے اس میں ہنوز کلام ہے کہ آیا صحیح ہے یا نہیں اس کا یہ قول بالکل غلط ہے۔ اور اپنے اس غلط قول کی بنا پر اس نے مدت قرضہ کو سود کا معاوضہ جو ٹھہرایا ہے وہ غلط در غلط ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے تحت میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے واجمعوا علی ان البر بالبر لا یجوز بیع بعضہ ببعض الا مثلا بمثل وسواء فیہ الطیب والردی وانہ کلہ علی اختلاف انواعہ جنس واحد۔

(۷) بعض یہ کہتے ہیں کہ آیت قرآنی احل اللہ البیع وحرم الربوٰ کو بھی مانند ان آیتوں کے حمل کیا جائے۔ جنکے متعلق مفسرین تحریر فرماتے ہیں اللہ اعلم بمرادہ یعنی مانند آیات مقطعات ومتشابہات کے کہ جن کے معنی ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تفسیر کے باب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے قول کا بڑا اعتبار رہے۔ کیونکہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے حق میں یہ دُعا کی تھی کہ خدایا ان کو قرآن شریف کا مطلب سکھادے اور ان سے علم تفسیر کو دُنیا میں پھیلا دے۔ اب حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے تفسیر کی باتوں کو بہت سے طریقوں سے روایت کیا جاتا ہے مگر ان طریقوں میں علی بن طلحہ ہاشمی کا وہ اعلےٰ درجہ کا طریقہ ہے جس کو امام بخاری نے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں معتمد علیہ قرار دیا ہے اور امام احمد بن حنبل رضؓ نے اس طریقہ کی نسبت یہ فرمایا ہے کہ مدینہ سے مصر تک اس طریقہ کی ایک روایت کے حاصل کرنے کے لئے اگر کوئی شخص سفر کرکے اس کو حاصل کرے تو اس شخص نے اس روایت کو گویا مفت پایا۔ تفسیر ابن ابی حاتم میں انہی علی بن طلحہ کے طریقہ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی روایت ہے کہ قرآن مجید میں جو آیتیں عمل کے لئے نازل ہوئی

ہیں جیسے نماز۔ روزہ۔ بیع و سود کی آیتیں وہ سب محکم ہیں اور جن آیتوں سے عمل متعلق نہیں ہے بلکہ ان آیتوں پر فقط بندوں کا ایمان لانا مقصود الٰہی ہے جیسے صفاتِ الٰہی کی یا حال قیامت کی آیات یا حروف مقطعات وہ سب متشابہ ہیں۔ اب یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ مستدل نے حلال و حرام کے عمل کی آیت مذکورہ کو آیات متشابہات کی مانند جو قرار دے لیا ہے تو یہ اس کی فن تفسیر سے ناواقفی کا سبب ہے۔ علاوہ اس کے جب کسی مفسر نے اس آیت کو متشابہ نہیں لکھا اور مذاہب کے آئمہ و علماء نے آیت کو مجمل اور احادیث صحیحہ کو رافع اجمال ٹھہرا کر حکم مذکورہ آیت کی فروعات فقہیہ پر ہر طرح بحث کی ہے تو تن تنہا مستدل کو یہ اختیار کونسے حکم شرعی سے مل گیا کہ وہ تمام شرعی دنیا کی مخالفت پر کمر باندھے؟

(۸) بعض اصحاب یوں کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی جو سایہ کی طرح پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے فرماتے ہیں کہ حرمت ربوٰ پیغمبر علیہ السلام کی حیات کے ایسے آخری زمانہ میں نازل ہوئی کہ ہم سے کسی کو ربوٰ کے بارہ میں پیغمبرؐ سے دریافت کرنے کی نوبت نہیں پہنچی یہ بات حضرت عمرؓ نے ضرور کسی ایسے موقعہ پر فرمائی ہوگی جبکہ کسی نے ربوٰ کے بارہ میں کچھ اشتباہ کیا ہوگا۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے ایسا فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کو ربوٰ کے بارہ میں اشتباہات تھے۔

جواب اس کا یوں ہے کہ جن اشتباہات کی تصریح مستدل نے اوپر بیان کی ہے وہ اس مطلب کی تائید میں ہے کہ نقد سود حرام نہیں ہے۔ اگر حرام ہے تو فقط سود در سود ہے۔ اگر مستدل اس طرح کا اشتباہ ایک صحابی سے نقل کرنا چاہے تو ہرگز نہیں کرسکتا کیونکہ نقد سود کے حرام ہونے پر صحابہ کا اجماع ہے۔ چنانچہ میزان شعرانی میں ہے اجمعوا علی ان الاعیان المنصوصة علی تحریم الربوٰ فیھا الذھب والفضة والبر والشعیر والتمر والملح اذا علمت ذٰلک فقد اجمع المسلمون کلھم علی

انہ لا یجوز بیع الذھب بالذھب منفرداً والورق بالورق منفرداً الا مثلا بمثل وزنا بوزن یدا بید ویحرم النسیئۃ۔ غرض مستدل کا یہ خیال تو بالکل غلط ہے کہ نقد سود کے حرام ہونے میں یا نقد سود کی حرمت کی چیزوں میں حضرت عمرؓ یا کسی اور صحابی کو کچھ اشتباہ تھا۔ یا نقد سود کے حرام ہونے یا حرمت کی اشیاء کو حضرت عمرؓ اسی سبب سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کرسکے کہ ربٰو کی آیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں نازل ہوئی۔ مستدل کا یہ خیال ہے کہ احادیث حرمت ربٰو سے تو یہ ثابت ہوا کہ سونے۔ چاندی۔ گیہوں۔ جو۔ کھجور اور نمک میں سے ہر ایک کو اسی کی جنس سے ادھار اور کمی بیشی کے ساتھ بیچنا یا بدلنا ناجائز اور حرام ہے۔ اب یہ ایک ظاہر بات ہے کہ صحابہؓ کے ایک انبوہ کی روایتوں سے نتیجہ متذکرہ کا نکالنا اور پھر یہ خیال کرنا کہ صحابہ کو نقد سود کے حرام ہونے میں اشتباہ تھا یا یہ خیال کرنا کہ سود کی آیت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ عمر میں نازل ہوئی۔ اس لئے اصل سود کی حرمت صحابہؓ میں نہیں پھیلی۔ ایک غلط خیال ہے۔ ہاں سود کی بعض بعض جزئیات میں بعض صحابہ کو اشتباہ تھا۔ لیکن جب انہوں نے دوسرے صحابہؓ سے اس اشتباہی مسئلہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سن لیں تو انکا وہ اشتباہ جاتا رہا۔ مثلاً عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کا قصہ اوپر گذر چکا ہے۔ اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ اور اور معاویہؓ کی نسبت حضرت عمرؓ کو سود کے مسئلہ میں جزئیات کا زیادہ علم تھا۔ اسی واسطے انہوں نے عبادہ ابن الصامت کی حدیث کی تائید کی ہے اور معاویہ کی رائے کو غلط ٹھہرایا ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ مجوزین سود حضرت عمرؓ کے متذکرہ بالا قول کو اس غرض سے جو اپنی کتابوں میں نقل کرتے ہیں کہ اس سے سود کی حرمت میں اشتباہ ڈالیں۔ اور یہ کہیں کہ حضرت عمرؓ کو بھی سود کی حرمت میں اشتباہ تھا وہ لوگ بڑی غلطی پر ہیں۔ کیونکہ حضرت عمرؓ تو سود کے مسئلہ میں اشتباہ سے اتنے دور تھے کہ جس لین دین

میں سود کا اشتباہ بھی ہو اسے بھی چھوڑ دینے کا حکم دیا کرتے تھے ۔حضرت عمر رضہ کا قول ایک صحیح حدیث کے موافق ہے ۔یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم میں نعمان بن بشیر کی روایت سے ہے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال و حرام یہ دونوں چیزیں تو ایسی ہیں کہ جنکے احکام صاف صاف ہیں مگر مشتبہ چیزوں سے انسان کو بچنا چاہیئے ۔کیونکہ مشتبہ چیزوں کے عمل میں لانے سے حرام کی حد کے اندر رفتہ رفتہ پہنچ جانے کا خوف ہے ۔مشتبہ وہ چیز ہے جس کے حلال یا حرام ہونے کی شریعت میں تصریح حاصل مطلب یہ ہے کہ جو آدمی مکروہ سے نہ بچے اُس کا قدم آہستہ آہستہ حرام کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور جو شخص مشتبہ چیز کو عمل میں لاتا ہے وہ آخر مکروہ کی حد میں گھس جاتا ہے ۔

مجوزین اور محرمین سود کے فی مابین سود کے حلال و حرام ہونے کی جو بحث تھی وہ گویا اسی طرح طے ہوئی کہ مجوزین نے تو نقد سود کی حرمت کو تسلیم کرکے فرقہ سود خوار کو سود کھانے پر اس طرح بے بس اور مجبور ٹھہرایا جس طرح قریب المرگ بھوکے شخص کو مجبوری کی حالت میں بقدر سدرمق حرام چیزوں کے کھانے کی شریعت میں اجازت ہے لیکن ان لوگوں کا یہ عذر ایسا ہے جیسے کوئی مالدار شخص ہر طرح کی حلال چیزوں کے کھانے پر قادر ہو اور پھر مردار جانور کا گوشت کھانے کی عادت ڈال لے اور کوئی آدمی اس سے مردار جانور کا گوشت کھانے کا سبب پوچھے تو وہ کہے کہ حلال چیزوں کے خریدنے اور پکوانے کی تکلیف کون اُٹھائے ۔اسلئے مردار جانور کا گوشت اس بے بسی کی حالت میں مجھ کو جائز ہے ۔یہ سود خوار فرقہ کے لوگ ہزار ہا روپیہ کے مالک ہوتے ہیں جن روپوں سے ہر طرح کی حلال تجارت کا موقع ان کو حاصل ہے مگر اس مردار خوار شخص کی طرح کاروبار تجارت کی تکالیف سے بچکر سود خوار بن گئے ہیں اور اس مردار خوار شخص کی طرح زبردستی سُود خواری کے لئے اپنے آپ کو بے بس قرار دیتے ہیں جو قرارداد بالکل خلاف عقل و نقل ہے ۔اس لئے بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کے حق میں سُود کی حرمت ثابت اور ان کا عذر

لنگ بالکل غیر ثابت ہے ٭

(۹) بعض لوگوں نے نقد سود کی حرمت کو تسلیم کرکے کہا ہے کہ اس سے تخصیص کرنا قرآن کا ساتھ خبر واحد کے لازم ہوگا۔ اُن لوگوں میں سب سے بڑے سر سید احمد خاں علی گڑھی ہیں ٭

سو اس کے رد میں مستدل کا اپنا بیان ہی کافی ہے کیونکہ اسکے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حدیثیں اجمال آیت کو رفع کرتی ہیں ان کو ائمہ اربعہ نے خبر واحد نہیں ٹھہرایا بلکہ ان احادیث کو مان کر انہیں آیت کا بیان اور آیت کی تفسیر قرار دیا ہے۔ اور ان حدیثوں میں جن اشیاء کا ذکر تھا ان اشیاء کی حالت پر غور کرکے سود کے اسباب حرمت پر طرح طرح سے بحث کی ہے۔ ان لوگوں کی طرح اگر آئمہ اربعہ بھی ان احادیث کو خبر احاد سمجھتے تو پھر مذکورہ بالا بحث کیونکر پیدا ہوتی۔ کتب فقہ میں بیع کی تعریف مبادلۃ المال بالمال لکھی ہے اور ربٰو کی تعریف الفضل الخالی عن العوض۔ ان دونوں تعریفوں سے بیع اور ربٰو میں جو فرق ہے وہ ہر ایک شخص کی سمجھ میں اچھی طرح آسکتا ہے۔ کیونکہ سودخوار شخص جو روپیہ قرض لینے والے شخص کو قرض دیتا ہے وہ تو مدت قرض پر کوڑی کوڑی واپس آجاتا ہے آخر کو زر سود خالی عن العوض رہ جاتا ہے۔ بخلاف بیع کے کہ اس میں بیع شدہ چیز بائع کی ملک سے نکل کر ہمیشہ کے لئے مشتری کی ملک میں چلی جاتی ہے بعض جہال نے بیع اور سُود کے مابہ الامتیاز سے جو انکار کیا ہے سو یہ انکی نافہمی کا نتیجہ ہے اسی طرح بعض نے مدت قرضہ کو سُود کا معاوضہ جو ٹھہرایا ہے تو وہ جمہور فقہاء کے برخلاف ہونے کے علاوہ انکی کوتاہ نظری اور کج فہمی کا نتیجہ ہے کیونکہ نہ مدت قرضہ مالیت کی چیز ہے اور نہ ہی اسپر مبادلۃ المال بالمال کی تعریف صادق آتی ہے۔ علاوہ اس کے مدت تو سود در سود میں بھی موجود ہے پھر وہاں مدت کو سُود کا معاوضہ کیوں نہیں ٹھہرایا جاتا ٭

مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہو سکتا ہے کہ مجوزین سُود نہایت بے سروپا اور خلاف اُصول شریعت جواز کے لیئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ کوئی قابل اطمینان حجت اُن کے ہاتھ میں نہیں۔ بعض مغربی اُصول اقتصادیات اور ہوائے نفس پرستی کی دھُن میں نصوص شریعت میں بے جا دست اندازی کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ لوگ حرمت سُود کی حکمت اور مصلحت میں غور کرتے تو اس قسم کی بے اعتدالیاں ان سے صادر نہ ہوتیں۔ کسی چیز کی حلت و حرمت شریعت کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں قطعی حجت کی ضرورت ہے۔ جس امر کی حلت و حرمت کے متعلق نصوص موجود ہوں اسکے متعلق کسی قسم کا اجتہاد کام نہیں دے سکتا۔ حرمت سُود کے بارہ میں ایسے آیات و احادیث موجود ہیں جو قطعی فیصلہ کے لیئے کافی ہیں مگر وہ لوگ جو موجودہ اقتصادیات کے زیر اثر آچکے ہیں وہ ان نصوص کو حجت تسلیم کرنے میں ہچکچاتے ہیں۔ یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ سُود ہر حالت میں حرام مطلق ہے اور اس کی حرمت اس مصلحت شرعی پر مبنی ہے کہ اسلامی اخوت اور ہمدردی کا سلسلہ مسلمانوں میں منقطع نہ ہونے پائے۔ جس کو مسلمانوں نے اپنی بدعملی کی وجہ سے عام طور پر متروک العمل بنا دیا ہے۔ ہمیں تجربہ و مشاہدہ سے معلوم ہے کہ عموماً اہل اسلام حکم شریعت کے برخلاف معاملات میں لین دین کرتے ہیں۔ مگر شریعت کی اس بڑی مصلحت کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کو نظر انداز کرنے سے کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسلام نے بروجہ حلال زرطلبی کی اجازت تو دی ہے مگر کفار کی طرح زر پرستی کو جائز نہیں رکھا۔ سود خواری تو زر پرستی ہے نہ زرطلبی۔ سود خوار لوگ عموماً مفصلہ ذیل مفاسد کا موجب بنتے ہیں۔ اوّل خود غرضی جس میں وہ بسا اوقات مدیون پر ایسا ظلم و ستم کرتے ہیں جسکی اجازت انسانی ہمدردی نہیں دیتی۔ دوم توکل کو (جسکے معنی یہ ہیں کہ کوشش کے ساتھ اپنے خالق حقیقی کے ارادہ کے تابع ہو کر تمام امور کو اسکی مشیت پر موقوف رکھا جاتے) بالکلیت ترک کر دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہمیں بلا مشقت ماہانہ

یا سالانہ معین رقم وصول ہو جایا کریگی اور اس یقین پر وہ مشیت خداوندی کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ سوم اصول تمدن و معاشرت کے رو سے یہ لوگ مفت خوار بنکر انسانی ہیئت اجتماعی یا سوسائٹی کے لئے کچھ مفید نہیں ہو سکتے۔ چہارم یہ لوگ پرلے درجہ کے ڈرپوک۔ بزدل۔ حریص اور بخیل ہو کر نہ تو خود اپنی کمائی ہوئی دولت سے مستفید ہوتے ہیں نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ بلکہ جُوں جُوں انکی دولت میں زیادتی ہوتی جاتی ہے یہ اخلاق ذمیمہ ان میں اور بھی ترقی کرتے جاتے ہیں۔ پنجم انسانی جماعت میں نہایت ذلت اور حقارت اور بغض کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ کیونکہ سود خواری بے مروّتی کی جڑ ہے اور بے مروّت شخص کبھی دُنیا میں عزت نہیں پا سکتا۔ ان مفاسد کے علاوہ اور بھی بہت سی اخلاقی برائیاں سود خواری میں پائی جاتی ہیں۔ جو اکثر اوقات سود خوار کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہیں ؏

یہ خیال کہ حالات حاضرہ میں مسلمان بجز سود خواری کے دولت نہیں کما سکتے۔ جیسا کہ بعض ناواقفوں کا خیال ہے۔ سخت ناہنجارانہ خیال ہے۔ جس کو ایک آن کے لئے بھی قابل التفات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ حالات میں سود خواری سے بچ کر معاملات تجارتی کے سرانجام دینے میں کسیقدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ وہ مشکلات بھی صرف شریعت حقہ کے احکام کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہیں۔ عام طور پر مسلمان لوگ خلاف شرع امور میں بڑے بڑے قرضہ کے زیر بار ہوتے ہیں۔ جس سے وہ بالکل مفلوک الحال ہو جاتے ہیں۔ سو اس سے شریعت حقہ پر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا بلکہ یہ انکی اپنی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے ؏

بینک سود چونکہ صریح سود ہے اس لئے قطعاً حرام ہے۔ علمائے شریعت نے اس کے جواز کا فتوے نہیں دیا۔ ان بعض اصحاب نے جائز رکھا ہے۔

کہ اگر روپے کی حفاظت بینک کے سوا نہ ہو سکے تو وصول شدہ سود مسکینوں اور محتاجوں کو دیدیا جائے اور خود ذاتی مصارف میں صرف کرنے سے پرہیز کی جائے۔ بینکوں کے عام ہو جانے سے دنیا میں کوئی ایسی سلطنت نہیں جو کروڑوں پونڈ کی مقروض نہ ہو +

بیمۂ زندگی کی حرمت

بیمۂ زندگی میں بھی چونکہ صحیح طور پر سود خواری کا مرتکب ہونا لازم آتا ہے اس لئے قطعاً حرام ہے۔ علاوہ ازیں اس معاملہ میں غرر لازم آتا ہے یعنی احد الجانبین کو ہرگز وثوق نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے مفاد کو حاصل کر سکیگا۔ مثلاً زید جو بیمۂ زندگی کی کمپنی میں شریک ہوتا ہے اگر تاریخ داخلہ سے دوسرے دن ہی مرجائے تو کمپنی اپنے قواعد کے مطابق پابند ہوگی کہ زید کے ورثا کو وہ رقم معینہ جو ڈاکٹر کے سارٹیفیکیٹ سے معین تعداد سالوں میں پوری ہونی چاہئے تھی پوری کردے گویا کمپنی دھوکا میں رہی اور اس کو خسارہ اٹھانا پڑا۔ اور اگر کمپنی کا دیوالہ نکل جائے تو زید کو اپنے روپے سے ہاتھ دھونے پڑینگے۔ اس صورت میں زید کو دھوکا لگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ بیمہ کمپنی کی بنا ایک گونہ قمار بازی پر ہے اور قمار بازی کے حرام ہونے کی علت بھی غرر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیع کی بعض صورتیں جن میں اٹکل پچو محض ظن وگمان پر لین دین ہوتا ہے حرام قرار دی گئی ہیں +

یہاں یہ خیال صحیح نہیں ہوگا کہ بیمہ کمپنی کے قواعد ہی ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کمپنی یا شریک کمپنی کو احتمال غرر کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اکثریتہ حالت سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ اس لئے احتمال جانب مخالف بدستور قائم ہے۔ لہذا بیمہ زندگی وغیرہ کرانا ازروئے شریعت حرام قطعی ہے۔ والعلم عند اللہ تعالے +

لاٹری

لاٹری جس کا لوگوں میں بلالحاظ شریعت مغربی ممالک کی تقلید میں ایک عام رواج ہو گیا ہے ایک قسم کی قمار بازی ہے اور جس علت پر

بیمہ زندگی شرعاً ممنوع ہے۔ اسی علت پر لاٹری شرعاً ناجائز ہے۔ قرآن مجید میں میسر یعنی قمار بازی کو بنص صریح حرام قرار دیا گیا ہے۔ افسوس کہ مسلمان عام طور پر اس طریق قمار کی ممنوعیت سے غافل رہ کر زر و مال کے لالچ میں مبتلا ہو جاتے ہیں ہر ایک مسلمان کو حکم شریعت کو ملحوظ رکھے بغیر کسی قسم کا ناجائز مال حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ مگر جو لوگ حکم شریعت کی پروا نہیں کرتے انہیں ہمارا لاٹری کو ممنوع قرار دینا ضرور ناگوار گذرے گا۔ مگر ہم انہیں کہتے ہیں کہ تمہاری حالت شعر ذیل کا مصداق ہے ؎

چوں سگِ درندہ گوشت یافت نپرسد
کایں شترِ صالح است یا خرِ دجال

عورتوں کے لئے حکمِ پردہ

حکم پردہ کے متعلق اسلام پاک میں جو کچھ وارد ہے اس سے سب مسلمان واقف ہیں۔ پردہ کوئی ایسا حکم نہیں جس کے سمجھنے میں کچھ دقت ہو اور جس کی ضرورت پر بحث کرنے کیلئے ہمیں بہت سے دلائل و نظائر کا مجموعہ بہم پہنچانا پڑے۔ اس کے موافق و مخالف لوگوں نے گاہ و بیگاہ اس پر اپنا اپنا زور طبیعت دکھایا ہے اور ہر ایک نے جو کچھ لکھا ہے اپنے خیال میں درست و صحیح لکھا ہے ؎

وللناس فیما یعشقون مذاہب[1]

مجھے اس موضوع پر بحث کرنا چنداں ضروری نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اس کے متعلق ایک مُلّا کا جو مذہب ہو سکتا ہے وہ پُر ظاہر ہے مگر بعض اصحاب نے مجھے

---

[1] لوگ اپنے اپنے مرغوبات کے پیچھے لگا کرتے ہیں ۱۲ منہ

بار بار استدعا کی ہے اور نیز بعض ان اصحاب کی غلط فہمی کا رفع کرنا ضروری نظر آتا تھا جو پردہ کی عدم ضرورت کو قرآن مجید اور احادیث سے ثابت کرنے کی جرأت کر بیٹھا کرتے ہیں۔ اس لئے ذیل میں اس موضوع کے متعلق صرف آیات اللہ اور احادیث نبویہ سے استدلال کر کے امر حق کو واضح کیا جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ اصل مسئلہ کو زیر بحث لایا جائے۔ مفصلہ ذیل چند امور میں غور کر لینا ضروری ہے:۔

(۱) جو لوگ پردہ کی عدم ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ ان میں آج تک ایک بھی ایسا نہیں ملا جو قرآن وسنّت کا کافی علم رکھتا ہو بلکہ ان کا مبلغ علم مغربی اقوام کے تمدنی نظریات سے آگے تجاوز نہیں کر سکتا اور اگر کسی نے آیات قرآنیہ سے کبھی استدلال بھی کیا ہے تو غلط ٭

(۲) ان لوگوں نے اصطلاح حکم پردہ کی بجائے رسم پردہ کا لفظ اپنی تحریروں میں برتنا شروع کر دیا جس سے ان کی ایک بڑی چالاکی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عوام الناس کو یہ دھوکا دیا گیا ہے کہ پردہ حکم شرعی نہیں بلکہ محض ایک ملکی رسم ہے اور ملکی رسوم بضرورت زمانہ بدلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ علیگڈھ کانفرنس کے ایک نیچری صدر مجلس نے ایک دفعہ نہایت بے باکانہ اور گستاخانہ تقریر میں بعض اکابر دین کی ہتک اس نعوذ خیال سے کی تھی کہ انہوں نے محض سلاطین کی خوشامد سے بعض امور پر مذہبی رنگ چڑھا کر عوام الناس میں رائج کیا۔ چنانچہ بعض مغربی مؤرخین کے اقوال سے اس نے اپنے اس دعویٰ کو ہم مشربوں میں پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا تھا اور بالآخر حکم پردہ کو بھی اس نے ایسا ہی ثابت کیا ٭

لے اسی طرح ایک دفعہ ایک نیچری صدر مجلس نے جوش میں آکر یہ کہا تھا کہ اسلامی شریعت کا تمام ذخیرہ کتب بجز قرآن مجید کے دریا میں ڈبو دینے کے قابل ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ نیچری اور قرآن شریف کی اس قدر عزت۔ بارے الحمد للہ کہ قرآن مجید کو تو مستثنیٰ لیا۔ (از زیں گناہ ضعیف ایں گمان نبود) مگر سوال یہ ہے کہ اس دریدہ دہنی کی بنا پر اگر عمل کیا بھی جائے تو پھر بھی قرآن شریف سمجھانے کے لئے علماء ہی کی ضرورت پڑے گی نہ نیچریوں کی، اور پھر وہی بات پیش آئیگی جو پہلے تھی ۱۲ منہ

(۳) نیچریہ کا یہ دستور ہے کہ اوّل تو وہ احکام شریعت کی ضرورت کو تسلیم ہی نہیں کرتے اور اگر بعض میں انہیں اتفاق ہو بھی تو ان کو اسی حد تک مسلم رکھتے ہیں کہ ان کے اُصول تمدن و معاشرت میں وہ احکام مفید ہوں، ورنہ بمقابلہ ضرورت زمانہ انہیں اللہ اور اللہ کے رسوؔل کی شریعت کا اصلا پاس نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت یہ نہیں چاہتے کہ اپنی ضروریات کو بمقتضائے شریعت پورا کریں بلکہ شریعت کو اپنی ضروریات کا تابع بنانا چاہتے ہیں ٭

(۴) واضح ہو کہ جن نیچریوں نے دربارہ حکم پردہ قرآن مجید کی مخالفت کی ہے ان کے دلائل کا ماخذ صرف مغربی اقوام کا تمدن اور قوانین سیاست ہیں جو بالکلیت منافی شریعت اور مخالف تعلیم قرآن ہیں اور جہاں تک میں نے ان لوگوں کے دلائل کا تتبع کیا ہے بجز نفس پرستی کے کچھ نظر نہیں آیا۔ ان کے بڑے بڑے دلائل حسب ذیل ہیں :۔

(ا) مرد اور عورت کو فطرت نے بلا امتیاز یکساں حقوق عطا کئے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ مرد تو بلا روک ٹوک باغ و بوستاں کی سیر کریں اور عورتیں جیل (گھر) میں محبوس رکھی جائیں ٭

(ب) مستورات کو اس طرح مقید رکھنا اُصول صحت کے برخلاف ہے ٭

(ج) انسان کو خدا نے چند قوٰے دئے ہیں جن میں قدرتی طور پر ترقی کرنے کی قابلیت ہے۔ پردے سے مستورات کے قوٰے جسمانی ترقی نہیں کر سکتے گویا قدرت کے جائز حقوق سے انہیں محروم رکھا جاتا ہے ٭

(د) مستورات اولاد کی معلّم ہوا کرتی ہیں جب ان کی اپنی ذاتی حالت ناقص ہوگی تو اولاد کی تربیت کماینبغی نہیں ہو سکے گی +

مذکورہ بالا دلائل خلاصہ ہیں ان مبسوط تقریروں کا جو ان لوگوں کی طرف سے آج تک شائع ہو چکی ہیں اور ممکن ہے کہ کچھ اور بھی دلائل ہوں مگر غالبًا وہ انہیں میں سے کسی

ایک کی فرع ہو نگے اور قریباً یہی دلائل ہیں جنہیں مجوزہ تعلیم نسواں کے بارہ میں یہ لوگ پیش کیا کرتے ہیں۔

یہ دلائل ممکن ہے کہ کسی قدر ان اشخاص کو خوش کر سکیں جو اسلامی احکام شریعت کے مصالح سے بکلی ناآشنا ہیں اور جنہوں نے تہذیب کا مفہوم محض ظاہری وضعداری تک محدود سمجھ رکھا ہے۔ مگر ایک ایسا شخص جس نے احکام شریعت کے باریک معانی تک اپنی نگاہ دوڑائی ہو اور کورانہ تقلید کے پھندوں سے بچ نکلا ہو ہرگز ایک آن کے لئے بھی ان دلائل کو سننا گوارا نہیں کریگا۔ کیونکہ یہ محض سطحی باتیں ہیں جن کی تہ میں کوئی معتدبہ نتیجہ مضمر نہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی شریعت کے احکام کا یہ ذاتی خاصہ ہے کہ اس میں تمام احکام کی بنا دینی اور دنیوی مصلحتوں پر قائم کیگئی ہے۔ جن احکام کی ضرورت ایسی مضبوط تھی کہ بدون تعلیم وحی ان میں راستی کا تجویز کرنا ناممکن تھا انکا خود تعلیم وحی اور سنت رسولؐ نے فیصلہ کر دیا اور جن احکام جزئیہ کا باقتضائے ضرورت زمانہ بذریعہ اجتہاد نافذ ہونا متصور تھا ان کو علمائے راسخون فی العلم کے اجتہاد پر موقوف رکھا گیا۔ پس اس اصل کو ہمیشہ بطور قاعدہ کلیہ کے ہر دو اقسام احکام کے لئے معیار کلی سمجھنا چاہیئے۔ ایک خالص الاعتقاد والعمل مسلمان کا ہرگز یہ شیوہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ بمقابلہ نص کتاب اللہ یا نص حدیث کے کسی امر کو محض مصلحت وقتی کی بنا پر طے کرنے لگ جائے۔ مگر افسوس کہ ہمارے اس ناہنجار زمانہ میں یہ مرض عام طور پر پھیل چکا ہے۔ کئی ایک احکام ایسے ہیں جنکی نسبت شریعت اسلامی قطعی فیصلہ دے چکی ہے۔ مگر ہمارے اکثر بے لگام نوخیزوں نے عمداً انکی مخالفت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ جب وجہ دریافت کی جائے تو جواب ملتا ہے کہ موجودہ تہذیب کی ضرورتوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اور سوسائٹی کی وضع ہی ایسے حالات کی مقتضی ہے کیونکہ بدون اسکے قوم کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتی۔ الغرض ان لوگوں نے دین

حق کی صورت کو ایسا مسخ کر ڈالا ہے کہ پناہ بخدا۔ اور چونکہ وہ علمائے اُمت کو اپنے گندہ اور ناپاک خیالات کا سراسر مخالف دیکھتے ہیں اسلئے انواع و اقسام کے بُرے الفاظ سے انکی ہتک کرنا اپنی عزت اور فخر سمجھتے ہیں اور جس قدر برائیاں انکے اپنے افعال قبیحہ سے قوم میں پھیل رہی ہیں انکا الزام علمائے کرام کے سر تھوپ دیتے ہیں ؀

مذکورہ بالا دلائل کا رَد

(۱) یہ خیال کہ مرد اور عورت کی فطرت یکساں ہے اس لئے انہیں پورے وہی حقوق حاصل ہیں جو مرد کو نہ تو اصول فطرۃ، ستدلال سے صحیح ہے اور نہ تعلیم قرآن کے رُو سے۔ ہم نے اسی موضوع پر اسی کتاب میں ایک مضمون بعنوان حقوق الرجال والنسار ایک مستقل باب کی صورت میں لکھا ہے۔ ناظرین وہاں اس کا مفصلاً مطالعہ کریں۔ مع ہذا اسلام پاک نے کہیں حکم نہیں دیا کہ عورتیں باغ کی سیر نہ کریں۔ اگر عورتیں کسی اجنبی مرد کی نظر سے محفوظ رہیں تو کوئی ممانعت نہیں ؀

(ب) اگر اصول صحت کا مفہوم یہی ہے کہ عورتیں آزادانہ طور پر تھیئٹروں میں جائیں اور بلا اجازت شوہر جہاں چاہیں سفر کریں اور گارڈن پارٹیوں اور دیگر جلسوں میں دوش بدوش اور زانو بزانو مردوں کے ساتھ بیٹھیں اور دفاتر میں کلارکی کا کام کریں اور مسز اینی بیسنٹ کی طرح ملک بہ ملک لیکچر بازی کرتی پھریں تو اس کی بجائے زیادہ موزوں و مناسب ہوگا کہ شہر بشہر رنڈیوں کے چکلوں کی تعداد زیادہ کر دی جائے کیونکہ تجربہ و مشاہدہ سے یہ ثبت ہو چکا ہے کہ ایسی مہذب عورتوں اور رنڈیوں میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ رنڈیاں ہر ایک سے جوان کے ہاں جائے ہم بستر ہو لیتی ہیں اور یہ مہذب عورتیں اپنی حسب مرضی کسی مہذب جنٹلمین سے مُنہ کالا کرتی ہیں۔ ہم نے آج تک نہیں سنا کہ شرفار کی مستورات بوجہ پردہ نشینی کے بیمار ہو گئیں۔ کیا معترضین کو یہ معلوم نہیں کہ مرد اور عورت کے قوا اور اعضار میں ایک نمایاں تفاوت نظر آتا ہے اور اس لئے حکمت الٰہی نے

عورتوں کے طبایع اور امزجہ کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے روزمرہ کاروبار میں قواعد طبی کے رُو سے اپنا وہ اندازِ صحت قائم رکھ سکتی ہیں جسکی ان کو ضرورت ہے۔ یہ کیسی لغویت ہے کہ عورتوں کے مزاج اور لوازم مزاج کو مردوں کے مزاج اور لوازم مزاج پر قیاس کرکے انہیں بھی مردوں کی روش پر چلایا جائے۔ محض احتمال پیدا کرنا تو مثبت دعویٰ نہیں ہوسکتا جب تک کوئی یقینی دلیل پیش نہ کی جائے۔ اور ہم صاف کہتے ہیں اور نہایت وثوق کے ساتھ کہ پردہ نشین مستورات پردہ نشینی سے کبھی بھی بیمار نہیں ہوئیں کیونکہ جس پردہ نشینی کا نتیجہ اگر کوئی بیماری ہوسکتی ہے تو وہ اسلام پاک نے تعلیم نہیں دی۔ یہ لوگ خواہ مخواہ اس کو ایک مہیب شکل میں ظاہر کر رہے ہیں جس سے صرف نفس پروری مدِنظر ہے نہ تحقیقِ حق۔ افسوس کہ معترضین ایک جسمانی بیماری کے محض احتمال کو جس کی کوئی قوی اصل نہیں بمقابلہ کئی ایک روحانی بیماریوں کے کس قدر زیادہ قابل لحاظ خیال کرتے ہیں۔ اور بالفرض اگر ہم مان بھی لیں کہ پردہ مضر صحت جسمانی ہے تو اس کے مقابل میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بے پردگی مضر صحت روحانی ہے جو صحت جسمانی کی نسبت زیادہ قابلِ وقعت ہے۔ اب چونکہ (بصورت تسلیم قول مخالف) ہر دو صورت میں ضرر متصور ہے۔ اس لئے ان میں سے جو آسان اور کم مضر صورت ہوگی ہم اسے اختیار کرینگے بحکم اِذَا بُلِیتُمْ بِبَلِیَّتَیْنِ فَاخْتَارُوْا اَھْوَنَھُمَا۔ (جب دو بلاؤں میں گرفتار ہو جاؤ تو آسان کو اختیار کرلو) اور عقلمند آدمی خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ ہر دو قسم کی خرابی میں سے کونسی صورت آسان اور قابلِ عمل ہے۔ پردہ کی اس نہایت ہی خفیف اور ناقابلِ اعتبار تکلیف کو بمقابلہ دیگر بیشمار اخلاقی اور تمدنی خرابیوں کے ملحوظ رکھنے کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ بارش کا ہونا تکلیف دہ امر ہے کیونکہ زید چلتے چلتے بازار میں پھسل پڑا یا فلاں شخص کا مکان گر گیا مگر کوئی عاقل سمجھ سکتا ہے کہ یہ بیوقوف معترض ایک صورت میں دُنیا کی تباہی کی استدعا

کرتا ہے مگر ہم تو سرے سے اس خفیف تکلیف کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے کیا شہادت بہ المشاہدۃ؟

اس اعتراض کی کیفیت کا ہم یوں بھی امتحان کر سکتے ہیں کہ کس قدر مرد ایسے ہیں جنہیں باغ و بوستان کی سیر نصیب ہوتی ہے اور پھر فیصدی کس قدر ایسے ہیں۔ جو باغ و بوستان کی سیر نہ کرنے سے انواع و اقسام کی جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے حالانکہ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے جانتے ہیں کہ عوام الناس کی صحت امرا کی نسبت عموماً زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ افسوس کہ معترضین اتنا بھی نہیں سمجھے کہ صحت جسمانی اور روحانی کا مدار حسن تربیت پر ہے۔ چنانچہ جن خاندانوں میں حسن تربیت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ان کے عام حالات جسمانی اور روحانی پہلو میں زیادہ قابل قدر ہیں اوّل تو ایسے خاندان ہی کم ہوتے ہیں اور جو ہیں وہ بپابندی احکام شریعت ہر ایک جائز نعمت سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ مستورات شرم و حیا کا برقع چہرہ سے اتار کر فٹن میں سوار بازاروں اور باغوں کی سیر کرتی پھریں؟

(جر) یہ خیال کہ علم پردہ کی پابندی سے مستورات کے قوائے کو ترقی کا موقع نہیں ملتا اس لئے وہ اپنے جائز حقوق سے محروم رکھی جاتی ہیں۔ معترضین کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ یہ بات بالخصوص اسلام پاک ہی سے مخصوص ہے کہ اس نے بلا امتیاز مرد و زن ہر ایک کو تدبر و تفکر کی تعلیم دی ہے۔ قوائے کو ان کے مقتضائے طبعی پر لگانا اسلام کا منشاء ہے مگر ہاں جس صورت میں چند ایک نمایاں قباحتیں نظر آتی ہوں اسلام ان کی کبھی بھی اجازت نہیں دے گا قوائے فطری سے صحیح طور پر کام لینا حُسنِ تربیت اور تعلیم کا نتیجہ ہے مگر وہی تربیت اور تعلیم جس میں کسی حکم شرعی کا نقض لازم نہیں آتا۔ افسوس یہ ہے کہ معترض اگر ایسے اصول تربیت و تعلیم کی ضرورت پر زور دیتا اور ان کے عملی نتائج سے آگاہ ہوتا تو حکم

پردہ کی مخالفت پر کبھی آمادہ نہ ہوتا۔ کون کہتا ہے کہ حکم پردہ کی پابندی کے ساتھ تعلیم و تربیت کے حصول پر کاربند ہونا ناممکن ہے؟ ملک کا مجوزہ طریق تعلیم و تربیت جس میں عورت و مرد کے لئے کسی ضروری حدفاصل کو ہرگز ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور جس کی نسبت مجوزین بار بار زور دے رہے ہیں کہ عام طور پر اس کو مسلمانوں میں رواج دیا جائے صرف انہیں اقوام کی عورتوں کے لئے مفید ہو تو ہو جو شریعت اسلامی کی پابند نہیں ورنہ اہل اسلام کے لئے تو زہر قاتل سے کم نہیں۔ مع ہذا ہم آئے دن اس بدطریق کے ضروری نتائج قبیحہ کو سنتے سنتے یقین کر چکے ہیں کہ باوجود ان نتائج سے آگاہ ہونے کے حضرات مجوزین کو بالعموم یہ مدنظر ہے کہ مطلقاً مذہبی قیود کو اٹھا دیا جائے۔ چنانچہ اس امر کی پیش رفت کے لئے مختلف حیلہ سازیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ اب قیود مذہب میں جکڑا رہنے کا زمانہ نہیں رہا اور بعض دبی زبان سے محض نفس احکام کا اقرار تو کرتے ہیں مگر جدت فرمائیگی اور جہالت سے آیات و احادیث کے الفاظ میں ایسے طور پر تصرف کرتے ہیں کہ ان سے اپنا مطلب پورا کر لیتے ہیں مگر حق وہی ہے جس کو اہل ایمان و غیرت پیش کرتے ہیں۔

(د) اس میں کچھ شک نہیں کہ مستورات شریف خاندانوں میں بچہ کی تربیت تقریباً دس بارہ برس تک مکمل کر دیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ کی طبیعت میں کسی قسم کے فرومایانہ خیالات جمنے نہیں پاتے۔ وہ اس اثنا میں علم تعلیم کو نہایت ہی آسانی سے قبول کر سکتا ہے اور قریباً آداب گفتگو و نشست و برخاست اور اکل و شرب کے متعلق لوازم سلیقہ شعاری کا پورا پورا عادی ہو جاتا ہے۔ مگر ناظرین یہ یاد رکھیں کہ اس قسم کی تربیت بجز ذی وجاہت خاندانوں کے ممکن نہیں۔ کیونکہ عوام الناس بیچارے چونکہ خود تعلیم و تربیت سے محروم ہوتے ہیں اسلئے ان کی اولادیں امراء کی اولاد کا ہرگز مقابلہ

نہیں کر سکتیں۔ مگر ہمارے ملک میں تو امراء کی اولاد بھی شاذ و نادر ہی تربیت یافتہ ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ والدین کی ابتدائی تربیت بچے کے قویٰ دماغی کی باضابطہ ترقی کی عالیشان عمارت کے لئے بنیادی پتھر ہوتا ہے۔ مگر اس کا التزام بہت کم لوگ کر سکتے ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ مائیں خود تربیت یافتہ نہیں ہوتیں۔ پس معترض کا اعتراض تو بالکل درست اور صحیح ہے مگر اعتراض کا منشا محض غلط۔ کیونکہ معترض کا اعتراض صرف حسن تربیت کی ضرورت پر مبنی ہے جس کو حکم پردہ کی عدم ضرورت سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ یہ مسلم ہے کہ جو مائیں قواعد شریعت کے مطابق خود تربیت یافتہ ہونگی وہ اولاد کی تربیت کا نہایت عمدہ انتظام کر سکینگی اور اولاد ذکور کو عامہ معلومات حاصل کرنے کے لیئے ان کے باپ بھی بہت کچھ اعانت کر سکتے ہیں اور اناث کی تربیت ابتدائی کے لیے صرف مائیں کافی ہیں اور فن تعلیم کے لئے وہی استانیاں جو قدیم زمانہ سے تعلیم دیتی چلی آتی ہیں۔ اگر اس طریق تعلیم و تربیت کو ملحوظ رکھا جائے تو کچھ شک نہیں کہ ہم حکم پردہ کی پابندی کے باوجود حسن تربیت و تعلیم کے نتائج حسنہ سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سید احمد خاں مرحوم جیسے نئی روشنی کے دلدادہ ریفارمر نے بھی اسی رائے کو پسند کیا اور بالآخر یہ کہا کہ اولاد اناث کے لئے اخلاقی۔ مذہبی تعلیم تو ضروری ہے مگر اسی طریق پر جس پر قدیم سے شرفا کاربند ہوتے چلے آتے ہیں۔ ہاں نوعیت تعلیم میں اگر کسی قسم کی ترمیم کر دی جائے تو کچھ حرج نہیں۔ مگر اس طریق کی پابندی جو ذکور کے لئے آجکل مروج ہے ہرگز شایاں نہیں۔ کیونکہ اس میں اگرچہ ایک فوائد ہیں بھی تو اُن کے مقابلہ میں بہت سی دیگر نمایاں خرابیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے بجز ایک ناعاقبت اندیش آدمی کے کوئی سمجھدار آدمی اغماض نہیں کر سکتا۔

حکم پردہ کی مخالفت کرنے والے اصحاب بعض اوقات اہل حق کے اعتراضات کا یوں رد کیا کرتے ہیں کہ پردہ کے اٹھا دینے سے جن بُرے نتائج اخلاقی و تمدنی کے

پیدا ہونے کی توقع کیجاتی ہے وہ آہستہ آہستہ تہذیب و ترقی کی تکمیل پر خود بخود رفع ہو جائینگے ۔ کیونکہ ایسی خرابیوں کا پیدا ہونا تب ہی متصور ہے جبکہ قوم پورے طور پر مہذب نہ ہو مگر مہذب ہونے کے بعد یہ نتائج ہرگز پیدا نہیں ہونگے ۔

ممکن ہے کہ اس خیال کی کچھ وقعت ہو مگر ہم بر ٹے تجربہ و مشاہدہ اس کو ایک آن کے لئے بھی تسلیم نہیں کرسکتے ۔ کیونکہ جس قسم کی تہذیب کے وجود پر ایسا ہونا باور کیا جاتا ہے اس کا منبع آجکل کا مغربی تمدن ہے جس میں اکثر امور اسلامی شریعت کے رو سے ہر ایک قسم کی ناپاکی اور گندگی کا عملی نمونہ سمجھے جاتے ہیں ایسی متمدن اقوام کی مذہبی حالت ناگفتہ بہ ہے ۔ کیونکہ بجز چند پادریوں کے جنہیں مشن بیا تنخواہیں ملتی ہیں کوئی شخص عیسائیت کا پابند نہیں اور اگر کوئی ہے تو محض بطور رفیشن کے ۔ وہ پادری بھی شب و روز شراب خواری اور زناکاری میں مصروف اور ہر ایک قسم کی عیش پرستی اور نا ہنجاری میں مستغرق پائے جاتے ہیں ۔ سائنس اور فلسفہ نے ان اقوام کو خدا کے وجود اور جوابدہی قیامت اور ضرورت نبوت کے بوجھ سے سبکدوش کر دیا ہے ۔ فرانس انگلینڈ اور امریکہ وغیرہ ممالک میں فیصدی پانچ آدمی بھی مذاہب کے معتقد نہیں ملینگے بلکہ سب کے سب ملحد اور بیدین ہو کر جہنم کی بھرتی ہو چکے ہیں ۔ ان کے گرجا ایک قسم کے تھیٹر ہیں ۔ جہاں نوجوان مرد اور عورتیں اپنے اپنے حظوظ نفسانی کی داد دیتے ہیں ۔ ان کی اعلےٰ سے اعلےٰ تہذیب یہ ہے کہ ناچ گھر میں ایک شخص کسی اجنبی عورت سے بلا ممانعت لپٹ جاتا ہے اور شوہر دیوث کو اصلاً غیرت نہیں ۔ ان میں حرامزادہ اولاد کا دستور روز بروز ترقی پر ہے اور قریباً تمام لوگ اولاد الحرام ہوتے ہیں ۔ اگر اس بیان کی تصدیق مطلوب ہو تو ذیل کی عبارات ہیں ملاحظہ کریں :۔

انگلستان کی ایک شریف خاتون اپنے ملک کی عورتوں کے متعلق ایک پرچہ میں لکھتی ہے جس کا ترجمہ مصر کے ایک مشہور رسالہ المنار نے شائع کیا تھا :۔

"انگلستان کی عورتیں اپنی تمام عفت و عصمت کھو چکی ہیں اور ان میں بہت سی کم ایسی ملینگی جنہوں نے اپنے دامن عصمت کو حرامکاری کے دھبہ سے آلودہ نہ کیا ہو ان میں شرم و حیا نام کو بھی نہیں۔ وہ اپنے تمام حالات میں مردوں کے قدم بقدم چلتی ہیں اور ایسی آزادانہ زندگی بسر کرتی ہیں کہ مذہب۔ قانون ملکی۔ رسم و رواج انکی آزادی پر کسی قسم کا اثر نہیں ڈال سکتے۔ اس ناجائز آزادی نے ان کو اس قابل نہیں رہنے دیا کہ انہیں انسانوں کے زمرہ میں شمار کیا جائے۔ ہمیں سرزمین مشرق کی مسلمان خواتین پر رشک آتا ہے جو نہایت دیانت و تقویٰ کے ساتھ اپنے شوہروں کے زیر فرمان رہتی ہیں اور انکی عصمت کا لباس گناہ کے داغ سے ناپاک نہیں ہوتا۔ وہ جس قدر فخر کریں بجا ہے۔ اور اب وہ وقت آرہا ہے کہ اسلامی احکام شریعت کی ترویج سے انگلستانی عورتوں کی عفت کو محفوظ رکھا جائے"

ہندوستان کا ایک ہندو رئیس جس نے حال ہی میں مغربی دُنیا کی سیاحت کر کے اپنے سفرنامہ کے حالات بعض اخبارات میں شائع کئے تھے ملک امریکہ کے متعلق حسب ذیل لکھتا ہے:۔

"غیر ممالک کے ناواقف مسافر کو نہایت احتیاط کرنا چاہیے کہ وہ راستہ میں چلتے وقت کسی عورت سے خواہ وُہ خود استدعا کرتی ہو گفتگو نہ کرے۔ کیونکہ اس ملک میں ایک عام دستور یہ ہے کہ عورتیں نہایت مکلف لباس پہنکر باہر نکلتی ہیں اور کسی شریف اجنبی سے کچھ گفتگو شروع کر دیتی ہیں۔ ناواقف کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایک شریف عورت مجھ سے کچھ دریافت کرنا چاہتی ہے وہ ٹھہر جاتا ہے اتنے میں اس عورت کا خاوند یا کوئی اور شخص جو کسی موقع مناسب پر دیکھ رہا ہوتا ہے جھٹ آموجود ہوتا ہے اور اس مسافر کو قابو کر لیتا ہے کہ تو نے میری عورت سے کیوں گفتگو کی۔ وہ عورت بھی اُس کی ہمزبان ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس شخص نے مجھ سے امر ناجائز

کی انتہا کی تھی۔ بالآخر معاملہ بڑھ جاتا ہے اور بیچارہ مسافر بدوں ایک معقول رقم پیش کرنے کے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

اسی طرح علاقہ دکن کے ایک مشہور رئیس مسلمان نے گذشتہ سالوں میں مغربی ممالک کی سیاحت کے حالات کے متعلق سفرنامہ کی صورت میں کچھ نوٹ شائع کئے تھے۔ انکے ملاحظہ سے مغربی اقوام کی تہذیب کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ جس میں فرانس۔ انگلستان۔ امریکہ کے اپنے چشم دید حالات لکھے ہیں جن سے پورا پورا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ قومیں انسانی وضع سے بالکل منسلخ ہو چکی ہیں اور ایسے شرمناک افعال کی مرتکب ہوتی ہیں جنکو دیکھکر بے حیائی بھی منہ پر پردہ ڈال لیتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جولائی ۱۹۲۸ء میں جب میں ایک موقعہ پر دہلی میں ایک دوست کے مکان پر بیٹھا تھا تو ولایت کا انگریزی اخبار جس کا نام میں بھول چکا ہوں اس دوست کو موصول ہوا۔ اخبار کے مطالعہ پر اس دوست نے مجھے ذیل کا ایک واقعہ پڑھکر سنایا۔ جس کا خلاصہ مجھے اب تک صحیح معنی میں یاد ہے:۔

ایڈیٹر اخبار نے لکھا تھا کہ لنڈن کے ہائڈ پارک میں ایک معزز انگریز جو سر کا خطاب بھی پا چکا تھا ایک مہوش نازنین کو کسی درخت کے سایہ تلے لئے پڑا تہذیب مغربی کی داد دے رہا تھا۔ پولیس نے اس تہذیب کے پتلے کی اس مہذبانہ حرکت کو دیکھکر اسے گرفتار کر لیا اور جب مقدمہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا تو مجسٹریٹ نے جو زمانہ ضرورت عقل کا کامل نمونہ تھا فیصلہ دیا کہ پولیس اس واقعہ میں قانوناً مجرم ہے کیونکہ اس نے ایک مہذب اور شریف آدمی کی جائز آزادی میں بلا وجہ دست اندازی کی ہے۔ چنانچہ پولیس والوں پر جرمانہ کی سزا عائد کی گئی اور سر مذکور کو بری قرار دیا گیا۔ واہ رے تہذیب تیرا کیا کہنا! یہ بعینہٖ وہی فیصلہ ہے جو کسی پرانے زمانہ کے ایک حاکم کے متعلق میں نے کسی تاریخ کی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک درویش مرد اپنی حاملہ بیوی کو گھوڑے پر سوار کرکے سفر کر رہا تھا۔ ایک پل پر سے گذرنے کا اسے اتفاق ہوا

عبور دریا کا محاصل وصول کرنے والوں نے محصول کا مطالبہ کیا۔ مگر درویش کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اُنہوں نے عورت کو زبردستی سے گھوڑے پر سے نیچے گرادیا جس سے اُس کا حمل ساقط ہو گیا۔ درویش مذکور حاکم شہر کے پاس دادرسی کے لئے نالاں ہوا۔ حاکم نے فیصلہ دیا کہ عورت سرکاری ملازموں کے حوالہ کی جائے تاکہ وہ حاملہ کرکے درویش کو واپس کر دیں۔ کیا اس فیصلہ اور مجسٹریٹ مذکور کے فیصلہ میں کچھ فرق ہے۔ ہاں یہ فرق تو ضرور ہے کہ وہ ایک غیر ترقی یافتہ زمانہ کا واقعہ ہے اور یہ ترقی یافتہ زمانہ کا ؎

لیبك علی التھذیب من کان باکیا

یعنی اس تہذیب پر آٹھ آٹھ آنسو رونا چاہئے ۔ پھر کیا وہ لوگ جو حکم پردہ کی مخالفت پر زور دے رہے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ شریف مسلمانوں کی بہو بیٹیاں بھی اسی رنگ میں رنگی جائیں تعجب ہے کہ ان ناعاقبت اندیشوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے محض فرضی منصوبوں کے پودے جو بالکل شیطانی خیالات کی سرزمین میں بوئے جاتے ہیں کبھی بھی نیک پھل نہیں لائینگے یہ لوگ صرف ظاہری آرائش اور زیب و زینت سے آراستہ پیراستہ ہونے کو تہذیب کے نام سے موسوم کر رہے ہیں۔ اور پھر نہایت جہالت سے اس گستاخی کو قومی ترقی کے نام سے نامزد کرتے ہیں گویا ان کے ہاں اسلامی دنیا کی ترقی کا معیار پردہ کے اُٹھا دینے پر موقوف ہے۔ بعض دیگر معتبر اصحاب کی زبانی خاکسار نے سُنا کہ بعض مغربی ممالک میں لب سڑک لوگوں کو زنا کرتے دیکھنا ایک عام نظارہ ہے۔ عورت و مرد بالکل بہائم کی طرح جمع ہو جاتے ہیں اور مطلقاً حجاب نہیں کرتے۔ تعجب ہے کہ اس نئی تہذیب کے دلدادہ اصحاب کیونکر اسلامی شرفاء کی مستورات کو ایسی ناشائستہ حالت میں دیکھنا گوارا کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلام پاک کی بنیاد محض غیرت و حمیت پر مبنی ہے لا ایمان لمن لا غیرۃ لہ ۔

مذکورہ بالا سطور سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مغربی ممالک میں پردہ کی عدم پابندی سے عورتیں بالعموم اپنی عصمت قائم نہیں رکھ سکتیں ۔ اب ہم بڑے دلیل عقلی ضرورت پردہ کا

ہم ذیل میں دکھاتے ہیں کہ حکم پردہ کس قدر خوبیوں کا جامع ہے۔ یہ مسلم ہے کہ انسان میں توالدو تناسل کا خاصہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ چند حیوانی قوائے فطریہ اس امر کے لئے مخصوص ہیں۔ مرد میں بصورت فعل اور عورت میں بصورت انفعال۔ قوائے مذکورہ کو ان کے طبعی میلان سے کوئی طاقت مانع نہیں ہو سکتی اسلئے مرد اور عورت کا بلا حجاب ایک دوسرے سے میل جول کرنا موجب ہے قویٰ مذکورہ بالا کے اظہار عمل کا۔ اور چونکہ نفس ہمیشہ اپنے مرغوبات کا خواہاں رہتا ہے اسلئے نوجوان مرد اور عورتیں جن میں مذکورہ بالا قویٰ کی زبردست عملی طاقت موجود ہوتی ہے جذبات حیوانیہ کے اثر سے لزوماً متاثر ہونگے اور اگر کوئی شخص اس لزوم کا انکار کر دے تو وہ محض ہیکڑی باز آدمی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض لوگ (جو نہایت ہی قلیل ہو سکتے ہیں) مرتکب زنا نہ ہوں۔ مگر کیا مرد و عورت ایکدوسرے کے لوازم حسن و شباب سے بھی متاثر نہ ہونگے؟ یہی وجہ ہے کہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ آنکھیں۔ کان۔ زبان۔ ہاتھ۔ پاؤں سب زنا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اعضاء ارتکاب زنا سے پہلے زنا کے تمام ابتدائی لوازم کو پورا کرتے ہیں۔ اس لئے مرد اور عورت کا ایک دوسرے کو دیکھکر متاثر ہونا ایک ایسا امر ہے جس کا کبھی انکار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یوں سمجھو کہ مذکورہ بالا اعضاء زنا کے تمام مراتب کو بجز آخری مرتبہ کے پورا کر دیتے ہیں۔ کاش! پردہ کے مخالفین مخالفت کرنے سے پہلے کوئی ایسی تدبیر سوچ لیتے جس سے نوجوان مرد اور عورت کے خیالات پر کوئی ناجائز اثر نہ پڑتا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو شریعت پردہ کا حکم نہ سناتی۔ پس پردہ کے اٹھا دینے کی صورت میں کوئی ایسی تجویز ممکن نہیں جس سے مرد اور عورت کے خیالات کو محفوظ رکھا جا سکے۔ خواہ وہ مرد اور عورت اعلےٰ تعلیم یافتہ ہوں یا متوسط یا جاہل۔ مع ہذا جس تعلیم کے بھروسہ پر یہ لوگ بُرے نتائج کا انسداد تصور کرتے ہیں وہ تعلیم سراسر زہر قاتل ہے۔ انگریزی سلسلہ تصنیف میں بالخصوص علم ادب کی کوئی کتاب ایسی نہیں ملیگی جس کے صفحات فحش تصاویر سے آراستہ نہ ہوں۔ علاوہ ازیں

ناولوں کے مضامین غلیظہ سے جو اثر طبائع پر پیدا ہوتا ہے وہ کسی صورت میں بھی زنا سے کم نہیں ہوتا۔ اور آجکل انگریزی اخبارات و رسائل ملک میں زنا کو رواج دینے کا مقبوضہ آلہ ہیں۔ اگرچہ بعض اخبارات و رسائل ملکی اور علمی بھی ہوتے ہیں مگر انہیں صرف چند ہی لوگ دیکھتے ہیں ورنہ عوام الناس کو غزلیات عشقیہ اور فحش تصاویر سے جو دلچسپی ہے وہ کسی علمی یا مذہبی تحریر سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اور یہ خیال کہ عورتوں سے ایسی تحریریں ہمارکھی جائیں نہایت ہی بیوقوفانہ خیال ہے کیونکہ یہ نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ نوجوانوں کے گھروں میں جہاں مرد اور عورت بلا محابا بے پردہ و کنار سے متمتع ہوتے ہیں بعض اس قسم کی فحش تصاویر دیکھی گئی ہیں کہ انہیں اگر ایک نوجوان مرد اور عورت (جب وہ دونوں تنہا ہوں) دیکھ پائیں تو اس کا نتیجہ بجز زنا کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ الغرض پردہ کے اٹھا دینے میں اگر مان بھی لیا جائے کہ ایک ہی قباحت لازم ہے تو بھی کوئی عقلمند آدمی پردہ کی عدم ضرورت کا قائل نہیں ہوگا کیونکہ یہ ایک ہی قباحت تمام دیگر قباحتوں کا مصدر ہے اگر اس میں شریعت کچھ گنجائش دیکھتی تو اس حکم میں کسی قسم کا تشدد نہ برتتی۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ حکم پردہ کی مخالفت کرتے ہیں وہ نہیں درحقیقت مستورات کی صلاح مدنظر نہیں بلکہ وہ اس بہانہ سے نفس پرستی کرنا چاہتے ہیں۔ اور خبیث و مردود اقوام کی نظیر پیش کر کے بھولے بھالے مسلمانوں کو دام تزویر میں پھانسنا چاہتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم رہے کہ مسلمان ہرگز ایسا نہیں کریں گے اور اگر مشتے از خروارے بے غیرت اپنی بہو بیٹیوں کو ایسا بے حیا بنانا مصلحت سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں۔ اہل ایمان کبھی بھی شریعت حقہ کا دامن نہیں چھوڑ سکتے اور اس قسم کی فرمایانہ تہذیب کی بجائے انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کافی ہے :

واضح ہو کہ پردہ کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں مندرجہ ذیل نتائج قبیحہ کا وجود

لہ ان نتائج کے ذیل میں اور بہت سے ضمنی نتائج بھی ہیں جو غور کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں ۱۲ منہ

بالواسطہ یا بلا واسطہ لازم ہے جو اسلامی کلمۂ اتحاد کے سخت منافی ہیں (۱) بے غیرتی و بے حمیتی (۲) زنا جو نتیجہ ہے بے غیرتی کا (۳) اولاد حرام کا پھیلنا جس کا نتیجہ ہے اضاعت نسب (۴) نزاع و خصومت جو فیما بین بدچلن لوگوں کے پیدا ہوتی ہے (۵) گستاخی و شوخیٔ مستورات جس سے وہ اپنے خاوندوں کی اطاعت ضروری بھی بجا نہیں لائینگی (۶) جھوٹ اور فریب کا رواج پذیر ہونا (۷) عیش پرستی کا عادی ہونا جو کسی قوم کی ذلت کا پہلا زینہ ہے (۹) اسراف یعنی غیر ضروری اسباب پر تکلف کا پابند ہونا جو تمدنی اصول کے رو سے موجب نقصان عظیم ہے (۸) قوم میں فحش علم ادب کا رواج پکڑ جانا جس سے ایک منفق مورخ کسی قوم کا تاریک پہلو دکھاتے ہیں بہت کچھ کامیاب ہو سکتا ہے (۱۰) طبائع کا بتدریج قوائے جسمانی اور روحانی میں درجہ انحطاط پر پہنچ جانا جس کا اثر بالعموم چار پشت کے بعد تھوڑا تھوڑا محسوس ہونے لگتا ہے (۱۱) روحانی کمالات کے خیر و برکات کا قوم سے بالکلیت منقطع ہو جانا جس کا نتیجہ بجز غرور و جہالت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ؛

مذکورہ بالا نتائج ایسے بیّن ہیں کہ بجز ایک جاہل متعصب کے کوئی انکا منکر نہیں ہو سکتا - اور اگر کوئی شخص چند ایک جزئی فوائد پر وہ اٹھا دینے میں تجویز کر سکیگا تو وہ اسی قسم کے فوائد ہونگے جو باوجود حرمت خمر کے خمر میں پائے جاتے ہیں اور جنکی طرف قرآن مجید نے مجملاً بالفاظ منافع للناس اشارہ کیا ہے - اور تعجب یہ ہے کہ مخالفین کیونکر اس قدر بیّن نقصانات کے مقابلہ میں چند ایک غیر معتدبہ اور غیر معقول فوائد کو قابل وقعت قرار دیتے ہیں - مگر سچ یہ ہے کہ جب ابلیس لعین کسی گناہ پر آمادہ کرتا ہے تو وہ اس گناہ کو مرتکب کے خیال میں بحکم زَیَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ بہتر سے بہتر صورت میں ظاہر کیا کرتا ہے - بہر حال یہ لوگ قرآن مجید کی وعید يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ

ملہ خدا تعالیٰ آنکھوں کی خیانت اور دلوں کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے ۱۲ منہ

وَمَا تَعْنِي الشُّدُوْدُ - کو عمداً نظر انداز کر کے اپنی خواہشات نفس کی پیروی کر رہے ہیں۔
کیا اس آیت سے اجنبی عورت کی طرف نگاہ کرنے کی حرمت ثابت نہیں ہوتی +

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب تہذیب کا آفتاب اوج کمال پر پہنچ جائیگا تو پردہ کے اُٹھا دینے سے جو قباحتیں سردست محسوس ہو رہی ہیں پیدا نہیں ہونگی چنانچہ اس خیال کی تائید انگلستان کی ایک معزز لیڈی کے الفاظ ذیل سے بھی ہوتی ہے جو اس نے ایک دفعہ انڈین نیشنل ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ عام میں بمقام لندن کہے تھے۔ "میں کسی طرح اس بات کو جائز نہیں سمجھتی کہ پردہ کا موجودہ طریقہ جو ہندوستانی عورتوں میں رائج ہے ترک کر دیا جائے۔ ہندوستان ابھی اس درجہ ترقی و تعلیم پر نہیں پہنچا کہ وہاں یورپ کی لیڈیوں کی طرح عورتوں کو بے پردہ کر دیا جائے بلکہ ابھی یہی مناسب ہے کہ عورتیں قدیم دستور کے مطابق رسم پردہ کی پابند رکھی جائیں +

بظاہر اس عورت کے الفاظ سے پردہ کی ضرورت کا مفہوم مترشح ہوتا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں کیونکہ دراصل یہ بیوقوف عورت اپنی جبلّی کمزوری سے جو فطرتاً عورتوں میں لازم ہے پردہ کی مخالفت کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے الفاظ میں صاف اشارہ موجود ہے کہ پردہ ایک جاہلانہ ضرورتوں کا بقیہ ہے اور جب کوئی قوم اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ تہذیب پر پہنچ جاتی ہے تو اس کو اس رسم کی پابندی ہرگز ضروری نہیں ہوتی۔ مگر ہمیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس غلط خیال کی تائید کونسے دلائل پر کیجاتی ہے کیونکہ عقلاً تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ قوم کے جمیع افراد اس درجہ تہذیب پر پہنچ جائیں کہ اپنے قوائے فطریہ کے عمل سے متاثر نہ ہوں بلکہ جب تک مرد اور عورت کے طبعی جذبات کے متعلقہ قویٰ ان میں موجود ہیں اپنے اپنے مواقع پر اپنا عمل برابر بجا لائینگے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت بھی ان طبعی تاثیرات کی مانع نہیں ہو سکتی۔ علےٰ ہذا القیاس اس خیال کو تجربہ و مشاہدہ کے رُو سے بھی ہم صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو ممالک آج سب سے زیادہ مہذب ملنے

گئے ہیں زنا میں اُنہیں کا نمبر اوّل ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو اُن لوگوں سے پوچھو جو اُن ممالک میں پھر آئے ہیں اور جن میں سے بعض کے حوالہ جات اوپر مذکور ہو چکے ہیں۔ پس ہم مس عورت کے مذکورہ بالا الفاظ کو ہرگز کچھ وقعت نہیں دیسکتے۔ بلکہ اُس کے برعکس ہم اُس کو یہ الزام دیتے ہیں کہ اسلامی حکم پردہ کی پابندی کئے بغیر یورپین عورتیں کبھی بھی اپنی عزت نفسی اور عصمت ذاتی حاصل نہیں کر سکینگی۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ جو مفہوم تہذیب ان لوگوں کے ہاں مسلم ہے وہ ہمارے اِن مذہبی سپاروں کے رُو سے ہرگز درست نہیں اگر ہم ان کے مفہوم تہذیب[۱] کے بالکلیت کاربند ہوں تو ہمیں اپنے احکام شرعیہ سے دست بردار ہونا ضروری ہے مگر ایسا ہونا محال ہے ہم انکے مفہوم تہذیب سے کبھی بھی متفق نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ہمیں ضرورت ہے ۔

مَاوَرَدَ فِی الْقُرْاٰنِ

(۱) قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم ذٰلک ازکیٰ لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون وقل للمؤمنات یغضضن من ابصارھن و یحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن ..... الآیۃ

(ترجمہ) اے پیغمبرؐ! ایماندار مردوں کو حکم دے کہ وہ اپنی نظروں کو کچھ پست رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ امر انہیں زیادہ پاک بنانیوالا ہے۔ بے شک اللہ تعالےٰ ان کی کارروائیوں سے آگاہ ہے اور اے پیغمبرؐ! ایماندار عورتوں کو حکم دے کہ وہ اپنی نگاہوں کو کچھ پست رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کو محفوظ

[۱] عرب جاہلیت میں زنا کے مختلف دستور تھے جنکا اس زمانہ میں پورا پورا رواج تھا۔ قریباً وہی صورتیں تمام مغربی ممالک میں مروج ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ عموماً جاہل زانی تھے جنکی معاشرت بڑی اعلےٰ نہ تھی اور یہ مہذب زانی ہیں مثلاً انہیں کوئی ایک شخص بلا اطلاع کسی اجنبی عورت کے پاس چلا جاتا اور اب یہ لوگ پہلے مکرر مری کمپنی زنا سے سرشتہ بانگٹ حاصل کرتے ہیں۔ یہی تہذیب ہے جسپر بار بار زور دیا جاتا ہے ۱۲ منہ

رکھیں۔ اور اپنی زینت کو بجز اس حصہ کے جو ضرورتاً برہنہ رہتا ہے۔ ظاہر نہ کیا کریں اور اپنی اوڑھنیوں کو اس طرح اوڑھیں کہ سر اور سینہ ڈھپ جائیں۔

(۱) اس آیت میں غض ابصار (نگاہوں کے پست کر لینے) سے مراد یہ ہے کہ کوئی مرد اجنبی عورت کو اور کوئی عورت اجنبی مرد کو نہ دیکھے۔ یہ ایک عام حکم ہے بلا تفریق تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کو شامل ہے۔ صرف اُن بوڑھی عورتوں کو پردہ نہ کرنیکا اختیار ہے[1] جو جننے سے رہ چکی ہوں۔ مگر اُن کے لئے بھی جب ہی اختیار ہے کہ زیور یا بناؤ سنگار سے خالی ہوں۔ البتہ چند صورتیں مستثنیٰ ہیں جو ضرورتاً بحکم شریعت مستثنیٰ قرار دیگئی ہیں مثلاً (۱) طبیب کا بغرض معالجہ نظر کرنا (۲) کسی زانی کی شہادت زنا کے لئے مرد ہو یا عورت کی شرمگاہ کو دیکھنا (۳) ڈوبتے وقت بغرض بچا لینے کے کسی عورت کے بدن کا دیکھنا یا چھونا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

(۲) لفظ زینت کے مفہوم میں اعضاء کی فطری زینت اور نیز مصنوعی مثلاً کحل خضاب زیور وغیرہ شامل ہیں۔ بعض نے لباس کو بھی شامل زینت قرار دیا ہے۔ کیونکہ آیہ خذوا زینتکم عند کل مسجد میں زینت بمعنی لباس مستعمل ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے زینت کی تقسیم ظاہری اور باطنی پر کی ہے سو زینت ظاہری سے مراد لباس وغیرہ ہے اور زینت باطنی سے زیور اور دیگر آرائشات۔ اور یہی قول ہے حضرت ابن مسعود رضہ کا (تفسیر در منثور)۔

(۳) اس آیت میں الفاظ الا ما ظھر منھا قابل غور ہیں۔ حضرت ابن عباس رضہ سے ایک روایت میں اس سے مراد خضاب و خاتم ہے۔ اور ایک دوسری روایت میں چہرہ اور ہاتھ اور خاتم مراد ہے (در منثور) چونکہ لفظ زینت بعض مفسرین نے

---

[1] والقواعد من النساء التی لا یرجون نکاحا فلیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن غیر متبرجات بزینۃ ۱۲ منہ [2] اگر بلا قصد و ارادہ ناگہاں کسی اجنبی عورت کے چہرہ پر نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے فی الفور نظر ہٹالے اگر دوبارہ نظر کرے تو گنہگار ہے ۱۲ منہ

نزدیک فطری اور مصنوعی زینت پر مشتمل ہے - اسلئے ما ظہر منہا سے وہی حصہ بدن اور آرائش کا مراد ہو سکتا ہے جو ضرورتاً برہنہ رہ سکتا ہے - سو وہ چہرہ اور ہاتھ ہیں اور ان کے ساتھ ان کی مصنوعی زینت بناؤ سنگار بھی داخل ہے (تفسیر کبیر)۔

(۲) ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن . . . . . زمانہ جاہلیت کی عورتیں پردہ نہیں کیا کرتی تھیں بلکہ سر اور سینہ ننگا چھوڑ کر باہر آیا جایا کرتی تھیں اور ان کے گریبان وسیع ہوتے تھے جن سے اندرونی حصہ برابر دیکھا جاتا تھا - اس پر شریعت اسلامی نے انہیں خمار اوڑھنے کا حکم دیا (جو روا یعنی چادر سے کم ہوتی ہے) چنانچہ حضرت ام المومنین عائشہ رض فرماتی ہیں کہ اس آیت کے نازل ہوتے ہی انصار مدینہ کی تمام عورتیں نماز کے لئے صبح ہی میں خمار اوڑھ کر حاضر ہوئیں (تفسیر کشاف و در منثور)۔

(ب) یا ایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذلک ادنی ان یعرفن فلا یؤذین وکان اللہ غفورا رحیما

(ترجمہ) اے پیغمبر! اپنی ازواج مطہرات اور اپنی بیٹیوں اور مومنین کی مستورات کو یہ حکم سنا دو کہ وہ تمام بدن کو ڈھانپ لیا کریں - اس طریق سے انکی شناخت ہو سکیگی - جس سے وہ ایذا نہ دی جایا کرینگی اور اللہ تعالٰے بڑا بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ مہاجرین و انصار کی عورتیں جب رات کے وقت قضائے حاجت کے واسطے باہر نکلا کرتی تھیں[1] تو شہر کے بعض بدمعاش ادھر ادھر نخلستانوں میں جا چھپتے اور جہاں کسی عورت کو دیکھتے اُس سے چھیڑ چھاڑ کرتے رجب ان بدمعاشوں کو روکا جاتا تو وہ اس عذر پر کہ وہ کسی عورت کو لونڈی سمجھ کر ایسا کرتے تھے وہ (آزاد و شریف) سے انہیں کچھ سروکار نہیں چھوٹ جاتے - خداوند کریم نے آیت مسطورہ بالا

[1] شروع اسلام میں کچھ مدت تک عورتیں بالکل زمانہ جاہلیت کی وضع کی پابند تھیں اور نیز ابھی مسلمانوں کی تمدنی حالت پورے کمال تک نہیں پہنچی تھی اور پاخانے گھروں میں تجویز نہیں کئے گئے تھے اسلئے عورتیں خواہ وہ حرہ (آزاد و شریف) ہوتیں یا لونڈیاں ایک ہی وضع میں نکلا کرتی تھیں ۱۲ منہ

نازل کی جس میں عورتوں کو حکم ہوا کہ وہ اس طرح بدن پر چادر لپیٹ لیا کریں کہ کوئی حصہ بدن کا فارغ نہ رہے۔ گویا اس طرح چادر میں لپٹ کر نکلنا حرہ عورتوں کو لونڈیوں سے تمیز کرنے کا ذریعہ سمجھا گیا۔ تاکہ شہر کے بدمعاش اس وضع کو دیکھکر سمجھ لیں کہ یہ عورت لونڈی نہیں بلکہ حرہ ہے اور ان سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کیا کریں۔ یہ آیت بھی افادۂ حکم میں عام ہے کیونکہ خاندان نبوت کی مستورات اور عامۃ اہل ایمان کی مستورات بلا امتیاز اس حکم کے مفہوم میں داخل ہیں۔ البتہ الفاظ یدنین علیہن[له] من جلابیبھن قابل غور ہیں:

امام جعفر محمد بن جریر الطبری اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اختلف اھل التاویل فی صفۃ الادناء الذی امرھن اللہ بہ فقال بعضھم ھوان یغطین وجوھھن ورؤسھن فلا یبدین منھن الا عیناً واحدۃً یعنی اہل تفسیر نے کیفیت ادناء میں جس کا خداوند تعالٰے نے حکم دیا ہے اختلاف کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ عورتیں اپنے چہرہ اور سر کو ڈھانپ لیا کریں اور صرف ایک آنکھ فارغ چھوڑ دیں۔ یہ معنی ابن عباس کی طرف منسوب ہیں:

پھر بروایت ہشام عن ابن سیرین عن عبیدہ لکھتے ہیں کہ عبیدہ نے اپنی چادر سے اپنا سر اور منہ ڈھانپ کر ایک آنکھ فارغ رکھی اور کہا یہ مطلب ہے الفاظ یدنین علیہن .... الخ کا:

پھر لکھتے ہیں کہ بعض دیگر مفسرین نے اس سے پیشانی پر چادر کے پلّہ کو کس لینا مراد لیا ہے۔ علامہ جار اللہ زمخشری جو علم ادب عربی کے ماہر استاد ہیں کسائی امام النحو کا یہ قول نقل کرتے ہیں وعن الکسائی یتقنعن بملاحفھن منضمۃ علیھن ارادبا لانضمام معنی الادناء (ترجمہ) کسائی کہتے ہیں کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں

له یدنین مصدر ادناء سے مشتق ہے جسکے معنی قریب کرنے کے ہیں اور جلابیب جمع ہے جلباب کی یعنی چادر پس لفظی ترجمہ ہوا کہ قریب کر لیا کریں اپنے اوپر اپنی چادریں۔ ۱۲ منہ

اپنے تمام بدن کو چادر میں ڈھانپ لیا کریں یعنی ادنار کے معنی اُنہوں نے چادر میں لپٹ جانے کے لئے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ معنی زیادہ قرین قیاس ہیں کیونکہ علیہن کے مفہوم میں عورت کا سارا بدن داخل ہے نہ صرف پیشانی یا چہرہ یا چہرہ اور سینہ وغیرہ۔ اگر ایسا ہوتا تو علیٰ وجوھھن یا علیٰ صدورھن او نحورھن یا کوئی اور الفاظ ہوتے اور خود علامہ زمخشری آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں یُرخینھا علیھن ویغطین بہا وجوھھن واعطافھن یعنی اپنے جسم پر چادر کو ڈھیلا کرکے اوڑھ لیا کریں اور اس سے اپنے چہروں اور پہلوؤں کو ڈھانپ لیا کریں اور لفظ جلباب کی حقیقت پر غور کرنے سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کیونکہ علامہ موصوف نے اس کی تشریح یوں کی ہے، الجلباب ثوب واسع اوسع من الخمار دون الرداء تلویہ المرأۃ علےٰ رأسہا وتبقی منہ ماترسلہ علےٰ صدرھا وعن ابن عباسؓ الرداء الذی یستر من فوق الیٰ سفل۔ یعنی جلباب ایک فراخ کپڑا ہے جو اوڑھنی سے بڑا اور چادر سے چھوٹا ہوتا ہے جس کو عورت اپنے سر پر لپیٹ لیتی ہے اور باقی حصہ سینہ پر کھلا چھوڑتی ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جلباب وہ چادر ہے جو سر سے پاؤں تک تمام بدن کو ڈھانپ لے ؁

اور حافظ جلال الدین سیوطی تفسیر درمنثور میں بروایت ابن منذر و ابن ابی حاتم عن محمد بن سیرین لکھتے ہیں کہ ابن سیرین کہتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سلمانی رضؓ سے آیت مذکورہ بالا کے معنی دریافت کئے تو اُنہوں نے عملی طور پر مجھے جواب دیا یعنی چادر کو اوڑھ کر اپنا سر اور چہرہ ڈھانپ لیا اور ایک آنکھ ننگی چھوڑ دی ؁

قاضی بیضاوی نے نہایت وضاحت کے ساتھ ان الفاظ کے مفہوم کو قلمبند کیا ہے چنانچہ وہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں یغطین وجوھھن وابدانھن علیٰ بدنھن اذا برزن لحاجۃ ومن للتبعیض فان المرأۃ ترخی بعض جلبابہا وتتلفع ببعض

(ترجمہ) یعنی عورتیں اپنے چہروں اور بدنوں کو فراخ چادروں میں کسی کام کے لئے باہر جاتے وقت لپیٹ لیا کریں اور لفظ من جو من جلابیبھن میں واقع ہوا ہے وہ تبعضیت کا مفہوم پیدا کرتا ہے کیونکہ کچھ حصہ سے عورت اپنے چہرہ کو ڈھانپ لیتی ہے اور باقی سے باقی حصہ بدن کو۔

الغرض جمہور مفسرین نے ان الفاظ کا مفہوم قریبًا قریبًا ایک ہی لکھا ہے یعنی کہ پردہ شرعی وہی ہے جو آجتک مروج ہے صرف کم و بیش طرز بیان میں اختلاف ہے۔ ان مختلف حوالجات سے مجھے یہ مدنظر ہے کہ آیت مذکورہ بالا کو چونکہ اکثر نیچری توڑ مروڑ کر اپنے دعوے کے مطابق کر لیا کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ مسلمان عورتوں کو صرف اسیقدر پردہ کا حکم دیا گیا ہے کہ ذرا چادر کو نیچے لٹکا لیا کریں اور بالکل مکشوف الوجہ ہو کر عام طور پر مردوں کی طرح بلا تکلف بازاروں میں آیا جایا کریں۔ یہ بالکل دھوکا ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ عمدۃ القاری شرح بخاری میں صاف لکھا ہے اشار البخاری فی ھذا الباب الی ان تبرز النساء الی البراز کان اولا لعدم الکنیف فی البیوت وکان رخصۃ لھن ثم لما اتخذت الکنف فی البیوت منعن عن الخروج منہا الا لضرورۃ ولن یخرجن باللیل دون النھار واذا تبرزن الی المناصع فلن یخرجن الی المساجد باللیل والغلس (ترجمہ) بخاری نے اس باب میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شروع اسلام میں بوجہ پاخانوں کے گھروں میں نہ ہونے کے عورتیں باہر جایا کرتی تھیں۔ اور انہیں اجازت تھی پھر جب پاخانے گھروں میں تجویز کئے گئے تو بلا ضرورت باہر جانے سے روک دی گئیں اور پہلے بھی قضائے حاجت کے لئے رات کو نکلا کرتی تھیں نہ دن کو۔ اور مسجدوں کی طرف بھی رات کو یا صبح سویرے جبکہ کچھ تاریکی باقی ہوتی تھی جایا کرتی تھیں۔ چونکہ نیچریہ کو خوب معلوم ہے کہ الفاظ قرآن مجید سے انکی کسی طرح بھی تائید نہیں ہوتی اسلئے

وہ پردہ کی مخالفت میں انواع واقسام کی حیلہ بازیوں سے کام لیا کرتے ہیں مثلاً کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ پردہ صرف ایسی تمدنی ضرورت کا بقیہ ہے جس کا زمانہ بدل گیا کوئی شرعی حکم نہیں۔ کبھی الفاظ الا ما ظہر منہا سے استدلال کرکے یوں کہا کرتے ہیں کہ منہ اور ہاتھ کے پردہ کا حکم نہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ زمانہ خلافت عباسیہ میں جب اہل عجم کے اصول تمدن کا رواج ہوا تو محض شرفاء کی تقلید میں اس پر زور دیا گیا۔ کبھی یوں کہتے ہیں کہ عورتیں زمانہ نبوت میں میدان جنگ میں ہوا کرتی تھیں اور بلا حجاب مردوں میں آمدورفت کیا کرتیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ سب دھوکا ہے۔ ان بیچاروں کو تاریخ اسلامی کی صرف اسیقدر خبر ہے جس قدر یورپین مؤرخین نے انہیں غلط سلط بتلایا ہے یہ انہیں خیالات کے معیار پر احکام قرآنیہ کا موازنہ کرنے پر بیٹھ جاتے ہیں اور علمائے سلف وخلف کو عرضۂ طعن بناکر اپنے تئیں مدعیان اصلاح کے زمرہ میں داخل کرنا چاہتے ہیں ؛

ان توہمات باطلہ کا مجمل جواب تو یہ ہے کہ شریعت اسلامی کے تمام احکام حکم ومصالح پر مشتمل ہیں اور ان میں سے ہر ایک حکم اپنی ابتدائی نوعیت کے لحاظ سے نہایت ہی خفیف طور پر پیش کیا گیا تھا۔ جوں جوں طبائع پابندئ شریعت کی عادی ہوتی چلی گئیں احکام میں بھی کسی قدر ساتھ ساتھ سختی بڑھتی چلی گئی۔ اور یہ طریق تبلیغ عین فطرت انسانی کے مطابق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بتدریج نجماً نجماً نازل ہوا۔ اگر تمام احکام شرعیہ زمانہ بعثت نبویؐ کے آغاز میں ایک دفعہ ہی پیش کردیتے جاتے تو لوگ انہیں تکلیف مالایطاق سمجھ کر کبھی بجا نہ لاتے۔ دیکھو کہ نماز پنجگانہ اور روزۂ رمضان اور فریضۂ زکوٰۃ وغیرہ اور دیگر اوامر ابتدا میں بلاتعیین وقت ومقدار ادا کئے جاتے تھے مگر وہ اپنے مواقع پر آہستہ آہستہ فرض مؤبد قرار پائے اسی طرح نواہی کو دیکھو تو مثلاً شراب نوشی کو حرام قرار دینا شریعت اسلامی

کا فوری حکم نہ تھا بلکہ ایک خاص مدت میں چار دفعہ احکام نازل ہوئے جن میں سے آخری اور قطعی حکم انما الخمر والمیسر ...... الخ کا تھا۔ ٹھیک یہی حالت حکم پردہ کی ہے کہ سب سے پہلے آیت قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ..... الخ نازل ہوئی اور اس سے الفاظ الا ما ظھر منہا میں اسقدر گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ عورتیں ہاتھ اور چہرہ کو برہنہ رکھا کریں کیونکہ یہ پہلا مرحلہ تھا اور زمانۂ جاہلیت کی لغو آزادی کو دور کرنا مقصود تھا۔ اس لئے بمقتضائے مصلحت یہی کافی سمجھا گیا۔ مگر ایک زمانہ گذرنے پر آیت یدنین علیھن من جلابیبھن نازل ہوئی۔ جس نے پردہ کی شرعی صورت قائم کردی جو اب تک اُن مسلمانوں میں جن کے دلوں میں شریعت الٰہی کی عظمت ہے بدستور زمانۂ نبوت سے قابل عملدرآمد سمجھی گئی ہے۔ اسکے بعد جب آیہ والقواعد من النساء ...... الخ نازل ہوئی تو بوڑھی عورتوں کو جو جننے سے رہ چکی ہوں کسی قدر تخفیف پردہ کی اجازت دیدی گئی مگر دوسری عورتوں کے لئے جو محل فتنہ ہوسکتی ہیں کوئی کسی قسم کی استثنائی صورت بجز ان صورتوں کے جو شرعی ضرورتوں پر مبنی ہیں قائم نہیں کیگئی۔ چنانچہ تفسیر درمنثور جلد خامس میں امام سیوطی لکھتے ہیں واخرج ابوداؤد فی الناسخ عن ابن عباس قال فی سورۃ النور ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن وقال یدنین علیھن من جلابیبھن ثم استثنی فقال والقواعد من النساء التی لا یرجون نکاحا فلیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن الآیۃ یعنی سورۂ نور میں آیہ لا یبدین زینتھن نازل ہوئی اور سورہ احزاب میں یدنین علیھن اور پھر سن رسیدہ عورتوں کے لئے آیہ والقواعد من النساء نازل ہوئی جنکی تشریح اوپر گذر چکی ہے۔

پردۂ شرعی کی حد

غالباً یہ امر ناظرین پر واضح ہو چکا ہوگا کہ شریعت نے پردہ کا حکم صرف انسداد فتنہ کی بنا پر عائد کیا ہے۔

ورنہ شریعت کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ مستورات کو اجنبی لوگوں کی نظروں سے در پردہ رہنے کا حکم دیتی - مغربی تمدن کے دلدادہ حضرات نہ تو کھلے الفاظ میں آیات قرآنیہ کے انکار کی جرأت رکھتے ہیں - اور نہ ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق - الغرض اِدھر کنواں اُدھر کھائی - دل میں پیچ و تاب تو بہت کھاتے ہیں مگر شریعت کے سامنے کوئی تدبیر کارگر نظر نہیں آتی اسلئے بعض تو نہایت بے باکی سے شرعی احکام کو بالائے طاق رکھکر عورتوں کو بے پردگی پر مجبور کرتے ہیں اور بعض خاندانی عزت و ناموس اور ابنائے جنس کی طعن و تشنیع کو مدِ نظر رکھ کر ایسی جرأت سے تو کام نہیں لیتے مگر دل سے متمنی ہوتے ہیں کہ کسی طرح پردہ کی مشکلات سے نجات مل جائے - یہ لوگ آیات قرآنیہ میں طرح طرح کی تاویلیں کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور چونکہ اصول تفسیر سے بے خبر ہوتے ہیں اس لئے جو کچھ چاہتے ہیں مُنہ سے نکال پھینکتے ہیں - آیہ قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ...... الخ اور آیۂ قل للمؤمنات یغضضن من ابصارھن ...... الخ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کسی اجنبی مرد اور اجنبی عورت کو حکم نہیں کہ کوئی ایک دوسرے کا چہرہ دیکھے - کیونکہ یہ امر باطن کو پاک رکھنے کے لئے زیادہ قرین مصلحت ہے - وجہ اس کی یہ ہے کہ صرف چہرہ ہی ایک ایسا محل فتنہ ہے جس پر بمجرد دیکھنے کے دل میں شیطانی وساوس پیدا ہونے لگجاتے ہیں جن سے مرد اور عورت ہر دو کی نسبت عصمت و عفت کے زائل ہونیکا قوی احتمال ہے اور یہ جو تفاسیر میں آیہ ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا کے ذیل میں لکھا ہے کہ چہرہ اور دونوں ہاتھ مستثنیٰ ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ عام حالات میں عورت جہاں جس وقت چاہے چہرہ اور ہاتھ کو برہنہ کئے پھرا کرے بلکہ یہ استثناء رفع حرج پر مبنی ہے کیونکہ عورت کی تمدنی زندگی میں ایسی صورتوں کے پیش آنے کا بھی امکان ہے - جن میں چہرہ اور ہاتھ کو برہنہ رکھنا پڑتا ہے سو یہ استثنا رداعیہ ضرورت

پر مبنی ہے نہ عام حالات ہیں۔ جہاں جو نظارۂ حسن کے دلدادہ ہیں اور جو تہذیب اور آزادی کی آڑ میں حظ نفس کو پورا کرنا چاہتے ہیں الا ما ظہر منہا کو پڑھکر سنبھالے نہیں سنبھلتے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر یوں تقریریں کرتے ہیں کہ علما رخواہ مخواہ تنگ خیالی سے کام لیتے ہیں۔ اور عورتوں کو اندر باہر آنے جانے سے روکتے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال بعینہٖ ان سُود خواروں کی سی ہے جو یہ کہا کرتے ہیں کہ سُود در سُود جو ایک گونہ ظلم ہے شرعاً منع ہے مگر معمولی سُود جیسا کہ زمیندارہ بینکوں میں یا سیونگ بینکوں میں مروّج ہے ممنوع نہیں کیونکہ یہ ایک قسم کا منافع ہے۔ مگر اُصول فقیہہ کا ماہر بخوبی جانتا ہے کہ یہ خالص سُود ہے۔ یہی حال بیمۂ زندگی کے مجوزین کا ہے جو اپنے وارثوں کے لئے حرام کا مال ترکہ میں چھوڑ مرتے ہیں اور وہ اس اُصول سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں کہ جس معاملہ میں احد المتعاقدین کو غرر (دھوکا) ہونے کا احتمال ہو وہ شریعت اسلام میں قطعاً ناجائز ہے وہ بمقابلہ شریعت یوروپین تمدنی زندگی کو اپنے لئے زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں ؎

الا ما ظہر منہا کی مذکورہ بالا توجیہ ترکیب الفاظ سے صاف طور پر عیاں ہے۔ کیونکہ ما اسم موصول ہے جس کے مفہوم میں عموم کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور اسم موصول کے لئے جملہ صلہ کا ہونا ضروری ہے اور وہ ظہر منہا ہے۔ ظہر کا ضمیر اسم موصول کی طرف راجع ہے اور ظہر فعل لازم ہے نہ متعدی۔ مطلب یہ ہوا کہ عورتیں اپنی زینت یا مواضع زینت کو غیروں پر ظاہر نہ کریں مگر وہی زینت یا مواضع زینت جو خود بخود مجبورانہ حالت میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ فعل یبدین متعدی ہے اور ظہر لازم۔ اور متعدی اور لازم کا تقابل خود اس امر پر دال ہے کہ ابدأ (یبدین کا مصدر) عورتوں کا فعل ہے اور ظہور (ظہر کا مصدر) ما اسم موصول کا جو عام ہے یعنی جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ما سے کیا مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے ما ظہر منہا کی تفسیر میں اختلاف کیا

ہے کسی نے لکھا ہے کہ وجہ اور کف مراد ہیں اور کسی نے لباس اور زیور مراد لئے ہیں۔ کسی نے لکھا ہے کہ کحل وخضاب و خاتم وغیرہ لیکن اقرب الی الصواب یہی ہے کہ وجہ اور کف ہی مراد ہیں کیونکہ لباس اور زیور۔ تا اینکہ وغیرہ ایسے امور نہیں ہیں جنکا ظہور تمدنی زندگی میں کسی خاص ضرورت پر مبنی ہو۔ برخلاف ظہور وجہ و کف کے جو تمدنی زندگی میں بعض اوقات ضروری سمجھا جاتا ہے اور ایسی حالت کو شریعت نے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ مگر کس قدر تعجب ہے کہ مخالفین حکم پردہ اسکو عام طور پر مستورات کے لئے ہر ایک حالت میں جائز سمجھتے ہیں اور اس سے پردہ اُٹھا دینے کا حکم مستنبط کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو یہ سمجھ بھی نہیں کہ اگر ایسی ہی عمومیت شریعت کو مدنظر ہوتی تو اسکو استثنار کی صورت میں پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ استثنار خود ہی دلالت کر رہا ہے کہ حکم استثنائی خاص خاص حالات میں قابل عمل ہے نہ ہر ایک حالت میں۔ جس سے یہ تہذیب کے پتلے اپنی نفسانی خواہشات کی کھلے بندوں داد دے سکیں۔

اب اسی حکم کی تائید میں سورہ احزاب کی دوسری آیت لو یاایہا النبیّ قل لازواجک وبناتک ونساء المؤمنین یدنین علیہن من جلابیبہن ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا یؤذین۔ اس آیۂ شریفہ میں چند امور قابل غور ہیں اول یہ کہ حکم اہلبیت نبویؐ اور دیگر مومنین کی مستورات کے لئے یکساں طور پر عائد کیا گیا ہے جس سے بعض نئے مجتہدین کا یہ خیال بھی باطل ہوگیا کہ آیۂ یانساء النبیّ لستن کاحد من النساء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا پردہ صرف حرم نبویؐ کے لئے مخصوص تھا۔ عام مستورات اس حکم کے ذیل میں نہیں آتیں۔ بھلا ان جہّال مجتہدین کو اس بات کے سمجھنے کی قابلیت کہاں کہ یہ آیت احتجاب کی علت نہیں بلکہ حرم نبویؐ رض کی فضیلت کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ جس سے ان کا دیگر مستورات کی نسبت باعصمت وعفت رہنا بدرجہ اولیٰ اہم ثابت ہوتا ہے اور اس سے آگے

الفاظ اذیٰ تفسیر الہ دیہ عاقدون من وراء حجاب اگرچہ حرم نبویؐ کے متعلق ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیگر مستورات اس حکم میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ جو علت اس حکم کے عائد کرنے میں حرم نبویؐ کے لئے ملحوظ ہے وہی دیگر مستورات کے۔ ٭ دوم یدنین
کا مفہوم یہ ہے کہ مستورات اپنا جمیع جسم مستور رکھا کریں کیونکہ اگر ذ علیہن کا مفہوم
یہی ہے۔ اگر جمیع جسم مقصود نہ ہوتا تو بجائے علیہن کے کوئی دوسرا استعلاء علی وجوھھن
راپنے چہروں پر) یا علی صدورھن راپنے سینوں پر) یا کچھ اور لفظ ہوتا۔ اگرچہ بعض
مفسرین نے اس لفظ کی تفسیر میں چہرہ کا مفہوم اخذ کیا ہے مگر اصول تفسیر ہماری مذکورہ
بالا تفسیر کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ حقیقت کو ترک کر کے مجاز کی طرف رجوع کرنا صرف اس
صورت میں ہی جائز ہے جبکہ حقیقت کسی محال عقلی کی مستلزم ہو ٭

اگر کوئی صاحب یہاں تقریر کرنے لگے کہ من جلابیبھن میں لفظ من تبعیضیہ ہے جس کے معنی یہ ہونگے کہ اپنی چادروں کا کچھ حصہ نیچے لٹکا لیا کریں اور چادر کے کچھ حصہ سے سارا جسم مستور نہیں ہوتا بلکہ چہرہ تک ہی محدود رہتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک یہ توجیہ غلط نہیں بلکہ یہ توجیہ تو ہمارے ہی مقصد کی موید ہے کیونکہ صرف چہرہ ہی محل فتنہ ہے۔ سو جب چہرہ مستور رہا تو حکم پردہ پر عمل پورا ہو گیا کیونکہ یہ کبھی نہیں ہوا اور نہ ہونا چاہئے کہ صرف چہرہ کو مستورات پردہ میں رکھیں اور باقی حصہ جسم کو برہنہ چھوڑ دیں۔ مطلب یہ ہے کہ جسم تو پہلے ہی مستور ہوتا ہے اور چہرہ کو بالخصوص پردہ میں رکھا کریں بعض اردو مترجمین نے یدنین علیہن سے گھونگھٹ کا مفہوم اخذ کیا ہے۔ سو اس سے ہمارے مقصد میں کوئی فرق نہیں آتا ٭

آیت کا بقیہ حصہ علت حکم پر مشتمل ہے اور اس میں فلا یؤذین کا لفظ بالخصوص قابل غور ہے کیونکہ اس میں حرف فا اشارہ کرتا ہے کہ مابعد اپنے ماقبل کا نتیجہ ہے اور لفظ ایذا میں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ پردہ نہ کرنے کی صورت میں مستورات

کی عصمت و عفت قائم نہیں رہ سکتی ۔ اگرچہ اس آیت کا مورد خاص ہے مگر حکم عام ہے اور یہ اصل عموماً ہر ایک حکم قرآنی میں مسلم ہے :

مذکورہ بالا آیات سے پردۂ شرعی کی حد واضح طور پر معلوم ہوگئی یعنی عورت کو جائز نہیں کہ وہ اپنا بدن یا چہرہ کسی اجنبی کے سامنے برہنہ کرے ۔ ہاں چہرہ کو کسی اضطراری حالت میں برہنہ کر سکتی ہے مگر وہ بھی صرف انہیں رشتہ داروں کے لئے جن کا ذکر قرآن مجید میں واضح طور پر بیان ہو چکا ہے ۔ چنانچہ اسی آیت مذکورہ بالا کے اگلے حصہ کو پڑھو جہاں فرمایا ہے ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن اوآبائھن اوآباء بعولتھن اوابنائھن اوابناء بعولتھن اواخوانھن وبنی اخوانھن اونسائھن اوماملکت ایمانھن اوالتابعین غیراولی الاربۃ من الرجال اوالطفل الذین لم یظھروا علیٰ عورات النساء الآیۃ جس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ما ظھر منہا سے خواہ کچھ ہی مراد لی جائے صرف انہیں رشتہ داروں کے لئے استثنا کا حکم عائد ہوگا جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ما ظھر منہا کو مستور رکھنا صرف انہیں رشتہ داروں تک محدود ہے نہ کہ ان کے علاوہ عام اجنبی مردوں کے لئے بھی ۔ اسلئے پوری آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ عورتوں کو بجز ما ظھر منہا کے تمام لوگوں سے (خواہ وہ عام اجنبی ہوں اور خواہ وہ اُن رشتہ داروں سے ہوں) تمام بدن کو مستور رکھنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ ہاں بصورت ضرورت مذکورہ بالا رشتہ داروں کے سامنے ما ظھر منہا کو مستور نہ رکھیں ۔ کیونکہ ان رشتہ داروں کے لئے وہ محل فتنہ نہیں ہیں ۔ اس کو مثال میں ہم یوں ظاہر کر سکتے ہیں کہ جس طرح کہا جائے کہ فلاں مکان کے اندر کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا بجز فلاں مخصوص حصہ کے ۔ مگر اس مخصوص حصہ میں بھی صرف زید ۔ عمرو ۔ بکر ۔ خالد داخل ہو سکتے ہیں ۔ ان کے سوا کسی کو اجازت نہیں ۔ اس سے ہر ایک شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ

فلاں مکان کے ایک مخصوص حصہ میں صرف - زید - عمرو - بکر - خالد کو داخل ہونے کی اجازت ہے نہ یہ کہ مخصوص حصہ میں جو چاہے داخل ہو سکے - آیت کے پہلے حصہ میں زینت مخصوصہ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں ان رشتہ داروں کو جو اس زینت کو دیکھ سکتے ہیں اور محل خطر نہیں - عوام الناس صرف ما ظہر منہا کو لے لیتے ہیں مگر الا لبعولتھن ۔ ۔ ۔ الخ کو نظر انداز کر جاتے ہیں - اس آیت کے ہر دو حصہ کو ملا کر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ما ظہر منہا بھی صرف مذکورہ بالا رشتہ داروں کے لئے ہے جن سے گھروں میں مستورات حسب ضرورت پردہ نہیں کر سکتیں اور ما ظہر منہا کے علاوہ باقی حصہ جسم کو نہ یہ رشتہ دار دیکھ سکتے ہیں نہ کوئی عام اجنبی مرد - پس ثابت ہوا کہ عام اجنبی مرد کسی حصہ کو بھی نہیں دیکھ سکتے اور مذکورہ بالا رشتہ دار صرف ما ظہر منہا کو ہی دیکھ سکتے ہیں اور بس ؛ اور عورت کو شریعت نے ضرورت کے وقت باہر آنے جانے سے منع نہیں کیا مگر پردہ میں - نہ کہ کھلے منہ بن ٹھن کر بلا حجاب جہاں چاہے چلی جائے جیسا کہ مغربی عورتوں میں مروج ہے - ہم نے سنا کہ ایک مسلمان معزز خاتون نے ایک موقعہ پر یہ کہا تھا کہ کیوں عورتوں کو بلا روک و ٹوک باہر آمد و رفت کرنے کی اجازت نہ دی جائے اگر مرد بلا روک و ٹوک اپنی عصمت و عفت قائم رکھ سکتے ہیں تو کیا عورتیں ایسا نہیں کر سکتیں ؟ ذرا غور کرو کہ اس مغربی تہذیب کی دلدادہ خاتون کا یہ استدلال کس درجہ مضحکہ خیز ہے اور اس کی اسی دلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت قوت استدلال میں مرد کی نسبت سخت ضعیف الفطرۃ واقع ہوئی ہے - غالباً اس خدا کی بندی نے کسی پارک یا کسی لکچر ہال تک ہی اپنی نظر کو محدود رکھا ہے اور اس کو یہ معلوم نہیں کہ ایک مرد جان جوکھوں کیسے خطرناک اور دشوار گذار پہاڑوں اور جنگلوں میں بلا خوف و خطر سفر کر سکتا ہے مگر کیا اس مہذب خاتون کو بھی بلا حفاظت

غیرت یہ حوصلہ ہے ؟

ہمیں یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک انگریزی خوان نیم ملا نے یہ کہا تھا کہ حکم پردہ عورتوں کے لئے فرض نہیں ہے ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو پردہ نہ رکھنے کا بھی اختیار ہے ۔ مگر تعجب ہے کہ بصیغۂ نہی جس امر سے روکا جاتا ہے اس کو ایک اختیاری امر قرار دیا جاتا ہے ۔ حالانکہ ایسا امر اصولاً فعل حرام یا مکروہ تحریمی ہوا کرتا ہے اور حرام یا مکروہ تحریمی سے بچنا ہر ایک ایماندار کا فرض ہے اسلئے عورت کے لئے پردہ کرنا فرض ہے بالخصوص جبکہ احادیث صحیحہ میں پردہ نہ رکھنے کے متعلق وعید شدید آچکی ہے ۔ کیا کبھی کوئی وعید شدید کسی فعل مباح کے لئے بھی آیا کرتی ہے ؟

اور یہ خیال کہ رسم پردہ اہل عجم کی تقلید میں اختیار کی گئی تھی محض وہم ہے بلکہ یہ حکم شرعی تھا جس کی تکمیل بزمانہ نزول وحی ہو کر اسپر عملدرآمد شروع ہو گیا تھا ۔ یہ ایک ایسا واضح امر ہے جسکی تحقیق کی کچھ ضرورت نہیں ۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ بآواز بلند اس حکم ضروری کو پیش کر رہی ہیں ۔ اگر کوئی شخص جاہلانہ ضد پر اڑا رہے یا لغو و بیہودہ تاویلات سے اس حکم میں کچھ ترمیم کرنا چاہے تو کیا کرے ۔ حق نہیں مٹائے سے مٹ سکتا ۔ ہے ؟

اور جہاد میں عورتوں کا حاضر ہونا حکم پردہ کی پابندی کا مانع نہیں ہو سکتا اوّل تو عورتوں کا [illegible] میں حاضر ہونا فرض ہی نہیں پھر اگر تیمارداری یا پانی پلانے کی غرض سے مجاہد [illegible] کے ساتھ گھر سے نکلیں تو کوئی ممانعت نہیں کیونکہ شریعت اس پر ناطق ہے [illegible] مگر نتیجہ یہ کی بات تو پھر بھی پوری نہیں ہوتی ۔ کیونکہ حدیث حضرت انس رضہ سے جس میں عورتوں کا جہاد میں موجود ہونا مذکور ہے یہ بالکل مترشح نہیں ہوتا کہ عورتیں بلا حجاب ہر ایک مجاہد کی تیمارداری کیا کرتی تھیں ۔ چنانچہ نووی

شارح مسلم اس حدیث کی ذیل میں لکھتے ہیں فیہ خروج النساء الی الغزو والانتفاع بھن فی السقی والمداواۃ ونحوھا وھذہ المداواۃ لمحارمھن وازواجھن یعنی اس حدیث سے عورتوں کا جہاد کیطرف نکلنا اوران سے پانی پلانے اور مرہم پٹی وغیرہ میں منتفع ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ مرہم پٹی وغیرہ کا کام صرف وہ اپنے محارم (باپ۔ بیٹا۔ بھائی وغیرہ) اور اپنے شوہروں کے لئے کیا کرتی تھیں۔سو ایسی شرعی ضرورتوں کے موقع پر اب بھی عورتوں کو باہر نکلنے کی کوئی ممانعت نہیں۔نیچریہ کا قاعدہ ہے کہ مفید مطلب بات کو خواہ وہ کیسی ہی کمزور کیوں نہ ہو جھٹ سند میں لے آتے ہیں اور جو برخلاف ہو خواہ وہ کتنی بڑی حجت ہی کیوں نہ ہو اُس سے بندر کی طرح مُنہ پھیر لیتے ہیں۔

مَاوَرَدَ فِی الاَخبار وَالآثار

ذیل میں چند احادیث کو قلمبند کیا جاتا ہے تاکہ مخالفین پردہ کو معلوم ہو جائے کہ وہ صاحب شریعت علیہ السلام کی کیونکر مخالفت کر رہے ہیں:-

(۱) عن جریر البجلی قال سألت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن نظرۃ الفجاۃ فامرنی ان اصرف بصری یعنی میں نے جناب پیغمبرؐ سے کسی عورت کو ناگہان دیکھ لینے کی بابت سوال کیا تو آپ نے مجھے نگاہ ہٹا لینے کا حکم دیا (مشکوٰۃ)

(۲) وعن بریدۃ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لعلیؓ لاتتبع النظرۃ النظرۃ فان لک الاولی ولیست لک الاخرۃ۔یعنی جناب پیغمبرؐ نے حضرت علیؓ کو فرمایا کہ نظر کے پیچھے نظر کو مت لگا کیونکہ کسی اجنبی عورت کو پہلی بار کا دیکھنا (جس میں کوئی خیال مخالف پیدا نہیں ہو سکتا) تیرے لئے موجب گناہ نہیں مگر دوسری بار کا دیکھنا تیرے حق میں بُرا ہے (کیونکہ اس میں بُرے خیالات کے پیدا

ہونے کا احتمال قوی ہے ۔ (درمنثور)

(۳) وعن ام سلمۃ انھا کانت عند النبی صلے اللہ علیہ وسلم و میمونۃ فقالت بینا نحن عندہ اقبل ابن ابی مکتوم فدخل علیہ فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم احتجبا عنہ فقالت یا رسول اللہ الیس ھو اعمی لا یبصرنا فقال افعمیا وان انتما الستما تبصرانہ یعنی حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ وہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا دو جناب پیغمبرؐ کے پاس موجود تھیں کہ اتنے میں ابن ام مکتوم صحابی جو نابینا تھے آنکلے ۔ جناب پیغمبرؐ نے ہمیں حکم دیا کہ پردہ کرو ۔ حضرت میمونہ نے فرمایا کہ یا حضرت کیا ابن ام مکتوم نابینا نہیں ہیں ؟ آپ نے فرمایا کیا تم بھی نابینا ہو ؟ یعنی جس طرح کسی مرد کو اجنبی عورت کا دیکھنا حرام ہے اسیطرح عورت کو کسی اجنبی مرد کا ۔

الغرض احادیث میں نہایت وضاحت کے ساتھ حکم پردہ کی ضرورت کو بیان کیا گیا ہے اور اس کی علت وہی انسانی فطری تقاضا ہے جس کی رو سے بجز انبیاء اور دیگر مقربان بارگاہ رب العزت کے کوئی شخص محفوظ نہیں رہ سکتا ۔ تعجب ہے کہ کس طرح ظاہری تہذیب پر مرمٹنے والے لوگ اپنے تئیں شیطان اور نفس کی نہایت باریک چالوں سے بری سمجھ سکتے ہیں جبکہ ایک نبی اللہ مقام معذرت میں یوں کہتا ہے وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء ۔ اسلام پاک کی بنیاد طہارت ظاہری اور باطنی اور تقوی پر قائم کیگئی ہے اور اس لئے وہ بحکم وذروا ظاھر الاثم وباطنہ نہ صرف ایسے گناہوں سے روکتا ہے جو موجب غضب الہٰی ہیں بلکہ وہ تمام ان ابتدائی اسباب اور مواقع سے بھی منع کرتا ہے ۔ جن کا استعمال یا جن میں موجود ہونا کسی گناہ کا باعث ہو سکتا ہے ۔ اسلام پاک ہمیں سکھلاتا ہے کہ تمہارے تمام اعضاء اور قویٰ اپنے اپنے اعمال کے جوابدہ ہیں اس لئے ہمیں حکم ہوا کہ اتقوا مواضع التہم یعنی تہمت کے مواقع سے اپنے تئیں بچاؤ ۔

معزز ناظرین یہ ہے اسلام پاک کی تعلیم جو نہایت اعلےٰ سے اعلےٰ حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اور ہمارے بعض مغرور اور ناعاقبت اندیش بلا سوچے سمجھے یہ کہہ دیتے ہیں کہ تہذیب کے پھیلنے پر ایسے نتائج قبیحہ پیدا نہیں ہوسکینگے۔ پس آپ خود اندازہ لگالیں کہ اس تہذیب کو حاصل کرکے مسلمان عورتیں کہاں تک اپنی عفت و عصمت کو قائم رکھ سکتی ہیں؟ ایک موٹی سی بات ہے کہ کسی حسین اور نازنین نوجوان عورت کے دیکھتے ہی شیطان دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے۔ کیا کوئی نیچری اس واقعہ کا انکار کرسکتا ہے؟ اگر ایسی حالت میں ہر دو کو خلوت کا موقع مل جائے تو کیا بعد کے قابل شرم مراتب پر اقدام کرنے سے کوئی چیز مانع ہوسکتی ہے؟ حاشا وکلا۔ پس یہ بات ہر حالت میں یقینی ہے تم چاہو احکام شریعت کی پیروی کرو یا نفس خبیثہ کی۔ یہی معنی ہیں اس مشہور مصرع کے ان النساء حبائل الشیطان ۔ یعنی عورتیں شیطان کے پھندے ہیں ۔

مذکورہ بالا تقریب سے ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ شرعی پردہ کی صورت یہی ہے کہ عورتیں بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلیں اور اگر نکلیں تو تمام چہرہ اور بدن ڈھانپ کر چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ثالث صفحہ ۱۷۵ میں حسب ذیل لکھا ہے والمعنی یغطین بها وجوههن وقت خروجهن من بیوتهن لحاجة ولا یخرجن مکشوفات الوجوه والابدان انتهی یعنی عورتیں باہر کسی ضروری حاجت کے لئے نکلتے وقت اپنا چہرہ اور بدن ڈھانپ لیا کریں اور چہرہ اور بدن کو برہنہ چھوڑ کر نہ نکلا کریں ۔

پھر یہی مفسر آگے چلکر لکھتے ہیں واعلم انه فهم من الآیة شیئان الاول ان نساء ذلك الزمان لا یخرجن لقضاء حوائجهن الا لیلا تسترا وتعففا واذا خرجن نهارا لضرورة یبالغن فی التغطی ورعایة الادب والوقار وغض البصر عن الرجال الاخیار والاشرار ولا یخرجن الا فی ثیاب دنیئة فمن خرجت من بیتها متعطرة متبرجة ای مظهرة زینتها ومحاسنها للرجال فان

علیہا ما علی الزانیۃ من الوزر۔ یعنی اس آیت سے دو باتیں بھی جا سکتی ہیں اوّل یہ کہ اس زمانہ کی عورتیں قضائے حاجت کے لئے ستر و عفت قائم رکھنے کی غرض سے رات کو باہر نکلتی تھیں اور جب دن کو نکلا کرتیں تو بدن کے ڈھانپنے اور ادب و وقار قائم رکھتے اور نیک و بد آدمیوں سے نظر کو ہٹائے رکھتے ہیں پورا پورا زور دکھاتی تھیں اور نکلتیں تو کم قیمت لباس میں۔ سو جب عورت گھر سے عطر وغیرہ کا استعمال کرکے اور بن ٹھن کر نکلتی ہے جس سے وہ اپنے زیور اور لباس وغیرہ تو عام مردوں کے سامنے ظاہر کرتی ہے تو اس پر وہی گناہ ہے جو زانیہ عورت پر ؎

چو زن راہ بازار گیرد بزن ٭ وگرنہ تو در خانہ بنشیں چو زن

ز بیگانگاں چشم زن کور باد ٭ چو بیروں شد از خانہ در گور باد

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ فطرتِ انسانی کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور انہیں احکام شریعت اور ان کی عمیق مصلحتوں پر بھی نظر ہے انہیں ہر وقت پاس عصمت کا خیال دامنگیر رہتا ہے ورنہ بحکم اذا لم تستحی فاصنع ما شئت (جب تو شرم اٹھائے تو جو جی چاہے کیا کر) مغربی اقوام کی تقلید اس امر میں کرنا کوئی مشکل کام نہیں مشکل تو صرف فرمان خداوندی کا بجا لانا ہے۔ سبحان اللہ ایک عورت حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا تھیں۔ آپ بیمار ہوگئیں۔ جب وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ کہیں جنت کا تصور آگیا تھا۔ خدا کی جناب سے عتاب ہوا ہے کہ کیا ہمارے سوا غیر کی جانب نظر اٹھانا حلال ہے؟ سو اس غم میں میری یہ حالت ہوگئی ہے یا ایک ہمارے زمانہ کے مہذب ہیں جو اپنی مستورات کو غیروں سے ہم آغوش ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں ؎

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

اور نہایت سخاوت سے اسکا نام ترقی و تہذیب رکھا جاتا ہے۔ اسکی وجہ بجز تقلید ملاحدۂ فرنگ اور کچھ بھی نہیں ؎

ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہنر است

لیکن ہم کہتے ہیں ؎

اے دو صد لعنت بریں تقلید باد

ابن سیرین فرماتے ہیں انی لا ادی المرأۃ فی منامی فاعلم انہا لا تحل لی فاصرف بصری۔ یعنی میں کسی اجنبی عورت کو خواب میں دیکھکر اپنی نگاہ اُس سے ہٹا لیتا ہوں اس قول سے شدت عفت کا جو مفہوم مترشح ہوتا ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے کسی غیرت مند طبیعت کی ضرورت ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حدیث ذیل پر عمل کرکے رضائے مولیٰ کا درجہ پایا تھا قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من فاکہ امرأۃ لم تحل لہ ولا یملکھا حُبس بکل کلمۃ الف عام فی النار ومن التزم امرأۃ حراما ای اعتنقھا قرن مع الشیطان فی سلسلۃ ثم یومر بہ الی النار والعیاذ باللہ۔ یعنی جو شخص کسی اجنبی عورت سے مذاق یا دل لگی کرتا ہے ایک ایک کلمہ کے بدلہ میں ہزار سال عذاب میں رکھا جائیگا اور جو ایسی عورت سے گلے ملتا ہے شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑا جاکر آگ میں جھونک دیا جائیگا ⁕

پردہ کے متعلق ایک مغربی عیسائی کا غلط خیال اور اُس کا رد دمشق کے ایک مشہور عالم کی طرف سے

دمشق کے روزانہ فرانسیسی اخبار لنیر کیو نے اسلامی پردہ پر کیسی عیسائی مضمون نگار کا ایک تنقیدی مضمون شائع کیا تھا۔ جس میں اُس نے اسلامی پردہ کے خلاف حسب ذیل دلائل قائم کئے تھے :۔

(۱) اصولاً پردہ عورت کی عصمت و عفت کا محافظ نہیں ہے بلکہ ایک پاکدامن عورت خود اپنی حفاظت کر لیتی ہے۔ اور پردہ تو صرف عیب و رسوائی

پر پردہ ڈال سکتا ہے - پس پاکدامن عورت پر اعتماد کرنا چاہئے کہ وہ اپنی عزت وآبرو کی خود محافظ ہے - اور اُس کی آزادی کو واپس دیدینا ضروری ہے - اس کے بعد اگر اُس سے کوئی اخلاقی لغزش بھی ہو جائیگی تو وہ توبہ و پشیمانی کے ساتھ اپنے گناہ کا اعتراف کرے گی ؛

دمشق کے ایک مشہور عالم محمد ہاشم رشید الخطیب نے المرشد العزلی میں اس کے جواب میں ایک بسیط مضمون شائع کیا ہے - اور اس عقلی استدلال کا جواب مختلف حیثیتوں سے دیا ہے - اولاً تو وہ اس غلط اُصول کا رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خیال کہ پردہ سے عورت کی حفاظت نہیں ہوتی صریح جھوٹ اور بہتان ہے - اگر پردہ عورت کی حفاظت کا ذریعہ نہ ہوتا تو ایک پردہ نشین عورت معزز و ممتاز کیوں قرار پائی ؟ خود خداوند تعالےٰ نے اسی شرف کی بنا پر پردہ دار عورتوں کو لونڈیوں سے ممتاز قرار دیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے ؛

یا یھا النبی قل لازواجک و بنٰتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلا بیبھن ذٰلک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین - اے پیغمبر اپنی بیبیوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادر سے گھونگٹ نکال لیا کریں - اس سے غالباً یہ (لوگ) پہچان پڑینگی اور ان کو کوئی چھیڑیگا نہیں ؛

البتہ عورتوں کی نسبت احادیث و آثار میں یہ الفاظ آتے ہیں ؛

بکم من کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ یوم القیامۃ نساء کاسیات عاریات مائلات ممیلات لا یدخلن الجنۃ - اور بہت سی عورتیں جو دنیا میں لباس پہنتی ہیں - وہ قیامت کے دن برہنہ ہونگی - جو عورتیں لباس پہننے پر بھی برہنہ رہتی ہیں - حق سے منحرف ہیں اور لوگوں کو حق سے منحرف کرتی ہیں وہ جنت میں داخل نہ ہونگی ؛

اُن کا نمائشی پردہ بے شبہ اُنکی عصمت و عفت کا محافظ نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید نے اس آیت میں اذا سألتموھن متاعا فاسئلوھن من وراء حجاب ذالک اطھر لقلوبکم وقلوبھن اور جب پیغمبر کی بیبیوں سے تمہیں کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے باہر (کھڑے رہ کر) اُن سے مانگو۔ اس سے تمہارے دل (انکی طرف سے) خوب پاک (صاف) رہینگے اور (اسی طرح) اُنکے دل (بھی)۔

جس پردے کا حکم دیا گیا ہے وہ یقیناً عورت کی عصمت و عفت کا محافظ ہے لیکن اس کے ساتھ ہمارا یہ دعوے بھی نہیں ہے کہ پردہ تمام اخلاقی جرائم کا سدباب کر دیتا ہے یا کر سکتا ہے بلکہ وہ عورت کی محافظت کا ایک عادی سبب ہے جیسا کہ دُنیا کی ہر چیز کی حفاظت انہی اسباب عادیہ سے ہوتی ہے مثلاً لعل و جواہر کی حفاظت لوہے کے بند صندوقوں کے ذریعہ سے کیجاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی چور ان صندوقوں کو توڑ ڈالے تو کیا اس سے یہ ثابت ہو سکے گا۔ کہ ان صندوقوں میں جواہرات کا رکھنا ایک قسم کی حماقت ہے؟ جن مریضوں کی موت آنے والی ہے وہ کتنے ہی علاج کریں۔ اُن کو موت کے پھندے سے رہائی حاصل نہ ہو سکے گی باایں ہمہ اور بہت سے مریضوں کو دوا سے یقینی طور پر شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ اور انہی طبی اسباب عادیہ کے باوجود ہر گو ہزاروں مریض مرجاتے ہیں۔ لیکن لوگ دوا کا استعمال ترک نہیں کرتے:

اسلام نے عورتوں کو جو آزادی دی ہے اُس کے واپس کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس آزادی کے معنے یہ نہیں ہیں کہ عورتیں بے پردہ ہو کر منظر عام پر نمایاں ہو جائیں۔ بلکہ اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو ہر قسم کے مالی اور خانگی تصرفات میں آزاد رکھا ہے اور انکی حیثیت اس قدر ممتاز کر دی ہے۔ کہ وہ نہ صرف لونڈیوں کے لئے بلکہ غیر مسلم عورتوں کے لئے بھی موجب صد رشک و غبطہ بن گئی ہیں۔ اسلام نے پردے کے ذریعہ سے اُن کو اپنی عصمت و عفت کی

حفاظت کا جو ذمہ دار قرار دیا ہے وہ بھی اس مخصوص آزادی کا لازمی نتیجہ ہے۔

(۲) عقلی حدود سے نکل کر اس عیسائی مضمون نامہ نگار نے معاشرتی حیثیت سے اسلامی پردہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اسلام میں بہت سے مرد ایسے ہیں جن سے عورتوں کو پردہ کرنا چاہیئے۔ لیکن مروت کی بنا پر ان سے پردہ ناممکن ہے۔ کیا کوئی شخص اپنے بھائی یا بھتیجے کو گھر میں آنے سے روک سکتا ہے؟ حالانکہ ان سے پردہ کرنا ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھائی کا اپنے بھائی کی بی بی کو دیکھنا اور بھتیجے کا اپنے چچا کی عورت پر نگاہ ڈالنا اسلام میں ممنوع ہے اور اس صورت میں اقتضائے مروت پر عورت صرف اس قدر عمل کر سکتی ہے کہ خود ان سے چھپ جائے اور بھائی کو بھائی کے اور بھتیجے کو چچا کے گھر میں آنے سے نہ روکے لیکن مشتبہ حالت میں روک ٹوک ہی عین مروت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جب مردوں اور عورتوں کے اختلاط اور میل جول کی ممانعت فرمائی تو شوہر کے اعزہ کی نسبت آپ سے سوال کیا گیا۔ اور آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "وہ تو موت ہیں" جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ان لوگوں کے میل جول سے ایک مسلمان عورت کو اور بھی شدت سے احتراز کرنا چاہیئے۔ غرض اسلام ایک ایسا باغیرت مذہب ہے کہ مشتبہ حالت میں باپ اپنی بہو کو اور بیٹا اپنی ماں کی طرف بھی باوجود جواز کے نگاہ نہیں اٹھا سکتا اور اگر مبتلائے گناہ ہونے کا احتمال ہو تو ان میں سے کوئی دوسرے کے گھر میں بھی نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم قوموں کو جب یہ نظر آتا ہے کہ ان کے یہاں عورتوں اور اجنبی مردوں کے میل جول اور بات چیت کا عام رواج ہے تو ان کے دلوں میں غیور مسلمان ہونے کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔

اس رد و قدح کے بعد علامہ محمد ہاشم نے خود اس عیسائی مضمون نگار کے دوسرے ہم مذہب ارباب فکر و بصیرت کی رائیں پردے کی تائید میں نقل کی ہیں مثلاً

ایک عیسائی کہتا ہے۔ کہ جب کسی غیر قوم کے بے پردہ بی بی سے اُس کا شوہر یا اُس کا کوئی اور قریبی عزیز بطور اخلاقی باز پرس و مواخذہ کے یہ سوالات کرتا ہے کہ فلاں شخص نے تم سے بڑی دیر تک گفتگو کی۔ "فلاں شخص تم کو گھور رہا تھا"۔ فلاں شخص سے کیوں اس لطف و محبت سے ملتی ہو"۔ "جب تم فلاں شخص کے قریب گئیں تو میں نے نگاہ دلفریب شیریں تبسّم کو خاص طور پر دیکھا" تو اس صورت میں اگر جھگڑا چکانے کے لئے اُس نے ان باتوں کا اعتراف کر لیا تو گویا خود اپنے آپ کو مشتبہ بنا لیا اور اگر اعتراف نہیں کیا تو باہم سخت اندرونی نزاعوں کے پیدا ہو جانے کا احتمال ہے ؎

مقدس پوپ نے ایک خط میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "روما میں جو عام جلسے کئے جاتے ہیں اُن کی تنظیم کرنی چاہیئے۔ کیونکہ انحطاط روما کے سخت ترین دور میں بھی عورتوں کو اس قسم کے جلسوں میں شرکت کی اجازت نہ تھی"۔

علامہ محمد ہاشم نے اس قسم کی اور بھی بہت سی رائیں نقل کی ہیں۔ اور اخیر مضمون میں یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ علم تمدن و اجتماع کے بڑے بڑے علماء اب پردے کی فضیلت کو تسلیم کرنے لگے ہیں اور وہ اس کے متعلق موجودہ زمانہ کی حالت کے مناسب اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے جس طرح امریکہ نے شراب نوشی کا انسداد کر دیا ہے۔ اور بہت سے ارباب نظر طلاق اور تعدد ازدواج وغیرہ کے جواز پر غور کر رہے ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ یہ لوگ پردے کی ضرورت کو تسلیم کر لیں ؎

مسلمانوں کو چاہیئے کہ غیرت اسلامی سے کام لیں اور نیچریہ کی چکنی چپڑی باتوں پر مست ہو جایا کریں۔ یہ جماعت ہے اعداء اللہ اور اعداء الرسول کی اور انہیں بجز ظاہر داری اور نفس پرستی کے شریعت حقہ سے کچھ تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اُمت کو مخالفت کرتے دیکھ کر ان کو بُرے الفاظ سے یاد کیا کرتے ہیں۔ پردہ

حکم خداوندی ہے اور عورتوں کی دینی و دنیوی بہتری اسی پردہ میں ہے ؎

مکن بر کار زن چنداں صبوری
کہ افتد رخنہ در سد غیوری

ولنعم ما قیل ؎

چو بینی کہ زن پائے بر جائے نیست ✤ ثبات از خرد مندی ورائے نیست
گریز از کفش در دہان نہنگ ✤ کہ مردن بہ از زندگانی بہ ننگ

وللہ در القائل ؎

چہ خوش گفت جمشید با رائے زن
کہ یا خانہ یا گور بہ جائے زن

تعلیم نسواں

مردوں اور عورتوں کے قوائے جسمانی و دماغی میں جو تفاوت رکھا گیا ہے اُس سے کس شخص کو انکار ہو سکتا ہے؟ اسی تفاوت پر ان کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی مردوں کے فرائض اور ذمہ داریوں سے مختلف ہیں۔ مرد ہو یا عورت ہر دو کیلئے انسان ہونے کی حیثیت سے نفس تعلیم کی ضرورت یکساں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ مگر قابل غور امر یہ ہے کہ آیا ہر دو کے لئے نوعیت تعلیم اور طریق تعلیم یکساں ہونا چاہئے یا نہیں۔ عورتوں کے لئے احکام شریعت۔ اخلاق حسن معاشرت اور ایک حد تک علم سیر و تواریخ اور حساب وغیرہ کی ضرورت ہے۔ ہاں بعض عورتوں کے لئے علم المعالجات کا حاصل کرنا ممنوع نہیں۔ عورتوں کی نوعیت تعلیم یہیں تک محدود

ہونی چاہیئے۔ کیونکہ تمدن و معاشرت میں اس تعلیم سے وہ مہذب کہلا سکتی ہیں۔ اور اپنے تمام فرائض اور ذمہ واریوں کو احسن طریق سے انجام دے سکتی ہیں +

(۲) طریق تعلیم۔ سواس کی نسبت اس امر کا سمجھ لینا کافی ہے کہ عصمت و عفت مستورات کا طبعی حق ہے۔ مستورات کا موجودہ طریق تعلیم شریعت اسلامی کے رُو سے سخت قابلِ اعتراض بلکہ حرام مطلق ہے کیونکہ پردہ جو حکم شرعی ہے اُٹھ جانے پر عصمت و عفت کا تو نام و نشان بھی باقی نہیں رہ سکتا جس کا مفصل بیان حکم پردہ کے مضمون میں پہلے آچکا ہے۔ یہاں اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں جو لوگ مغربی عورتوں کی تعلیم و تربیت کو مسلمان عورتوں میں رواج دینے کے دلدادہ ہیں وہ یقیناً ہماری اِس رائے سے متفق نہیں ہونگے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ تعلیم مذہب کے نہ تو خود پابند ہیں اور نہ اپنی اولاد کو پابند بنانا چاہتے ہیں سو یہ لوگ بمقابلہ حکم شرعی مروجہ نام نہاد تہذیب کو جس میں ظاہری بناوٹ کے سوا کچھ بھی نہیں رکھا اپنی ذاتی رائے کی بنا پر زیادہ اہم خیال کرتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ بحکم حدیث اِذَا لَمْ تَسْتَحِیْ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ یعنی ؎

بے حیا باش و ہرچہ خواہی کُن

اِس بحث میں ہمارے مخاطب ہی نہیں۔ مستورات کے مروجہ طریق تعلیم کی برائیاں اس قدر ہیں کہ ان صفحات میں ان کا ذکر کرنا ہم جائز نہیں سمجھتے۔ تجربہ و مشاہدہ ہماری اس رائے کی تصدیق کے لئے شاہد عادل ہیں۔ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ مروجہ طریق تعلیم کے مؤید صرف وہی لوگ ہیں جو احکام شریعت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے انہیں غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ در حقیقت یہ لوگ اعداء اللہ اور اعداء الرسول کی جماعت میں داخل ہیں جو مختلف قسم کی چکنی چپڑی باتوں سے اپنے تئیں مصلحانِ قوم و ہمدردانِ اسلام ظاہر کرتے ہیں مگر فی الحقیقت ان لوگوں سے بڑھ کر کوئی بھی

بدخواہ قوم نہیں ہو سکتا ہے

اِذَا کَانَ الْغُرَابُ دَلِیْلَ قَوْمٍ
سَیَهْدِیْهِمْ اِلٰی اَرْضِ الْجِیَافِ[1]

بعض جہاّل اپنے بیہودہ خیالات کی تائید میں حدیث طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ پیش کرکے عام لوگوں کو دھوکا دیا کرتے ہیں مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ جس علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے وہ صرف علم شریعت ہے جو اصلاح عقائد و اعمال پر مشتمل ہے نہ علوم اقتصادیات - فلسفہ و سائنس وغیرہ جو بسا اوقات راہزن دین و اسلام ثابت ہوتے ہیں - دیکھو قرآن مجید میں جہاں ابراہیم علیہ السّلام اپنے باپ کو دعوت اسلام دیتے ہیں یوں فرماتے ہیں یَا اَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِکَ فَاتَّبِعْنِیْٓ اَهْدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا - یعنی اے باپ مجھے خدا سے وہ علم ملا ہے جو تجھے نہیں ملا - تو میری پیروی کرلیں تجھے سیدھے راستہ کی ہدایت کرونگا - کیا اس آیت میں علم سے مراد علم معرفت ذات باری ہے یا سائنس و فلسفہ یا ناول خوانی ؟ دوسری جگہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو یوں تلقین کیگئی ہے قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا یعنی خدایا میرے علم کو اور بھی بڑھا - کیا یہاں بھی علم سے فلسفہ و سائنس و جغرافیہ و اقتصادیات و ناول خوانی مراد ہیں؟ سلف صالحین میں اہل علم کی اصطلاح صرف ان لوگوں تک محدود تھی جو علم شریعت یا یوں کہو کہ عقائد و اعمال کا صحیح علم رکھتے تھے مگر ہمارے مغربی تہذیب کے دلدادگان نے اس اصطلاح کو بہت بُرے معنی میں استعمال کرنا شروع کردیا ۔

تاریخ اسلام کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک زمانہ میں عورتیں کم و بیش تعلیم یافتہ ہوتی رہی ہیں - مگر انہوں نے اپنی عصمت و عفت کے حق میں کو کبھی بھی زائل نہیں ہونے دیا - چنانچہ زمانہ نبوت میں خاندان نبوت کی حضرات مستورات علم و ادب سے کافی

[1] یعنی جب کسی قوم کا رہنما کوا ہو تو وہ انہیں مردار خواری ہی کی ہدایت کریگا ۱۲ منہ

بہرہ اندوز تھیں - جناب سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالےٰ عنہا اور ام المومنین حضرت ام حبیبہ وغیرہ بہت ممتاز تھیں - جناب سیدۃ النساء نے حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے غم وفات میں ایک مرثیہ تحریر فرمایا جو آج تک فصاحت و بلاغت کے اعلےٰ نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے - حضرت ام ورقہ بنت نوفل بنت عبداللہ ام المومنین حضرت ام سلمہ اور ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمرؓ طبقہ اوّل کے حفاظ قرآن میں سے ہیں +

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا علاوہ حافظ قرآن ہونے کے محدثہ اور مجتہدہ مانی گئی ہیں - کیونکہ آپ سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں اور بعضوں نے کہا ہے کہ شریعت محمدیہ کے چوتھائی احکام آپ سے منقول ہیں - بعد وفات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حضرات شیخین رضؓ آپ سے اکثر مسائل حدیث و سنن دریافت فرماتے اور آپ کے اجتہاد کو تسلیم فرماتے تھے - آپ کی صائب رائے و راستی ادراک اسی سے ظاہر ہے کہ آپ کا ایک قول یا آپ کی روایت کی ہوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں - جو عقلاً یا درایتاً نادرست یا ضعیف ہو - فن روایت میں بھی آپ کو اچھی مہارت حاصل تھی - سولہ ہزار اشعار حفظ تھے جو اہل عرب کا تاریخی سرمایہ سمجھا جاتا ہے - آپ اکثر نعتیہ اشعار تصنیف فرماتیں +

مسلمان بیبیاں عام طور پر علوم میں حصہ لیتی تھیں - چنانچہ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ دمشق کے مشہور مؤرخ ابن عساکر نے جن اساتذہ سے فن حدیث حاصل کیا تھا - ان میں اسّی سے زیادہ عورتیں تھیں +

حضرت رابعہ بصریہ نے جو تبع تابعین میں سے تھیں - فرقان حمید پر ایسی قدرت پائی تھی کہ مواخذہ آخرت سے خوف زدہ ہو کر عہد کر لیا تھا کہ آیات قرآنی ہی سے اپنے ہر مفہوم کو ادا کیا کرونگی چنانچہ بقیہ عمر یعنی چالیس سال سے زائد اسکی پابند رہیں - ایسی نظیر تمام تواریخ و سیر میں نہ پاؤ گے +

جعفر ابن منصور عباسی کی بیٹی زبیدہ خاتون علاوہ علوم کے تدابیر ملکی میں بھی دخل رکھتی تھی -اس کا شوہر خلیفہ ہارون الرشید اکثر امور مملکت میں اسکی رائے صائب سے فائدہ اٹھایا کرتا تھا - عربی اور فارسی میں شعر اچھا کہتی تھی -اپنے بیٹے امین کے مرثیہ میں کہتی ہے ؎

اے جانِ جہاں جہاں ناخوش بے تو ؛ بغداد پریشان و مشوش بے تو
رفتی تو و من بے تو بماندم فریاد ؛ تو در خاکی و من در آتش بے تو

خاندانِ عباسیہ کی اور شاہزادیاں بھی تعلیم یافتہ تھیں -شاہزادیاں تو شاہزادیاں کنیزیں تک بھی فصاحت و بلاغت شاعری خطاطی اور دیگر علوم میں کامل مہارت رکھتی تھیں -جس سے تاریخ بالکل ساکت نہیں ؛

امام یزید ابن ہارون اخیر عمر میں ضعف بصارت کی وجہ سے کتاب دیکھنے سے معذور ہو گئے تھے -ان کی لونڈی بوقت ضرورت انکے لئے حدیثیں اخذ کر کے یاد کر لیا کرتی تھی ؛

تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ ایک بار ابن سماک کوفی نے جو اپنے عہد کے مشہور عالم تھے تقریر کرنے کے بعد اپنی جاریہ سے پوچھا میرا طرز بیان کیسا ہے ؟ سخن شناس جاریہ نے کہا کہ تقریر تو اچھی ہے لیکن اتنا نقص ہے کہ آپ ایک ہی بات کو بار بار کہتے ہیں -علامہ نے کہا کہ میرا اعادہ کلام اس لئے ہے کہ جو مخاطب اوّل مرتبہ نہ سمجھے ہوں وہ سمجھ جائیں -تو جاریہ نے کیا ہی معقول جواب دیا کہ جب تک کم فہم سمجھینگے سمجھنے والے مکدر ہو چکے ہونگے ؛

اس کے بعد اہلِ عجم کی تاریخ میں بھی مستورات کی اعلیٰ درجہ کی قابلیت کا ثبوت ملتا ہے -جس کا ذکر بخوفِ تطویل نظر انداز کیا جاتا ہے ؛

میرے نزدیک تعلیم مستورات بہرصورت ایک امر مہتم بالشان ہے اور ان کو

تعلیم کی طرف متوجّہ نہ کرنا اس صنف نازک پر ناروا ظلم وستم کا مترادف ہے۔ کچھ عرصہ گذرا پنجاب کی ایک قومی مجلس میں مستورات کی نسبت مروّجہ تعلیم کی ضرورت کا مسئلہ پیش ہوا۔ جس کے متعلق ایک طویل بحث کے بعد ضرورت تعلیم مروّجہ کا فیصلہ صادر کیا گیا۔ اس فیصلہ پر پنجاب کے ایک معزز ایڈیٹر اخبار نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :۔

"اگر علم کی حقیقت کو دیکھا جائے تو ایک روشنی اور ایک دریافت کی وجہ اور علّت کا نام علم ہے بغیر کسی زبان کی تخصیص کے جیسے اندھیری کوٹھڑی میں چراغ کا نور ہادی ہے جیسے دریا کے سفر میں ستارے راہبری کرتے ہیں۔ یہی علم ہے اسی کا نام علم ہے اور یہ ایک کارآمد اور ضروری چیز ہے۔ اور کوئی عقلمند اور ذی فہم یہ چاہے گا بلکہ نہیں کہ ہم زندگی بھر سویا کریں اور اس دنیا سے جب اس عالم میں جائیں تو کسی شے کا ادراک نہ کیا ہو اور کسی شے کی ماہیت نہ سمجھی ہو۔ یہ سب کچھ درست ہے۔ اور اسی کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ مجدّد الخیال کون ہیں جو یہ سمجھ چکے ہیں کہ علم کے معنی انگریزی تعلیم ہے اور تعلیم یافتہ سے مراد انگریزی انٹرینس پاس ہے اور عربی کا منتہی مراد نہیں؟ اگر عورتوں کو تعلیم دلانا منظور ہے تو ضرور دلاؤ لیکن مسلمانی سماج کیوں مٹائے دیتے ہو۔ مذہب کی تعلیم سے کیوں اجتناب ہے؟ کیا تعلیم کی صورت میں بھی جدید خیالات پورے کرنے ہیں کہ مسٹر اور مسز کے معزز اور خوشنما خطاب حاصل کئے جائیں؟ اگر یہی مطلب ہے تو صاف صاف کہو۔ اپنے ساتھ دوسروں کی مٹی خراب نہ کرو۔ مسلمانو! سنو۔ انگریزی تعلیم کا اثر دیکھو کہ انگریزی تعلیم کس قدر حفاظت اسلام کی ذمہ دار ہے؟ سمجھو۔ میں ایک نئی اور سچی مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ آج سے دو روز پہلے کا واقعہ ہے کہ لکھنؤ کے مشہور محلوں میں باورچی ٹولہ بھی ایک محلہ ہے جہاں مسلمان کثرت سے آباد ہیں۔ اسی محلہ میں ایک شریف مسلمان جو علاوہ

شرافت ونجابت کے ایک معزز خاندان کے رکن یادگاریں رہتے ہیں۔ اس بزرگ نے اپنی آنکھوں پر غفلت کے پردے ڈال کر اپنی کم سن لڑکی کو انگریزی مدرسۂ نسوان میں بھیجدیا۔ لڑکی صرف دو سال تک آتی جاتی رہی جس طرح سکول سے لڑکے ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک آمد و رفت کی منزل طے کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں اس لڑکی کے اوضاع واطوار میں فرق پیدا ہوگیا۔ عقائد میں ضعف آگیا۔ لیکن بنائی ہوئی پردہ پوشیوں نے ماں باپ پر کوئی راز ظاہر نہ ہونے دیا۔ اب ضرورت ہوئی کہ لڑکی کو سبق پڑھا کر پکا کیا جائے تاکہ جو امر کل ہونا ہو آج ہی ہو جائے۔ لہذا لڑکی کو ضعف دماغ کے معانی سمجھا کر اور درد سر کی دوا کا حکم دے کر شفا خانہ روانہ کیا گیا۔ یہ لڑکی وہاں سے دو مہینے تک واپس نہ ہوئی تو ماں باپ کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اٹھے اور انہوں نے لڑکی سے مضطربانہ ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دو ماہ کے بعد صاحبزادی ایک چپڑاسی اور کئی ایکلیڈی ڈاکٹروں کی حفاظت میں آئی اور پہلا فقرہ جو سلام کے بعد والدین سے کہا گیا یہ تھا کہ "ماما اب ہم تمہارے کام کے نہیں رہے۔ جو دین حق تھا وہ پسند کرلیا اور برے دین اسلام کو ترک کردیا۔ اس کے بعد پولیس کی معرفت لڑکی مشن کے حوالہ کردی گئی"۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ کیا اسی کا نام حفاظتِ اسلام ہے ؎

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا

کارِ طفلاں تمام خواہد شد

جناب یہ افسانہ یا قصہ یا شاعرانہ خیال نہیں بلکہ ایک واقعی بات ہے جو عرض کی گئی۔ اس قسم کی ناہنجار اور قابلِ شرم مثالیں ملک میں کثرت کے ساتھ مشاہدہ میں آچکی ہیں۔ مگر ہمارے مروجہ تعلیم کے دلدادگان اس عفت و عصمت کی تباہی اور دین حق کی تذلیل و توہین کو قومی ترقی و تہذیب بتلایا کرتے ہیں انا للہ و انا الیہ راجعون

خاکسار مؤلف کے نزدیک مسلمان لڑکیوں کو انگریزی مروجہ تعلیم دلانا جس کا

لازمی نتیجہ کئی ایک احکام شرعیہ کا محو کرنا ہے شرعاً حرام ہے۔ مگر آثار میں وارد ہوا ہے کہ کسی قوم کی ذلت و ادبار کا نشان یہ ہے کہ وہ تعلیم وحی سے منہ موڑ کر ایسے علوم میں لگ جائے جو عالم آخرت میں کچھ مفید نہیں۔ مگر بیچارہ کب سنتے ہیں۔ وہ وقت قریب آگیا ہے کہ اللہ تعالےٰ موجودہ اسلامی اُمت کو مٹا کر ایک دوسری قوم کو حامئی اسلام پیدا کرے ۔

ہمیں یقین ہے کہ ملحدین ہماری مذکورہ بالا سطور کو پڑھ کر ناک بھوں چڑھائینگے مگر گفتگو یہ ہے کہ ان لوگوں کو پہلے مذہب کی اہمیت اور ضرورت کا مسئلہ ذہن نشین کرانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ لوگ مذہب کی ضرورت کو صرف ایک فیشن کی حد تک محدود سمجھے بیٹھے ہیں مگر ہمیں اُن سے یہ کہنا ہے کہ ہم نے بر بنائے احکام شرعی جو کچھ لکھنا تھا لکھدیا تمہارے چیں بجبیں ہونے پر حق گوئی سے باز نہیں رہ جا سکتا ہے

مارا بحق کار است گو خواہ راضی مباش

افسوس ہے کہ دیوثیت کا نام تہذیب رکھا جاتا ہے ۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

مسئلہ نکاحِ وطلاق

(۱) ازدواج اور حسنِ معاشرت صحیح معنی کے رُو سے باہم لازم و ملزوم کا تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ اسلام پاک فطرتِ الٰہیہ کا صحیح نمونہ ہے۔ اس لئے انسان کی اعلےٰ اور عمدہ زندگی کے ہر ایک طریق پر بحث کرنا اس کا ضروری فرض ہے۔

ضرورت ازدواج اور اس کے تمدنی۔ اخلاقی اور دینی مصالح میں کسی کو کلام نہیں روئے زمین کی تمام قوموں کا اس امر میں متفق ہونا کافی شہادت ہے۔ اس امر کی ازدواج مقتضائے فطرت انسانی ہے مجھے صرف اسی ایک بدیہی امر کی نسبت بحث کرنا مطلوب نہیں بلکہ میں اس وقت یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اس ضروری اور اہم فرض کے متعلق جس طریق کی اسلام مقدس نے تعلیم کی ہے وہ دیگر مذاہب کی نسبت زیادہ سہل اور نتیجہ خیز ہے +

(۲) ضرورت ازدواج کے متعلق صرف یہی کہنا کافی ہے کہ حفاظت حقوق کا خیال انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص اپنے حقوق کا مالک نہیں وہ کبھی کسی قسم کی ترقی نہیں کرسکتا۔ اسلئے ہم فطرتاً تمام ایسے اسباب کی خواہش کرینگے جن سے ہمارے حقوق کی (خواہ فطری ہوں یا غیر فطری) پوری پوری حفاظت ہو سکے۔ ہم فطری حقوق کی حفاظت بذریعۂ ازدواج یوں کرسکتے ہیں کہ جس قدر حیوانی قوتیں ہم میں ودیعت رکھی گئی ہیں ان کا مقتضا ایسے طور پر حاصل کریں جس سے دیگر بنی نوع کے حقوق میں کسی قسم کی دست اندازی نہ ہو کیونکہ اس صورت میں ہم اپنی آزادی کو ایسے طور پر استعمال نہیں کرینگے جس میں دیگر بنی نوع کا اضرار متصور ہو ورنہ انسانی فہرست سے ہمارا نام کٹ کر بہائم کی فہرست میں لکھا جانا زیادہ موزوں ہوگا۔ غور کرکے دیکھ لو کہ جس قدر قوائے شہوانیہ کو برخلاف صورت ازدواج استعمال کرنے کی صورتیں ہیں کسقدر مستلزم قبائح ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے ہر ایک کے متعلق سخت وعیدیں عائد کی ہیں۔ سب سے مشہور صورت زنا کی ہے۔ اس کی نسبت حکم دیا ولا[1] تقربوا الزنیٰ انہ کان فاحشۃً وساء سبیلاً۔ حکمت اس نہی کی یہ ہے کہ

[1] زنا کے قریب بھی مت پھٹکو کیونکہ وہ ایک امر شنیع ہے اور برا طریق ہے ۱۲ منہ

زنا سے نسب تلف ہوتی ہے اور تربیت انسانی کا کوئی نظام کلی باقی نہیں رہتا۔ اور نہ ہی کسی قسم کی ہمدردی اور شرکت رنج و راحت متصور ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہمارے ترکہ اور دیگر حقوق کی حفاظت ممکن ہے حالانکہ تسلیم کیا گیا ہے کہ انسانی تمدنی اجتماع کا روح رواں یہی امور ہیں۔ ہم اپنے تمام قوائے فطریہ کو ان کے حقوق دیتے ہیں مگر اسی حد تک کہ موجب خلل نظام ثابت نہ ہوں۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ فطرت اس حد سے زیادہ ہم سے تقاضا بھی نہیں کرتی۔ ان قوائے شہوانیہ کو ناجائز استعمال میں لانے کی باقی صورتیں اس قابل نہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ کیونکہ وہ اس قدر مضرت آمیز ہیں کہ ان کو بجز ایک ایسے شخص کے جو حقیقت انسانی سے مسخ ہو کر طویلۂ بہائم میں شامل ہو گیا ہو کوئی دوسرا ہرگز اختیار نہیں کر سکتا۔ الغرض ازدواج انسانی زندگی کے اعلےٰ سے اعلےٰ نمونے قائم کرنے میں جزوِ اعظم ہے ؞

(۳) اسلام میں کثرت ازدواج کا حکم ہے ؞

کسی مسئلہ کی حقیقت کو نہ سمجھنا اور بے سمجھے ایک اعتراض جڑ دینا بیوقوفی اور حماقت کی دلیل ہے۔ کثرت ازدواج کا اتہام مقدس اسلام پر یورپ کے بعض متعصب عیسائیوں کا تراشا ہوا ہے۔ چونکہ ہمارے بعض نو تعلیم یافتہ اصحاب کے دماغوں میں بھی دیکھا دیکھی ایک اُلجھن سی پیدا ہو رہی ہے اس لئے بغرض رفع اتہام اس کی حقیقت کو کھولنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ اسلام مقدس کثرت ازدواج کا مجوز ہے نہ موجب۔ قبل اس کے کہ اس دعوے کو دلیل سے ثابت کیا جائے یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جواز امر اور وجوب امر میں بڑا فرق ہے۔ کسی امر کے جواز کا صرف یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ اس کے کر لینے میں کسی قسم کا شرعی مواخذہ نہیں مگر کسی امر کے وجوب سے اس امر کا بجا لانا لازم ہو جاتا

ہے اور بصورت ترک ایسا شخص گنہگار ہو کر قیامت کو جوابدہ ہوگا۔ متعصب مصنفین یورپ نے جس قدر اعتراض اس مسئلہ کے متعلق عائد کئے ہیں سب کے سب جواز و وجوب میں فرق نہ کرنے پر مبنی ہیں کیونکہ اکثر نے یہی لکھا ہے کہ اسلام کثرتِ ازدواج کا حکم دیتا ہے۔ اس جملہ سے عام طور پر بعض ناواقفوں نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام حکماً کثرتِ ازدواج پر مجبور کرتا ہے۔ حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اب رہا یہ امر کہ اس مسئلہ میں جواز کی کیا صورت ہے؟ سو معلوم ہونا چاہیئے کہ معترضین نے یہ اعتراض آیہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث وربٰع پر وارد کیا ہے۔ اور عجیب قسم کی ملمع تقریروں سے اس پر زور دیا ہے۔ بالخصوص پادری لوگ بہت کچھ شور و غل مچایا کرتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ یہ لوگ دیانت و تقویٰ سے ہرگز کوئی بات منہ سے نہیں نکالتے۔ اسلام کی ہر ایک بات پر گو وہ کوئی اعلیٰ خوبی ہی کیوں نہ ہو اعتراض کر دینا ان کا فرض منصبی ہے۔ کیونکہ وہ اپنا روزنامچہ اسی قسم کی کارروائیوں سے پُر کرتے ہیں۔ مگر میں اس لغو اعتراض کے رد میں الزامی اور تحقیقی طور پر حسب ذیل عرض کرتا ہوں۔ اُمید کہ ناظرین توجہ سے کام لینگے :-

حسب ضرورت انسانی ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہ دینے سے آج عیسائی اُمت کا یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ دُنیا کے تمام مذاہب میں ناپاک اور خلاف فطرت مذہب شمار کیا جاتا ہے۔ تمام عیسائی ممالک میں زنا ان لوگوں کی طبیعت ثانیہ بن چکا ہے عصمت و عفت کا کہیں نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ انگلستان کی ایک شریف عورت لنڈن کے پال مال گزٹ میں اپنی ہم ملک عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ غالباً انگلستانی عورتوں میں بہت ہی کم ایسی عورتیں ملینگی جو عصمت و عفت کا صحیح دعویٰ کر سکیں ہمیں مشرقی ممالک کی خواتین پر رشک آتا ہے کہ وہ کیونکر انسانیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ حقوق کی مالک ہیں۔ ہماری آزادی نے ہمیں ننگ و ناموس کا دشمن بنا دیا ہے۔ اس کے

بعدہ وہ عورت اس خرابی کے وجوہ قلمبند کرتی ہے جن میں پردہ[له] کا اُٹھا دینا اور نکاح ثانی کی ممانعت کو بھی شامل کیا ہے۔ میرے پاس دو معتبر اور معزز تعلیم یافتہ آدمیوں نے جو انگلستان میں مدت رہ آئے ہیں بیان کیا کہ زنا کی یہ حالت ہے کہ بہائم کی طرح لب سڑک عورت و مرد مشغول ہیں اور اس بارہ میں ذرا بھی حجاب نہیں ہوتا۔ اگر کوئی زیادہ پاس شرم کرے تو سڑک کی جانب کو اپنا چھاتا تان لیتا ہے۔ پیرس وغیرہ شہروں میں اس سے بھی بدتر نقشہ بدفطرتی کا نظر آتا ہے۔ وہاں ربڑ کی مصنوعی عورتیں جماع کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ پادری صاحب ل. جر جیس انگریزی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ عیسائی مذہب کی بدنامی اور ذلت کا باعث پوپوں کی اندرونی کارروائی ہے۔ یہ لوگ زنا کے مشتاق اور ہر ایک قسم کی نفس پرستی کے دلدادہ ہوتے ہیں اور ان کے گرجا رنڈیوں کے چکلے ہوتے ہیں۔ ایک سے زیادہ عورت سے نکاح ناجائز بتلاتے ہیں۔ مگر زنا میں ان کا نمبر سب سے اول رہتا ہے۔ پادری اسحٰق ٹیلر جو مدتوں ممالک افریقہ میں رہا ہے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ عیسائی مذہب کی اشاعت اسلامی ممالک میں ناممکن ہے کیونکہ عیسائیت کی تعلیم اس قابل نہیں کہ فطرت کے معیار پر لوگ اس کا موازنہ کر سکیں۔ یہ لوگ جن باتوں کو اسلام کے حق میں قابل اعتراض بتلاتے ہیں ان میں خود نہایت ہی بُری روش سے گرفتار ہیں۔ اسلام قواعد شریعت کی پابندی بتلاتا ہے اور کسی امر خلاف شریعت کو جائز نہیں رکھتا۔ عیسائی ممالک میں خود اولاد الحرام کے لئے غریب خانوں کا قائم کرنا عیسائی اُمت کی زناکاری کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ دیکھیے باوجود تقدس کے جب جرجیس پادری نے وہ تالاب صاف کروایا جو اس گرجا کے متعلق تھا جس میں مجرد عورت و مرد عیسائی دین کے مقدس بنکر رہتے تھے تو اس تالاب میں سے سینکڑوں کھوپریاں حرامی بچوں کی نکلیں! الخ

له حکم پردہ کے متعلق ہم نے اسی کتاب میں مفصل و مدلل بحث کر دی ہے ۱۲ منہ

جو اِدھر اُدھر پھینک دئے گئے یا کہ حمل گرائے گئے۔ اُنکا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ حال ہی میں اکثر اصحاب نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ ایک پادری صاحب علاقہ جنوبی ہند کے ایک لڑکیوں کے یتیم خانہ کے مہتمم تھے وہ سولہ کس یتیم لڑکیوں سے مُنہ کالا کر کے انگلستان بھاگ نکلے جہاں سے وہ بذریعہ وارنٹ طلب کئے گئے۔ معلوم نہیں کہاں کی سیر کی ہوگی؟ چنے یہ نظائر جن کی اصلیت میں کسی کو شک و شبہ نہیں محض بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ معترضین کا اسلامی شریعت سے انحراف کرنا کن بُرائیوں کا مستلزم ہے؟ کاش! اگر یہ لوگ فطرت الٰہیہ کے قوانین میں غور کرتے اور دیانت و تقوےٰ سے کام لیتے تو اسلامی شریعت کی حکمت سے واقف ہو کر جہنم کی جلتی آگ کا ایندھن نہ بنتے۔ میں چند اقوال ان منصف مزاج پادریوں کے بھی یہاں نقل کرتا جنہوں نے ایک سے زیادہ نکاح کی ضرورت کو محسوس کر کے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ منجملہ جنکے لوتھر جرمن ریفارمر بھی ہے۔ مگر بخوف طوالت ان کو چھوڑنا پڑا ہے ٭

(۴) اب میں تحقیقی طور پر اسلامی شریعت کی اس حکمت کو بیان کرتا ہوں۔ جو تعدد ازدواج میں مضمر رکھی گئی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی فطرت چند فطری قوتوں پر مشتمل ہے۔ کوئی عام آدمی ہو یا کوئی خاص فطری قوت کے مقتضے میں سب برابر ہیں انسان جس طرح اپنی ذات کی بقا کے لئے طلب غذا کا محتاج ہے اسی طرح بقار نسل کا بھی محتاج ہے۔ کسی شریعت کا ضروری اور بہتم بالشان اُصول یہ ہونا چاہئے۔ کہ وہ ان انسانی قوار فطریہ کو اعتدال کی صراطِ مستقیم پر چلانا تعلیم کرے۔ اگر کسی شریعت میں یہ امر ملحوظ نہیں تو وہ شریعت کبھی نوع انسانی کے لئے قطعی حجت نہیں قرار پا سکتی۔ اسلام پاک نے ہر ایک فطری قوت کے استعمال کے لئے کیفیت و کمیت کی ایسی صراط مستقیم بتلادی ہے جو نہ تو بہائم کی طرح نفس پروری سکھلاتی ہے اور نہ بالکل رہبانیت

اور قطع تعلق کی تعلیم دیتی ہے ۔ اور یہی ایک امر کسی مذہب کی صداقت کی اعلیٰ دلیل ہو سکتا ہے ۔ مسئلہ ازدواج کے متعلق بھی شریعت حقہ نے اسی حکمت کو مدنظر رکھا ہے ۔ لیکن میں قبل اس کے کہ وجہ جواز تعدد ازدواج کو ظاہر کروں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ کسی نبی کی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ ان تمام مروجہ مفاسد کا استیصال کرے جو برخلاف فطرتِ انسانی لوگوں میں جاری ہوں ۔ اور ایک ایسا جامع دستور العمل وضع کرے جس پر بمقتضائے فطرت صحیحہ تمام لوگ کاربند ہو سکیں ۔ چونکہ اسلام دُنیا کا آخری اور قطعی آسمانی مذہب ہے اس لئے ضروری تھا کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق نہ صرف جُہال عرب کی اصلاح کا ذمہ لیتا بلکہ تمام دنیا کی آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک قاعدہ کلیہ وضع کرتا جس میں پھر کسی ترمیم کی ضرورت نہ ہوتی ۔ چنانچہ اِسی کتاب میں ضرورت نبوت کے مضمون میں اس امر کا بیان کر دیا گیا ہے اس مضمون کو زیادہ واضح کرنے کے لئے میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ پہلے اہل عرب کے ان متعدد طریق نکاح کا ذِکر کردوں جو زمانۂ جاہلیت میں مرّوج تھے اور جن کا اسلام پاک نے استیصال کر دیا ۔ اہل عرب میں نکاح کے حسب ذیل طریق تھے :-

(اوّل) نکاح عام سب سے مہذب طریق کا نکاح جو قریش اور دیگر شرفائے عرب میں مرّوج تھا ۔ اس کی صورت آجکل کے نکاح سے جو مسلمانوں میں رائج ہے ملتی جلتی تھی اور یہ نکاح اور نکاحوں سے بہتر خیال کیا جاتا ۔ اِس کا طریق یہ تھا کہ ایک مرد دوسرے مرد سے اس کی بیٹی یا اس عورت کی جو اسکی ولایت میں ہوتی منگنی کی درخواست کرتا اور اس کا حق مہر مقرر کرتا ۔ جب وہ شخص منگنی منظور کر لیتا تو مہر کی معیّن مقدار پر جس کا اس مجلس میں ذکر ہوجاتا اُس کے ساتھ عقد ہو جاتا ۔ منگنی کی درخواست عورت کے باپ یا بھائی یا چچا یا چچا زاد بھائیوں سے کرتے تھے ۔ لوگ جب منگنی کی درخواست کرتے تو عورت کے باپ

یا ولی سے کہتے کہ خدا کرے تم پر صبح خوش رہے کہ ہم تمہاری ذات برادری کے ہیں۔ اگر تم ہم سے اپنی بیٹی بیاہ دو تو ہماری خوشی پوری ہو جائیگی اور ہم تمہارے ہو جائینگے اور ہم تمہاری تعریف کرتے ہوئے تمہاری فرزندی میں داخل ہو نگے اور اگر کسی علت کی وجہ سے جس کو ہم بھی جانتے ہوں تم ہمیں محروم لوٹاؤ گے تو ہم تم کو معذور سمجھ کر لوٹ جائینگے۔ اگر عورت کی قوم سے خاطب کی قرابت قریبہ ہوتی اور اس کی منگنی منظور ہو کر اس کے ساتھ عقد ہو جاتا تو رخصت کے وقت لڑکی کا باپ یا بھائی لڑکی سے کہتا کہ خدا کرے جب تو اس کے پاس جائے تو عیش و آرام سے رہے اور لڑکے جنے۔ نہ لڑکیاں۔ خدا تجھ سے کثیر التعداد اور عزت والے اشخاص پیدا کرے اور تیری نسل ہمیشہ رہے۔ اپنا خلق عمدہ رکھنا اور اپنے شوہر کی عزت و تعظیم کرنا اور پانی کو خوشبو سمجھنا ✦

اگر عورت کسی اجنبی اور پردیسی سے بیاہی جاتی تو اس کا باپ یا بھائی اس سے کہتا کہ خدا کرے نہ تو عیش و آرام میں رہے اور نہ لڑکے جنے۔ کیونکہ تو اجنبیوں سے قریب ہو گی اور دشمنوں کو جنے گی۔ اپنا خلق عمدہ رکھنا اور اپنے شوہر کے عزیز و اقارب کی نظر میں پیاری بنی رہنا کیونکہ انکی آنکھیں تیری طرف اٹھی ہوئی ہو نگی اور ان کے کان تیری طرف لگے ہوئے ہو نگے اور پانی کو خوشبو سمجھنا ✦

قریش اور عرب کے اکثر قبائل میں یہی نکاح رائج تھا اور اکثر شریف اور خاندانی لوگ اسی نکاح کو پسند کرتے تھے ✦

(ب) نکاح استبضاع۔ اس کا طریق یہ تھا کہ جب عورت حیض سے پاک ہو جاتی تو اس کا شوہر اسکو خود اجازت دیتا کہ فلاں رئیس یا شریف قوم سے ہم بستر ہو لے۔ وہ عورت اس سے ہم بستر ہوتی۔ اور جب تک وہ

اس شخص سے حاملہ نہ ہو جاتی اُس کا شوہر اُس سے ہمبستری نہ کرتا مگر جب اُس سے اُس کا حمل قرار پا جاتا تو اُس کا اصلی شوہر اس سے جس وقت چاہتا ہم بستر ہوتا۔ استبضاع ان سرداروں اور رؤسا کے ساتھ کراتے تھے جو شجاعت یا شرافت و سخاوت وغیرہ اوصاف میں مشہور ہوں۔ اور اس سے غرض یہ تھی کہ بچہ شریف النسب پیدا ہو۔ یہ قریباً وہی رسم ہے جس کو ہندو نیوگ کہتے ہیں ؟

(ج) چند آدمی جمع ہو کر جو دس سے کم ہوتے کسی عورت کے پاس جاتے اور باری باری اُس سے ہم بستر ہوتے۔ یہ عمل طرفین کی رضامندی سے ہوتا۔ جب عورت حاملہ ہو کر بچہ جنتی تو وہ ان سب کو اپنے پاس بلواتی۔ وہ سب کے سب اس کے پاس جمع ہو جاتے اور کسی کو انکار کی مجال نہ ہوتی۔ جب سب جمع ہو جاتے تو وہ ان سے کہتی کہ تم نے جو میرے ساتھ کیا ہے تمہیں معلوم ہے۔ اب بیٹے یہ بچہ جنا ہے اور وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کر کے کہتی کہ اے فلاں یہ تیرا بیٹا ہے۔ سو تو اس کا نام تجویز کر۔ وہ شخص اس کے قبول کرنے سے انکار نہ کر سکتا تھا یہ رسم نرینہ اولاد کے لئے ہوتی۔ اور اگر لڑکی پیدا ہوتی تو اُس کے لئے اس کی ضرورت نہ ہوتی تھی کیونکہ لڑکیوں کو عموماً زندہ ہی دفن کر دیا کرتے تھے ؟

(د) بہت سے آدمی جمع ہو کر عورت کے پاس جاتے وہ کسی کو اپنے پاس آنے سے منع نہ کرتی اور غیر معین اور بے تعداد آدمیوں سے ہم بستر ہوتی یہ فاحشہ عورتیں تھیں جو اپنے دروازوں پر جھنڈیاں قائم کر دیتی تھیں تاکہ اس قسم کی تجارت کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ ان نشانوں کو رایت کہتے تھے۔ اور ایسی عورتیں بغایا کہلاتی تھیں۔ بچہ پیدا ہونے پر وہ سب اس کے پاس جمع ہو جاتے اور قیافہ شناس کو بلاتے۔ قیافہ شناس بچہ کو جس کے زیادہ مشابہ پاتا اُسی کا بیٹا قرار دیتا۔ مرد اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ہشام بن الکلبی نے اپنی کتاب المثالب میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور ایسی عورتوں کی ایک فہرست اسم وار لکھی ہے۔ چنانچہ ام مہزول سب سے زیادہ مشہور

تھی - اسی بدرسم کے استیصال میں آیہ الزانیۃ لا ینکحھا الا زان او مشرک نازل ہوئی ؛

(ہ) نکاح الخدان - ایک قسم کا ناجائز تعلق ہوتا تھا جس کو یارانہ بولتے ہیں جاہلیت کے لوگ کہا کرتے تھے کہ جو نکاح چھپا کر کیا جائے اُس میں مضائقہ نہیں ہے لیکن جو نکاح ظاہر ہو وہ منحوس ہے یہ بھی عام طور پر جاری تھا - آیۂ متخذات اخدان میں اسی کی ممانعت وارد ہوئی ؛

(و) نکاح المتعہ - مرد ایک وقت معیّن تک کسی عورت کو اپنے نکاح میں لے لیتا اور وہ مدت گذرنے پر ہر دو علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ؛

(ز) نکاح البدل - ایک مرد دوسرے مرد کو اپنی بیوی سے ہم بستر ہونے کی اجازت دیدیتا اور اسی طرح وہ دوسرا پہلے کو اپنی بیوی سے ؛

(ح) نکاح الشغار - ایک شخص اپنی بیٹی یا بہن یا بھتیجی یا کسی اور عزیزہ کو اس شرط پر کسی کے نکاح میں دیدیتا کہ وہ اپنی بیٹی یا بہن یا بھتیجی یا کسی اور عزیزہ کو اُس کے نکاح میں دیدے - اس میں کسی قسم کا حق مہر نہ ہوتا تھا - بلکہ یہ آپس کا تبادلہ یعنی ایک کا نکاح دوسرے کے نکاح کا مہر ہوتا تھا - حدیث شریف میں اس کی ممانعت موجود ہے ؛

(ط) ایک شخص بلا تعداد بیویاں نکاح میں لے آتا اور ان کے حقوق نان ونفقہ وشب باشی سے عہدہ برا نہ ہو سکتا ؛

اہل جاہلیت ماں - بیٹی - خالہ - پھوپھی - بہن - بھانجی - بھتیجی اور ان تمام عورتوں سے نکاح نہیں کرتے تھے - جن سے شریعت اسلام میں نکاح کرنا حرام ہے - ان رشتہ داروں کو خواہ وہ نسبی ہوں یا رضاعی نکاح میں لانا حرام جانتے - خصوصاً اہل قریش اس بارہ میں بڑے حیا اور غیرت والے تھے - وہ ان ارحام قریب کی حرمت کا پورا

پورا پاس رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے ہاں جو عورتیں محرمات ہیں جاہلیت میں ان سے صرف دو صورتیں مستثنیٰ تھیں۔ اوّل یہ کہ وہ لوگ اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ اس میت کا ترکہ متصوّر کرتے تھے۔ باپ کی بیوی کا سب سے زیادہ مستحق اُس کا بڑا بیٹا خیال کیا جاتا تھا۔ اگر وہ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا تو بے تامل کرلیتا۔ کوئی عیب نہ تھا۔ جو لوگ اس قسم کا نکاح کرتے تھے اُن کو ضیزن کہا جاتا تھا۔ بنی قیس بن ثعلبہ میں سے تین بھائیوں نے یکے بعد دیگرے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا۔ اوس بن حجر تمیمی ان کو اُنکے اس فعل پر یوں عار دلاتا ہے ؎

نبکو! فکیہة وامشوا حول قبتها
فکلکم لابیه ضیزن سلف

ترجمہ: فکیہہ سے ہم بستر ہو اور اس کے قبہ کے گرد چکر لگاؤ۔ تم سب اپنے باپ کے ضیزن سلف ہو ٭

اگر میت کا بڑا بیٹا اس کی بیوی سے نکاح نہ کرنا چاہتا تو اس کے چھوٹے بھائی کرلیتے اور اگر وہ بھی نہ چاہتے تو میت کا اور کوئی قریبی رشتہ دار کرلیتا۔ اس میں عورت کی رضامندی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ میت کا ترکہ خیال کی جاتی تھی۔ اور جو کوئی اُس پر اپنا کپڑا ڈال لیتا وہی اس کے نکاح کا مالک ہو جاتا۔ جاہلیت میں اس نکاح کو نکاح مقت کہتے تھے اور جو اولاد اس نکاح سے پیدا ہوتی تھی اس کو مقتی۔ قرآن مجید میں خدائے کریم نے اس نکاح کو حرام فرمایا اور مذمت میں یہ آیت نازل فرمائی ولا تنکحوا ما نکح اٰباؤکم من النساء الا ما قد سلف انہ کان فاحشۃ ومقتا وساء سبیلا۔ یعنی جن عورتوں سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہے تم اُن عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ پہلے جو ہو چکا سو ہو چکا۔ یہ نکاح بے حیائی اور خدا کے غصہ کا باعث ہے

دوسری صورت جو شریعت اسلام کے خلاف تھی یہ تھی کہ ایک شخص اپنے نکاح میں دو سگی بہنیں ایک وقت میں جمع کر لیتا تھا۔ اس میں بھی ان کے نزدیک کوئی عیب نہ تھا۔ خدائے تعالیٰ نے اس کو بھی ان تجمعوا بین الاختین نازل فرما کر حرام فرمایا یعنی تم کو دو بہنوں کا ایک وقت میں نکاح میں جمع کرنا حرام ہے ؛

جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد معین نہ تھی۔ مرد جس قدر بیویاں چاہتے کر لیتے چنانچہ جب قیس بن حارث مسلمان ہوئے تو اس وقت ان کے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں اور غیلان بن سلمہ ثقفی کے اسلام قبول کرنے کے وقت انکے نکاح میں دس عورتیں تھیں۔ اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار نکاحوں کی اجازت دی اور اس سے زیادہ کی ممانعت کر دی ؛

مذکورہ بالا اقسام نکاح اہل عرب میں حضور علیہ السلام کی بعثت کے وقت عام طور پر رائج تھے۔ ایک عقلمند آدمی بشرطیکہ تعصب کو بالکل بالائے طاق رکھدے یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی غیرت ہرگز اس امر کی مقتضی نہ تھی کہ ایسے بُرے وقت میں ان لوگوں کی اصلاح کے لئے کسی نبی کو مبعوث نہ کیا جاتا کیونکہ فطرۃ اللہ ہمیشہ اپنے طبعی اسباب کے رُو سے غالب آکر باطل کو بے نام ونشان کر دیا کرتی ہے ؛

آیت مذکورہ بالا جس پر معترض کا اعتراض مبنی ہے نہایت وضاحت کے ساتھ تعدد ازدواج کو روک رہی ہے۔ کیونکہ اس آیت کے آگے الفاظ وان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ موجود ہیں یعنی اگر تمہیں ایک سے زیادہ نکاح کرنے میں ڈر ہو کہ تم تمہیں ہر ایک طرح مساوات حقوق کو ملحوظ نہ رکھ سکو گے تو ایک ہی پر قانع رہو۔ یہ الفاظ درحقیقت ایک کافی روک ہیں تعداد ازدواج کے لئے بشرطیکہ کوئی شخص حقیقت عدل کو باریک نگاہ سے دیکھے۔ اور خود دوسرے مقام پر خداوند کریم

نے نہایت وضاحت سے اس وقت عدل کی حقیقت کو بیان کر دیا حیث قال ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل یعنی تم عورتوں میں ہرگز عدل قائم نہیں رکھ سکو گے اگرچہ تم اس بات پر حرص بھی کرو۔ سو تم ایک ہی پر پورا پورا مت جھک پڑو۔ غور کرو کہ کس زور کے ساتھ انسانی کمزوری کا بیان کیا ہے اور خود جناب سرورِ کائنات ایک حدیث میں اس اشکال کی طرف یوں اشارہ فرماتے ہیں اللّٰھم ھذا قسمی فیما املک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک یعنی خدایا! یہ تو ازدواج میں میری تقسیم ہے جس کا میں مالک ہوں سو تو کسی ایسی فروگذاشت پر جو تیرے قبضۂ قدرت میں ہے اور میرے اختیار[1] سے باہر ہے مجھے ملامت نہ کر۔ لوگوں نے حقیقت عدل کو ایک سرسری بات سمجھ کر اس آیت کے مفہوم پر بہت بری طرح عملدرآمد کرنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین نے بجائے اس کے کہ آیۂ مذکورہ بالا کو تعدد ازدواج کی ممانعت کا حکم خیال کرتے وجوب تعدد نکاح پر محمول کیا (عمداً یا غلطی سے) بہرصورت یہاں دو امر قابلِ لحاظ ہیں۔ اوّل یہ کہ انسانی تمدنی تعلقات کے رو سے آیا مرد کو بمقتضائے فطرت کبھی ایک سے زیادہ نکاح کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے۔ دوم یہ کہ اگر ایک سے زیادہ نکاح کرے تو آیا وہ شخص عین اس حکم کے مطابق جو منشاء قرآن ہے اپنی بیویوں میں من کل الوجوہ مساوات قائم رکھ سکتا ہے؟ امر اوّل کے متعلق صرف یہی کافی ہے کہ ضروریات بشریت کی کمیت و کیفیت چونکہ ہر ایک فرد بشر کے لئے مختلف ہے۔ کیونکہ ہر ایک کے قوائے فطریہ اور تمدنی حالات ایک ہی درجہ پر کبھی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ایک عورت کسی شخص کی تمام ضروریات بشریہ کو پورا نہ کر سکے۔ عورت کا بانجھ ہونا۔ دائم المرض ہونا۔ حاملہ

---

[1] واضح ہو کہ حضورؐ کی یہ دعا محض بغرض اظہار عبودیت تھی جو شیوۂ انبیا علیہم السلام ہے ورنہ جناب سے بڑھ کر عدل کون کر سکتا ہے گویا ایک طرح سے یہ حدیث آیہ لن تستطیعوا کی تفسیر ہے۔ ایک موقع پر تقسیم غنیمت کے وقت حضورؐ نے ایک معترض کو فرمایا اذا انا لم اعدل فمن یعدل۔ یعنی اگر میں عادل نہیں تو پھر کون عادل ہے ۱۲ منہ

ہو کر مرد کو قریبًا سال بھر تک کے لئے باز رکھنا حالانکہ وہ فطرتًا ایسا قوی الخلقت ہے کہ وہ باز نہیں رہ سکتا اور نیز دیگر تمدنی ضروریات وغیرہ ایسے امور ہیں کہ کوئی شخص اگر ان کو نظرانداز کردے تو کسی دوسری صورت میں ان کے مفاسد بہت بری طرح سے اپنا اثر دکھائینگے اس لئے کوئی سمجھدار اس بات کو جائز نہیں رکھ سکتا کہ ایک شخص باجازت شریعت وخلاق کیوں اپنے قوائے فطریہ کو بمعطل چھوڑے یا کسی مفاد و تمدنی سے محروم رکھا جائے۔ یہ کیسی سراسر حماقت ہے کہ ایسے امر کو جو محض بمقتضائے فطرت اختیار کیا جاتا ہے تعصب یا جہالت سے قابل اعتراض ظاہر کیا جاتا ہے۔ سچ کہا ہے سرزمین مصر کے ایک مسلمان فاضل نے کہ اگر شریعت محمدیہ کا نزول کہیں ممالک یورپ میں ہوا ہوتا تو اہل یورپ اس کی صداقت کا چاردانگ عالم میں ڈنکا بجادیتے۔ مگر تعصب بہت برا مرض ہے ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد

صد ہزاراں پردہ سوئے دیدہ شد

امر دوم کے متعلق جب کیفیت عدل کو مدنظر رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو شہوت رانی اور نفس پرستی سے قطعًا روک دیا گیا ہے کیونکہ جو امر بغرض شہوت پرستی کیا جائیگا وہ سراسر عدل کے منافی ہوگا۔ اس کی تشریح یوں ہوسکتی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کرے اور ان میں مساوات قائم نہ رکھ سکے۔ تو چونکہ عدل من کل الوجوہ قائم رکھنا قریبًا ناممکن ہے اسلئے بالضرور افراط و تفریط میں مبتلا ہوکر شرعی مجرم قرار پائیگا کیونکہ اس معاملہ میں بالخصوص تفریط کی نسبت افراط کی طرف لوگ زیادہ مائل ہوتے ہیں اس لئے وہ افراط بضرور موجب فتنہ و فساد ثابت ہوگی اور اگر سب سے بے قاعدگی برتے گا تو اس کی زندگی وبال ہوجائیگی یا کثرت جماع اس کے حق میں مضر ثابت ہو کر اس کو وعید ولا تلقوا[1] بایدیکم الی التھلکۃ میں لا ڈالے گی

[1] خود اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو ۱۲ منہ

یہ ایسے اُمور ہیں جو روزمرہ ہمارے سامنے پیش آ رہے ہیں۔ خصوصاً طبقہ امراء میں تو کثرت عیاشی سے بہت بڑی بڑی نظیریں دیکھی جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں کیونکر گمان ہو سکتا ہے کہ شریعت اسلامی نے عام طور پر بلا ضرورت اور بلا مراعات حقوق ازواج یہ اجازت دی ہے کہ جس کا جتنی عورتوں سے جی کرے نکاح کرے۔ غالباً معترض نے الفاظ دُو دُو۔ تین تین۔ چار چار کو پکڑ لیا ہے اور اس کے مخالف وموافق پہلو پر کچھ غور نہیں کیا۔ حالانکہ اِن اعداد کے بیان سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تقاضائے فطرت کے رُو سے جبکہ مختلف اشخاص کے حالات طبعی و تمدنی مختلف ہوتے ہیں تو وہ کونسا ایسا جامع اصل ہے جو ان مختلف حالات و اوضاع کے اشخاص کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان تمام وجوہ اختلاف کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ سب کی ضرورتوں کو کسی خاص صورت میں محدود کر دیا جائے۔ اسلئے بعض محققین نے دیگر وجوہ اختلاف کو جو تمدنی ضرورتوں پر مبنی ہیں علیحدہ رکھ کر صرف انسانی قوائے فطریہ کے رُو سے چار نکاح کی ضرورت کو یوں ثابت کیا ہے کہ فرض کرو کہ زید بالکل ایک تندرست اور صحیح القویٰ شخص ہے جو عین اُٹھتی جوانی میں نکاح کرتا ہے۔ اب اگر پہلی ملاقات میں اسکی بیوی حاملہ ہو جائے تو بموجب اُصول طب جس کو آجکل کے ڈاکٹروں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ زید عورت کے حاملہ ہو جانے پر صرف اڑھائی ماہ اس کے ساتھ مباشرت کر سکتا ہے مگر عورت کو وضع حمل کے لیئے نو ماہ اور کچھ دن پورے کرنے ہونگے بعد ازاں چالیس دن تک اور انتظار کرنا پڑیگا اس طرح سے اس کو قریباً دس ماہ اُس عورت کی ہمبستری سے علیحدہ رہنا پڑیگا۔ مگر اس عرصہ میں چونکہ وہ صحیح القویٰ نوجوان ہے۔ اس خیال سے کہ کہیں ناجائز طور پر تقضائے شہوت نہ کرے دوسری منکوحہ کی ضرورت ہو گی۔ اب اگر اس کے ساتھ بھی یہی حالت پیش آئے تو پھر اس دوسری عورت کے

لہ میرے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ کوئی گھبراہٹ نہ ہو جو ہر وقت ڈاکٹروں اور طبیبوں کے دروازوں پر کھڑے نظر آتے ہیں تمام

وضع حمل اور ایام نفاس تک اس کو محترز رہنا ہوگا اسلئے تیسری عورت کی ضرورت ہوگی۔ فرض کرو کہ تیسری کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا تو چوتھی کی ضرورت ہوگی۔ اس چوتھی عورت کے حاملہ ہونے پر اڑھائی ماہ کا عرصہ اس کے ساتھ ہم بستر ہوتا رہیگا اور اس عرصہ کے بعد وہ پہلی عورت ایام وضع حمل اور نفاس کو پورا کر چکی ہوگی۔ اس لئے وہ اسے کام دینے کے قابل ہو جائیگی۔ اس طرح سے اس کے دس ماہ کٹ جائینگے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو وہ نوجوانی کی ترنگ میں کسی ناجائز طریق کا مرتکب ہو جاتا اسلئے خاص حالات میں چار بیویوں کا نکاح میں لانا ہرگز خلاف فطرت انسانی نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ از روئے تجربہ و مشاہدہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عورت چالیس پینتالیس سال تک پانچ چھ بچے جن کر عجوز نو دسالہ ہو جاتی ہے اور مرد بشرطیکہ بالکل صحیح و تندرست ہو ستر سال تک بھی بچہ پیدا کرنے کے قابل ہوتا ہے بلکہ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ مدت تک۔

جو لوگ انسانی قوائے فطریہ کی حقیقت سے آگاہ ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ قوا رجاحلہ ہمیشہ اپنے فطری عمل کا تقاضا کرتی رہتی ہیں۔ مرد چونکہ عورت کی نسبت زیادہ قوی الفطرة ہوتا ہے اس لئے یہ خیال بالکل ساقط الاعتبار ہے کہ اگر مرد کو از روئے فطرت ایک سے زیادہ عورت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ عورت کو ایک سے زیادہ مرد کی ضرورت نہ ہو۔ کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ عورتوں کے چند امور فطریہ ایسے بھی ہیں جو اُن کو مرد کی طرح خواہش مباشرت سے مانع ہیں اور مردان سے بالکل بری ہیں مثلاً ایام حیض۔ ایام حمل۔ ایام نفاس۔ ایام رضاعت ایسے ایام ہیں جن میں عورت سے مباشرت کرنا اصول طب کے رُو سے منع ہے اور یہی حکمت ہے کہ شریعت حقہ نے بھی ایسے حالات میں ممانعت کر دی۔ اب اگر عورت کی اس مدت عمر سے جو بالغ ہونے سے اس وقت تک شمار ہو سکتی ہے جبکہ وہ بچہ جننے کی قابلیت رکھتی ہے ان ایام کو منہا کر دیا جائے

تو یقیناً ایک محدود مدت ایسی باقی رہ سکتی ہے جس میں عورت مباشرت کے قابل ہو۔ ہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عورت کو ان ایام میں ایک گونہ مباشرت سے نفرت بھی ہوجاتی ہے۔ گو کوئی جاہل ان موانع کو ملحوظ نہ رکھے مگر تقاضائے فطرت یہی ہے کہ رکا رہے۔ اب اگر مرد کو عورت کے ساتھ ایک ہی راستہ پر چلایا جاوے تو کیسی مشکلیں پیش آئینگی۔ کیونکہ فطرت ایک کو تو معذور قرار دے رہی ہے اور دوسرے کو کامل القدرۃ۔ پھر ہر دو میں مساوات کیونکر متصور ہوسکتی ہے؟ جن لوگوں نے عورت کو بھی اس امر میں مرد کے برابر رکھنا چاہا ہے۔ انہوں نے عورتوں کے ان ضروری موانع کو بالکل نظر انداز کردیا ہے بلکہ عورت کو اپنی حالت پر قیاس کرکے ایک بے معنی اور مہمل سی رائے قائم کرلی ہے۔ مگر نظر دقیق تو اس کو باطل کررہی ہے۔ غالباً یہ اعتراض آریہ ہندوؤں کا ہے۔ جن کو قواعد نظر و استدلال سے بالکل محروم رکھا ہے۔ بظاہر انہوں نے اسلام پاک پر یہ اعتراض کیا ہے مگر در اصل نیوگ کی وجہ جواز قائم کرنا متصور ہے۔

اسلام تعدد ازدواج کے لئے بربنائے ضرورت فطری انسان کو جواز کا راستہ بتلاتا ہے نہ یہ کہ ہر ایک شخص کو خواہ مخواہ لاتعداد بیویوں سے نکاح کرلینا واجب ہے۔ حاشا وکلا یہ خیال اسلام پاک پر محض بہتان و افترا ہے اور اگر کوئی عقلمند بلا تعصب اس مسئلہ کی اصلیت پر غور کرے تو اسے معلوم ہوجائیگا کہ کس خوبی کے ساتھ اسلام پاک نے انسانی فطرت کے تقاضا کو جو بلحاظ اصول تمدن و معاشرت لابدخیال کیا گیا ہے ملحوظ رکھ کر ناجائز طور پر قضائے شہوت سے روکا ہے! میرے خیال میں جن مذاہب میں ایسی فطری ضرورتوں کے لئے کوئی چارہ جوئی نہیں رکھی گئی ان میں زنا اور دیگر ضروری مفاسد کی نسبتاً کثرت ہے۔ ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ فطرتاً ایک مرد کو صرف ایک عورت کافی ہے۔ مگر جب فطرت ہی انسان کو خاص خاص ناگزیر موانع اور حالات کے پیش آنے کی صورت میں دوسری عورت کی ضرورت پر مجبور کرے۔ تو اس صورت میں دوسری عورت

سے نکاح کرنا بھی فطرت ہی کا تقاضا ہوگا نہ کسی امر خلاف فطرت کا۔ عربی میں ایک مشہور ضرب المثل ہے اذا بلیت ببلیتین فاختار واھونہما۔ یعنی جب تم دو مصیبتوں میں پڑ جاؤ تو جو اُن میں سے آسان ہو اُسے اختیار کرو۔ اب اگر کوئی شخص ایسی حالت میں گرفتار ہو کہ اِدھر اُسکو ایک بانجھ عورت سے پالا پڑا ہے اور دوسری طرف بہ تقاضائے فطرت وہ اپنی بقائے نسل کو ضروری سمجھتا ہے تو بتلائیے وہ کیا کرے؟ کیا عیسائی مذہب کی پابندی کرکے دُنیا سے نامراد رخصت ہو یا یہ کہ دوسری عورت سے نکاح کرکے جائز طور پر اولاد پیدا کرے؟ بھلا ایسا جماد بے حس و حرکت کون ہوگا جو اس مجبوری کو گوارا کر سکے اور عیسائی اُمت کا ایک کے سوا دوسری بیوی سے نکاح کرنے سے روکنا محض بے سود اور بے معنی بات ہے۔ کیونکہ کہیں دوسری عورت سے ممانعت انجیل میں وارد نہیں ہوئی۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی پر قناعت کرو۔ سو یہ ہم بھی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے کیونکہ اسلام بھی یہی کہتا ہے وان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ۔ انجیل کی تعلیم مجمل تھی قرآن مجید نے اس اجمال کی تفصیل جملہ شرطیہ کی صورت میں کردی۔ بات ایک ہی ہے اور ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ پہلی شریعتوں کے احکام میں زیادہ شدت ملحوظ تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو دیکھو کیسے کیسے سخت احکام کی پابندی انپر لازم قرار دیگئی۔ اسی طرح مسیح علیہ السلام کی فطرت پر چونکہ زہد و رہبانیت زیادہ غالب تھی اور اس زمانہ میں اُن مفاسد کی کثرت نہ تھی جو شروع اسلام میں عام طور پر موجود تھے اُنہیں ایسی ہی تعلیم دیگئی مگر اسلام نے تمام شریعتوں کا خلاصہ اور عین صراط مستقیم یعنی ایک معتدلانہ احکام کا مجموعہ ہمارے سامنے پیش کیا۔ مع ہذا توریت کی تعلیم تعدد ازدواج کو جائز رکھتی ہے۔ چنانچہ پادری لوگوں نے نظر عمیق کے بعد اس کا فتویٰ دیدیا۔ (دیکھو کتاب اصلاح السہو مطبوعہ امریکن مشن پریس ۱۸۷۱ء) اس کتاب میں صاف لکھا ہے کہ خدا نے منع نہیں کیا بلکہ دوسری بیوی سے برکت کا وعدہ کیا ہے اور مارٹن لوتھر نے فلپ کو دو بیویوں کی اجازت دیدی۔

اِس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام پاک ہر ایک قسم کی نفس پرستی کا دشمن ہے۔ چنانچہ تمام احکام شرعیہ میں انکے محض خالصاً لوجہ اللہ بجالانے کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے محض شہوت رانی کی نیت سے اگر کوئی شخص بلا ضرورت دوسرا نکاح کرتا ہے تو وہ اسلامی تعلیم کا حکم نہیں سمجھا جائیگا بلکہ اس شخص کی اپنی ہوائے نفس کا نتیجہ ہوگا۔ اگر اُمرا یا دیگر عیش پرست مسلمان ایسا کرتے ہیں تو یہ امر انکی شرعی خلاف ورزی پر محمول ہونا چاہئے۔ اس سے اسلام پاک کیونکر مطعون ہو سکتا ہے؟ اسلام کے احکام عین حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں اور اگر ان کی پابندی کما حقہ کیجائے تو کسی پہلو میں بھی قابل اعتراض ثابت نہیں ہونگے۔ غالباً مخالفین نے ایسے ہی چند مسلمانوں کے حالات دیکھکر اسلام پاک کو عرضۂ طعن بنالیا ورنہ جس طریق ازدواج کو اسلام نے پیش کیا ہے وہ تعدد ازدواج کا سخت مانع ہے بلکہ وہ افراط و تفریط کے درمیان اعتدال قائم رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ اور ؎

زنِ نو کن اے مرد در ہر بہار ٭ کہ تقویم پارینہ ناید بکار

اور

مرا بیک دم شہوت کہ خاک برسر او ٭ اسیر زن نتواں شد بسالہائے دراز

ہر دو کو باطل کرتا ہے۔ کیونکہ پہلا خیال کسی عیش پرست دُنیادار کا ہے اور دوسرا کسی خشک زاہد کا جو حقیقت فطرت سے بے خبر ہے ٭

مسئلہ تعدد ازدواج کے متعلق اِس امر کا بیان کردینا بالخصوص ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیویوں میں عدل کر سکنے کا معیار مرد کی رائے پر موقوف ہے جو احکام شرعیہ متعلقہ نان و نفقہ و شب باشی وغیرہ کے رُو سے قرار پائے۔ کیونکہ محض اپنی رائے سے کبھی عدل کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اسلئے ضروری ہے کہ اپنی رائے کو اس بارہ میں احکام شریعت کے مطابق قائم کیا جائے۔ بعض کوتاہ اندیشوں نے یہ بھی اعتراض کیا

سبب نہ عورت کو اس بارہ میں کچھ اختیار نہیں دیا گیا بلکہ عدل کا معاملہ مرد ہی کی رائے پر
ملی توقف ہے کہ جس حالت کو وہ مناسب سمجھے اسی کو عدل کہا جائیگا۔ مگر یہ اعتراض حکم
شریعت کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ حقیقت عدل کا قائم کرنا شریعت کا کام ہے
نہ کسی دوسرے شخص کا۔ اور شریعت نے جو کچھ حکم دیدیا ہے وہ عین عدل ہے کیونکہ
جو حقیقت شریعت نے عدل کی بتائی ہے اس میں کسی طرح بھی کسی ایک عورت کی حق تلفی
لازم نہیں آتی۔ اور تعجب یہ ہے کہ معترض کیونکر حقیقت عدل کے قائم رکھنے کے لئے
عورت کی رائے کو بھی دخیل قرار دیتا ہے۔ کیونکہ عدل کی بجاآوری تو مرد پر فرض ہے۔
عورت کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ پھر یہ قرار دینا کہ فلاں امر عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔
اس میں مرد ہی کی رائے جو تابع احکام شریعت ہے معتبر ہونی چاہیئے نہ عورت کی۔
عورت اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے کبھی جائز نہ رکھیگی کہ شوہر دوسرا نکاح کرے مگر
مگر بضرورت شریعت اس کی اس رائے کو رد کرتی ہے یا ایک عورت دوسری عورت کے
ساتھ کیونکہ مرد کو طریق عدل قائم رکھنے دیگی۔ اگر مرد ایک عورت سے رائے لیگا تو
وہ یقیناً دوسری کے برخلاف ہوگی۔ اور اس لئے ممکن بلکہ اغلب ہے کہ خلاف شریعت
ہو اسلئے گو بظاہر عدل قائم کرنے میں مرد اور عورت ہر دو معزول الاختیار رہیں۔ ہر دو
کو شریعت کا تابع ہونا ضروری ہے۔ مرد صرف ان احکام کی بجاآوری کا متکفل ہے
نہ ان احکام کے وضع کرنے کا۔ پس معترض کا اعتراض بالکل بےمعنی ہے ؛

(۵) مرد اور عورت میں ازدواج کے رُو سے گویا ایک قسم کا معاہدہ قائم ہو جاتا
ہے جسکی طرفین کو پابندی لازم ہوجاتی ہے۔ اس معاہدہ کے رُو سے ہر دو اپنے اپنے
مفوضہ فرائض کی نگہداشت کرتے ہیں۔ شریعت نے ہر دو کے فرائض کی علیحدہ علیحدہ
حدبندی کردی ہے۔ یہ معاہدہ سوائے خاص خاص حالات کے قابل انفساخ نہیں ہوتا
بعض جُہّال کا یہ خیال کہ انفساخ کا حق صرف مرد ہی کو دیا گیا ہے۔ شریعت اسلامی سے

ناواقفی کا نتیجہ ہے۔ اوّل تو انفساخ کے حالات ہی شاذ و نادر واقع ہوتے ہیں مگر ان میں بھی جس طرح مرد کو کسی وجہ وجیہ کے پیدا ہونے پر طلاق کا اختیار دیا گیا ہے اسی طرح خاص خاص حالات میں عورت کو بھی قاضی کے حضور میں حاضر ہو کر قطع تعلق زوجیت کا اختیار دیا گیا ہے۔ البتہ مرد کے اختیار کو نسبتاً زیادہ مستحکم رکھا گیا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کی فطرت چونکہ یکساں نہیں اسلئے حقوق تمدن و معاشرت میں بھی ہر دو کا درجہ علیحدہ علیحدہ تجویز کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس امر کو ہم نے اسی کتاب میں زیر عنوان حقوق الرجال والنساء دلائل عقلیہ اور حجج شرعیہ سے ثابت کر دیا ہے اور جو لوگ اس تفاوت حقوق کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتے انہیں اپنے دعوے کے دلائل اصول فلسفہ اور شریعت اسلامی ہر دو سے پیش کرنے چاہئیں۔ ہم صرف کسی ایسے دہری یا نیچری کے قول کو حجت نہیں سمجھتے جو محض اپنے ظن فاسد کی پیروی میں عورت اور مرد کے متحد الفطرۃ ہونے کا مدعی ہے۔ عیسائی لوگ کبھی اسلامی مسئلہ طلاق پر اعتراض نہ کرتے اگر وہ اس امر کا علم رکھتے کہ اسلام نے طلاق کی سخت ممانعت کر دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے تفریق بین المسلمین لازم آتی ہے جو منافی اصول اسلام ہے۔ ایک حدیث میں حضور علیہ السلام نے طلاق کو ابغض الحلال فرمایا ہے یعنی حلال امور میں سب سے برا اور ناپسند امر خدا کے نزدیک طلاق ہے۔ اور قرآن مجید میں نکاح زینب رضہ کا ذکر آیا ہے خداوند کریم حکایتاً فرماتا ہے امسک علیک زوجک واتق اللہ یعنی حضور بار بار زید کو یہ اشارہ فرماتے رہے کہ تو اپنی بیوی سے سمجھوتہ کر لے اور طلاق نہ دے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اسلام تمام مختلف افراد کو متحد بنانے کی تعلیم دیتا ہے فاصبحتم بنعمتہ اخوانا اور الفاظ واتق اللہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بلا کسی عذر کامل کے طلاق عمل تقویٰ کے برخلاف ہے اور طلاق اس اصل عظیم کو توڑتا ہے مگر چونکہ بعض حالات واقعی ایسے ناگزیر پیش آجاتے ہیں جنکی ضرورت کو

انسانی طرزِ معاشرت اور اُصول تمدن کے بطریق احسن قائم رکھنے کے لئے ہر ایک آدمی جو عقلمند ہو تسلیم کرسکتا ہے۔ اِس لئے میاں اور بیوی میں بالمعروف یعنی خوش معاملگی کی صورت میں علیٰحدگی کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ غور کرو کہ اگر حکم طلاق کسی مجبورانہ حالت میں بھی نہ دیا جاتا تو کسقدر مشکلات جانی اور مالی اور دیگر بدعنوانیوں اور بے اعتدالیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کی اصلیت سے تو کوئی سمجھدار ہرگز انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ بعض اوقات بمقتضائے اختلاف طبائع یا کسی دیگر ہوائے نفس میں گرفتار ہوکر منازعت اس درجہ تک تجاوز کرجاتی ہے کہ میاں اور بیوی ایک دوسرے کی جان کے بھی دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ کیسا سراسر ظلم اور جہالت ہوگی کہ اُنہیں باوجود فتنہ وفساد بھی تعلق زناشوئی پر مجبور کیا جائے۔ آخر تعلق ازدواج انسان کی عمدہ زندگی بسر کرنے کا ذریعہ ہے یا مصیبت میں پڑنے کا سے

وصلے کہ درو ملال باشد

ہجراں بہ ازاں وصال باشد

(۶) شریعت حقہ نے طلاق کے بارہ میں مرد اور عورت ہر دو کو محدود الاختیار کردیا ہے۔ جہاں مرد کو بلاوجہ طلاق سے روکا ہے۔ عورت کی نسبت بھی فرمادیا کہ جو عورت بلاوجہ طلاق حاصل کریگی اس پر جنت کی بُو حرام ہے۔ مسائل طلاق میں غور کرکے دیکھو صاف معلوم ہوگا کہ اسلام طلاق کا سوائے مجبورانہ حالت کے سخت دشمن ہے۔ طلاق کا تین طہر میں[1] وارد کرنا مشروع قرار دیا گیا ہے اور ایک ہی دفعہ تین طلاق کے عائد کرنے سے منع کیا۔ اسی طرح حیض کے دنوں میں طلاق کو بدعت کہا۔ ان سب احکام کی علت یہی ہے کہ ایام طہر میں ممکن ہے کہ میاں اور بیوی کی ملاقات سے پھر ہر دو میں محبت پیدا ہو جائے۔ اور تیسری طلاق کے پہلے تک

[1] طہر۔ ہر ماہ میں عورت کے ایام حیض کے علاوہ باقی دن جن میں ہم بستر ہوسکتے ہیں طہر کہلاتے ہیں ۱۲ منہ

جو طلاق بائن کہلاتی ہے۔ رجوع کا اختیار دیا۔ اس کی بھی علت غائی یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مصالحت ہو جائے اور نا چاقی کے زمانہ میں ہر دو کے رشتہ داروں کو مِلکر صلح کرا دینے کا حکم دیا گیا اور ایّام طلاق بلکہ ایّام عدّت میں مرد کے گھر میں عورت کا رہنا بھی اِسی حکمت پر مبنی ہے۔ الغرض طلاق صرف اس تفریق کا نام ہے جو کسی سخت سے سخت ناگزیر امر کے پیدا ہونے پر شریعت حقّہ نے جائز رکھی ہے اسلئے ایسے جواز کو مورد اعتراض قرار دینا ایسی حماقت ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔ کہاں ہیں عیسائی جو بجز زنا کے کسی دوسری مجبورانہ حالت میں خواہ وہ کیسی ہی نقصان مالی اور جانی پر مشتمل ہو طلاق کو جائز نہیں رکھتے؟ اور کہاں ہیں یہود جو بلا وجہ ایک ادنیٰ سی ادنیٰ بات پر طلاق کو جائز رکھتے ہیں؟ آئیں اور شریعت اسلامی کو دیکھیں کہ کس طرح یہود کے افراط اور نصاریٰ کی تفریط کے عین بیچوں بیچ واقع ہوئی ہے جس کو صراط مستقیم کہتے ہیں اور یہی اس کی صداقت کی زبردست دلیل ہے۔ سبحان اللہ! کیا پاک شریعت ہے جس نے فطرت انسانی کو نہایت عمدگی کے ساتھ ملحوظ رکھکر احکام کا ایک حقیقی دستور العمل تیار کیا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی جہالت سے اعتراض کئے جائے تو اس کی مرضی ورنہ حق اسلامی حدود سے یقیناً آگے تجاوز نہیں کر سکتا۔

(۷) مسئلہ ازدواج و طلاق کے اخیر پر مجھے بمناسبت مقام ضروری نظر آتا ہے کہ مخالفین کے اس اعتراض کا بھی جواب دوں جو وہ جناب سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد منکوحات کے بارہ میں کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں کچھ نئی نہیں مگر ان لوگوں کے لئے جو حقائق مذہب سے بالکل بے بہرہ ہیں ضروری معلوم ہوتی ہیں اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ایک نبی اللہ کی شان ارفع و اعلےٰ ہوتی ہے۔ اس امر سے کہ اسکی نسبت کوئی شخص نفس پرستی کا گمان کر سکے کیونکہ وہ معصوم ہوتا ہے اور اس کا معصوم ہونا واجب ہے ورنہ تمام احکام شرعیہ کا اعتبار اُٹھ جائیگا۔

اور کوئی شخص بھی دنیا میں اس قابل نظر نہ آئیگا جس کا قول و فعل حجت قرار پاسکے۔ کیونکہ جب نبی اللہ بھی ہوائے نفس کا تابع ہوا تو وہ نبی اللہ کیسا؟ لیکن اگر نبی اللہ کا کوئی فعل ایسا ہو جو بظاہر دوسرے لوگوں کے فعل سے متمیز ہو تو دیکھنا چاہیئے کہ وہ منافی شریعت ہے یا کسی خاص استثنائی صورت میں داخل ہے؟ جو کسی دوسری صورت میں بعین شریعت حقہ کی تابعہ پر مبنی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی حالت کا موازنہ کرنے میں اکثر مخالفین نے بہت کچھ بیجا الزام قائم کئے ہیں مگر سب کے سب اس غلط فہمی پر مبنی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو انھوں نے اپنی ذات پر قیاس کر لیا۔ مگر وہ یہ نہ سمجھے کہ ممکن ہے کہ ایک فعل زید کی نسبت جرم ہو اور وہی فعل عمرو کی نسبت عین مصلحت ہو۔ دنیا میں ہزاروں ایسے متشابہ امور ہیں جن میں بظاہر کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا۔ مگر عند التحقیق ان کی حقیقت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ زید مجلس میں ایک شخص کی تعریف غائبانہ حالت میں اس لیے کرتا ہے کہ سننے والوں کو بھی ذکر جمیل کی خواہش ہو اور وہ بھی نیک کام کریں اور عمرو بھی اسی شخص کی تعریف کرتا ہے مگر اس کا منشا یہ ہے کہ جب وہ شخص سنے گا تو میری طرف سے اس کے دل میں حسن ظن پیدا ہوگا اور اس طرح سے میں اس کا مقرب بن سکوں گا۔ ممکن ہے کہ ایک تیسرا شخص بکر بھی اسی کی تعریف کرنے لگے مگر اس کا منشا یہ ہو کہ خالد جو اس شخص غائب کی نسبت سوء ظن رکھتا ہے میری طرف سے اس کا سوء ظن رفع ہو جائے۔ علیٰ ہذا فعل ایک ہی ہے مگر اغراض علیحدہ علیحدہ ہیں اور یہ ایک ایسا امر ہے جس کی مثالیں روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گذرتی ہیں۔ مخالفین نے ایک سطحی بات کو لے لیا کہ حضرت کے متعدد ازواج تھے۔ مگر ان وجوہ کو نظر انداز کر دیا جن پر حضور کا متعدد ازواج کو نکاح میں لانا مبنی تھا۔ کفار بھی اسی طرح کا اعتراض کرکے کہا کرتے کہ یہ کیسا نبی ہے جو ہماری طرح ہی کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ بس ان کا مبلغ علم یہی تھا کہ نبی اللہ کو اپنے سے

زیادہ کچھ وقعت نہیں دیا کرتے تھے مگر حق یہ ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور دیانت کو چھوڑ جاتے ہیں اُن کے لئے ہر ایک قسم کی بددیانتی آسان ہو جاتی ہے اور وہ نفوس قدسیہ کو بھی اپنے پلید نفس پر قیاس کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہمارا ہر ایک فعل محض ہماری نفس پرستی پر مبنی ہے اسی طرح انبیاء بھی ہوائے نفس کے تابع ہوتے ہیں مگر حاشا وکلا۔ تشابہ فی الاشکال سے تشابہ فی الحقیقت لازم نہیں آسکتا ؎

کار نیکاں را قیاس از خود مگیر ٭ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شِیر

صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں ٭ فرق شاں ہفتاد سالہ راہ بیں

اس تمہید کے بعد میں اپنے ناظرین پر یہ امر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں جناب رسولِ عربی روحی فداہ وابی وامی ؐ کی خدا پرستی اور مقام عبودیت میں اعلیٰ سے اعلیٰ کمال روحانی کے لاکھوں شواہد آفتاب سے بھی زیادہ روشن موجود ہیں جو واقفان قرآن و سنت پر مخفی نہیں وہاں کسی ناتراشیدہ عیسائی یا نیچری کی بکواس کو گوز شتر سے زیادہ کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ اے نادانو! تم جناب رسول عربیؐ کی نسبت نفس پرستی کا الزام عائد کرتے ہو اور اس بات کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہو کہ حضورؐ کی تعلیم کا اصل اصول ہی ہوائے نفس کی مخالفت کرنا تھا۔ قرآن مجید نے تو ہوائے نفس کے پیچھے لگنے والے کو الفاظ افرایت من اتخذ الٰھہٗ ھواہ یاد کیا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص خود ہوائے نفس کا تابع ہو وہ دوسروں کو ہوائے نفس کی قید سے رہائی دے سکے؟ آخر وہ لوگ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت و وفاداری میں اپنے اقارب و اعزا اور اپنے املاک و جائداد سے دست کش ہو کر وطن مالوف کو خیرباد کہہ آئے تھے اور جو حضور علیہ افضل التحیات کی ادنے ادنے بات کی نہایت غور سے نگرانی کیا کرتے تھے حضورؐ کی حقیقت نفس کا موازنہ کرنے میں تم سے بھی گئے گذرے تھے جواب ڈیڑھ ہزار سال بعد محض الزام قائم کر دینے کو حجت سمجھے بیٹھے ہو۔ تم

حضور کی شان کو کیا سمجھ سکتے ہو۔ وہاں تو یہ حال تھا کہ جس کو معصیت اور گناہ سے بچنے کا کوئی حیلہ نہ سوجھا جب جناب کے آستانِ معلٰے پر آگرا تو تقویٰ اور ورع کے رنگ میں رنگا گیا۔ ذرا انصاف کرو اور خدا کے لئے دیانت سے کام لو کہ جس شخص کو نفس پرستی مقصود ہوتی ہے بھلا وہ ایسی عورتوں کو نکاح میں لاتا ہے جو اپنی جوانی کو دوسرے شوہروں کے ہاں گزار کر ایسی حالت کو پہنچ چکی ہوں کہ عموماً ان سے نکاح کرنا موجب وبال سمجھا جاتا ہے۔ تمام مورخ اس امر پر متفق ہیں کہ بجز جناب ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کوئی عورت باکرہ حضور کے نکاح میں نہیں آئی اور یہ سب کی سب ایسی تھیں جو اپنے پہلے شوہروں کے پاس اپنی جوانی گزار چکی تھیں اور بیوہ ہو کر حضور علیہ السلام کے نکاح میں آئیں۔ تعجب یہ ہے کہ اہل کتاب حضور علیہ السلام کے منکوحات پر کیونکر معترض ہو سکتے ہیں کیونکہ بعض دیگر انبیاء علیہم السلام کے مقابل جناب پیغمبر عرب نے منکوحات کی تعداد کو نہایت ہی محدود رکھا ہے جنکی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی تھی۔ مثلاً داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام مع تمام بنی اسرائیل میں تعدد ازدواج بروئے تعلیم توریت جائز ہے مگر نصاریٰ خواہ مخواہ مسلمانوں کے سامنے یہ فخر کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام نے تمام عمر نکاح نہیں کیا حالانکہ قواعد فطرت کے رُو سے یہ امر قابلِ اعتراض ہے اور ممکن ہے کہ یہود لوگ جو جناب مسیح علیہ السلام کو مطعون کیا کرتے تھے اس واسطے کسی نے انہیں رشتہ ہی نہ دیا ہو۔ بہرحال اگر مسیحی اُمت حضرت مسیح علیہ السلام کے ترک ازدواج کو قابلِ فخر ظاہر کرتی ہے تو اپنے پیغمبر بلکہ خدا کی اس سنت پر خود بھی عمل کر کے دکھائیں۔ پھر معلوم ہوگا کہ سچے طور پر متبع ملت ہیں اور جو یہ نہیں تو پھر اسلام پاک کے مسئلہ ازدواج پر جو عین قانون فطرت کے منشاء کو پورا کرتا ہے لغو اعتراض کرنے

سے باز آئیں - اب سنو کہ حضور علیہ السلام کے متعدد ازواج میں کیا کیا مصلحتیں تھیں :-

(ا) حضور علیہ السلام نے اعلائے کلمۃ الحق میں تمام ممکن طریقوں سے کام لیا - منجملہ ان کے متعدد ازواج کو نکاح میں لانے کا طریق بھی آپ نے استعمال کیا - غرض یہ تھی کہ مختلف قبائل عرب سے رشتۂ مصاہرت قائم ہو کر ان کے لئے موجب ترغیب ہو - چنانچہ تواریخ سے معلوم ہوگا کہ حضور کی یہ سعی بہت کچھ کارگر ہوئی اور سینکڑوں کو شرف بہ اسلام ہونے کا موقع ملا ؛

(ب) حضور علیہ السلام کو نہایت ضروری نظر آتا تھا کہ اسلام کی جماعت کو قوت حاصل ہو سو متعدد ازواج کے نکاح میں لانے سے ایک جماعت کثیر سے اسلام کو تقویت ہوتی چلی گئی ؛

(ج) اُمت کے لئے اس عملی نمونہ کو ظاہر کرنا مقصود تھا کہ کس طرح رانڈ اور بیوہ عورتوں کو بلا غرض نفسانی اپنے نکاح میں لاکر ان کے بار معیشت کو اپنے ذمہ لیا جاتا ہے تاکہ نکاح بیوگان جن سے عموماً طبائع متنفر رہتی ہیں اُمت کے لئے شرعی حکم قرار پائے - چنانچہ قرآن مجید نے بھی وانکحوا الایامی سے اس مسئلہ کو حل کردیا ؛ ایک مخالف کیا بکواس کریگا کہ حضور علیہ السلام کو شہوت پرستی مدِنظر تھی حالانکہ جناب کا رانڈ عورتوں کو محض بغرض تربیت و حفاظت عصمت نکاح میں لانا مخالفین نے بھی تسلیم کرلیا - دیکھو ابو طالب جو آپ کے چچا تھے اور باآنکہ ایمان نہیں لائے تھے مگر آپ کی عفت پر کس زور سے شہادت دیتے ہیں ! حیث قال ؎

وابیض یستسقی الغمام بوجہہ ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

لہ یعنی وہ شریف جس کے منہ مبارک کی برکت سے آسمان ابر سے بارش طلب کیجاتی ہے اور جو یتیم بچوں کا فریادرس اور رانڈ عورتوں کا سہارا ہے ۱۲ منہ

(۳) مختلف قبائلِ عرب کی عزت افزائی مدِنظر تھی کیونکہ حضورؐ خاندانِ قریش سے تھے جو تمام عرب میں سب سے زیادہ شریف سمجھا گیا تھا اور بالخصوص حضورؐ کے رشتہ مصاہرت کے وہ لوگ دل سے خواہاں تھے۔ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ازواج محض بغرضِ حصولِ سعادت آپ سے وابستہ ہوئیں ؛

(۴) اسلامی شریعت ایسی جامع شریعت ہے جس میں ہر ایک قسم امر کے متعلق احکام نہایت شرح وبسط کے ساتھ مندرج ہیں۔ چونکہ ان احکام کی تبلیغ نہایت ضروری تھی اس لئے صحابہ کا ایک گروہ ہمیشہ حضورؐ کی خدمت میں بغرضِ استفادہ جمع رہتا۔ چنانچہ قرآن مجید سے بھی آیہ فلولا نفر من کل فرقۃ میں اس کی ضرورت ظاہر کی۔ یہ ازواجِ مطہرات حضور علیہ السّلام سے اس حصۂ تعلیم کو حاصل کرتیں جو صرف عورتوں سے مخصوص ہیں۔ مثلاً مسائلِ حیض ونفاس و نکاح وطلاق اور دیگر مسائل طرزِ معاشرت وخانہ داری وغیرہ ایسے اُمور ہیں جو بجز گھر کے آدمیوں کے مفصّل معلوم نہ ہو سکتے تھے اور اجنبی عورتیں بلا واسطہ حضور علیہ السّلام سے ان مسائل کے دریافت کرنے میں حجاب کیا کرتیں اسلئے ازواجِ مطہرات گویا آپ کے مکتبِ شریعت کے لئے بمنزلۂ معلم کے تھیں جن سے عام عورتیں مسائلِ شریعت سیکھا کرتیں ؛

(۵) مخالفین ہمیشہ اس ٹوہ میں لگے رہتے کہ حضور علیہ السّلام کے اندرونی حالات پر مطلع ہو کر نکتہ چینی کیا کریں۔ اس لئے جنابِ والا نے متعدد قبائلِ عرب سے ازواج کو تجویز کیا تاکہ انہیں ان کی وساطت سے آپ کے اندرونی حالات پر اطلاع حاصل ہوتی رہے۔ کیونکہ جب انہیں حضورؐ کا خلا وملا یکساں ثابت ہو جاتا تو ان کے لئے آپ کی صداقت کی دلیل ہوتا۔ چنانچہ واقفانِ علمِ سِیَر پر مخفی نہیں ہوگا کہ کئی ایک بڑے بڑے مخالف صرف اسی تدبیر سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ؛

(۶) اُمت کے لئے اس نمونہ کا قائم کرنا مقصود تھا کہ کس طرح ایک شخص با خدا

ہو کر ضروریات تمدن و معاشرت پر بھی کاربند ہو سکتا ہے۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک عورت کی سخت مزاجی کی بھی بُردباری نہیں کر سکتے۔ مگر حضور علیہ السلام نے نہایت مصلحت کے ساتھ مختلف الطبائع ازواج کے حقوق کو ہمیشہ برابر ملحوظ رکھا اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا ؞

(ح) اہل عرب اس شخص کو جو مردی میں کامل ہو عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ امر بھی حضور علیہ السلام کے حشمت و وقار کا بڑا بھاری باعث تھا یہ امر واقف رسوم عرب پر مخفی نہیں ؞

(ط) اظہار خرق عادت مدنظر تھا۔ کیونکہ عام طور پر لوگوں میں اس قدر قوت رجولیت نہیں ہو سکتی باآنکہ حضور علیہ السلام کی غذا کا یہ حال تھا کہ بسا اوقات کئی دن فاقہ میں گذر جاتے مگر حقوق زوجیت میں فرق نہ آتا ؞

ممکن ہے کہ کوئی اور صاحب فراست اور بھی بہت سے وجوہ تجویز کر سکے مگر ایک سمجھدار کی ایمانی طاقت کے لئے کیا یہ کچھ کم ہیں؟ حضور نے ایک حدیث میں فرمایا کہ مجھے تمہاری[1] دنیا سے تین چیزیں مرغوب خاطر ہیں۔ عورت۔ بوئے خوش۔ نماز۔ ان کلمات کو ایک خبیث باطن کا آدمی جانے کس پہلو پر محمول کرے مگر ایک سلیم الفطرۃ آدمی جانتا ہے کہ اگر نکاح جائز سے کوئی شخص بلاوجہ محترز رہے تو سوائے بدمعاشی کے وہ اور کیا سیکھ سکتا ہے۔ عورت کا ہونا مرد کے لئے ہزاروں قسم کے گناہوں سے بچنے کا بڑا بھاری ذریعہ ہے۔ ذرا غور کر کے سمجھ لو کہ یہ کلام کس قدر خوبیوں کا جامع ہے! ؞

الغرض اسلامی مسئلہ نکاح و طلاق ایسا جامع مانع ہے کہ اس سے بہتر کسی شریعت میں بھی مذکور نہیں۔ جس شخص نے تاریخ زمانہ جاہلیت کا مطالعہ کیا ہوگا

[1] لفظ تمہاری سے یہ مراد ہے کہ حضور کا ان چیزوں کو پسند کرنا محض بغرض ثواب اخروی تھا۔

وہ بخوبی جانتا ہے کہ اہل عرب کے ہاں طلاق تین طریق پہ عائد کیجاتی تھی۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ مینے ثقہ اور معتبر اہل علم کی زبان سے سنا ہے کہ اہل جاہلیت تین طرح پر طلاق دیتے تھے۔ بذریعہ ظہار کے۔ بذریعہ ایلاء کے اور بذریعہ طلاق کے۔ سو طلاق کو تو خداوند تعالےٰ نے ثابت رکھا اور ظہار اور ایلاء کے وہ فیصلہ کیا جو قرآنمجید میں مذکور ہے ❊

جاہلیت کے ایلاء کی نسبت طبرانی نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جاہلیت میں ایک سال اور دو سال کا ایلاء کرتے تھے۔ خداوند تعالےٰ نے ان کے لئے ایلاء کے کل چار مہینے مقرر کئے۔ جو ایلاء چار مہینے سے کم کا ہو وہ ایلاء نہیں ہے ❊

جاہلیت میں مختلف اوقات میں تین طلاق دیتے تھے۔ یہ طریقہ بعینہٖ اسلام کا طریقہ ہے۔ اس طریق کی بنیاد سب سے پہلے حضرت اسمٰعیل بن ابراہیمؑ نے ڈالی تھی۔ پھر ان کے بعد اہل عرب نے اس پر عمل کیا۔ چنانچہ جب ان میں سے کوئی اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تو فقط ایک طلاق دیتا اور اور لوگوں کی نسبت اس کا سب سے زیادہ حقدار شوہر سمجھا جاتا۔ جب پوری تین طلاقیں دے چکتا تو اُس وقت عورت اُس سے بالکل علیحدہ ہو جاتی اور شوہر کا اس پر کوئی اعتبار باقی نہ رہتا ❊

یہ طریق کسی طرح بھی قابل ملامت نہیں ہے لیکن جاہلیت میں اس میں یہ خرابی واقع ہوگئی تھی کہ اہل جاہلیت عورتوں کو طلاق دیتے جبکہ ان کی عدت گزرنے کا زمانہ ہوتا اور ایک دو دن باقی رہ جاتے تو اُس وقت اُن سے رجعت کر لیتے نہ اس غرض سے کہ اُنہیں اُن کے ساتھ محبت یا اُن کی حاجت ہوتی تھی بلکہ اس غرض سے کہ اُنہیں نقصان پہنچے اور عدت طویل ہو جائے اور نکاح ثانی کے لئے زمانہ دراز تک انتظار کرنا پڑے ❊

ان کی یہ بھی شرارت تھی کہ اپنی عورتوں کو طلاق دیتے یا نکاح کرتے یا اپنا غلام آزاد کرتے تو کہتے کہ ہم نے مذاق کیا تھا۔ شریعت اسلام نے ان دو نوں باتوں کو باطل کیا۔ پہلے امر کی نسبت خدائے تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف او سرحوھن بمعروف ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذٰلک فقد ظلم نفسہ یعنی جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب ہوں تو اس کے بعد انہیں خوبی سے روک رکھو یا خوبی کے ساتھ چھوڑ دو۔ ضرر اور نقصان پہنچانے کی غرض سے انہیں نہ روکو ورنہ تم حد سے بڑھ جاؤ گے اور جو انہیں نقصان پہنچانے کی غرض سے روکے گا وہ اپنے پر ظلم کرے گا +

دوسری بات کو جناب سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول سے باطل کر دیا اور فرمایا کہ نکاح کا انعقاد اور طلاق و رجعت کا وقوع ہر حالت میں ہو جاتا ہے خواہ انسان دل سے ان کا مرتکب ہو یا مذاق سے۔ مذاق ان باتوں کو کرنا ایسا ہی ہے جیسے دل سے (دیکھو بلوغ الارب فی احوال العرب جلد ۲) +

طلاق کے باب میں زمانہ جاہلیت کے بعض عربوں کا یہ بھی دستور تھا کہ جس طرح خاوند اپنی بیویوں کو طلاق دینے کا اختیار رکھتے تھے اسی طرح بیویاں بھی اپنے شوہروں کو طلاق دینے کی مجاز تھیں۔ بیویوں کے اپنے خاوندوں کو طلاق دینے کا طریق یہ تھا کہ جب کوئی عورت اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے طلاق دینا چاہتی تو جس خیمہ میں وہ رہتی اُسکے دروازہ کا رُخ بدل دیتی۔ یعنی اگر خیمہ کا دروازہ مشرق کی طرف ہوتا تو اُسے مغرب کی طرف اور اگر مغرب کی طرف ہوتا تو مشرق کی طرف پھیر دیتی۔ اسی طرح اگر خیمہ کا رُخ جنوب کی طرف ہوتا تو اُسے شمال کی طرف اور اگر شمال کی طرف ہوتا تو جنوب کی طرف بدل دیتی اس کے ایسا کرنے سے خاوند پر طلاق پڑ جاتی اور جب وہ خیمہ کا رُخ بدلا ہوا دیکھتا تو سمجھ جاتا

کہ اس کی بیوی نے اسے طلاق دیدی ہے۔ پھر اس کے پاس نہ جاتا اور دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے +

جاہلیت میں عورتیں خُلع بھی کراتی تھیں۔ خلع کے یہ معنی ہیں کہ عورت شوہر کو کچھ مال دے کر اُس سے اپنا پیچھا چھڑا لیتی تھی۔ یہ بھی ایک قسم کی طلاق ہی تھی۔ اس میں اور طلاق میں فقط صرف یہ فرق ہے کہ طلاق شوہر خود اپنی مرضی سے دیتا ہے مگر خلع میں مال کے عوض عورت اس سے طلاق مانگتی ہے۔ خلع کا موجد عامر بن ظرب تھا جس کا مختصر حال یہ ہے کہ عامر بن ظرب نے اپنی بیٹی اپنے بھتیجے عامر بن حارث بن ظرب سے بیاہ دی تھی۔ نکاح کے بعد جب دُلہن دُولہا کے پاس بھیجی گئی تو دُلہن کو دُولہا کی صورت دیکھکر اس سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اس نے اس کا ذکر اپنے باپ سے کیا۔ باپ نے کہا کہ اگر تو اس سے علیحدہ ہونا چاہتی ہے تو وہ مال جو اس نے تجھے مہر میں دیا ہے اسے واپس کر دے یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ تجھے بھی تیرے شوہر سے چھڑا دوں اور اس کا مال بھی تیرے پاس رہے۔ پھر اس کے شوہر سے کہا کہ جو مال تو نے اسے دیا تھا میں اس سے واپس کرائے دیتا ہوں تو اسے چھوڑ دے۔ یہ سب سے پہلا خلع ہے جو عرب میں واقع ہُوا +

چند سال گذرے کہ مصر کے ایک مشہور رسالہ اللواء میں ایک دلچسپ مضمون شائع ہُوا تھا۔ اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے زیر بحث موضوع پر بہت کچھ روشنی ڈالتا ہے :-

اسلام کا ظہور اُس وقت ہوا جبکہ طبقۂ اناث کو غایت درجہ کی ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس فرقہ پر یہ احسان کیا کہ اس کو قعر ذلت سے نکال کر مرد و عورت کے حقوق فیما بین میں مساوات کا درجہ قائم کر دیا۔ بقولہ تعالےٰ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ۔ یہ فضیلیں کونسی

ہیں ؟ مردوں کی جسمانی طاقت عقل اور مال و دولت جو انکی بہتری اور گذارہ کے لئے کماتے اور خرچ کرتے ہیں - جو حقوق ایک مسلمان عورت کو شریعت اسلامیہ نے عطا کئے ہیں انکی نظیر کسی قوم میں نہیں ملتی اور نہ اس سے بڑھکر کسی کے دل میں آسکتے ہیں *

منجملہ ان حقوق کے جو عورت کو اسلام نے عطا کئے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ طلاق کا امر ایک حد تک عورت کے اختیار میں ہے کیونکہ عقد کے وقت ضمنًا یہ شرط ملحوظ ہوتی ہے کہ اگر مرد اس کے ساتھ اچھی طرح سلوک نہ کرے یا حسن سلوک کے ناقابل ہو تو وہ عورت امام وقت یا قاضی سے کہہ کر مرد سے جبرًا طلاق لے سکتی ہے - خواہ مرد کی مرضی ہو یا نہ ہو - علاوہ ان صورتوں کے مرد کو مطلق اختیار حاصل ہے کہ جب وہ چاہے عورت کو طلاق دیدے کسی دوسرے شخص کو کوئی حق نہیں کہ اس سے سبب دریافت کرے - البتہ اس پر یہ اعتراض آسکتا ہے کہ عورت کو بغیر سبب تبلائے طلاق دیدینا اس کے لئے بے عزتی اور اس پر ظلم کرنا ہے - لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ امر اس کے لئے باعث عزت اور اس کے عیوب کے لئے پردہ پوشی ہے کیونکہ بسا اوقات اظہار وجہ میں عورت کی تشہیر عیوب ہوتی ہے - اور یہ امر اس کے لئے دوسری جگہ نکاح کرنے میں سدِ راہ ہوجاتا ہے - یہ اُن احسانات کی بیّن دلیل ہے جو اسلام نے فرقہ اناث پر کئے اسی لئے خداوند تعالےٰ نے کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں دیا کہ مرد کو اسباب طلاق بیان کرنے پر مجبور کرے - اکثر یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ عورت کی کوئی خاص خصلت جو اگرچہ دوسروں کی نظروں میں پسندیدہ ہو خاوند کو نہایت بری معلوم ہوتی ہے ع وللناس فیما یعشقون مذاھب - اس صورت اس وجہ کا اظہار خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز دوسروں کو عورت پر بدظن ہونیکا موقع دیتا ہے - جس سے اسکی زندگی کٹھن ہوجاتی ہے اور وہ ذلت او رحقارت کی نگاہ سے

دیکھی جاتی ہے۔ ہر کس و ناکس کو طعن و تشنیع اور آوازے کسنے کا موقع ملجاتا ہے۔ جس کا تدارک ناممکن ہوجاتا ہے۔ بلکہ یہ اصلاح اس کے لئے مصیبت ہوجاتی ہے بلکہ صحیح لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمدن و معاشرت کو سخت نقصان پہنچاتی ہے اب معترض کہہ سکتا ہے کہ پھر قرآن مجید (سورۂ نساء) میں مرد اور عورت کے خاندانوں سے منصفوں کا قرار دیا جانا اور حکم بنا کر ان کو مرد اور عورت کے درمیانی اسباب نفاق کا بتانا کیوں آیا ہے؟ وہ بھی اس عورت کے حق میں مضر ہوتا ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اسباب شقاق (مخالفت و عداوت) اور اسباب طلاق میں بہت فرق ہے۔ صورت اوّل میں اگر طلاق تک نوبت نہ پہنچے تو افشائے راز سے عورت کو کچھ ضرر نہیں پہنچ سکتا اور اگر طلاق واقع ہوجائے تو اس صورت میں دوسری صورت سے مقابلۃً بہت کم ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نفاق کا باعث عورت کی بدخلقی ہی ہوا کرتی ہے۔ لیکن اسباب طلاق مختلف ہوتے ہیں۔ دو منصفوں کا فریقین کے اسباب شقاق کی تحقیقات کے لئے مقرر کرنا اکثر صلح مابین الفریقین کے لئے مفید ثابت ہوا ہے۔ بخلاف تحقیقات اسباب طلاق کے کہ اس صورت میں وقوع طلاق کے بعد اس کی تلافی محال بلکہ ناممکن ہے۔ اگر ہم مرد کو معمولی وجوہ سے طلاق دینے پر عذاب کا خوف دلائیں تو یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ ہم کسی بات کو معمولی سمجھیں مگر وہ مرد و عورت کے حق میں معمولی نہ ہو۔ بلکہ اس سے انکی زندگی ہی تلخ گذرتی ہو۔ اور وہ آپس میں گذارا نہ کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی میں اس امر کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے مجبور نہیں کیا گیا۔ کقولہ تعالےٰ فان کرھتموھن فعسٰی ان تکرھوا شیئًا ویجعل اللہ فیہ خیرًا کثیرًا۔ کیونکہ کراہت دل کی باتوں کو دور نہیں کرسکتی۔ اس کا نتیجہ سوائے بغض اور کینہ کے اور کچھ نہیں ہوسکتا ٥

لا ترجع الا نفس عن غیبہا
ما لم یکن منہا لہا زاجر

وجوہات مندرجہ بالا پر شارع علیہ السلام نے طلاق کا امر مطلقاً مرد کے اختیار پر چھوڑ دیا۔ اگر وہ طلاق دیدے تو ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہم اسے بُرا بھلا کہیں۔ اگر اس نے ظلم سے ایسا کام کیا ہے تو خود خدا اس سے سمجھ لے گا۔

وقوعات طلاق کو حتی الامکان کم کرنے کے لئے شارع علیہ السلام نے مفصلہ ذیل فرائض کو مردوں پر لازم کر دیا ہے:۔

(۱) عورت کا حق مہر ادا کرنا۔ فاتوھن اجورھن فریضۃ ؕ

(۲) اُن اشیاء کا واپس نہ لینا جو قبل از طلاق عورت کو دیدی گئی ہوں۔ وان اردتم استبدال زوج مکان زوج واتیتم احداھن قنطارا فلا تأخذوا منہ شیئا اتأخذونہ بھتانا واثما مبینا ؕ

(۳) ان اشیاء کا عورت کو بخش دینا جو بوقت طلاق اس کے زیر استعمال ہوں اس کا نام اصطلاح شریعت میں مُتعہ ہے وللمطلقٰت متاع بالمعروف حقا علی المتقین ؕ

(۴) عدت کے گذرنے تک ان کو نان و نفقہ دینا اور گھر میں رکھنا لاتخرجوھن من بیوتھن الا ان یأتین بفاحشۃ مبینۃ ؕ

(۵) اگر حاملہ ہو تو وضع حمل تک اس کو اخراجات وغیرہ دینا وان کن اولات احمال فانفقوا علیھن حتی یضعن حملھن ؕ۔

(۶) اگر مطلقہ عورت مرد کے شیر خوار بچہ کو دودھ پلاتی ہو تو اُسکی اُجرت وغیرہ دینا وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف ؕ

(۷) اگر کسی وجہ سے عورت کی طرف سے دل کھٹا ہو جائے تو صبر کرنا فان کرھتموھن ۔۔۔ الآیۃ

(۸) عورت و مرد کے خاندانوں سے دو شخص مقرر کرنا۔ تاکہ وہ اسباب شقاق

کو دریافت و تحقیق کرکے اس کے ازالہ کی کوشش کریں۔ وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینھما

(۹) مفلس شخص کو جو اخراجات خانہ داری کا متحمل نہ ہوسکے نکاح کرنے سے باز رکھنا ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحا حتی یغنیھم اللہ ؛

(۱۰) عورتوں سے حسن سلوک روا رکھنا فامسکوھن بمعروف اوفارقوھن بمعروف ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا ومن یفعل ذلک فقد ظلم نفسہ ولا تتخذوا ایت اللہ ھزوا ؛

بیان مذکورہ بالا سے واضح ہوگیا کہ اسلام نے اس مسئلہ کو نہایت عمدہ طور پر حل کیا ہے کہ کسی شخص کو نکاح جائز نہیں جب تک اسے اس کی ذمہ داریوں سے واقفیت نہ ہو اور جب تک وہ اپنے آپ کو عورت سے حسن سلوک کرنے کے قابل نہ پائے۔ اس لئے امام المسلمین پر واجب ہے کہ جب تک کوئی شخص ان صفات سے متصف نہ ہو اسے نکاح کرنے کی اجازت نہ دے تاکہ اسلام میں ایسی حرکات نامطبوعہ کی کثرت نہ ہو جائے۔ ہم پر بھی واجب ہے کہ اس کی کلی اطاعت کریں واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ جو شخص امام کے احکام کی پیروی نہیں کرتا وہ گناہ کرتا ہے اس کے لئے ہمیں ایسی سزا دینی اور ان خرابیوں کے روکنے کے لئے ایک ایسا دستور العمل بنانا چاہئے جو مندرجہ ذیل امور پر مبنی ہو ؛

(۱) کوئی شخص نکاح نہ کرے جب تک وہ نکاح کی ذمہ داریوں کو بجالانے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور جب تک وہ اپنی بیوی سے حسن معاشرت نہ کرسکے ؛

(ب) شریعت اسلامی کے موجب مرد اپنی منسوبہ بیوی کو دیکھ بھال لے تاکہ اسے شکایت کا موقع نہ رہے ؛

(ج) عام لیکچروں اور تقریروں میں ظلم کی برائیاں بیان کریں اور عذاب الٰہی

سے ڈرائیں ؎

(د) فرزندانِ اناث میں یہ رُوح پھونکیں کہ کسی مرد کے ساتھ نکاح نہ کریں جب تک وہ ایک معتدبہ رقم بطور مہر مقرر نہ کرے یا نکاح کے وقت طلاق کا اختیار اپنے قبضہ میں رکھیں ؎

(ہ) عورت کی بے پردگی اور اجنبیوں کے سامنے اظہار زینت کا بموجب احکام قرآن مجید بڑے زور سے رد کریں اور اس کے رد کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کریں ؎

اگر ہم مذکورہ بالا طریق پر عمل کریں تو انشاء اللہ العزیز طلاق جس کی کثرت کی ہم شکایت کرتے ہیں بہت کم ہوجائیگی اور اس کا اخر بد ہم سے اُٹھ جائیگا ؎

عدّت

شریعت اسلام میں مطلقہ عورت یا اس عورت کے لیئے جس کا خاوند مرجائے عدت پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم میں ایک مصلحت تو یہ ہے کہ ایام عدت کے پورا ہونے سے پہلے پہلے مطلقہ عورت اور شوہر میں ممکن ہے کہ مصالحت ہوجائے اور تفریق بین المسلمین لازم نہ آئے۔ کیونکہ طلاق کی صورت میں مرد اور عورت ہر دو کے خاندانوں میں ایک قسم کی مخالفت پیدا ہوجاتی ہے جو منشاء اسلام کے برخلاف ہے اور جس عورت کا شوہر مرچکا ہو اس کی عدت میں یہ حکمت ہے کہ اس کے حاملہ ہونے کی صورت میں اگر وہ بے عدت دوسرے مرد سے نکاح کرے تو اس امر کا فیصلہ دشوار ہوگا کہ بچہ پہلے شوہر کا ہے یا دوسرے کا۔ اور اس طرح بچہ صحیح النسب ثابت نہیں ہوسکتا اور یہ امر تقسیم ترکہ کے وقت موجب نزاع ثابت ہوگا۔ مختلف قسم کی عورتوں کی عدت کتب فقہ میں بالتفصیل مذکور ہے ؎

زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کی عدت کا طریق حسب ذیل تھا۔ وفات کی عدت ایک سال تھی۔ جب کسی عورت کا خاوند مرجاتا تو وہ ایک چھوٹے سے تنگ و تاریک گھر میں جس کی چھت نیچی ہوتی تھی نہایت خراب اور میلے کچیلے کپڑے پہن کر بیٹھ جاتی سال بھر

تک اس میں بیٹھی رہتی - اس عرصہ میں نہ نہاتی نہ کپڑے بدلتی - نہ ناخن کٹواتی نہ خوشبو لگاتی - غرض زینت اور آرائش کی کسی چیز کے پاس نہ پھٹکتی - جب پورا سال گذر جاتا اس وقت اس کے پاس کوئی جانور گدھا یا بکری یا پرندہ لایا جاتا اس کے ساتھ وہ اپنی عدت توڑتی - یعنی اس جانور یا پرندے کے جسم کے کسی حصہ کو اپنی شرمگاہ پر رگڑتی - اور اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتی - پھر بری صورت سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں چند خشک مینگنیاں دی جاتیں جن کو وہ کسی کتے کے اوپر یا اپنے کندھے پر سے اپنی پیٹھ پیچھے پھینکدیتی - اور ایسا کرنے کے بعد عدت سے باہر ہو جاتی - پھر خوشبو لگاتی اور جن باتوں کی اسے ممانعت تھی وہ اس کو مباح ہو جاتیں اور اس کے بعد جس قسم کا بناؤ سنگار چاہتی کرتی - راوی کا بیان ہے کہ جب وہ پرند کو اپنی شرمگاہ پر رگڑ کر پھینک دیتی تو وہ پرند مر جاتا تھا ۔

اسلام وعیسائیت کی اشاعت[1]

بعض ناواقفوں کا خیال ہے کہ مسئلہ جہاد صرف اسلامی شریعت سے تعلق رکھتا ہے - حالانکہ یہ خیال صریح طور پر غلط ہے - کیونکہ شریعت موسوی میں جہاد کا حکم موجود ہے - اور مختلف انبیاء بنی اسرائیل اس پر عمل پیرا ہوتے رہے ہیں - چنانچہ کتاب استثناء میں جبیئون اور ان کے ساتھ بعض دیگر لوگوں کے جہاد کرنے کا صریح حکم موجود ہے - اور مرتد اور بتوں کی قربانی دینے والے اور پرستش کرنے والے کی نسبت قتل کا حکم شریعت موسوی میں ایک تاکیدی حکم تھا - بلکہ اس حکم پر اس شدت کے ساتھ عملدرآمد کیا گیا کہ بچوں - بوڑھوں اور عورتوں کو بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا تھا - کتاب استثناء میں

[1] اس مسئلہ کو ایک خاص مناسبت کی بنا پر ہم نے دیگر مضامین کے ساتھ لکھنا مناسب سمجھا ہے ۱۲ منہ

مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ اس سرزمین کے تمام باشندوں کو ہلاک کرڈالو۔ اگر تم ہلاک نہیں کروگے تو وہ تمہاری آنکھوں میں ہنیوں اور تمہارے پہلوؤں میں نیزوں کا کام کرینگے۔ اور تمہاری سرزمین میں فساد کرینگے۔ اور میں جو انکے ساتھ کرنا چاہتا ہوں تمہارے ساتھ کرونگا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع علیہ السلام بھی بدستور حکم جہاد پر عملدرآمد کرتے رہے اور بے شمار مخالفین کو تہ تیغ کیا۔ جس کا ثبوت کتاب یوشع کے باب اوّل تا باب یازدہم میں موجود ہے اور باب دوازدہم میں مذکور ہے کہ انہوں نے کفار کے ۳۱ سلاطین کو قتل کیا اور بنی اسرائیل انکی سلطنت پر قابض ہوگئے۔ اور کتاب صموئیل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اہل جاسور اور عمالکہ کو بلا امتیاز زن و مرد قتل کرڈالا اور ان کے مال و متاع کو لوٹ لیا اور اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ موبین لوگ داؤد علیہ السلام کے مطیع ہو کر خراج ادا کیا کرتے تھے۔ اور سریانیوں کے چالیس ہزار سوار کو قتل کیا۔ اور سات سو گھوڑے لوٹ میں لئے۔ اور داؤد علیہ السلام کے ان اعمال کو اللہ تعالیٰ نے اعمال حسنہ قرار دیا۔ چنانچہ کتاب ملوک میں لکھا ہے کہ داؤد میرا بندہ ہے جس نے میری وصیت کو محفوظ رکھا اور دل سے میرے حکم کی اطاعت کی۔ طولس حواری ان انبیاء کے عمل جہاد کی بابت شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے نیکی کا کام کیا۔ ان کا ایسا کرنا گناہ نہیں تھا بلکہ قوت ایمانی اور رضاء الٰہی کا حاصل کرنا مقصود تھا۔ اس کو سنگدلی اور ظلم نہیں کہہ سکتے۔ صحائف انبیاء میں اور بھی بہت سے اس قسم کے حوالہ جات موجود ہیں۔ جب عادت اللہ سرکش کفار کی نسبت ہمیشہ جہاد پر جاری رہی ہے تو زمانہ نبوت اور بعد میں زمانہ خلافت کے ایسے جہادات کو کیوں مورد طعن بنایا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلامی جہاد میں انبیاء بنی اسرائیل کے جہاد کی نسبت کفار کے لئے بہت سی سہولتیں مدنظر رکھی گئی ہیں پہلے انبیاء علیہم السلام کے جہاد

میں بچوں - بوڑھوں - عورتوں کو قتل سے مستثنے نہیں کیا گیا تھا - مگر اسلامی جہاد میں ایسے لوگوں کی جانیں محفوظ رکھی گئی ہیں - اور اہل عرب کے سوا دیگر ممالک کے کفار کی نسبت حکم ہے کہ پہلے ان کے سامنے اسلام پیش کیا جائے - اگر وہ قبول کرلیں تو ان کے جان و مال اسی طرح محفوظ رکھے جاتے ہیں - جس طرح دیگر مسلمانوں کے - اور اگر اسلام قبول نہ کریں تو وہ ایک نہایت خفیف ٹیکس جو جزیہ کے نام سے مشہور ہے حفاظت جان و مال کے معاوضہ میں ادا کیا کریں اس کے بدل میں جنگی ضرورت کے وقت ان لوگوں پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا اور باینہمہ کئی ایک معذور لوگ ایسے ٹیکس سے معاف رکھے گئے ہیں - لیکن اگر وہ جزیہ ادا کرنے سے بھی انکار کردیں تو تیسرے درجہ پر ان سے جہاد کا حکم کیا گیا ہے - یہ امر کسقدر حیرت انگیز ہے کہ آجکل مغربی حکومتیں اپنے ملکی یا قومی حقوق کی حفاظت میں کروڑوں بندگان خدا کا بیدریغ خون کردینا تو جائز سمجھیں اور اعلائے کلمۃ الحق کے دشمنوں سے جو تکذیب حق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کرتے تھے توحید الہی کی اشاعت اور فساد فے الارض کے مٹانے کی غرض سے جہاد کرنا جائز قرار نہ دیں ؁

اس امر میں غور کرنا چاہیئے - کہ عادت اللہ ہمیشہ مخالفان حق کے ہلاک کرنے پر جاری رہی ہے - جن انبیاء علیہم السلام کو جہاد کے اسباب مہیا نہیں ہوئے - انکے مخالفوں پر انواع واقسام کے آسمانی عذاب نازل ہوتے رہے - نوح - لوط - ہود - صالح اور شعیب علیہم السلام کی قوموں کی تباہی کے حالات جو مختلف قسم کے عذاب کی صورتوں میں کتب تواریخ میں مذکور ہیں - اسی عادت اللہ ہی کے نتیجہ تھے - اور انبیاء بنی اسرائیل اور جناب پیغمبر علیہ السلام کے جہادات بھی عادت اللہ ہی کے سلسلے میں شمار کیئے جاتے ہیں - اور اس کی مثال بعینہ ایک ماہر ڈاکٹر کی سی ہے جو عمل جراحی کے اصول پر کسی عضو کو صرف اس غرض سے کاٹ دیتا ہے کہ مریض کی جان بچ جائے

یا یوں سمجھو کہ ایک بیمار بچہ جب کڑوی دوا نہیں پینا چاہتا تو اُسے جبراً پلائی جاتی ہے کیونکہ وہ استعمال دوا کے نتیجہ سے بے خبر ہے - اسی طرح ایک کسان اناج کے کھیت سے اس قسم کی نباتات کو اکھاڑ پھینکتا ہے - جو محض فضول اور زائد اور کھیتی کی نشوونما میں خارج ہوتی ہے - کیا کوئی عقلمند آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ ڈاکٹر یا کسان کا مذکورہ بالا عمل ناجائز یا غیر معقول ہے - سیرت نبوی کے واقف پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ کلمتہ الحق کی اشاعت میں جناب پیغمبر علیہ السلام کو مخالفین کی طرف سے کس کس قسم کی مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا - اور آپ اور آپ کے صحابہ کی جماعت نے کس استقلال کے ساتھ ان سب کو برداشت کیا - چونکہ قوت جہاد کے اسباب مکّہ کی زندگی میں میسّر نہ تھے - اس لئے بجز صبر کوئی چارہ نہ تھا - مگر خدائے تعالےٰ کی طرف سے برابر وعدہ نصرت کے آیات نازل ہوتے رہے - جس کا ایفاء بحکمت خداوندی واقعۂ ہجرت کے ساتھ وابستہ تھا - چنانچہ بالآخر مدینہ کی زندگی میں اسلام پاک کی تعلیم عرب کے کونے کونے تک پہنچ گئی - اکثر قبائل عرب نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا - اور بعض کے ساتھ جہاد کی ضرورت بھی پیش آئی - ان جہادی کارروائیوں میں بھی اکثر تو ایسی تھیں جو مدافعت کے طور پر عمل میں آئیں اور بعض ایسی بھی تھیں جو ان مخالفین کی قوت توڑنے کے لئے جنکے منصوبوں سے قبل از وقت اطلاع موصول ہوئی - بطور حفظ ماتقدّم کیگئیں - جناب پیغمبر علیہ السلام چونکہ مامور من اللہ تھے اس لئے آپ کا ہر ایک فعل حکم خداوندی پر مبنی تھا - چنانچہ ان جہادی کارروائیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کے دنیا سے رحلت فرمانے کے وقت تک عرب کی سرزمین جس پر لاکھوں معبودوں کی پرستش کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی انوار توحید سے و اشرقت الارض بنور ربہا کا مصداق بن گئی ؎

برزمینے کہ نشان کف پائے تو بود ✦ سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

پدر بجائے پسر ہرگز ایں کرم نہ کنند * کہ دست جود تو با خاندان آدم کرد

عیسائی مشنریوں نے جو ہمیشہ اسلام پاک کی مخالفت میں سر توڑ کوششیں کرتے چلے آئے ہیں۔ اور جنہیں اسلام کے محاسن بھی معایب نظر آتے ہیں۔ اسلام کے مسئلہ جہاد پر گاہ و بیگاہ نکتہ چینی کی ہے۔ اگرچہ ان کا یہ اعتراض کہ اسلام کی اشاعت میں دنیا میں تلوار سے کام لیا گیا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں اور نہ اس کا جواب آج کوئی نیا جواب ہو سکتا ہے مگر ہم ان لوگوں سے صرف دو باتوں میں غور کرنے کی استدعا کرتے ہیں۔ اول تو یہ کہ مذہب کی حکومت دلوں پر ہوا کرتی ہے۔ جن کے آثار لوگوں کے خارجی اعمال میں ظاہر ہوتے ہیں اور دلوں کو مسخر کرنا کسی دنیوی سلطنت کا کام نہیں۔ جب تک جوہر صداقت کسی مذہب کا اصل اصول نہ ہو۔ قانون فطرت اسکا کبھی ساتھ نہیں دیتا اور نہ دنیا کی تاریخ میں اس کا کہیں نام موجود ہے۔ زمانہ خلافت کی تاریخ پڑھو جس میں عرب سے باہر دیگر ممالک میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ تمہیں خوب واضح ہو جائیگا کہ مسلمانوں نے کبھی اشاعت مذہب میں جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا بلکہ ان معاہدات کی شرائط پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ غیر مسلم اقوام کو اختیار دیا گیا کہ مذکورہ بالا اور مختصر ٹیکس یعنی جزیہ ادا کرنا قبول کرلیں یا اسلام میں داخل ہو جائیں۔ ٹیکس جزیہ ادا کرنے کی صورت میں انکو انکے مذہب میں ہر ایک قسم کی کامل آزادی دیدی گئی۔ اور مسلمانوں کے ساتھ بحیثیت رعایا ان کو برابر کے حقوق حاصل تھے۔ اور اس قسم کے بہتیرے نظائر موجود ہیں۔ جن میں مسلم اور غیر مسلم فریقین مقدمہ میں سے غیر مسلم کے حق میں فیصلہ صادر کیا گیا۔ اور اگر بعد کی کسی اسلامی سلطنت میں کسی مسلمان حکمران نے کسی قسم کی بے اعتدالی کی ہو۔ تو اس کی جوابدہی صرف اسی شخص کی ذات تک محدود ہے مذہب اسلام اس کا ذمہ وار نہیں۔ مگر غالباً ایسی نظیر تاریخ میں مشکل سے دستیاب

ہو گی۔ الغرض اسلام کی سادہ اور بے لاگ تعلیم نے دلوں کو اپنی مقناطیسی قوت سے اپنی طرف جذب کر لیا۔ اور مختلف مذاہب کے لوگ کفر و شرک کی ظلمت سے نکل کر خود بخود نورِ توحید کی طرف کھیچے چلے آئے اور آیہ سنریہم ایٰتنا فی الآفاق و فی انفسہم حتی یتبین لہم انہ الحق کا آسمانی وعدہ پورا ہو گیا۔ اس لئے ہم ان کج بحث مشنریوں کو کہتے ہیں موتوا بغیظکم یعنی دانت پیسو اور کڑھو۔ دوم جناب پیغمبر علیہ السلام کے ابتدائی زمانۂ بعثت کے حالات میں غور کرو تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ حضور علیہ السلام کس طرح تن تنہا تبلیغ توحید کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور مخالفین نے جو حقیقت توحید سے کوسوں دور تھے کس طرح آپ کی آواز کو ناگوار محسوس کیا۔ چونکہ ورفعنا لک ذکرک کا وعدہ ہو چکا تھا۔ اس لئے بتدریج چند ایک سعادت مند آپ کی آواز پر لبیک کہکر آگے بڑھے۔ اور آہستہ آہستہ لوگوں کا رجوع بڑھتا چلا گیا۔ اور بالآخر ایک معتدبہ جماعت قائم ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے کونسی مادی قوت استعمال کیگئی اور کس طریق پر انہیں مجبور کیا گیا۔ اور ہجرت حبشہ پر مہاجرین کو کس طاقت نے اپنے عزیز وطن اور دیگر تعلقات سے علیحدہ ہونے پر مجبور کیا۔ حالانکہ کوئی شخص معمولی حالات میں اپنے اہل و عیال اور دیگر تعلقات سے علیحدہ ہونا کبھی پسند نہیں کرتا۔ پھر خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ بجز تکالیف و مصائب کے کسی قسم کے لالچ کی اُمید بھی دامنگیر نہ ہو۔ غالباً معترضین کو دنیا بھر کی تاریخ میں اس کی نظیر ہرگز نہیں ملسکتی۔ حضور علیہ السلام ابھی مکہ ہی میں تھے کہ اہل مدینہ نے آپ کی پاک تعلیم سے متاثر ہو کر آپ سے استدعا کی کہ مدینہ تشریف لے چلیے۔ چونکہ نصرت الٰہیہ کے ایفاء وعدہ کا وقت قریب آرہا تھا۔ اسلئے ہجرت کا واقعہ اسلامی تاریخ میں ایک ایسا اہم واقعہ ہے جس کی نسبت نہایت دیانتداری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِس ہجرت نے لاکھوں مہجورین کو بزم وصال میں قرب

الٰہی کے مسند پر بٹھا دیا۔ یہ وُہ واقعات ہیں جنکی اہلیت میں ہمارے مخالفین کو بھی مجال انکار نہیں۔ خدارا ذرا انصاف کرو کہ وہ کونسی تلوار تھی جسکی ہیبت سے دُور ونزدیک کے لوگ جوق در جوق حاضر ہو کر برضا و رغبت اسلام کی پاک تعلیم سے بہرہ یاب ہوئے۔ برخلاف اس کے عیسائی سلطنتوں نے گاہ بیگاہ دوسرے مذہب کے لوگوں کو ایسے ناپاک حیلوں اور شرمناک تجویزوں سے عیسائیت کی دعوت دی ہے جن کو اسلام نہایت ذلّت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ابن جبیر ساتویں صدی ہجری کا ایک مشہور اندلسی سیاح جزیرہ مسلی کے مقام اطرابنش کے چشم دید واقعات میں یوں لکھتا ہے :۔

کہ حکومت نصاریٰ کے ماتحت وہاں کے مسلمانوں کی کیا گت بنائی جاتی تھی حکومت کی طرف سے اس قسم کے احکام جاری کئے جاتے تھے جن سے مسلمان زن و مرد کو عیسائیت کی طرف مجبوراً رجوع کرنا پڑتا تھا اور بڑے بڑے اکابر اہل اسلام پر مختلف قسم کی تعزیرات عائد کی جاتیں جن سے وہ بالکراہ واجبار اسلام چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے۔ چنانچہ مقام مذکور کے ایک مشہور فقیہ ابن زرعہ کا واقعہ جو ہمارے ایام قیام میں پیش آیا یوں ہے کہ عاملانِ حکومت نے اسے ایسا تنگ کیا کہ وہ بیچارہ مجبور ہو کر داخل کلیسا ہو گیا اور مذہب اسلام سے دست بردار ہُوا اور اسے اناجیل اور اہل روما کی تاریخ و قوانین کے مطالعہ پر متوجہ کیا گیا۔ چنانچہ وہ نصاریٰ میں لارڈ بشپ کے عہدہ پر مقرر کیا گیا اور عیسائی شریعت کے مطابق فتوے دینے لگا۔ اور اس کے گھر کے متصل کی مسجد کو کلیسا بنا دیا گیا۔ مگر ہمیں اندرونی طور پر اطلاع ملی کہ وہ دل سے بدستور اپنے مذہب اسلام پر قائم ہے۔ غالباً قرآنمجید کے اس حکم استثنا میں داخل تھا۔ قال اللہ تعالیٰ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان۔ انہیں دنوں میں جزیرۂ مذکور کا ایک بڑا مشہور رئیس

ابو القاسم ابن حمود المعروف ابن الحجر جو خاندان اہل بیتؑ سے تھا اور جو آباؤ اجداد سے اپنی ریاست کا خود مختار رئیس تھا شہر مذکور میں وارد ہوا جس کے آنے پر مسلمانوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور جس کو عیسائی حکومت نے نظر بند رکھا اور اس پر چند ایک جھوٹے الزامات قائم کر کے انکی جواب دہی پر مجبور کیا اور اُسے مجرم قرار دیکر تیس ہزار دینار سے زاید بطور تاوان اس پر عائد کیا گیا چنانچہ اس نے اپنے تمام املاک و جائداد کو حکومت کے حوالہ کر کے اِس مصیبت سے رہائی حاصل کی - اس کے بعد وہ حکومت کی طرف سے کسی سیاسی مہم پر متعین ہوا جس کو اُس نے بادل ناخواستہ سرانجام دیا۔ جب اُس نے ہم لوگوں کے شہر مذکور میں وارد ہونے کی خبر سُنی تو اس کے دل میں ہماری ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ ہم سے ملا اور اُس نے عیسائی حکومت کے ظلم و ستم اور مسلمانوں کے ساتھ جبر و تعدّی کے ایسے درد انگیز واقعات سُنائے جنہیں سُنکر ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور سُننے والوں کے جگر کباب ہو گئے اثنائے گفتگو میں اُس نے کہا کہ میں دِل سے چاہتا ہوں کہ میں اور میرے کُنبے کے لوگ بیچ دئیے جائیں۔ ممکن ہے کہ میں اس عذاب سے نجات حاصل کر سکوں اور اسلامی ممالک میں پہنچ جاؤں۔ اس کی مصیبت کا اندازہ یہیں سے لگ سکتا ہے۔ کہ وہ باوجود ایک ذی رُتبہ اور عالی منصب رئیس ہونے کے ایک ایسی ناگوار خواہش کا متمنی تھا ہم نے اس کے اور دیگر مسلمان بھائیوں کے عیسائی حکومت کے شکنجۂ عذاب سے نجات پانے کی دُعا کی اور بالآخر وہ روتے رُلاتے ہم سے رخصت ہوا۔ اور وہ باوجود اپنی ایسی ناگفتہ بہ حالت کے غربا، مساکین اور حجاج بیت اللہ کی امداد و اعانت میں بہت سرگرم اور کوشاں رہتا۔ اور یہ دستور تو اس جزیرہ میں عام طور پر جاری تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے بیٹے پر یا اپنی بیوی پر یا کوئی ماں اپنی بیٹی پر ناراض ہوتی تو وہ بگڑ کر کلیسا میں چلے جاتے اور عیسائیت کا بپتسمہ پا لیتے۔ اقارب کو ان پر کسی قسم کا اختیار باقی

نہ رہتا - وہاں کے اکثر ذی فہم ہمیشہ اس بات سے خائف رہتے کہ کہیں ان کے ساتھ حکومت نصارٰی کی طرف سے وہی سلوک کیا جائے جو جزیرہ اقریطش میں مسلمانوں کے ساتھ عیسائی حکومت نے کیا تھا جو سب کے سب بجبر و تعدی عیسائیت میں داخل کیئے گئے تھے - اور بعض جان بچا کر وہاں سے نکل بھاگے تھے - اور اس سے بڑھکر اور کیا ذلت و ادبار کی دلیل ہو سکتی ہے کہ اکابر اہل اسلام میں سے ایک شخص نے اپنے بیٹے کو ہم جماعت حجاج بیت اللہ کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص ایک صغیرۃ السن باکرہ لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کے رضامند ہونے پر ہم لڑکی کو اس کے نکاح میں دینے کے لئے طیار ہیں اور یہ صرف عیسائی حکومت کے ظلم و ستم سے بچنے اور اسلامی ممالک میں پہنچ جانے کے لئے ایک قسم کا حیلہ تجویز کیا جاتا تھا - ہم نے ان دردانگیز واقعات کو دیکھکر سخت تعجب کیا - (انتہی کلامہٗ) *

چونکہ اسلام نے مسیحیت کی بنیاد کو متزلزل کر دیا اور اسے مختلف ممالک میں شکست پر شکست ہوئی اور مشنریوں کے مذہبی آڑ میں آکر دنیا پرستی کی پورے طور پر قلعی کھولدی - اس لئے مشنریوں کا اسلام کے برخلاف زہر اگلنا اور ناجائز حیلہ سازیوں سے کام لیکر لوگوں کو اسلام کی طرف سے بدظن کرنا ایک ضروری نتیجہ تھا اور اب بھی ان لوگوں کو بالیقین معلوم ہے کہ صرف اسلام ہی دنیا میں ایک ایسا مذہب ہے - جو نہ صرف عیسائیت بلکہ تمام دیگر مذاہب باطلہ کو بھی صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیگا - کیونکہ قانون الٰہی کے رُو سے ضروری ہے کہ باطل حق کے مقابلہ میں کبھی سرخرو نہیں ہو سکتا - اسلام پاک خدا کا واحد مذہب ہے جو تمام مذاہب عالم سے بعد میں بنی آدم کے سامنے پیش کیا گیا - اور جس کی بنائے استدلال اسقدر مستحکم اور مضبوط اصول پر مبنی ہے کہ فطرت الٰہیہ ہر ایک ملک اور ہر ایک

زمانہ کے لئے اس کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہے۔ اگر کسی کو شک ہو تو قرآن مجید کے اس اٹل وعدہ کو نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ سن لے۔ هو الذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون (یعنی اسی ذات اقدس نے اپنے برگزیدہ رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر دنیا میں اس غرض سے مبعوث فرمایا کہ تمام مذاہب عالم پر اس کے دین کو غلبہ دے۔ اگرچہ مشرک لوگ برا منایا کریں۔ یہ قرآنی الفاظ ہیں کوئی علی بابا کا قصہ نہیں۔ عیسائیت درحقیقت اب مٹ چکی ہے صرف گرجاؤں میں جو درحقیقت نفس پرستی کا کام دیتے ہیں۔ مشنریوں کے خطوط نفسانی کے لئے ٹمٹماتے چراغ کی صورت میں باقی رہ گئی ہے۔ یورپ دہریہ ہو چکا۔ اور عیسائیت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اور لوگ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلام کی صداقت اور حقانیت کا اعتراف کرتے چلے جاتے ہیں فالحمد للّٰہ علیٰ ذالک۔ ایک انگریز عیسائی مشنری آنوک ٹیلر اپنے سالہا سال کے تجربہ کی بنا پر باشندگانِ افریقہ کی بابت لکھتا ہے کہ یہاں عیسائیت اسلام کے مقابلہ میں کبھی کامیاب نہ ہوگی۔ ہم کہتے ہیں کہ اس نے نہایت صحیح کہا ہے مگر اس کے لئے ابھی کچھ عرصہ درکار ہے۔

مافی الاسلام

حصہ دوم تمام شد